

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

نگہت سیمما اور قیصرہ حیات کے سلسلے وار نااول
شیریں حیدر ناواب چیلاانی اور دیگر کہنے مشفق راٹھور کی پُر لطف تحریریں



پاکینہ

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد



رکنِ آل پاکستان

شعبہ اشتہارات

فیجراشتہارت محمد بنو خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانالہ حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور سید فراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچہ (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچہ (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی اتحاد عرب الامارات

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے ہم خاص کیوں ہیں:-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ری شیخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ری شیخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1





عید مبارک

مستقل عنوانات

296	پاکیزہ بہنیں	خوش فراقہ	16	ادارہ	دین کی باتیں
271	مدیرہ	سندھ لیسے	271	مدیرہ	بہنوں کی محفل
298	پاکیزہ بہنیں	سندھ لیسے	285	عظمی آفاق سعید	پاکیزہ ڈائری
300	ادارہ	روحانی مشورے	289	انجم انصار	جلت رنگ
302		ہومیوکلینک	294	صغریٰ زیدی	میں اکثر ننگی ہوں

افسانے

51	قانتہ رابعہ	آدم کے انسان ناک
83	شائستہ انجم	ضرورت مند
87	عقیلہ حق	عشیرہ مبارک
115	غزالہ عزیز	انمول دولت
127	نزهت جبین ضیا	مہر کی عید
159	نگہت اعظمی	ایک لڑکا
169	میمونہ صدف	بیتری ہے
205	ام طیفور	بچل
219	فرح طاہر	واپس
227	سعیدہ حیدر	میر انصاری
233	شمیم فضل خالق	صبح شانہ
241	ثوبیہ رفعت ذوالفقار	اللہ مالک
247	کائنات غزل	دل کے دروازے
258	رابعہ نیازی	نورین امرتنگ

خصوصی مضامین

261	اختر شجاعت	شمع ہدایت
265	شائستہ زریں	سرو جے

اداریہ

15	مدیرہ	مجھے کچھ کہنا ہے
18	نگہت سیما	اعتبار و وفا
138	قیصرہ حیات	آخری امرتنگ

سلسلے وار ناول

56	نبیلہ ابر راجا	مستراح آواز
180	نایاب جیلانی	پاکیزہ

ناولٹ

منی ناول

96	شیریں حیدر	زندگی خاک تھی
----	------------	---------------

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر پروپرائٹر: ذیشان رسول، اشاعت: گراؤنڈ فلور-C-63 فیڈل ایکس ٹینشن، ٹیفس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی





اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ بڑھاپے کا حقیقی آغاز کب سے شروع ہوتا ہے تو ان سے ہم یہ کہیں گے کہ جس لمحے آپ یہ کہنا شروع کرتے ہیں..... آہ بیٹے ہوئے دن گنتے اچھے تھے۔ جب میں جوان تھی تو ہر طرف میرا شہرہ تھا، جب میں کھانا پکاتی تھی، جب میں گھر ڈیکور بیٹ کرتی تھی، ہر طرف میری واہ، واہ ہوتی تھی۔ کاش وہ بیٹے ہوئے دن پھر لوٹ آئیں، مختصر یہ کہ جس لمحے یاد ماضی عذاب بن جائے سمجھ لیجیے کہ آپ کے بڑھاپے کا آغاز ہو گیا ہے۔

جس لمحے آپ کو حال کے بجائے ماضی دکھ نظر آنے لگے، مستقبل میں دکھ ہی نہ رہے تو خواتین و حضرات کو یہ جان لینا چاہیے کہ آپ پر پیرانہ سالی کا سایہ منڈلانے لگا ہے۔ آپ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔ آپ نے بھی غور کیا ہے کہ ضعیف اور بوڑھے لوگ عموماً کیا باتیں کرتے ہیں؟ کیا وہ کبھی حال کی باتیں کرتے ہیں؟ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں؟ یا وہ صرف یہی باور کراتے ہیں کہ ان کا ماضی ان کے حال سے زیادہ اچھا تھا تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف حال سے ہی نہیں بلکہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور ایسے تمام لوگ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور آج ہمیں آپ سے یہی کہنا ہے کہ ہمیں زندگی اور اس کے تغیر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرنے کے بجائے اپنے موجودہ وقت کو کامرانیوں اور شادمانیوں سے ہمکنار کرنے کے لیے کوشش کیجیے۔ اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے..... جب تک ہم مستعد رہیں گے ہم پر بڑھاپا طاری نہیں ہوگا..... ورنہ بہت سے جوان لوگ بھی بوڑھے لوگوں جیسی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں اور ہم تو ایک پُر عزم قوم ہیں، ہمیں اپنی زندگی اور اپنے ملک کو بہتر، کامیاب اور شادمان بنانا ہے اس کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور بہت کچھ پانا ہے کہ اللہ ہمارا کارساز ہے (بے شک) آپ سب کو پیشگی یوم آزادی مبارک ہو.....!

مدیرہ
انجم انصار

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ڈائجسٹ
ماہنامہ



میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

شیش محل

ہر دل عزیز اور معروف قلم کار

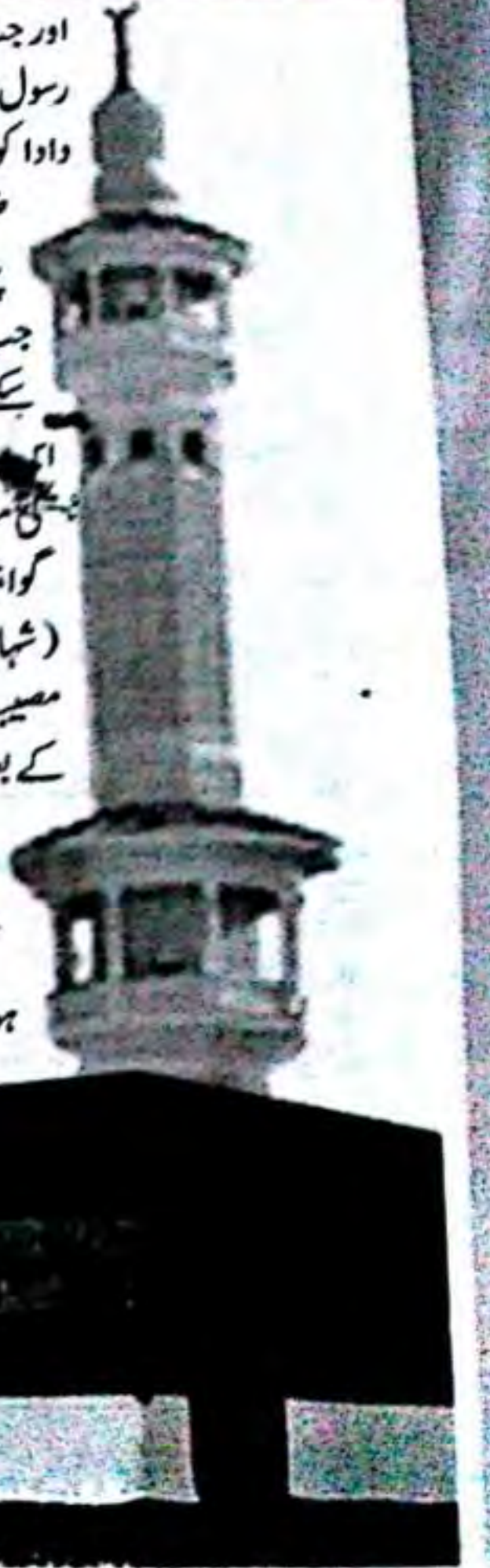
اسما قادری

کے قلم سے ستمبر 2015ء کے شمارے میں منفرد صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

کبھی خوش امیدی اور کبھی مایوس کن جذبات میں
ابھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف اور رسول (اللہ) کی طرف آؤ تو کہتے ہیں کہ ہم نے جس (طریقے) پر اپنے باپ، دادا کو پایا ہے (وہی) ہمیں کافی ہے (ہم) کو رسول کے پاس آنے کی ضرورت نہیں) کیا اگر ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں (۱۰۴) اے ایمان والو تم پر اپنی جانوں کی حفاظت لازمی ہے جب تم ہدایت پر ہو گے تو جو شخص گمراہ ہو گیا ہے وہ تمہیں کچھ ضرر نہیں پہنچا سکے گا اللہ کی طرف تم سب کو لوٹا ہے پس جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے تھے اس سے تمہیں آگاہ کر دے گا (۱۰۵) اے ایمان والو جب تم میں سے کسی کی موت قریب آئے تو وصیت کے وقت تم میں سے دو انصاف والوں کی گواہی تمہارے درمیان میں کافی ہے یا تمہارے سوا دوسرے آدمیوں کی (شہادت ہو) اگر تم زمین میں سفر کرو اور (بحالت سفر) تمہیں موت کی مصیبت پہنچے اگر تمہیں (کسی قسم کا) شک ہو تو ان دونوں (گواہوں) کو نماز کے بعد روکو وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس (گواہی) کے عوض میں کچھ دام نہیں لیتے اور اگر چہ (جس کی گواہی ہم دیتے ہیں وہ ہمارا) عزیز ہو (تب بھی ہم جھوٹی گواہی نہ دیں گے) اور اللہ کی (فرض کی ہوئی) گواہی نہ چھپائیں گے بے شک ہم اس وقت یقیناً گناہ گاروں سے ہو جائیں گے (۱۰۶) پھر اگر اس بات پر اطلاع ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مستحق ہو گئے (یعنی جھوٹی گواہی دی) تو دوسرے دو آدمی ان لوگوں میں سے جن کی حق تلفی کی ہے زیادہ قرابت دار (ہوں) ان کے قائم مقام ہوں اور اللہ کی قسم کھائیں کہ بے شک ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے سچی ہے اور ہم نے تجاؤز نہیں کیا بے شک ہم اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہو جائیں گے (۱۰۷)

(سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۰۴ تا ۱۰۷)



سیدنا محمد و آلہ

۶..... حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرے حوض کی مسافت ایک مہینہ کی ہے۔ (یعنی وہ اس قدر طویل و عریض ہے کہ ایک جانب سے دوسری جانب تک جانے کے لیے مہینہ درکار ہے) اور اس کے زاویے (گوٹھے) بالکل برابر نہیں (یعنی مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی خوشبو مشک سے بھی بہتر ہے اور اس کے کوزے آسمان کے تاروں کی طرح حسین و چمکدار ہیں۔ اور بے شمار ہیں جو اس کا پانی پے گا کبھی پیاس میں مبتلا نہیں ہوگا۔
حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ فرمایا..... رسول اللہ ﷺ نے کہا میں مقام محمود پر کھڑا ہونے والا ہوں آپ ﷺ سے پوچھا گیا وہ کیا ہے؟ فرمایا وہ دن ہوگا جس میں اللہ تبارک تعالیٰ کرسی پر اترے گا اور میرا مقام عرش کے دائیں جانب ہوگا جہاں میں اپنی امت کے لیے سفارش کروں گا۔ حضرت ابو ہریرہ نے پوچھا۔ آپ ﷺ کے لیے شفاعت کے بارے میں کیا وارد ہوا ہے۔ فرمایا۔ ”میری شفاعت اس شخص کے لیے ہے جو خالصتاً اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا دل اس کی زبان کی تصدیق کرتا ہو۔“ (کتاب الشفا)

۳۔ الرائے.....

۱۔ انصاف کا دن یوم قیامت یوم لادین کون سادل

ہے جس میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی آرزو میں کروٹ نہ لیتی ہوں۔ 19 ویں صدی کے وسط میں برطانیہ کا ایک آدمی ساٹھ برس کی زندگی پالینے کی امید کر سکتا ہے۔ جب یہ ساٹھ برس گزر جاتے ہیں تو کیا وہ زندگی ایک دو دن کی محسوس نہیں ہوتی۔ مایوسی اور ناامیدی کی اس صورت حال میں محسن انسانیت محمد ﷺ کا پیغام ہمیں حیات جاوداں کا مژدہ سناتا ہے۔ یہ حسین ترین سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

اعتبارِ وفا

گہت سیا

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک ہر ایک ہے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سنبھالنی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اولین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے ہیں رکھتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط: 12



”ہاں، میں سائیں مشا۔“ اس نے شرحیات کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی زہریلے سانپ کی سی چمک تھی اور اس کی نظریں جیسے شرحیات کے وجود میں کبھی جا رہی تھیں۔
 ”کیسے ہو دادا! میں تو سمجھا تھا کہیں مرکب چکے ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
 شرحیات ہونٹ پیچھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے تلاطم پاتاھے، طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جسے وہ زندگی میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے بارہا دعا کی تھی کہ وہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے ورنہ اسے ڈر تھا کہ وہ کبھی فرجی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑ نہ دے۔ وہ وعدہ جو اس نے مرتے دم اس سے لیا تھا لیکن آج اتنے سالوں بعد وہ پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے خون میں ابال اٹھ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اس نے منٹھیاں بھیجنے کی تھیں۔

”سائیں مشا اپنے دشمن کو قبر تک نہیں چھوڑتا دادا، تم خوش قسمت تھے جو تب بچ گئے تھے لیکن تقدیر پھر تمہیں آج میرے سامنے لے آئی ہے تو شاید اس بار تم اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہو سکو۔“ وہ عجیب طرح سے ہنس پالی جو سیمو کو سہارا دیے شرحیات کے پیچھے ہی آ رہا تھا ایک دم اس نے سیمو کے بازو سے ہاتھ ہٹایا اور جیتے کی سی پھرتی سے چلا ہوا شرحیات کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بے اختیار اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کھلے ڈلے گرتے کی جیب میں ڈالا تو سائیں مشا کے ہونٹوں پر بکھری طنزیہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے پیچھے موجود گاڑی کی طرف دیکھا جن کے ہاتھ اپنی گنوں پر تھے اور پھر مڑ کر بالی سے مخاطب ہوا۔

”لڑکے اپنا کھلونا جیب میں ہی رہنے دو پھر کسی موقع پر اپنی حسرت پوری کر لینا۔“ اور پھر شرحیات کی طرف دیکھا۔
 ”اسی شہر کراچی میں رہتے ہو دادا تو پھر ملاقات تو ہوتی رہے گی تب پچھلے حساب دیکھیں گے اور سارے کھاتے کھولیں گے۔ قدرت اگر آج اتنے سالوں بعد تمہیں سامنے لائی ہے تو پھر بھی ضرور لائے گی۔ کیوں دادا؟“
 شرحیات خاموش کھڑا فرجی کے ساتھ کیسے اس آخری وعدے کو دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔
 ”آج اگر کچھ دیر بعد میری بیوی کا یہاں اس کلینک میں آپریشن نہ ہوتا تو آج ہی دو، دو ہاتھ کر لیتے لیکن تم بہت غلط وقت پر سامنے آئے ہو۔ دادا تمہاری قسمت.....“

”مشا سائیں۔“ ایک ملازم نما شخص گاڑی کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا اور تقریباً آدھا جھک گیا تھا۔
 ”بولو۔“ سائیں مشا اب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 ”بی بی پوچھ رہی ہیں وہ ابھی گاڑی میں ہی بیٹھیں یا.....“
 ”انہیں لے آؤ۔“ سائیں مشا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”جی سائیں۔“ ملازم یوں ہی جھکے، جھکے بولا تھا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے چندا لٹے قدم چل کر مڑا تھا۔ شرحیات کی نظریں اب ملازم پر تھیں جو گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بی بی ایم ڈبلیو تھی اور اس کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک اور گاڑی گن ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ادھر ادھر تجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ کچھ دیر یونہی گاڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ بی بی ایم ڈبلیو سے اترنے والی خاتون بڑی سی سفید چادر لپیٹے ایک ملازمہ کے سہارے ہوئے، ہوئے چلتی ہوئی کلینک کی طرف آ رہی تھی۔ بے حد مضطرب سا ہو کر اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ریوالور پر پڑا تھا جو تھیس کے نیچے چھپا ہوا تھا اور ایک لمحے کو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنے ریوالور کی ساری گولیاں سامنے ہوئے، ہوئے قدم دھرتی کلینک کی طرف آتی عورت کے سینے میں اتار دے اور اپنے سینے میں جلتی آگ کو کھنڈا کر لے..... وہ آگ جو کئی برسوں سے اس کے اندر جل رہی تھی، دہک رہی تھی، خون کا بدلہ خون..... لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ کاش فرجی نے جاتے، جاتے اسے وعدے کی اس زنجیر میں نہ باندھا

ہوتا تو آج..... ایک گہری سانس لے کر اس نے سائیں مشا کی طرف دیکھا۔ اپنی بند منٹھیاں کھولیں لیکن اس کے اندر جھک چل رہے تھے آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔
 ”ہوں تو دادا پھر ملاقات ہوگی اور یاد رکھنا سائیں مشا اپنی بے عزتی نہیں بھولنا نہ بھولے گا آج اگر.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک نفرت بھری نظر شرحیات پر ڈالی اور خاتون کا ہاتھ پکڑ کر کلینک کی طرف بڑھ گیا۔ شرحیات ہونٹ پیچھے اپنے اندر اٹھتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب بالی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”باس یہ تو سکندر سومرو ہے ایم پی اے۔“ اس نے چونک کر بالی کی طرف دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخری بار جب وہ سائیں مشا سے ملا تھا تو صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک بگڑا ہوا جاگیردار ہے اور اب بالی جو کہ رہا تھا یقیناً ایسا ہی ہوگا ہماری سیاست آخرا یسے ہی لوگوں سے تو بھری ہوئی ہے۔

”چلیں باس۔“ بالی نے اسے پھر مخاطب کیا۔
 ”سیمو کو گھر چھوڑ کر پھر ہمیں ولسن صاحب کی طرف جانا ہے، یہ لوگ وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں باس۔“
 اس نے خالی، خالی نظروں سے بالی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھک کر گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے..... اپنے اندر اٹھتے طوفان سے لڑتے ہوئے اس نے گاڑی پارکنگ سے باہر نکالی تھی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گاڑی میں بیٹھے ہی تینوں گاڑی بہت عجلت سے بی ایم ڈبلیو کے پیچھے کھڑی گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور بہت احتیاط سے اس کی گاڑی کے پیچھے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ارتقاع نائیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بہت ایزی موڈ میں ٹی وی دیکھ رہی تھی جب افغان ہاتھ میں فائل اٹھائے اپنے کمرے سے نکلا اور اسے لاؤنج میں اطمینان سے براجمان دیکھ کر ٹھنک کر رک گیا۔
 ”ہے..... رتی تم نے یونیورسٹی نہیں جانا؟“
 ”نہیں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل چینج کیا۔
 ”کیوں؟“ افغان نے بغور اسے دیکھا۔
 ”بس موڈ نہیں۔“

”تم کل بھی نہیں گئی تھیں... کیا بات ہے؟“ اب کے افغان کے لہجے میں تشویش تھی۔
 ”بس ویسے ہی موڈ نہیں ہو رہا ان دنوں۔“ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں اب بھلا وہ افغان بھائی کو کیا بتاتی کہ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہی اور اس کے دل میں کیا خوف ہے۔ افغان کو تو صرف کل کا پتا تھا اور وہ پچھلے چار دنوں سے یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی۔ ایمل سے تو اس نے بہانہ کر دیا تھا کہ ان دنوں کچھ خاص پڑھائی نہیں ہو رہی اور وہ گھر میں رہ کر زیادہ اچھی طرح سے پڑھ سکتی ہے لیکن افغان بھائی کو نانا آسان نہیں تھا۔
 ”لیکن تم تو اپنی اسٹڈیز کے متعلق بہت کوشش رہتی ہو۔ تم لاہور بھی زیادہ دن اسی وجہ سے نہیں رکھیں۔“
 ”ہاں، لیکن ان دنوں دل اچاٹ سا ہو رہا ہے پڑھائی سے۔“ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا تو افغان نے تاسف سے کہا۔

”لیکن رتی ان دنوں تو بہت اہم لیکچرز ہوں گے تمہارے، اب جبکہ ایگزام نزدیک ہے تو تمہیں اپنے لیکچرس نہیں کرنے چاہئیں۔“ افغان کے انداز میں فکر بھی تھی اور سمجھ بھمی۔ اس نے صرف سر ہلایا تھا۔
 ”کھیں عالیہ سے ناراضی تو نہیں چل رہی؟“ افغان نے کچھ سوچتے ہوئے اندازہ لگایا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس کی بات کی تردید نہیں کی تھی۔

بے حد مضطرب اور بے چین تھی۔ پاپا تو خیر اس کی ہر بات مان لیتے لیکن ماما اور افغان ضرور اعتراض کریں گے بلکہ افغان تو خفا ہو جائے گا۔ ابھی تو خیر اس نے اسے ٹال دیا تھا لیکن پھر بعد میں کیسے اسے اور ماما کو قائل کرے گی۔

”اگر سب سچ بتا دوں تو افغان تو غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ ظفری کو مارنے پر تل جائے گا۔ نہیں میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی..... کبھی نہیں۔“ اس نے جیسے اپنے فیصلے پر تصدیق کی مہر لگائی۔

”لیکن روادحہ.....“ دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔ ”اگر میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی تو پھر روادحہ سے بھی نہیں مل سکوں گی..... تو کیا ہوا کیا فرق پڑتا ہے وہ محض ایک کلاس فیلو ہی تو ہے..... لیکن کیا وہ واقعی صرف ایک کلاس فیلو ہے؟“ اس نے خود سے پوچھا اور اس کے دل میں ہوتی خوشگوار دھڑکنوں نے اس کی تردید کی تو وہ افسردہ سی ہو کر نئی وی دیکھنے لگی تب ہی پاس پڑے اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی کسی کا فون آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونی فون کی طرف دیکھتی رہی۔ فون ساکنٹ پر تھا اور نمبر اجنبی لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے فون اٹھا کر آن کیا۔

”ہیلو..... ارتقا سے بات کرنی ہے۔“

”جی، میں ارتقا ہوں۔“

”میں روادحہ ہوں۔“ دوسری طرف سے روادحہ نے کہا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ ”کیسی ہیں آپ اور یونیورسٹی کیوں نہیں آرہی ہیں؟“

”وہ دراصل.....“ وہ چپ کر گئی۔

”ظفری کی وجہ سے نا؟“ دوسری طرف سے روادحہ پوچھ رہا تھا۔ ”لیکن آپ کو بھلا ظفری سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ڈرنا تو اسے چاہیے۔“ اس کا لہجہ بہت نرم تھا دل میں اترتا ہوا سا؟ کتنا خوب صورت لہجہ تھا اور کتنی سحر انگیز آواز..... وہ اس سحر میں ٹھوی گئی۔

”ویسے ظفری بھی آج کل یونیورسٹی نہیں آرہا۔“ اس نے بتایا تو ارتقا نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

”آپ پریشان ہیں رتی..... پلیز پریشان نہ ہوں مجھے اندازہ تھا آپ کی پریشانی کا میں آپ کو پہلے فون کرتا لیکن میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا آج ہی نمبر ملا ہے۔“

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اس کا نمبر کہاں سے ملا کیا عالیہ سے.....؟ لیکن وہ پوچھ نہ سکی بس خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

”آپ جانتی ہیں ان دنوں سرحفظ کتنے اہم لیچر دے رہے ہیں۔ آپ کی اسٹڈی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ آپ کل سے یونیورسٹی آئیں گی رتی اور آپ کو کسی سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”جی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اول تو ظفری اب آپ کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو ہم ہیں نا، یوں بھی ظفری آپ کا دوست تھا۔ کوئی دوست بن کر وار کرے تو آدی بے خبری میں مارا جاتا ہے لیکن اب کم از کم وہ بے خبری میں وار نہیں کر سکتا۔“ وہ سمجھا رہا تھا اور وہ ایک انوکھی سی کیفیت میں گھری ہوئی تھی اسے روادحہ کی بات سننا اچھا لگ رہا تھا۔

”تو پھر آپ کل آرہی ہیں نا؟“ اس نے تصدیق چاہی تھی۔

”جی، میں کل آؤں گی۔“

”گڈ..... تو پھر کل انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔“ فون بند ہو گیا تھا لیکن وہ فون ہاتھ میں لیے حیران بیٹھی تھی۔

مرد دل کی دھڑکنوں نے اودھم مچایا ہوا تھا کیا اس طرح بھی ہوتا ہے کبھی کہ کوئی لحوں میں اتنا قریب آ جائے جیسے مدیوں کی آشنائی ہو یہ روادحہ حسن ایک سال سے اس کا کلاس فیلو تھا لیکن دل پہلے کبھی اس کے نام پر یوں نہیں دھڑکا

”یعنی میرا اندازہ درست ہے کہ دونوں دوستوں میں لڑائی ہو گئی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”بہتر ہے اسے مٹا لو سسٹر بجائے اس کے کہ اپنی پڑھائی کا نقصان کرو۔“ اس نے اس کا سر تھپتھپایا۔ ”ویسے تم انتہائی بے وقوف ہو رتی بھلا دوست کی ناراضی پر کوئی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میں واپس آ کر عالیہ کو فون کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ ”ہماری صلح ہو گئی ہے اور میں کل سے یونیورسٹی جا رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ عالیہ کو فون کرے۔

”گڈ۔“ افغان بھی مسکرا دیا لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔ ”زندگی بہت مشکل ہے رتی اور تم چھوٹی، چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہو اور ان کا اثر لگتی ہو۔ بہادر بنو، کیا خبر آئندہ زندگی میں کوئی مشکل مقام آ جائے اور تم ہمت ہار دو۔“ وہ اس سے چھوٹا تھا لیکن اس سے زیادہ سمجھدار تھا اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسا تھا اور اسے چھوٹی، چھوٹی نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے محبت سے افغان کی طرف دیکھا۔

”تمہاری نصیحت کا شکر یہ اتنی آئندہ کوشش کروں گی کہ چھوٹی، چھوٹی باتوں کا اثر نہ لوں۔“ وہ زبردستی مسکرائی اور افغان نے آنکھیں پھیلا کر کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ کم از کم وہ ارتقا سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس کی بات اتنے آرام سے سن لے گی بلکہ اس کا شکر یہ بھی ادا کرے گی۔

”یہ تم ہی ہونا رتی، مجھے یقین نہیں آرہا۔“ اس نے ایک شرارت بھری نظر اس پر ڈالی اور ایک بار پھر اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

”یہ چھوٹی سی بات کہاں تھی اتنی۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ”اگر تم جان لو تو پتا نہیں تمہارا روتیوں کا کیا ہو؟“ وہ توجہ بھی ان لحوں کے متعلق سوچتی تھی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اگر اس رات وہ ظفری کے چنگل سے نہ نکل پاتی، اگر روادحہ کی گاڑی اتفاق سے وہاں نہ آتی تو.....؟ اس نے جھرجھری سی لی۔

کیا سمجھا تھا اس نے ظفری کو اور وہ کیا نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ظفری سے محبت تھی لیکن وہ اسے اپنا اچھا دوست سمجھتی تھی۔ عالیہ نے ہی پہلی بار اسے ظفری سے متعارف کروایا تھا اور وہ ہمیشہ ہی ظفری کی تعریف کرتی تھی شاید وہ بھی نہیں جانتی ہوگی کہ ظفری درحقیقت کیا ہے اور روادحہ اس کے لیے محض ایک کلاس فیلو تھا۔ اس نے بھی روادحہ کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا کبھی اس کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ ایک بار عالیہ نے کہا تھا کہ روادحہ اسے پسند کرتا ہے شاید لیکن چند روز بعد ہی عالیہ کی بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ روادحہ خوش شکل، ذہین اور مہذب تھا۔ جواد، شہاب اور عظام کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتی تھی لیکن اب روادحہ کے متعلق یکا یک اس کے احساسات بدل گئے تھے۔ کیا یوں اس طرح اچانک بھی احساسات بدل جایا کرتے ہیں یا اس کے دل میں کہیں کوئی چور گوشہ پہلے سے ہی موجود تھا؟

وہ حیران تھی ان پچھلے چار دنوں میں اس نے روادحہ کو بہت سوچا تھا اور روادحہ اسے دوسروں سے بہت مختلف لگا تھا۔ اس کا بہت جی چاہا تھا کہ وہ روادحہ سے ملے، اس کے متعلق مزید جانے۔ اس سے اس کے متعلق، اس کے خاندان کے متعلق پوچھے لیکن یونیورسٹی جانے کے خیال سے ہی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ وہاں یونیورسٹی میں ظفری بھی ہوگا۔ وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی اور اگر اس نے وہاں اسے مخاطب کر لیا۔ وہاں سب کے سامنے کچھ کہہ دیا کوئی غلط بات، کچھ ایسا کہ وہ سرائٹھانے کے قابل ہی نہ رہے اور کیا پتا اس نے وہاں یونیورسٹی میں ذکر کر دیا ہو کسی سے۔ اپنے دوستوں سے ہی کہ اس نے مجھے بلایا تھا اور میں اس کے گھر چلی گئی تھی۔ کوئی الٹی سیدھی کہانی سنا دی ہو۔ عالیہ نے بھی تو ان چار دنوں میں اسے فون نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیا کہا ہوگا اس نے عالیہ کو۔

”نہیں، میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔“ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے بظاہر مطمئن ہو گئی تھی لیکن اندر سے

تھا۔ وہ اپنے دل کے ساتھ ہونے والی اس واردات سے پریشان تھی۔ اسے خود اپنا یقین نہیں تھا کہ وہ ارتقاغ باہر کبھی کسی سے اتنا متاثر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے رہی تھی۔ اگر اس کیفیت کا نام محبت تھا تو کم از کم یہ نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں گم بیٹھی تھی۔ نی وی چل رہا تھا لیکن آواز بند تھی۔ جب ایل لاؤنج میں آئی اور اس نے خاموش بیٹھی ارتقاغ کو دیکھا۔ ایل کے آنے پر بھی اس نے ایل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ایل کو وہ اداس اور پریشان لگ رہی تھی اور یونیورسٹی بھی نہیں جا رہی تھی۔

”کیا ارتقاغ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟“ ایل نے سوچا اور پریشان سی ہو کر اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ارنی بیٹا کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔“ ارتقاغ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”تم کچھ پریشان لگ رہی ہو ارنی بیٹا، کوئی بات ہے؟ کوئی پر ایلم سے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔ مجھ سے کہو گڑیا ماں ہوں میں تمہاری۔“

اس نے ایل کی طرف دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہے اگرچہ باہر نے کل کر اس بات کا اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس کا بہم انداز اسے شک میں مبتلا کرتا تھا بلکہ یقین دلاتا تھا کہ ایل اس کی سگی ماں نہیں ہے گوا سے باہر کے کاغذات سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا لیکن پھر بھی بہت ساری باتیں تھیں جن پر پہلے اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب غور کرتی تھی۔ بچپن سے ہی وہ ایل کی نسبت باہر کے زیادہ قریب رہی تھی اور باہر نے جس طرح اس کے لاڈ اٹھائے تھے اور اس کی ضدیں پوری کی تھیں ایل نے نہیں۔ ایل، افنان کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔ بچپن میں وہ کچھ کمزور اور بیمار سا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ ایل اسے گود میں بٹھائے اس کے ساتھ کھیلے، اسے توجہ دے لیکن کبھی تو افنان رو رہا ہوتا، کبھی اسے بھوک لگی ہوتی اور وہ دو سالہ ارتقاغ ایل سے مایوس ہو کر باہر کی گود میں پناہ لیتی۔ باپ کے بے جالا ڈی پیار نے اسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ اس بنا پر اس نے بچپن میں دو تین بار ماں سے تھپڑ بھی کھائے تھے۔ بچپن میں وہ سمجھتی تھی کہ ایل، افنان سے اس سے زیادہ محبت کرتی ہے لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایل اس کی سگی ماں نہیں ہے لیکن اب یہ خیال دل سے نکلتا ہی نہیں تھا ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ اس کا یقین پختہ ہوتا چلا جاتا۔ ایک بار اس نے باہر سے پوچھا تھا کہ اس کا نام کس نے رکھا تھا تب باہر نے بتایا تھا کہ اس کا نام خود اس نے رکھا تھا لیکن تمہاری ماما نے کہا یہ مشکل نام ہے میں تو اسے رتی بلایا کروں گی لیکن ایل نے اسے کبھی رتی کہہ کر نہیں بلایا تھا وہ ہمیشہ اسے ارنی کہتی تھی جبکہ بانی سب اسے رتی ہی بلاتے تھے۔ اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کبھی ایل کے منہ سے اپنے لیے رتی نہیں سنا تھا۔ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی لیکن اس وقت اس کے لہجے کی دلگرتی نے اس کے دل کو گداز کیا تھا۔ یہ بھی تو سچ تھا کہ ایل نے کبھی اس کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سلوک نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک تو اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ اس کی روک ٹوک سے چڑتی بھی تھی لیکن اس نے اپنے دل میں اتنی بیگانگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

”ارنی میری جان بتاؤ ناں کیا بات ہے؟“ ایل نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پھر پوچھا۔

”کچھ نہیں ماما۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہے بس یونہی موڈ نہیں ہو رہا تھا یونیورسٹی جانے کا، کل سے چلی جاؤں گی۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو ناں ارنی۔ دیکھو مجھ سے کوئی بات مت چھپانا۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی آپ کا ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہوتا جس طرح وہ آپ کا تحفظ کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں کر سکتا۔“ ایل کے لہجے میں اب بھی تشویش تھی۔

اعتبار و وفا

”کوئی بھی تو بات نہیں ہے ماما اگر ہوتی تو ضرور بتاتی۔ آپ کو نہ سہی پاپا کو تو ضرور بتاتی۔“ وہ مسکرائی تو ایل کو بھی یقین آ گیا کہ وہ اپنی ہر بات باہر سے ضرور شیئر کرتی تھی۔ ”بی لیوی ماما۔“ اس نے پھر یقین دلایا۔ مسکراہٹ اسی طرح اس کے ہونٹوں پر گھبری ہوئی تھی اور اس کے اوپر والے دانت ذرا سے نظر آ رہے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ترتیب سے جڑے سفید دانت۔ وہ کھوس گئی تھی کتنے سالوں بعد اس کی یہ مسکراہٹ اسے کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ ایسے ہی ذرا، ذرا سے فاصلے پر ترتیب سے جڑے دانت۔ وقت نے جیسے پیچھے کی طرف ایک زقند لگائی۔

”افوہ مڈر! یہ تمہارے دانت ہر وقت باہر ہی کیوں نکلے رہتے ہیں؟“ وہ ڈریٹنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی اور آئینے میں اس نے اپنی پیچھے کھڑے مڈر کے عکس کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

مڈر کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا تھا اور مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔

”تو کیوں نہ نکلیں دانت باہر۔۔۔۔۔ اپنی محبت کا پالینا، بل جانا کچھ کم ہوتا ہے کیا، شکر کرو میں دیوانہ نہیں ہو اور نہ میرا تو جی چاہتا تھا تمہیں لگاؤں، ناچوں، گاؤں اور پوری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کر لوں۔ سب کو بتاؤں کہ مجھے میری محبت مل گئی ہے۔“

”تم سچ سچ پاگل ہو مڈر۔“ وہ اندر ہی اندر اترا تھی لیکن بظاہر اس نے منہ بتایا تھا۔

”ہاں، پاگل ہوں۔۔۔۔۔ دیوانہ ہوں تمہارا، یہ پاگل پن اور دیوانگی تمہارے لیے ہے ایما۔“

”تم پہلے تو ایسے نہ تھے مڈر اتنے جذباتی، اتنے رومینٹک!“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”میں پہلے بھی ایسا ہی تھا اتنا ہی جذباتی، اتنا ہی رومینٹک۔“ اس نے ایک بازو اس کے گرد حائل کرتے ہوئے ایک شوخ سی جسارت کی تو وہ ہنس ہو گئی۔

”لیکن مجھے تو کبھی نہیں لگا تھا کہ تم اتنے رومینٹک ہو۔۔۔۔۔ ہمیشہ اقبال کے شعر سناتے تھے اور بات کرتے ہوئے کوئی سنجیدہ بوڑھے پروفیسر لگتے تھے۔“ وہ نچلے ہونٹ کا ایک کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرائی تھی لیکن وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں ڈرتا تھا ایما اپنے جذبوں کے بے وقعت ہو جانے سے۔۔۔۔۔ ان کے رائیگاں چلے جانے سے۔۔۔۔۔ مجھے خوف آتا تھا کہ ہمارے راستے الگ ہو گئے تو میرے کہے الفاظ تمہارا جینا مشکل کر دیں گے۔“ اس نے اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھینکتی آواز میں کہا۔ ”مجھے اب بھی کبھی کبھی بڑا خوف آتا ہے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہماری خوشیوں کو نظر نہ لگ جائے۔۔۔۔۔ کہیں ہم پھٹ نہ جائیں۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا، وعدہ کرو کچھ بھی ہو جائے میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔“ اور اس نے وعدہ کیا تھا۔

”ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے مڈر۔۔۔۔۔ زندگی کی آخری سانسوں تک۔۔۔۔۔“

لیکن زندگی کی طرح لفظ بھی کبھی کبھی کتنے بے اعتبار ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے ہی کہے ہوئے لفظوں سے مکر جاتا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ کب اس نے کیا کہا تھا۔ اس کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی تو اس نے چونک کر ارتقاغ کی طرف دیکھا وہ نی وی کی طرف متوجہ تھی۔

مڈر سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس نے خود کو بہت بار باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ ڈیڈی نے مڈر کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ نصابہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنگ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران میریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹنگ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



twitter.com/paksociety1

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

ڈیڈی کو انکار کر دیا تھا اس کا اور مدثر کا ساتھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر می، ڈیڈی کو مدثر کا رشتہ قبول نہیں ہوا تو وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی جس سے اس کے ڈیڈی کی عزت پر حرف آئے۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی جو انہیں دکھ پہنچائے ایسا دکھ جیسا اس کے دادا اور دادی نے اٹھایا تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو تڑپ رہا تھا، چل رہا تھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے اگر اسے مدثر کی رفاقت نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔ وہ اس کے بغیر جی نہیں سکے گی۔

”مدثر میں کیا کروں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی پلیز کچھ کرو۔“ اس نے بے حد مایوس ہو کر اسے فون کیا تھا۔ ”میں ڈیڈی کو دکھ نہیں دینا چاہتی مدثر اور میں تمہارے بغیر بھی جی نہیں پاؤں گی۔“ وہ رو پڑی تھی۔ مدثر اس سے زیادہ مایوس اور اداس تھا پھر بھی اس نے سمجھایا تھا۔

”ہم یہ جانتے تھے ایسا کہ طبقاتی فرق کی وجہ سے شاید ہمارا ملن ممکن نہ ہو پھر بھی ہمارے دل ایک دوسرے کی محبت میں دھڑکے، یہ محبت خود بخود ہمارے دل میں پیدا ہوئی۔ یہ محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی یہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی۔ ہر محبت کے نصیب میں وصل نہیں ہوتا۔ والدین اولاد کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں ان کی بہتری کے لیے ہی کرتے ہیں شاید تمہاری بہتری اسی میں ہو۔“ وہ خود بھی رو پڑا تھا اور اس کے آنسو جیسے اس کے دل پر گرے تھے۔

”تمہیں مدثر..... تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے صرف تمہارے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں۔ میں کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ تم مجھے جو کہو گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ جذباتی سی ہو گئی تھی ہارنے لگی تھی اور بھول گئی تھی کہ جب اس کی پھوپھو نے اپنی پسند سے شادی کی تھی تو دادا، دادی کو روتے دیکھ کر وہ سوچتی تھی کہ وہ کبھی پھوپھو کی طرح اپنے می، ڈیڈی کو ناراض نہیں کرے گی۔

”نہیں..... میں تمہیں کچھ بھی ایسا کرنے کو نہیں کہوں گا جس سے تمہارے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو پلیز اور بھول جانا وہ سب جو ہمارے درمیان تھا۔“

”کیسے بھول جاؤں مدثر؟“

”وقت ہر زخم مندمل کر دیتا ہے ایک دن۔“ اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”پلیز..... پھر فون نہ کرنا کہیں اختیار کی لگا میں میرے ہاتھوں سے چھوٹ نہ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے کسی عمل سے میرے اور تمہارے خاندان کی عزت پامال ہو۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا اور وہ بلک، بلک کر رونے لگی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ، خاندان کی عزت کو محبت پر قربان نہیں کیا جاسکتا تھا اسے اپنی جذباتیت پر شرمندگی ہوئی تو وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔

تب ہی ڈیڈی دستک دے کر اندر آ گئے تھے اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔

”ایسا..... میری جان، میری گڑیا۔“ وہ ہولے، ہولے اس کا سر تھپتھپانے لگے تھے۔ ”تم کیا سمجھتی ہو بیٹا کہ تمہارے ڈیڈی کو تم سے محبت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے جو بھی سوچا تھا تمہاری بہتری کے لیے سوچا تھا شاید میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا تھا۔ سوچا کہ باہر سے شادی کر کے تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو گی۔ میں اب بھی جو فیصلہ کروں گا تمہاری بہتری کے لیے ہی کروں گا تمہیں اپنے ڈیڈی پر اعتبار ہے ناں؟“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا تھا اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

”سوری ڈیڈی۔“

PAKSOCIETY.COM



نکوئی چیز خرید کر لے آتے۔ ڈھیروں کپڑے اور دوسری ضرورت کی چیزیں۔

”بابا ابھی اتنی جلدی ان سب کی کیا ضرورت ہے؟“ اسے بابا سے شرم آتی۔

”ضرورت تو بڑے گی ناں بس سانسے نظر آگئی تو لے لیں۔ ارادتا تو نہیں کیا تھا لینے۔“ اسے بابا کی بات پر ہلسی آتی لیکن وہ اپنی ہلسی چھپا جاتی اور جس روز پتا چلا تھا کہ اس کے ہاں جڑواں بچوں کی آمد متوقع ہے تو اس روز تو مدثر نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا۔ بابا اور وہ مدثر کی دیوانگی پر مسکراتے رہے تھے اور مدثر نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”سنو میں صرف انہی دو بچوں پر اکتفا نہیں کروں گا مجھے کم از کم دو بچے اور چاہئیں۔“

”تو بے مدثر..... اب دو آئے نہیں اور تم دو حریذ کالاج کرنے لگے ہو۔“ اس نے اسے گھورا تھا۔

”تو میں نہیں چاہتا میرے بچوں کا بچپن بھی میری طرح گزرے..... تہا، خاموش، اکیلا اکیلا سا۔ میرا تو جی چاہتا ہے میرا آنگن بچوں سے بھرا ہو وہ سب مل کر کھیلیں کودیں، بڑیں بھگڑیں اور گھر میں خوب ہنگامہ اور رونق ہو۔“ ان دنوں زندگی میں مزید رنگ بھر گئے تھے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا اور مدثر کچھ نہ کچھ آنے والے بچوں کے لیے خرید کر لے آتے تھے۔

”ٹھیک ہے ناں کچھ اور جو میرے ذہن میں نہیں ضرورت ہو تو بتانا۔“ بابا پوچھتے تو وہ جھینپتی، شرماتی۔

”مہی کہہ رہی تھیں مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود کر لیں گی سب۔“

”ہاں تو ضرور کریں ان کا بھی حق ہے لیکن ہمیں بھی تو اپنے شوق پورے کرنے ہیں۔“ بابا ان دنوں بالکل بچے بنے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے نام سوچتے رہتے۔ مدثر کو کبھی نہیں آتا تھا کہ کون سا نام زیادہ اچھا ہوگا اسے کئی نام پسند تھے۔

”سنو مجھے شہر یار نام پسند ہے۔ عبد اللہ بھی اچھا ہے اور بابا کو تو عمر، بلال، تیمور جانے کون، کون سے نام پسند ہیں اور..... تمہیں کون سے نام پسند ہیں؟“

”بچے دو ہیں دس نہیں ہیں۔“ وہ اسے چڑاتی تو اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔

”چلو اس بار بابا کی پسند کا نام رکھ لیں گے اور اگلی بار تمہاری پسند کا اور پھر اگلی بار میری پسند کا اور.....“

”مدثر۔“ وہ اسے گھورتی۔ ”بچے دو ہی اچھے۔“

”ہائے نہیں یار..... دیکھو یہ سارے نام اتنے پیارے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ سارے پیارے، پیارے نام میرے بچوں کے ہوں۔“

وہ اس کی پیٹھ پر مکا مارتی۔

خوشی کی تلیاں جیسے ہر وقت اس چھوٹے سے گھر میں رقص کرتی تھیں۔ بابا ہر روز ان کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتے تھے لیکن پھر کیا ہوا تھا ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سارے خواب مٹی میں مل گئے تھے وہ جیسے خوشیوں کا جھولا جھولتے بہت بلندی سے نیچے گری تھی۔

ان دنوں وہ بڑی پھپھو کی بیماری کی وجہ سے مہی ڈیڈی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ بڑی پھپھو کئی سال پہلے بیوہ ہو گئی تھیں چونکہ اولاد نہیں تھی اس لیے دادا دادی کی زندگی میں ہی وہ ادھر آگئی تھیں اور اہل کوان سے بہت محبت تھی۔ اس لیے ان کی بیماری کا سنتے ہی وہ ادھر آگئی تھی۔ مدثر بہت بے چین تھا۔

”یار میں تمہارے بغیر کیا کروں گا؟“

”وہ جو پہلے کرتے تھے۔“

”کس بات کے لیے؟“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھا تھا اور اس نے نظریں جھکا لی تھیں وہ اپنی سوچ اور جذباتیت پر شرمندہ تھی لیکن وہ یہ بات بھلا ڈیڈی کو کیسے بتاتی کہ کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہی تھی کہ اگر مدثر کہے گا تو وہ اس سے کورٹ میرج کر لے گی۔ یہ تو مدثر سے شادی کے بعد اسے پتا چلا تھا کہ ڈیڈی نے ایکسٹینشن پر اس کی اور مدثر کی باتیں سن لی تھیں اور مدثر سے متاثر ہوئے تھے۔

”اب مت رونا تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“ وہ اس کا سر چوم کر چلے گئے تھے اور وہ لٹی، لٹی سے بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی ہو لے، ہو لے اس کے اندر مر رہی ہو۔ وہ جانتی تھی ڈیڈی کا فیصلہ قبول کر کے وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی لیکن پھر بھی اس نے ڈیڈی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا کہ اسے اپنی پھوپھی جیسا نہیں بنا تھا۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آگئے تھے اور ایک بار پھر وہ رو رہی تھی اور جب مہی نے آکر بتایا تھا کہ ڈیڈی نے اس کی شادی مدثر کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے مہی کو دیکھتی رہی تھی۔

”وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ تمہاری شادی باہر کے ساتھ ہوتی اور تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتیں۔“ مہی بہت اداس اور دلگرفتہ لگ رہی تھیں۔

”مہی۔“ وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔ ”سوری میں نے آپ کو دکھ دیا لیکن میں نے باہر بھائی کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مدثر اگر نہ ہوتا تب بھی باہر بھائی نہیں۔ پلیز مہی مجھے معاف کر دیجیے گا۔ خفا مت ہوں مجھ سے۔“ اور مہی اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے ہو لے، ہو لے تھکنے لگی تھیں۔

”میں ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے ہمارے لیے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ مقدم ہے۔“ اور جب اس نے سراٹھایا تھا تو ڈیڈی دروازے پر کھڑے تھے۔

”ڈیڈی میں بہت بری ہوں، میں نے آپ کو دکھ دیا آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے ڈیڈی اگر آپ کو مدثر پسند نہیں تو.....“ وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی اور آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا تھا۔

”نہیں..... میری بیٹی بہت اچھی ہے اور مدثر اچھا لڑکا ہے۔“ ان کی آنکھوں میں مدثر کے لیے ستائش تھی۔

”میں پہلے اسے دولت کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی وہ ایک اعلیٰ کردار کا اچھی سوچ رکھنے والا لڑکا ہے اور ایسا ہی لڑکا میری بیٹی کو ڈیزر کرنا ہے۔“

”آپ خوش تو ہیں ناں ڈیڈی؟“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

”میں خوش ہوں..... میری بیٹی کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔“ اور وہ کتنے ہی دن بے یقین سی رہی تھی اور یقین تو مدثر کو بھی نہیں آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں کتنی ہی بار پوچھتا تھا۔

”یہ سچ ہے ناں..... میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ناں؟“ لیکن یہ خواب نہیں تھا سچ تھا۔ ان کا ماسٹر مکمل ہوتے ہی بہت دھوم دھام سے ان کی شادی ہو گئی تھی اور وہ مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مدثر کے گھر سوائے اس کے بابا کے اور کوئی نہیں تھا اور بابا تو محبتوں اور شفقتوں کا سمندر تھے۔ دھیسے لہجے میں بات کرتے تھے، ہر وقت اس کے لیے اور مدثر کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ زندگی اتنی خوب صورت ہو گی اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ بابا اور مدثر بھر، بھر کر محبتوں کے خزانے لٹاتے تھے اور ان محبتوں کو سینٹے، سینٹے اس کا دامن تنگ پڑنے لگا تھا وہ سوچتی تھی کیا اس روئے زمین پر اس سے زیادہ خوش قسمت بھی کوئی ہوگا..... وقت جیسے پر لگا کر اڑا جا رہا تھا اور جس روز اسے پتا چلا تھا کہ وہ

ماں بننے والی ہے تو مدثر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پورے شہر میں چڑاغاں کر دے اور بابا..... ان کی خوشی بھی دیدنی تھی وہ اس طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے کہ اگر مدثر کی امی زندہ ہوتی تو شاید اس طرح اس کا خیال نہ رکھ پاتیں۔

کانچ سے واپسی پر ہر روز لدے پھندے گھر آتے تھے۔ فروٹ اور جو سز کے علاوہ تو مولود بچے کے استعمال کی کوئی

اسے مدثر پر یقین تھا۔ اس کی محبتوں پر اعتبار تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ مدثر ایسا نہیں ہو سکتا اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا اور مطمئن بھی ہو گئی۔ مدثر کی وابستگیوں اور محبتوں میں کھو کر وہ باہر کی کہی ہوئی بات بھول گئی تھی۔ مدثر تو ایسا ہی تھا روز اول کی طرح فون کرتا تو بند کرنا بھول جاتا۔

”مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی سچ..... کب آؤ گی؟“

”ڈاکٹر نے ابھی ایک ماہ کا اور بیڈ ریٹ بتایا ہے۔“

”تو بیڈ تو یہاں بھی ہیں ادھر آ کر بیڈ ریٹ کر لو۔“ وہ چڑتا اور وہ اس کی محبتوں پر مغرور ہو جاتی۔ بابا بھی صبح شام فون پر اس کی خیریت پوچھتے تھے اور کبھی کبھار ملنے بھی آ جاتے تھے پھر کئی دن گزر گئے۔ باہر سے کھانے اور ناشتے کے وقت ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنی جاب میں بڑی تھی۔ مہی اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں باہر نے پھر کوئی ایسی بات نہیں کی تھی لیکن ایک دن اچانک اس نے ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

”آج مدثر ملتا تھا، شاپنگ کر رہا تھا۔ ایک لڑکی بھی ساتھ تھی غالباً کوئی رشتے دار ہو گی۔“

”لیکن اس کی تو کوئی رشتے دار لڑکی نہیں ہے بس ایک بچہ تو تھیں جو گاؤں میں رہتی تھیں اور ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ضرور مونا ہو گی۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں چکن کا پیرس رکھتے ہوئے سوچا۔

”یہ لڑکا تو پاگل ہے۔“ مہی نے مدثر کی شاپنگ پر تبصرہ کیا تھا۔ ”ہر روز بلاوجہ ہی ڈھیروں چیزیں خرید لاتا ہے، تم اسے منع کیوں نہیں کرتیں؟“

”کیا منع کروں مہی اس کا تو جی چاہتا ہے کہ مارکیٹ میں جو کچھ بھی بچوں کی ضرورت کا ہے سب خرید لائے۔“ اور شام کو جب مدثر آیا تو واقعی وہ بچوں کے بہت پیارے بلیٹکٹ خرید کر لایا تھا ایک پنک، ایک اسکاٹی بلو۔

”کیسے ہیں؟“ اس نے بہت اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”پیارے ہیں لیکن بابا پہلے ہی دو بلیٹکٹ لائچکے ہیں۔“

”تو مجھے یہ اچھے لگے، دیکھو کتنے نرم اور ملائم ہیں۔“ اور اس کے ہاتھ سے کبل لیتے ہوئے اس نے یونہی سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

”تم کس کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے تھے؟“

”کسی کے ساتھ نہیں اکیلا ہی گیا تھا، کالج سے نکلا تو سوچا اپنے لیے کف لکس اور ٹائی لے لوں تو بس یہ نظر آگئے خرید لیے۔“ اور اس روز پہلی بار اس کے دل میں شک کا کاٹا چھتا تھا۔ مدثر کے ساتھ اگر کوئی تھی تو اس نے چھپایا کیوں..... کیا اس کے دل میں کوئی چور ہے اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شک کے یہ کانٹے بڑھتے گئے۔ جیسے کانٹوں کی پوری فصل آگ آئی تھی۔ باہر کی سرسری سی کی گئی بات اسے گھنٹوں پریشان رکھتی تھی۔ مدثر حیران تھا۔

”کیا بات ہے ایما تم اتنی چڑھی کیوں ہو رہی ہو؟“

لیکن وہ اسے کیا بتاتی کہ شک کے کوڑیا لے ناگ اپنی بسی زبانیں نکالے ہر وقت اسے ڈستے رہتے ہیں اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی لیکن گھر جانے کو اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ مدثر کی محبتیں اس کی شدتیں سب اسے مصنوعی، مصنوعی سی لگتیں۔ انہی دنوں جب بابا اسے گھر لے کر آنے کی باتیں کر رہے تھے بڑی پھوپھو کا انتقال ہو گیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

ریٹیننس کی نکالیف، بیزاری اور چڑھاہن مدثر کی محبتوں پر شکوک اور پھوپھو کی ڈبھ وہ بہت ڈپریشنڈ اور ٹینڈ تھی اسی ٹیشن میں وہ گھر سے باہر نکل کر پورچ کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور لان میں مالی کو گھاس پر ٹیشن چلاتے

”یہ ظلم ہے میرے ساتھ زیادہ دن مت لگانا۔“

”اچھا۔“ اس نے وعدہ کر لیا تھا لیکن پھر اس کی اپنی طبیعت ہی خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریٹ بتایا تھا اور مہی نے اسے روک لیا۔

مدثر نے گھر چلنے کی ضد کی لیکن بابا نے اسے سمجھایا تو مجبور ہو گیا لیکن دن میں دس، دس بار فون کرتا۔ صبح کالج جاتے اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے چکر لگاتا۔ وہ اس کی دیوانگی پر ہنستی۔

”کالج میں کسے وقت گزارتے ہو؟“

”سچ بتاؤں یا لکل دل نہیں لگتا۔“ وہ بچوں کی طرح بسورتا اور وہ دل ہی دل میں اس کی محبت پر نازاں ہوتی۔ پھوپھو، مہی، ڈیڈی سب ہی اس کی خوشگوار زندگی سے مطمئن تھے لیکن اس روز جب باہر نے پوچھا۔

”تم خوش تو ہونا؟“

”ہاں بہت۔“ اس نے بے حد حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ باہر سے شادی سے پہلے بھی اس کی بے تکلفی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ بات چیت ہوتی تھی اور اب بھی رسی سی بات چیت ہوتی تھی۔ جب سے وہ مہی کے گھر آئی تھی چند پارہی براہ راست بات ہوتی تھی لیکن اس وقت کمرے میں لینے، لینے اس کا دل گھبرا رہا تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ مہی، ڈیڈی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ پھوپھو اپنے کمرے میں تھیں اور باہر لاؤنج میں صوفے پر نیم درازنی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ کرٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ جہاں ایک دلچسپ پروگرام لگا ہوا تھا۔ تب اچانک ہی آواز آہستہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”مدثر تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہے نا؟“ لٹھے بھر بعد اس نے پھر پوچھا تھا۔

”کیا بات ہے باہر بھائی، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں یہ؟“ اس بار جواب دینے کے بجائے اس نے خود ہی سوال کر ڈالا تھا۔

”بس یونہی۔“ باہر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”یونہی تو نہیں کوئی بات تو ہے؟“ وہ تجسس ہوئی تھی۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مدثر کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہو گا؟“

”نہیں..... بس میں چاہتا چاہتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہے تم خوش ہو..... تم نے کہا کہ تم خوش ہو تو.....“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”لیکن آپ یہ کیوں چاہتا چاہتے تھے؟“ اس کے اندر تجسس پیدا کر کے وہ انجان بن رہا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہے ہیں؟“

”تم یقین نہیں کرو گی اس لیے بتانے کا فائدہ۔“

”یقین کرنا یا نہ کرنا تو بعد کی بات ہے، آپ بتائیں تو۔“ وہ بھند ہوئی تھی۔

”تم بہت ضدی ہو۔“ باہر نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا اور لہجہ بھر بعد آہستگی سے بتایا۔ ”مدثر تمہارے ساتھ غلط نہیں ہے ایما۔“

”نہیں۔“ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ”ایسا نہیں ہے آپ کو غلط نہیں ہوئی ہے۔“

”مجھے پتا تھا تمہیں یقین نہیں آئے گا، اس لیے میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔“

”مدثر ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ اسے پورا یقین تھا۔

”سے بی۔“ باہر نے کندھے اچکائے تھے اور ٹی وی بند کر کے لاؤنج سے چلا گیا تھا۔

دیکھ رہی تھی۔ پھوپھی کو پانچ دن ہو گئے تھے اور بابا آج کل میں اسے آکر لے جاتے۔ وہ بابا کے سامنے انکار نہیں کر سکتی تھی جبکہ مدثر سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔

بابا نے نہ جانے کتنی بار اسے کسی لڑکی کے ساتھ لہج کرتے، گھومتے، آئس کریم کھاتے، شاپنگ کرتے دیکھا تھا لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتا تھا۔

”میرے ساتھ بھلا کس لڑکی نے ہونا ہے، یہ روایتی بیویوں والے شک مت کیا کرو۔“ اس نے سوچا اگر بابا لینے آئے تو وہ بابا کو سب کچھ بتا دے گی۔

کسی قدر مطمئن سی ہو کر وہ پھر مالی کی طرف دیکھنے لگی تھی جو اب مشین ایک طرف رکھ کر باڑھ میں بیٹھے بلی کے بچے کو اٹھا کر گیٹ سے باہر لے جا رہا تھا۔ تب ہی بابا آکر اس کے پاس ہی بیٹھی پر بیٹھ گیا تھا۔

”وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے، آج کل ہر رات ڈنروہ اس کے ساتھ ہی کرتا ہے۔ تم میری کزن ہو میری بہت پیاری جان سے عزیز خالہ کی بیٹی۔ میں چاہتا ہوں تم مدثر پر اندھا اعتماد مت کرو۔ یہ اس طبقے کے لوگ مدثر کی طرح ہی امیر لڑکیوں کو بیٹھی بناتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا دھوکا دے کر.....“ وہ ہولے، ہولے کہہ رہا تھا اور ایمل کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سب کچھ ڈھنسا جا رہا ہو۔

مدثر کی محبتوں اور وفاؤں پر اس کا یقین اور اعتبار سب کر چکی، کر چکی ہو گیا ہو اور یہ کر چیاں اس کے دل و جان میں چھپی جا رہی ہوں شدید اذیت سے اس نے آنکھیں موند لیں اور اس درد کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو دل و جان کو کاٹتا تھا۔

”تم اگر آج رات میرے ساتھ چلو تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا، میری بات کا شاید تمہیں یقین نہ آئے۔“ بابا نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور اس نے سر ہلا دیا تھا اور اس رات بابا کے ساتھ اس ہوٹل کے ڈائننگ میں ایک ٹیبل پر مدثر کے ساتھ ایک ماڈرن لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

”محبت اور نفرت کے درمیان بہت کم فاصلہ ہوتا ہے جتنی شدت سے اس نے مدثر کو چاہا تھا اس سے اس نے اس کے لیے اتنی ہی شدید نفرت محسوس کی تھی۔“

ٹی وی کی آواز کا ایک بلند ہوئی وہ ماضی کی بھول بھلیوں سے واپس آ چکی تھی۔ وہ چونک کر کچھ دیر یونہی خالی، خالی نظروں سے ارتقاع کی طرف دیکھتی رہی جو اب بھی پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ تھی اور پھر بابا کی طرف دیکھنے لگی جو موبائل پر بیٹج پڑتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ ان دنوں اس کا موڈ کافی خراب تھا اور وہ اس کے موڈ کی خرابی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید کاشن کے اس سوڈے میں اسے خاطر خواہ منافع نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا تھا اور نہ اس کے پوچھنے پر اس نے کچھ نہیں بتایا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر اسے کچھ بتانا نہ ہوا تو وہ کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ ایسا ہی تھا اگر اسے کوئی بات نہ بتانی ہوتی تو کبھی نہ بتاتا۔ اس وقت بھی اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اس نے ایک سرسری سی نظر ایمل پر ڈالی اور پھر ارتقاع کے پاس رکا۔

”پاپا میری گاڑی؟“ ارتقاع کو یک دم ہی یاد آیا تھا کہ بابا نے اسے نئی گاڑی لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

”ابنی ماما سے پوچھو اس نے منع کر دیا ہے تمہیں نئی گاڑی لے کر دینے سے۔“ ارتقاع نے مڑ کر ایمل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی لیکن کچھ کہہ نہ سکتا تھا پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایمل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بابا نے رات ہی اس سے ارتقاع کے لیے نئی گاڑی خریدنے کی بات کی تھی۔

”میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا نئی گاڑی کا لیکن ان دنوں میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اٹھارہ لاکھ کی گاڑی اسے لے دوں۔ میری رقم ادھر ادھر کئی جگہوں پر پھنسی ہوئی ہے اگر تم اپنے اکاؤنٹ سے.....“

”نہیں بابا۔“ اس نے بابا کی بات کاٹی تھی۔ ”ڈیڈی نے وہ رقم اس لیے میرے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروائی تھی... اگر کبھی کوئی مشکل آئے امیر جنسی ہو جائے تو کام آئے جیسے تمہیں اب ضرورت تھی تو کام آگئی اور میں نہیں سمجھتی کہ رتی کوئی گاڑی کی ضرورت ہے۔ آئل کا ایک ہونا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا جتنی بھی رقم ڈیڈی نے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی ہے اسے محفوظ رکھنا چاہیے آنے والے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔“ وہ اپنے اکاؤنٹ سے مزید رقم نہیں نکھوانا چاہتی تھی۔ مٹی سے اس نے یونہی سرسری سا ذکر کیا تھا تو وہ خاصی ناراض ہوئی تھیں کہ اس نے بابا کو اس رقم کے بارے میں کیوں بتایا۔

”جانتی ہو پہلے بھی تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھا تمہارے اکاؤنٹ میں جو تم نے بابا کو بزنس کے لیے دے دیا تھا.....“ اس نے بابا کو مٹی کی ناراضی کا نہیں بتایا تھا لیکن ارتقاع کے لیے گاڑی خریدنے سے منع کر دیا تھا۔

”ارنی کی ایجوکیشن کپلیٹ ہوتے ہی میرا ارادہ اس کی شادی کا ہے، مٹی کی نظر میں دو تین اچھے رشتے ہیں اس کی شادی پر میں اسے اس کی پسند کی گاڑی لے دوں گی۔“ اور بابا کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

”جیسے ہی مجھے رقم ملے گی میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروادوں گا۔ تم پریشان مت ہو، تمہارے ڈیڈی کی دی ہوئی رقم تمہارے پاس محفوظ رہے گی۔ رہی گاڑی کی بات تو وہ رتی سے میں نے وعدہ کیا ہے تو میں ہی پورا کروں گا اپنی بیٹی کو خود گاڑی لے کر دوں گا۔“

”بابا.....“ وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ ”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا، آپ کو رقم کی ضرورت تھی آپ نے استعمال کر لی ہم الگ تو نہیں ہیں، بابا! میں نے کب کہا کہ آپ رقم واپس اکاؤنٹ میں جمع کروائیں۔ ارنی میری بھی بیٹی ہے میں دکن نہیں ہوں اس کی لیکن میں چاہتی ہوں کہ.....“

”لیواٹ ایمل یہ موضوع ختم ہو چکا۔“ اس کا لہجہ سخت اور انداز جتنی تھا۔ وہ بابا کے اس موڈ کی وجہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ بیٹے سالوں میں بابا نے اس طرح بی بی نہیں کیا تھا جیسا ان دنوں کر رہا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اس کا موڈ ضرور خراب ہوتا تھا لیکن اس طرح کا رویہ تو کبھی اختیار نہیں کیا تھا اس نے۔

”ارنی بیٹا میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تمہیں گاڑی.....“ اس نے ارتقاع کی آنکھوں میں شکایت کا رنگ محسوس کر لیا تھا۔

”اس اوکے ماما، میں نے آپ سے کوئی وضاحت تو نہیں مانگی۔“ ارتقاع کے لہجے کی بیزاری نے ایمل کو دکھی کیا اس نے شکایتی نظروں سے بابا کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ کال ریسیو ہوتے ہی وہ باتیں کرتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ بیزاری سے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے کو کارپٹ پر آگے پیچھے کرتے ہوئے کارپٹ کے پھولوں کو اتنے دھیان سے دیکھ رہی تھی جیسے یہ کوئی بہت اہم کام ہو۔ اس کے سامنے صوفے پر صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں جبکہ ان کے برابر میں بیٹھے بخاری صاحب کی نظریں تو جیسے اس کے چہرے پر ہی چپک گئی تھیں اور وہ بار، بار اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیر رہے تھے جیسے شدید پیاس نے ہونٹ خشک کر دیے ہوں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بعد وہ ایک طویل اور گہری سانس لیتے..... ”عائشہ یہ وہی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر ہیں جنہیں موتیا کے کہنے پر صاحبزادہ صاحب اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ وہ اسے کوئی چانس دے کر اماں کی خواہش پوری کر دیں۔“

کھل بنے کارپٹ کے پھولوں کو سکتے ہوئے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ موتیا کے پیچھے لاؤنج میں داخل

آپ کی بھل کو بھی دیکھیے گا ایک روز صدف اول کی ہیروئن بنا دیں گے۔“
”بڑی مہربانی بخاری صاحب۔“ شاہجہان کا دل تو بلیوں اچھل رہا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔

”آپ بے فکر رہیں شاہجہان بیگم، کل آڈیشن کے لیے بھجوادیں۔“ وہ پھر بھل کو دیکھنے لگا تھا اور اسے دیکھنے میں اتنا متوجہ تھا کہ اپنے مسلسل بچتے فون کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔

”صاحب آپ کا فون آرہا ہے۔“ موراں نے جوس کا گلاس اسے پکڑتے ہوئے جتایا۔
”ادہ ہاں۔“ بخاری صاحب نے چونک کر گلاس پکڑتے ہوئے بھل کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کوئی تیسری بار فون کی بیل کو نظر انداز کیا اور بھل سے پوچھا۔

”آج کل کون سا ڈراما زیادہ شوق سے دیکھ رہی ہیں آپ؟ کبھی میرا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈراما بھی دیکھا؟“
”نہیں..... میں ڈرامے نہیں دیکھتی۔“ بھل نے پہلی بار کارپٹ سے نظریں ہٹا کر بخاری صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واضح ناگواری تھی۔ صاحبزادہ صاحب دل ہی دل میں بے حد ملاحظہ ہوئے اور بہت دلچسپی سے بھل کی طرف دیکھا۔

”اور مجھے اداکاری بھی نہیں آتی، میں نہیں کر سکتی اداکاری۔“ لمحے بھر کے توقف کے بعد بھل نے کہا تو شاہجہان نے بے حد جربز ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”لو بھلا اداکاری ایسا کون سا مشکل کام ہے بخاری صاحب سکھا دیں گے۔“
”میں نے تو ایسے ایسے جاہل ان پڑھ لوگوں سے بھی اداکاری کروالی، آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں یہ میرا بیڈک ہے آپ کو سکھانا۔“ بخاری نے پُر شوق نظروں سے اسے دیکھا۔

ہوئی تھی تو صاحبزادہ صاحب مہبوت سے ہو گئے تھے۔ سفید لباس میں وہ کوئی آسمان سے اتری اپرا لگ رہی تھی۔
ایسا شفاف اور نونیز حسن..... انہوں نے ایک شکایتی نظر شاہجہان بیگم پر ڈالی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں ایسے نایاب ہیرے کو تو چھپا کر رکھا ہوا تھا اور ہمیں نقلی موتیوں پر غر خا دیا۔ شاہجہان بیگم نے نظریں جڑالی تھیں اور انجان بن کر موراں کو آواز دینے لگی تھی۔

”کہاں مرگئی ہو موراں، کیا کتواں کھودنے چلی گئیں؟“ صاحبزادہ صاحب نے دائیں طرف والے سنگل صوفے پر بیٹھی موتیا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس وقت قیامت ڈھا رہی تھی..... سانچے میں ڈھلا جسم، چمکتا ہوا سفید رنگ، لائبریری گردن..... وہ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے ٹارہوتی نظروں سے صاحبزادہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”خیر موتیا بھی کچھ کم نہیں۔“ انہوں نے دل ہی دل میں اعتراف کرتے ہوئے بھل کی طرف دیکھا۔ ان کے بالکل سامنے بیٹھی میک اپ سے بے نیاز یہ نونیز لڑکی اپنی سادگی میں بھی قیامت سے کم نہ تھی جو لاؤنج میں آنے کے بعد سلام کر کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور چہرے پر انتہائی بیزارگی لیے، وہ تب سے اب تک نگاہیں جھکائے غالباً کارپٹ کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کمال ہے شاہجہان بیگم ہم کئی بار لاہور بھی آئے..... یہاں بھی دو تین بار آنا ہوا لیکن آپ نے پہلے کبھی بھل سے متعارف نہیں کروایا؟“ آخر ان کے لبوں پر شکوہ آ ہی گیا۔

”ارے کیا بتاؤں صاحبزادہ صاحب، جن دنوں آپ لاہور آتے تھے اپنی سجو بہت چھوٹی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ گھر آ کر بھی کتابوں میں گھسی رہتی تھی اور پھر آپ وہاں نکلتے کب تھے، آئے موتیا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چل دیے۔“ صاحبزادہ صاحب سے بات کر کے باقی کی آدھی بات شاہجہان نے بخاری صاحب کی طرف دیکھ کر کی۔

”اسے تو یوں بھی کسی شے سے دلچسپی نہ تھی، یہ تو اب پتا نہیں کیوں اسے اداکاری کا شوق جڑایا ہے تو موتیا نے آپ سے ذکر کر دیا۔“

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ ہم تو ایسے فن کے دیوانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔“ بخاری صاحب کی نظریں بڑی دیر بعد بھل کے چہرے سے ہٹی تھیں اور اب وہ مسکراتی نظروں سے شاہجہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھاگ ڈائریکٹر تھا چہرہ دیکھ کر اندر اتر جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بھل کی آنکھوں میں چھائی ناگواری اور چہرے پر پھیلی بیزارگی سے جان گیا تھا کہ اداکارہ بننے کا شوق بیٹی کو نہیں ماں کو ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اداکارہ بنانا چاہتی ہے جبکہ بیٹی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لگتی۔

”میں آج کل اپنی ایک نئی سیریل کے لیے ہیروئن کی تلاش میں تھا بالکل ایسا ہی نیا اور تر و تازہ چہرہ لانا چاہتا تھا میں، تو بس سمجھیں کہ میری تلاش ختم ہو گئی۔“ شاہجہان کی باچھیں کھل گئیں۔ ”اب دیکھیے گا ایک ہی سیریل کے بعد کیسے بھل بی بی کا طوطی بولتا ہے۔“ شاہجہان سے بات کرتے، کرتے بخاری صاحب نے ایک حریص سی نظر بھل پر ڈالی تو صاحبزادہ صاحب بھی اپنے اندر اچلتے جذبات پر قابو پا کر مسکرائے۔

”بالکل..... بالکل بخاری صاحب تو پارس ہیں پارس جس کو ہاتھ لگا دین سمجھو وہ سونا ہو گیا۔“ بخاری کے لبوں پر تفریح بھرا تبسم نمودار ہوا۔

”آج کئی ایسے اداکار، رائٹرز، اداکارائیں جن کا طوطی بول رہا ہے ان سب کو اس مقام تک لانے میں بخاری کا ہی ہاتھ ہے۔ ایسے ہی تو لوگ کنگ میکر نہیں کہتے انہیں۔ جسے چاہیں زیرو کر دیں جسے چاہے ہیرو بنا دیں۔“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عید سعید کی بابرکت ساتھیوں
امت کے شہرے کی منفرد کہتیں

● **اولین صفحات**
سرزمین وطن کی مٹی میں پوشیدہ ذخائر... دشمن ان کی تاک میں تھے... جشن آزادی پر **پروین زبیر** کی پراثر تحریر...

● **انگاریے**
شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کرنے والے قانون شکن عسکر کی یکجائی جہنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پانی...

● **آوارہ گرد**
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

● **سرورق کئی کہانیاں**
دھن دولت کبھی کسی کے نہیں ہوتے... لوگ پھر بھی اس کی خاطر جان واردیتے ہیں... سرورق کا تیکھا رنگ

● **دوسری کہانی**
انہوں نے کسی کسی کے ساتھ ہوتی ہے... وہ بھی کسی انہونی کا منتظر تھا۔



آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہتائیں

پہلو بدلا اس کا چمکتا چہرہ ماند پڑ گیا تھا اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”جو کورقص نہیں آتا۔“ صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ پھلی کو پانی میں رہ کر تیرنا نہ آتا ہو۔“

”ایسا ہی ہے صاحبزادہ صاحب، یہ تو شروع سے ہی پڑھائی میں پڑ گئی تھی اسے کبھی ناچ گانے سے دلچسپی

نہیں رہی اور سچی بات ہے میں نے بھی کبھی اسے محفل میں بٹھانے کا نہیں سوچا۔ اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ

اس کی اولاد کو اس کام میں نہیں ڈالوں گی۔ ہم لاکھ برے سخی پر اپنے قول سے پھرنے والے نہیں۔“

شاہجہان نے جواب دیا تو صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر پھمڑی استہزائیہ مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ کچل

ایک دم کھڑی ہو گئی اس نے صاحبزادہ صاحب کو نہ تو خدا حافظ کہا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھا اور.....

”اماں میں جا رہی ہوں۔“ کہتی ہوئی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

”اپنی اس بیٹی کو تم نے ادب آداب نہیں سکھائے شاہجہان بیگم۔“ صاحبزادہ صاحب نے جریز ہو کر پہلو بدلا۔

”نہیں صاحبزادہ صاحب ایسی بات تو نہیں ہے بس اجنبیوں سے جلدی کھلتی ملتی نہیں ہے۔“ شاہجہان بیگم

نے شرمندگی سے کہا۔ اسے کچل پر غصہ تو بے حد آ رہا تھا لیکن پی گئی۔ اب بھلا اگر صاحبزادہ صاحب کو غصہ آ گیا تو اس

اجنبی شہر میں وہ بھلا کیا کرے گی بے یار و مددگار۔

”خیر اب شوہر میں بھجوانا ہے تو کچھ ادب آداب تو سکھانے ہوں گے اسے اور ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں کہ اس

کے باپ سے وعدہ کیا تھا تو کون تھا اس کا باپ؟“ اور کچل جو لادنج سے باہر نکل کر لے بھر کے لیے رکھی تھی اس کا پورا

وجود کان بن گیا۔

”تھا کوئی شریف آدمی۔“ شاہجہان بیگم کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”اچھا ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ساتھ کیوں نہ لے گیا، تمہارے پاس کیوں چھوڑ گیا؟“ صاحبزادہ صاحب

کے طنز کو شاہجہان بیگم نے ہنس کر پی لیا۔

”مرکب گیا ہوگا، مجھے اتنا پتا معلوم نہ تھا ورنہ پہنچا دیتی اسے اس کے پاس۔“ اور کچل کا دل جیسے ڈوب کر

ابھرا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کا باپ ایک شریف آدمی تھا، پتا نہیں شاہجہان کچل کہہ رہی تھی یا جھوٹ۔

”کیا خیال ہے موتی کچھ دنوں کے لیے مری، اسلام آباد کا چکر نہ لگا آئیں؟“ صاحبزادہ صاحب اب موتیا

کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ کچل اٹھی تھی اور اس کا بچھا ہوا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

”کراچی کے اس ایک جیسے موسم سے دل ادب گیا ہے شاہجہان بیگم۔ اجازت ہے موتیا کو کچھ دنوں کے لیے

مری لے جاؤں؟“

”آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے صاحبزادہ صاحب آپ حکم کریں۔“ شاہجہان نے بھی اطمینان کی سانس

لی کہ صاحبزادہ صاحب، کچل کے موضوع سے ہٹے لیکن صاحبزادہ صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یوں

بھی ٹھنڈی کر کے کھانے کے قائل تھے۔ عمر کی ساٹھ بہاریں گزار چکے تھے اور کچل پر ان کا دل آ گیا تھا۔ وہ دل ہی

دل میں پلاننگ کر رہے تھے کہ کیسے اس نوخیز حسن کو اپنا بنالیں اور قدرت ان کی پلاننگ پر ہنس رہی تھی۔

”موراں..... موراں کہاں مر گئی ہو، تمہاری چائے ابھی نہیں گلی؟“ شاہجہان کی چیخی آواز سے کچل چونکی اور

ہولے، ہولے چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے لمبی، لمبی سانس لی۔

”کون تھا اس کا باپ؟ کوئی شریف آدمی۔“ شاہجہان کچل کہہ رہی تھی یا جھوٹ لیکن دل پر ایک بوجھ سا آگرا

تھا اور پھر شاہجہان کا کیا پتا اتنے فرارنے سے جھوٹ بولتی تھی کہ مقابل کو شک تک نہ ہوتا تھا اور ممکن ہے شاہجہان کو

حسن بھی تھا، جسکنت بھی تھی اور بے نیازی بھی..... بخاری سوچنے لگا کہ اسے ہیروئن کے کردار میں کیا، کیا

تبدیلیاں کروانی ہوں گی۔ تھوڑی سی مغرور تھوڑی بے نیاز اور پھر اتنی حسین، بھلا سیریل کیسے ہٹ نہ ہوگا۔

”سنہری بہت اچھی ایکٹنگ کرتی ہے۔“ کچل نے شاہجہان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اسے اپنے چہرے کے

تاثرات بدلنے میں ملکہ حاصل ہے۔“ کچل نے شاہجہان کی ناراضی کی پروا کیے بغیر مزید اضافہ کیا۔

”سنہری کون؟“ بخاری چونکا۔

”میری کچلی بیٹی ہے۔“ شاہجہان نے کچل کی اس بے وقت بات پر اندر ہی اندر دانت پیسے لیکن مصلحتاً لبوں پر

مسکراہٹ سجالی۔

”بخاری صاحب سنہری تو سچ سچ سنہری ہے، سونے سے ترشی ہوئی، چمکتی دکتی.....“ صاحبزادہ صاحب کی

آواز میں چکار گئی۔

”ارے تو ان سے بھی ملوائیں..... کہیں نہ کہیں کوئی چانس نکل ہی آئے گا۔ جانتے تو ہیں ناں آج کل کیسے

دھڑا دھڑا سے بن رہے ہیں۔“ اس کا فون پھر بجنے لگا تھا اس نے جھنجھلا کر کچل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر فون

آن کیا اور کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

”بس آ رہا ہوں ملک صاحب، پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ بس نورین بی بی کی کچھ خاطر تو واضح

کریں۔“ فون بند کر کے اس نے پھر کچل کی طرف دیکھا۔

”سوری دراصل مجھے شوٹ کے لیے جانا ہے۔ آج میرے ڈرامے کی آخری قسط تھی اور نورین بی بی آج

وقت پر پہنچ گئی ہیں اور اگر ناراض ہو کر چلی گئیں تو پھر جانے کب ہاتھ آئیں اور اگر آج یہ episode نہ کر سکا

تو ملک صاحب کا غصہ بجا ہوگا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ارے بخاری صاحب چائے آ رہی تھی۔“ شاہجہان بیگم نے اسے روکا۔

”چائے پھر کبھی سہی، ہاں کل بارہ بجے کے بعد آڈیشن کے لیے آ جائے گا۔“ اس نے کچل پر ایک نظر ڈالی اور

تیزی سے باہر نکل گیا۔ صاحبزادہ صاحب وہاں ہی بیٹھے اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہے تھے۔ برسوں کی جان

پہچان تھی لیکن شاہجہان بیگم نے کبھی کچل کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ شاہجہان بیگم بھی صاحبزادہ صاحب کی ناراضی نوٹ

کر رہی تھی لیکن جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ صاحبزادہ صاحب جب کبھی لاہور آتے ان کے چوبارے پر

ضرور آتے تھے۔ ہاتھ کے کھلے اور دل کے نجی نجی سوخوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ یوں بھی ان دنوں شاہجہان کا

چوبارہ تھا یا پرستان تھا سر شام ہی پر یوں کا میلا سا لگ جاتا۔ رنگ برنگے آچل لہرانے لگتے، خوشبوئیں بکھر جاتیں

ایک سے ایک طرح دار لڑکی تھی لیکن اب تو چوبارہ ویران ہی ہو گیا تھا۔ کچھ کو موذی امراض لگ گئے اور کچھ دوسرے

چوباروں پر چلی گئیں چند ایک نے گھر بسالے۔ لے دے کر دو چار لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں شاہجہان کے پاس.....

صاحبزادہ صاحب دل والے تھے۔ چوبارے کا حال دیکھا تو انہیں کراچی آنے کی دعوت دے دی انہی کے

آسرے پر کراچی آئی تھی اور یہ گھر بھی انہوں نے ہی موتیا کے لیے خریدا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ موتیا صرف ان کے

لیے وقف رہے۔ وہ صاحبزادہ صاحب کو ناراض نہیں کر سکتی تھی اس لیے ان کا دل ملنے کی کوشش کی۔

”آپ کا بہت شکر ہے صاحبزادہ صاحب کہ آپ نے میری کچل کے لیے کوشش کی۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں

بھولوں گی بہت حسرت تھی مجھے کہ میری جو بڑی اداکارہ بنے۔“

”احسان کیسا شاہجہان بیگم، ہم موتیا کا کہا ناں لے سکتے ہیں بھلا!“ موتیا کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”لیکن ہمیں کبھی تم

نے کچل کے رقص و آواز سے مستفید نہیں کروایا۔“ گلہ اب بھی ان کے لہجے سے جھلکتا تھا۔ موتیا نے بے چینی سے

اعتبار وفا

زبان دانتوں تلے دہلی۔ ”دراصل بابا اور روادح، بابا کے کسی کو لیک کے ہاں گئے ہوئے تھے تعزیت کے لیے اور گھر میں اکیلے بیٹھے، بیٹھے میرا دل گھبرایا تو میں یہاں آ گیا چند بار بابا کے ساتھ صبح، صبح واک کے لیے آیا تھا لیکن آج اس وقت بس یونہی.....“ اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور وہ بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے گھبرا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”سوری، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں عظام ہوں آپ اپنی مدر کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھیں۔“
”میں نے پہچان لیا ہے، آپ کیسے ہیں؟“ اس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔ اب وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ عظام کی خوشنما آنکھوں میں جگنو سے دکنے لگے۔ ”بیٹھیں ناں پلیز۔“ اس نے اپنے سامنے بڑے دوسرے تے کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ بھی غالباً میری طرح تہائی سے گھبرا کر ادھر چلی آئی ہیں۔“
”نہیں، تہائی تو نہیں جس اور کھٹن سے گھبرا کر۔“ اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ اس قدر شاندار وجہہ شخص اس کے کانوں میں موتیا کی آواز گونجی۔

”سن سنہری یہاں سے جان چھڑانے کے لیے تو بس پھر ایک ہی حل ہے کسی کو پھنسا لے اور گھر سارے۔“
”اور اگر میں اسے.....“ اور اپنی سوچ پر شرمندہ سی ہو کر وہ اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جائیں ناں پلیز۔“ عظام نے پھر تے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بیٹھا کچھ کہے بیٹھ گئی۔
”آپ کیا کھڑے رہیں گے؟“ اس نے پھر ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں اور اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔
”کیا ہے اگر یہ شخص..... ہاں یہ شخص مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے معتبر کر دے۔“ کیا یہ صرف معتبر ہونے کی خواہش تھی یا کچھ اور جذبہ بھی درون دل موجود تھا۔ اس سے وہ اس سے بے خبر تھی لیکن کچھ دنوں بعد اس نے جانا تھا کہ اس خواہش کے ساتھ محبت کے رنگ بھی شامل تھے لیکن اس وقت تو صرف معتبر ہونے کی خواہش رہ رہ کر دل میں چمکیاں بھرتی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عظام نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔
”اس روز آپ کی والدہ نے بتایا تھا کہ آپ نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی ہے تو پھر سارا دن کیا کرتی رہتی ہیں کوکنگ وغیرہ؟“
”نہیں..... کوکنگ تو موراں کرتی ہے، مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں سارے فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔“

”کیسی کتابیں پڑھتی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔
”ہر طرح کی جو بھی مل جائیں ناول، افسانے، سفر نامے، سوانح عمریاں کچھ بھی۔“
”کوئی خاص کتاب جو آپ کو پسند ہو؟“ عظام نے لہجہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

”کوئی ایک نہیں..... بہت ساری ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں۔“ وہ پہلی بار کسی اجنبی سے اس طرح بات کر رہی تھی۔ کیوں کر رہی تھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل پر بہت بوجھ تھا، یہ بوجھ کیوں تھا وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اماں اسے ادا کارہ بنانا چاہتی تھی یہ بات بھی وہ پہلے سے جانتی تھی اور موتیا نے کہا تھا یہ اس سے بہت اچھا ہے جو انہیں کرنا پڑتا ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ کیا اس لیے کہ صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا کہ اگر اس کا باپ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو..... اور کیلے۔ واقعی اس کا باپ کوئی شریف آدمی تھا یہ سارا بوجھ شاید اس لیے تھا

خود بھی پتا نہ ہو اس کے باپ کا۔ اس نے سوچا اور دل پر دھرا بوجھ بڑھ گیا۔ شاہجہان سے کچھ پوچھنے کا فائدہ بھی نہ تھا وہ بتانے والی بھی نہیں تھی۔

”ایسا شریف زادہ ہوتا تو ساتھ ہی نہ لے جاتا۔ اس دلدل میں کیوں چھوڑ جاتا۔ صحیح تو کہہ رہے تھے صاحبزادہ صاحب۔“ ایک گہری سانس لے کر وہ پورچ میں بکھری دھوپ کو دیکھنے لگی اس سے زیادہ دھوپ تو اس کے اندر بھری تھی جو رگ، رگ کو جھلساتی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑنے لگی لیکن وہ یونہی بے حس سی بیٹھی رہی کہ دل کی زمین۔ چھوپ کی پیش سے سلگ رہی تھی اور کہیں سے کوئی بادل آ کر اس جلتی جلتی زمین پر برس کر اسے ٹھنڈک نہیں بخشتا تھا، ایک دم ہی کھٹن اور جس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اندر شاہجہان اور موتیا غالباً صاحبزادہ صاحب کی خاطر داریوں اور خوشامدوں میں لگی تھیں کہ ابھی تک وہ باہر نہیں آئے تھے۔ اس نے کبھی اپنی زندگی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ مطمئن تھی یا نہیں اس نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا تھا۔

سنہری کبھی کبھی اسے بے حس کہتی تھی لیکن وہ بے حس تھی یا حد سے زیادہ حقیقت پسند وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ سنہری کی طرح واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سنہری جو کبھی کبھار واویلا کر کے پھر خوش اور مطمئن ہو جاتی تھی۔ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی تھی اور اس حقیقت کو بدلنے پر وہ قادر نہیں تھی۔ اس کا باپ کون تھا اس کے متعلق بھی اس نے زیادہ تجسس نہیں کیا تھا۔ بس اسے اسکول میں ظہورے کا نام دیکھ کر پوچھا تھا ایک بار کہ کیا ظہور ہی اس کا باپ ہے اور بس بقول سنہری کے وہ بغیر کسی گلے، شکوے کے ایک بے حس زندگی گزار رہی ہے لیکن آج اس کا دل کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دل پر جیسے آبلے بنتے اور پھونٹتے تھے اور ان پھونٹے آبلوں کی جلن اور اذیت رگوں کو کاٹی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی روئی تھی لیکن اس وقت اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید آنسو اس جلن کو کم کر دیں۔ وہ یک دم کھڑی ہو گئی اور گہری گہری سانس لی اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کھول کر باہر نکل آئی اور سڑک کر اس کے پارک کی طرف جانے لگی۔ شاید کھلی فضا میں یہ کھٹن کم ہو جائے جو رہ رہ کر اس کا دم گھونٹی تھی۔

”کچھ لوگوں پر خدا کتنا مہربان ہوتا ہے۔“ اس نے پارک کی طرف سے آتی خوش باش خاتون کی طرف دیکھا۔ جو ایک پیارے سے بچے کی انگلی پکڑے مسکرا، مسکرا کر بچے سے باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تو اس نے غیر ارادی طور پر انگلی سے بچے کے رخسار کو چھوا، عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو اس نے بھی مسکرانے کی کوشش میں اپنے ہونٹ پھیلا دیے اور پارک میں داخل ہو گئی۔ یہاں گئے درخت تھے، سبزہ تھا اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے رونق تھی۔ اگرچہ فضا میں دھوپ کی پیش تھی پھر بھی آس پاس کے گھروں کے بچے پارک میں کھیل رہے تھے۔ غبارے، دال سوئیاں اور قلفی بچنے والے بھی آوازیں لگاتے پارک میں چکر لگا رہے تھے جبکہ بچوں کے ساتھ آنے والی کچھ خواتین اور مرد حضرات بیچوں پر بیٹھے تھے۔ وہ سر جھکائے کسی تنہا گوشے کی تلاش میں چلتی گئی۔ چلتے، چلتے یک دم کسی کی نظروں کی پیش محسوس کر کے وہ رکی اور اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف درخت کے قریب کٹے ہوئے تے پر وہ بیٹھا تھا ایسے کٹے ہوئے تے پارک میں کئی جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اسے رکے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”آپ..... یہاں..... کیسی ہیں آپ؟“ اس کی آنکھوں سے اشتیاق جھلکتا تھا لیکن اس اشتیاق میں نہ تو صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں والی حس تھی نہ بخاری صاحب کی آنکھوں کی ہوس۔ شفاف، بے ریا آنکھیں اپنے اندر شوق کا جہان چھپائے اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”کتنا عجیب اتفاق ہے کہ میں یونہی بلا ارادہ اٹھ کر پارک میں آ گیا تھا..... شاید میرے دل.....“ اس نے

نے کبھی گلہ کیا ہو رتب سے۔ شکر ادا نہیں کیا تو کبھی گلہ بھی نہیں کیا لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں شکر ادا کروں کہ اللہ نے مجھے سنہری اور موتیا جیسی بہنیں دی ہیں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں حالانکہ میں نے کبھی ان کی محبت کا رپانس نہیں دیا اور اماں ہیں جنہوں نے ہمیشہ میرا فخور کیا۔ اپنی فطرت کے برخلاف مجھے بچا بچا کر رکھا اور موراں ہے جس کو ہر دم میری فکر رہتی ہے اور میں اللہ سے گلہ کروں..... شکوہ کروں کہ اس نے مجھے..... اور اسے اپنی سانس سینے میں کھٹی محسوس ہوئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عظام نے نا سنجی سے اسے دیکھا وہ اس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا پھر بھی اس نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

”ہاں، ہمیں شکر تو ہر وقت ادا کرنا چاہیے۔ میرے پاپا کہتے ہیں کہ بندے پر خالق کا شکر واجب ہے، اس کے اپنے بندوں پر اتنے احسانات ہیں، اتنی رحمتیں ہیں اور اتنی نعمتیں عطا کی ہیں اس نے کہ بندے کو ہر دم اس کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس نے آپ کو محبت کرنے والے رشتے دیے بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے آپ کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے آپ کو آنکھیں دیں، دیکھنے کے لیے، ہاتھ پاؤں عطا کیے، سمجھ اور عقل دی اور پھر بہت ساری نعمتیں ہوا، پانی، پھل بندہ تو کبھی اپنے خالق کا شکر ادا نہیں کر پاتا، ساری زندگی ادا کرتا رہے تب بھی نہیں.....“ وہ سر جھکائے اس کی بات سن رہی تھی اس نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور دھجے سے مسکرایا۔

”اور گلہ..... اور مخلوق کو گلہ کرنا تو بنتا ہی نہیں سبل..... ہاں اسے صبر اور دعا کرنی چاہیے۔“

”صبر اور دعا“ صبر تو اس نے ہمیشہ ہی کیا تھا لیکن دعا..... دعا کبھی نہیں کی تھی۔

”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کبھی دے کر، کبھی لے کر۔“

”ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس نے نظریں اٹھائیں عظام اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی دلا سادتی، تسلی دیتی ہوئی مسکراہٹ.....

”ویسے.....“ اسے اپنی طرف ہلکا سا عظام نے کہا۔ ”ایکٹربنا ایسا برا تو نہیں جو آپ اتنی اب سیٹ ہو رہی ہیں۔“

”ہاں شاید اتنا برا نہیں..... لیکن میں کیا کروں میں اداکاری نہیں کر سکتی۔“ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اب

وہ اسے کیا بتاتی کہ بات صرف اداکاری کی نہیں تھی۔ کوئی اور بھی دکھ تھا جو چپکے، چپکے اسے کاٹ رہا تھا۔ اس نے کبھی

کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کی تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ کسی اجنبی سے دل کی بات کر رہی تھی۔ وہ اجنبی ہی تو

تھا بھلا دو تین بار صرف دیکھنے سے کوئی اجنبی اپنا تو نہیں بن جاتا نا۔

اس نے تو کبھی موتیا، سنہری اور اماں کو کبھی اپنے دل کا بھید نہیں دیا تھا اور اب وہ اس سے اس پہلی ملاقات میں

ہی سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتی تھی وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیوں ایسا کر رہی تھی لیکن وہ ایسا

کر رہی تھی۔

”آپ نے پوچھا نہیں موتیا اور سنہری کیا کرتی ہیں؟“ اس نے جیسے کرب کے سمندر سے ابھر کر عظام کی

طرف دیکھا۔ ”وہ ناچتی گاتی اور محفل سجاتی ہیں اور.....“ ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے گلاب لبوں پر تھر تھرائی۔

”اور میری اماں..... بلکہ ہم سب یہاں آنے سے پہلے لاہور کے شاہی محلے میں رہتے تھے گلبرگ میں

نہیں۔“ آنسو یک دم ہی اس کی آنکھوں کی سطح پر چپکے اور پھر جیسے بند توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔

عظام نے تڑپ کر اسے دیکھا اور حیرت سے سوچا کہ اگر وہ گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی ہے تو اس

میں رونے کی کیا بات ہے پھر یک دم ہی اس کے اندر کچھ کلک ہوا اس نے ایک بار ایک مضمون پڑھا تھا کسی سنڈے

میگزین میں شاہی محلے کے بارے میں اور اس کی حیرت، تاسف میں بدل گئی لیکن نہیں..... شاید میں کچھ بھول رہا

ہوں۔

موتیا اور سنہری میری بڑی بہنیں ہیں اور مجھے تو اس کے لیے اماں کا ممنون ہونا چاہیے لیکن میں شاید ناشکری

ہوں۔ میری دوست آمنہ بھی کہتی تھی کہ مجھے ہمیشہ رب کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن میں نے کبھی نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ میں

کہ اسے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم تھا اور اس لیے بھی تھا کہ بخاری صاحب اور صاحبزادہ کی نظریں..... اسے لگتا تھا جیسے وہ سچ چوراہے میں بیٹھی کوئی عورت ہو اور ہر آنے جانے والا اس کا تماشا کر رہا ہو۔ آج سے پہلے تو اسے کبھی اپنا آپ اتنا کمتر اتنا کھنپا نہیں لگا تھا لیکن آج۔

”آپ نے انٹر کے بعد کیوں چھوڑ دیا مزید کیوں نہیں پڑھا؟“ عظام اس سے کچھ نہ کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اس سے بات کر رہی تھی اس نے ایسا سوچا تو تھا کہ کبھی ایسا ہو کہ وہ آمنے سامنے بیٹھ کر

بات کریں لیکن ایسا ہو گا اس کا اسے یقین نہیں تھا لیکن ایسا ہو گیا تھا وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سوالوں

کے جواب دے رہی تھی۔

”میری اماں مجھے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں۔“

”اور آپ ایکٹنگ پسند نہیں کرتیں؟“ عظام نے پتا نہیں کیسے اندازہ لگایا اس کی نظریں انھیں اور پھر کچھ دیر

اسی زاویے پر اٹھی رہ گئیں۔

”نہیں۔“ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے ”نہیں“ میں عجیب طرح کی سختی تھی۔

”حالانکہ آج کل تو بہت معزز گھرانوں کی لڑکیاں بھی اداکاری کر رہی ہیں۔ ایک دور تھا شاید جب اسے

پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب تو یہ بھی پروفیشن ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر چوتھے لڑکے کو اداکار بننے کا کریز ہے

جسے دیکھو آڈیشن کے چکر میں پڑا ہے۔“ وہ مسکرایا اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی اور اس کے دانت بے حد خوب

صورت تھے۔

”ہاں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی اداکاری نہیں کر سکتی جبکہ میری اماں نے میرے پیدا ہوتے ہی سوچ لیا تھا

کہ وہ مجھے اداکارہ بنائیں گی۔“ وہ ہلکے سے ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں بلا کا درد تھا۔ عظام کے دل پر ضرب سی پڑی کیا

اس لڑکی کو کوئی دکھ ہے اس نے سوچا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ خالی، خالی نظروں سے عظام کے پیچھے

درخت کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے کوئی کرب آ کر ٹھہر گیا تھا۔

”آپ یقیناً بہت خوب صورت اور پیاری ہوں گی تب آپ کی اماں نے سوچا ہو گا کہ آپ کو اداکارہ بنائیں

اس وقت عموماً یہی تاثر تھا کہ اداکارائیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔“

”اور کیا میں اب خوب صورت نہیں ہوں؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا تھا۔

”آپ.....“ اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ”میرے پاس لفظ نہیں اس حسن کو بیان کرنے کے

لیے کیا آئینے نے کبھی آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”آئینے نے..... بہت بار لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔“ اس کے لہجے میں

افسردگی گل گئی تھی یا اسے محسوس ہوئی تھی۔

”دراصل اس فیلڈ میں پیسہ بھی تو بہت ہے۔ شہرت، عزت، پیسہ شاید اس لیے آپ کی اماں نے ایسا سوچا ہو

لیکن اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو انہیں بتادیں کہ آپ کو نہیں پسند ایکٹنگ کرنا۔“

”ان کے پاس میرے لیے شاید اس سے بہتر چوائس نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے حساب سے تو میرے لیے

بہت اچھا سوچا اس سے بہتر جو موتیا اور سنہری کر رہی تھیں۔“ لمبے بھر کے توقف کے بعد وہ کسی اذیت آمیز خیال سے

جیسے ڈوب کر ابھری۔

”موتیا اور سنہری میری بڑی بہنیں ہیں اور مجھے تو اس کے لیے اماں کا ممنون ہونا چاہیے لیکن میں شاید ناشکری

ہوں۔ میری دوست آمنہ بھی کہتی تھی کہ مجھے ہمیشہ رب کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن میں نے کبھی نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ عمدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہرائی بینک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بینک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تجدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی بینک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی مارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریٹج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہوں اس نے اس کے شفاف پاکیزہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس لیے رو رہی تھی کہ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی ہے اور اس کا ہر آنسو عظام کے دل پر آتشیں سیال بن کر گر رہا تھا۔

”آپ پلیز مت روئیں، کیا آپ صرف اس بات پر رو رہی ہیں کہ آپ کی اماں آپ کو ادا کارہ بنانا چاہتی ہیں یا اس لیے کہ آپ کی اماں گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی تھیں؟“

”آپ کو پتا ہے شاہی محلے میں رہنے والی عورتیں کون ہوتی ہیں؟ معاشرہ انہیں کس نام سے پکارتا ہے؟“ اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

”اوہ..... ہاں۔“ وہ چونکا اور شرمندہ ہو گیا وہ مضمون پوری جزئیات کے ساتھ اسے یاد آ گیا تھا۔

”مجھے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم کیا مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے؟“ اس کے لہجے سے ناراضی جھلکنے لگی تھی اور وہ بے حد خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں۔“ وہ شپٹایا۔ ”لیکن آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار سکتی ہیں اپنی والدہ کو قائل کر سکتی ہیں۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر آ گئے جب وہ چھوٹی تھی تو اماں غلط پاؤں اٹھانے پر کیسے دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔ اماں نے اگر ساری زندگی اسے اس ماحول سے الگ رکھا تھا تو اس کا پس منظر یقیناً کچھ اور تھا اس کے باپ سے کیا وعدہ..... یا شاید اماں کو اس کے باپ سے محبت ہو گئی ہو یا..... اس نے شاکی نظروں سے عظام کو دیکھا۔

”سائل پر کھڑا شخص سمندر میں ڈوبتے ہوئے شخص کی اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو وہ بھری ہوئی موجوں سے لڑتے ہوئے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔“

”سوری۔“ عظام مزید شرمندہ ہوا۔

”آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جس سے ہمیں گزارنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے سنہری کو پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتے۔ آزادی کے خواب دیکھتے اور پھر اپنی قید پر قانع ہوتے ہوئے۔ قناعت کی وہ بے بسی آپ محسوس نہیں کر سکتے۔“

”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں سائل، آپ مجھے بتائیں؟“ اس نے دگرنگی سے پوچھا۔

وہ لہجہ بھر یونہی عظام کی طرف دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں سائل کا درد اتر آیا تھا۔ موتیا کہتی تھی۔

”سنہری تم کتنی بھی کوشش کر ڈالو کسی کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لو لیکن اسے جب تمہاری حقیقت معلوم ہوگی تو بھاگ جائے گا۔“

اس نے تو آگے بڑھنے سے پہلے ہی، پہلے قدم پر ہی حقیقت کھول دی تھی۔ پتا نہیں صحیح کیا تھا یا غلط..... اور سنہری کہتی تھی کہ اگر سائل سے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ نہیں بھاگے گا۔

وہ کم عمر تھی، تجربہ کار نہیں تھی لیکن کتابوں نے اسے اپنی عمر سے بڑا کر دیا تھا۔ اس نے عظام کی آنکھوں میں وہ جذبہ دیکھا تو جو محبت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور جو جب عشق میں ڈھلتا ہے تو پھر آتش نمرود میں بے خبر کود پڑتا ہے۔

”کیا آپ واقعی میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟“ اس نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں..... آپ کہیں تو۔“ عظام نے اس کے بھیکے رخساروں سے یہ مشکل نظر ہٹائی۔

”تو آپ مجھ سے شادی کر لیں۔“ اس نے ایک بار ہی چھلانگ لگا دی آریا پار۔ عظام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ لڑکی جو پہلی نظر میں ہی اسے دل میں اترتی محسوس ہوئی تھی اور دوسری بار

PAKSOCIETY.COM



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایف کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اعتبار و وفا

جب اس نے اسے دیکھا تھا تو رات اپنے بستر پر لیٹے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ محبت صدیوں کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ تو لہجوں میں طے پا جاتا ہے اور اسے اس اجنبی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور آج اس پہلی ملاقات میں وہ کیا کہہ رہی تھی اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں نے غلط سنا ہو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اسے جانے بغیر وہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر طنز یہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ موتیا نے سچ ہی تو کہا تھا سنہری سے کہ تمہاری حقیقت جاننے کے بعد وہ تمہاری طرف مڑ کر دیکھے گا بھی نہیں اور یہ اس کے سامنے بیٹھا لڑکا اپنی خوشنما آنکھوں میں حیرت لیے اسے نکلتا ہوا۔ اس نے تو اس سے محبت کا کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے بس اپنی نظر پر بھروسہ کیا تھا۔ وہ نظر جس نے اس کی آنکھوں میں ایک لوجھتی دیکھی تھی اور اس نے پہلی منزل پر ہی اسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا جب لو بھڑک کر شعلہ بن جاتی اور آتش نرود میں بے دھڑک کودتے ہوئے خوف نہ آتا لیکن وہ تو ایک ہی بار بل صراط سے گزر جانا چاہتی تھی۔

اس کی آنکھوں کے کنارے پھر سے بھیکنے لگے جو ہوا سو ہوا وہ خلا میں مسلسل لٹکے رہنے کی اذیت سے توجیح مگنی تھی۔ یہاں اور نہ کے درمیان کی اذیت سے یہ اذیت سے یقیناً کم ہوگی جو اس وقت اسے ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور ساکت بیٹھے عظام پر ایک طنز یہ نظر ڈالی اور واپس مڑی۔

”کیا تھا اگر یہ شخص اس سے شادی کر لیتا جو اسے اتنی محبت سے نکلتا تھا کہ بہوت ہو جاتا تھا۔ وہ معتبر ہو جاتی۔ وہ صرف شاہجہان کی بیٹی نہ رہتی بھلے پھر اسے اپنے باپ کا نام معلوم ہوتا یا نہ ہوتا وہ بکل زریں ہوتی زوجہ عظام حیات..... مسز عظام۔“ آنسوؤں سے اس کا حلق نمکین ہو رہا تھا اور وہ پلکیں جھپک، جھپک کر انہیں باہر آنے سے روک رہی تھی۔ وہ تیز، تیز چلتی ہوئی پارک کے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ عظام جیسے کسی نیند سے چونکا اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”سنو بجل..... سنو..... رکو۔“ لیکن وہ مڑی نہیں یوں ہی ہولے، ہولے چلتی رہی۔ باوجود کوشش کے آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگے تھے۔ عظام تیز، تیز چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا اور اب اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

”سنو..... مجھے تم سے شادی میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں اور تم کیا جانو تم سے شادی کرنا زندگی کی معراج کو پالینا ہے میرے لیے۔“ وہ تیز، تیز بول رہا تھا۔ ”میری مڈ نہیں ہیں اور میرے پاپا ملک سے باہر ہیں۔ تم مجھے اتنا سا تو وقت دو گی نابل کہ وہ آ جائیں اور میں انہیں تمہارے گھر بھیجوں؟“ وہ بے اختیاری میں آپ سے تم پر آ گیا تھا اس کے چلتے قدم رک گئے اور اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جھوٹ کو جانچنے کی کوشش کی۔

”تمہارے پاپا.....؟“ اور عظام جیسے سمجھ گیا۔

”تم جن سے ملی تھیں وہ میرے پاپا نہیں تھے روادح کے بابا ہیں لیکن میں انہیں بابا ہی کہتا ہوں۔ میں آج ہی پاپا سے بات کرتا ہوں..... اگر وہ خود نہ آسکے جلدی تو میں ان سے اجازت لے کر بابا کو بھیج دوں گا آپ کے گھر۔“ وہ پھر چلنے لگی تھی عظام اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

”آپ..... آپ پلیز مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ اس طرح اچانک اٹھ کر چلی آئیں تو مجھے لگا جیسے آپ مجھ سے بدگمان ہو گئی ہیں۔“ وہ پھر تم سے آپ پر آ گیا۔

”آپ اس طرح سوچ میں پڑ گئے تو میں نے سوچا کہ آدمی سوچ میں تب پڑتا ہے جب وہ سو دو زیاں کا حساب کرنے لگتا ہے تو پھر عقل نے تو زیاں ہی زیاں بتانا تھا۔“



تھے بار بار ایک ہی صغے کو پڑھتے لیکن کوئی بھی لفظ ذہن میں نکلنے نہ پاتا۔ تنگ آ کر انہوں نے بجیے کے پاس کتاب یونہی اوندھی کر کے رکھ دی دل جیسے کسی کپے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ”عمر کی نقدی ختم ہوتی جا رہی ہے کاش..... اے کاش ایک بار صرف ایک بار.....“ لیکن وہ جو ایک ننھی سی امید کی کرن نظر آئی تھی اس کو آج انہوں نے خود ہی بچھا دیا تھا۔ بہت درد..... بہت گہرا درد جیسے ان کے دل کو چھیلنے لگا اور اس درد کو برداشت کرنے کے لیے انہوں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور لب بچھینے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

آج سڈے تھا اور انہیں اپنے ایک کولیگ گل اختر صاحب کے ہاں ان کے سر کی تعزیت کے لیے جانا تھا وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آئے تو رواد اور عظام لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ رواد سے کہیں کہ وہ ان کے ساتھ چلے، پتا نہیں کیوں انہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈرائیو نہیں کر پائیں گے۔ بڑی کمزوری اور فضاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ صحیح طرح سے سو نہیں سکے تھے شاید اس وجہ سے یا شاید ان رجسکوں میں کر لادینے والی ماضی کی یادوں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔

”بابا آپ کہیں جا رہے ہیں؟“ رواد نے ان سے پوچھا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوبارہ کہا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ”نہیں، مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ وہ خالی کپ نیمل پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور انہیں بہت دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ ”وہم ہے تمہارا۔“ وہ مسکرائے تھے۔

”آپ کا جانا ضروری ہے بابا؟“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”مگل صاحب کے سر کا افسوس کرنے جانا ہے والد کی طرح ہی تھے ان کے لیے سب کولیگ ہو آئے ہیں، میں ہی رہ گیا ہوں۔“

”تو ایک منٹ رکھیں بابا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ انہوں نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ جیسے دل کے تاروں سے جڑے تھے۔ رواد نے ان کے دل کی خواہش جان لی تھی۔ وہ عظام سے کچھ کہتا ہوا ان کے ساتھ ہی لاؤنج سے نکلا تھا۔ پورنج کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھادی تھی۔

”میرا جی چاہ رہا تھا رواد کہ تم ڈرائیو کرو۔ پتا نہیں کیوں آج ہمت نہیں ہو رہی تھی۔“ ”بابا۔“ اس نے گاڑی کی چابی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”پھر آپ نے مجھے کہا کیوں نہیں؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، کیا آپ کو کہنا نہیں چاہیے تھا کہ رواد بیٹا آج تم میرے ساتھ چلو..... بابا آپ.....“ وہ بے حد خفا، خفا سا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

”میری جان۔“ انہوں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے عظام کے خیال سے نہیں کہا۔“

”میں بیٹا ہوں آپ کا بابا۔ ساری زندگی آپ نے میرا خیال رکھا..... ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی، میری ذرا سی تکلیف پر آپ تڑپے، کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ میں آپ کے لیے کچھ کروں؟ آپ حکم دیا کریں بابا۔“ وہ بدستور خستگی سے کہہ رہا تھا۔ ”میرا تو دل چاہتا ہے کہ آپ تھکے ہوئے آئیں تو میں آپ کی ٹانگیں دباؤں آپ کے پاؤں دباؤں..... بابا میں آپ کو سکھ دینا چاہتا ہوں۔ آرام پہنچانا چاہتا ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تمہیں کیا خبر رواد میری جان کہ تمہارا ہونا ہی میرے لیے کتنے سکھ اور سکون کا باعث ہے تم نہ ہوتے تو شاید

”نہیں..... نہیں میں سو دو زبیاں کا حساب تو نہیں لگا رہا تھا مجھ پر تو شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔ مجھے تو اپنی سماعتوں پر اعتبار کرنے میں وقت لگا۔ میں نے تو جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا تو دل نے آپ کی عمر بھر کی رفاقت کی چاہ کی تھی۔ یقین کریں آپ تو تب سے ہی میرے دل میں دھرتا دیے بیٹھی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ آپ کا خیال دل سے نکل جائے لیکن نہیں نکل سکا۔“ عظام کا لہجہ خوشگوار تھا اور وہ اس کے ساتھ، ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔ پورے پارک میں دھوپ بھری تھی اور نکل کو یہ دھوپ اور گرمی بیزار نہیں کر رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود پر ٹھنڈی، ٹھنڈی پھوار گر رہی ہو۔ ایک خوشگوار سی خستگی اور ٹھنڈک اس کے اندر اتر آئی تھی اور اس کی اور وہ زندگی میں پہلی بار دعا کر رہی تھی۔ اس شخص کے ہمیشہ کے ساتھ کی دعا کی دعا کی دعا کے لیے اجنبی ہی تھا۔ اپنی دعا کی قبولیت کا یقین خود بخود ہی الہام بن کر اس کے دل میں اتر آیا تھا تو دوپہر کا ویران سناٹا اس کے لیے صبح کی خوشگوار خستگی میں بدل گیا اور اس کے سپاٹ چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔ اس نے مجھ ہی نظر اس پر ڈالی۔

”آپ کو لگا ہوگا میں پتا نہیں کیسی ہوں شاید بہت بے باک.....“ ”نہیں۔“ عظام نے اس کی بات کالی۔ ”میں نے سمندر میں چھلانگ لگا کر ڈوبنے شخص کو سمندر کی موجوں سے نبرد آزما ہونے محسوس کیا اور اس کی اذیت و کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ یہ بے باکی نہیں بلکہ اپنے حالات سے نکلنے کی ایک کوشش تھی، ڈوبتا ہوا شخص ایک تنکے کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔ میں آپ کے لیے وہ تنکا سہی لیکن آپ میرے لیے بہت اہم ہیں..... میرے دل کی اولین خواہش۔“

”نہیں.....؟“ نکل اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے لیے بہت اہم ہے اور یہ کہ اس نے بھی اسے دیکھنے کے بعد راتوں کو سوچا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس سے یہ سب نہ کہہ پاتی۔ وہ تو محض کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے نکلی تھی لیکن وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی اور اس نے اپنے بھیکے رخساروں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔ شاید یہ سنہری کے دیکھے گئے خواب اور باتوں کا اثر تھا یا اپنے حالات سے فرار کی کوشش..... کچھ بھی تھا لیکن اسے عظام کے ساتھ چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ واقعی محبت صدیوں کا عمل نہیں یہ تو لحوں کی بات ہے اور اس کے دل میں بھی عظام کی محبت نمودار ہو رہی تھی۔

وہ دونوں پارک سے نکل کر روڈ پر آ گئے تھے۔ اپنے، اپنے خیالات میں گم دونوں ساتھ، ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ نکل کا گھر آ گیا۔ عظام چونکا وہ اپنے گھر والی روڈ پر جانے کے بجائے نکل کے ساتھ ہی آ گیا تھا اور ٹیرس سے سنہری نے اسے عظام کے ساتھ آتے دیکھا پہلے تو اس کی آنکھیں پھیلیں پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہ ہلکھلا کر ہنسی ہوئی موتیا کے کمرے کی طرف بھاگی اور نکل نے عین اسی وقت اوپر دیکھا اور اسے سنہری کا سبز آنچل نظر آیا تو کچھ سوچتے ہوئے اس نے عظام کو اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی۔

”آئیے ناں..... اماں سے مل لیں۔“ ”کیا مناسب ہوگا میرا اس طرح آنا؟“ عظام جھجکا۔

”نامناسب بھی نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”ہاں اگر لاہور کے شاہی محلے والا گھر ہوتا تو میں کبھی آپ کو آنے کو نہ کہتی۔“ ”اسی بات نہیں ہے۔“ عظام پشٹایا اور اس کے ساتھ گیٹ میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بہت دیر سے کتاب کھولے بیٹھے تھے لیکن ابھی تک دو صفحے بھی نہیں پڑھ پائے

آدم سے انسان تک

فتاویٰ رابع

یعنی بڑی دلچسپی سے کہانی پڑھنے میں مگن تھی، کہانی بہت دلچسپ موڑ پر تھی، یعنی کے بغیر بتائے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ہی پتا چل رہا تھا کہ ایک دم یعنی کاموڈ سخت خراب ہو گیا..... رسالہ شیخ کر پرے پھینکا اور کیمبل میں منہ دے کر لیٹ گئی..... لائٹ آف ہونے میں اور موڈ آف ہونے میں بس چند لمحوں کا فاصلہ تھا..... فروہ..... ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی۔



تمہارا بابا جی نہ پاتا۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور ہولے سے بنے۔

”پنگے میری ٹانگوں اور پاؤں میں درد نہ ہو تو پھر بھی۔“

”میرا جی چاہتا ہے ناں بابا کہ میں آپ کی خدمت کروں۔“ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر انہیں دیکھا تھا اب اس کی خوشنما آنکھوں سے ناراضی نہیں محبت اور پیار جھلکتا تھا۔ اس کی اس محبت پر جیسے ان کا دل پھیل کر پانی ہونے لگا لے اختیار ان کا جی چاہا کہ وہ اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے اپنے کمزور پڑتے جسم کو سہارا دیں لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اس کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے کہ اللہ نے تمہیں مجھے دیا۔ تم میرا نذر ہو میرا مان ہو۔“

”بابا۔“ روادح خوش ہونے کے بجائے تشویش سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ”بابا آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، گل صاحب کے ہاں جانے کے بجائے پہلے اسپتال چلتے ہیں اس وقت ڈاکٹر شہر یار اسپتال میں ہی ہوں گے ناں۔“

”ارے نہیں میری جان! اب ایسا بھی بیمار نہیں ہوں بس ذرا سستی ہو رہی ہے۔“

”مجھے لگتا ہے آپ باقاعدگی سے دوا نہیں کھا رہے۔“

”یار کھاتا تو ہوں صبح شام سگی بھر دوائیں۔“

”آپ جانتے ہیں ناں بابا میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ آپ ہیں تو میں ہوں۔“ اس نے کئی بار کی کہی بات دہرائی تھی اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہولے، ہولے اس کا بازو تھپتھپاتے رہے۔

”گل صاحب کے ہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے بابا اور وہاں سے سیدھا اسپتال جائیں گے۔“

”اوکے یار لے جانا ڈاکٹر کے پاس۔“ انہوں نے کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا تھا اور پھر ان کے منہ نہ کرنے کے باوجود وہ انہیں اسپتال لے گیا تھا۔ ڈاکٹر شہر یار اس وقت اسپتال میں بیٹھتے تھے اور شام میں اپنے کلینک میں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شہر یار تب سے ہی ان کے معالج تھے جب انہیں انجانا کا ٹیک ہوا تھا۔

”کیا آپ کو آج کل کوئی مینشن ہے کوئی پریشانی.....؟“ ان کا بی بی چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر شہر یار نے پوچھا تھا۔

”نہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا ایک بار انجیو گرافی کروالیں اب بھی یہی مشورہ دوں گا اور پلیز اپنے آپ کو ہر پریشانی سے دور رکھیں۔“

”بابا آپ کو کیا پریشانی ہے؟“ ڈاکٹر شہر یار کے کمرے سے باہر نکلتے ہی روادح نے پوچھا تھا۔

”مجھے کوئی پریشانی نہیں میری جان۔“

”پھر آپ کا بی بی اتنا ہائی کیوں ہے؟“ وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”یار ہو جاتا ہے کبھی کبھی ہائی..... عمر کا تقاضا ہے جب ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ نہ آئے تو وہ بس یونہی کہہ دیتے ہیں کہ مینشن ہے پریشانی ہے۔“

”لیکن بابا ڈاکٹر شہر یار صحیح کہتے ہیں ایک بار انجیو گرافی کروالیں پتا چل جائے گا کہ وینز.....“ وہ باتیں کرتے کرتے اسپتال سے باہر نکل رہے تھے جب انہوں نے اسے دیکھا وہ ایک اسٹریچر کے پاس جھکی اسٹریچر پر لیئے مریض سے کچھ کہہ رہی تھی وہ روادح کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

جاری ہے

سرگزشت

ماہنامہ

ستارہ اگست 2015

کی جھلکیاں

لنگر پاکستان کا خالق کیوں؟

چوہدری رحمت علی یا علامہ کاظمی ایک نہایت اہم چونکا دینے والی تحقیق

صوفی

کئی صدی پہلے زمین کا مالک کا شکار کا نعرہ بلند کرنے والے سندھ کے سپوت کی سوانح حیات

بن باس

حقیقی خوشیاں جب قریب آئیں تو خود ساختہ محبوب نے عجب فیصلہ سنا دیا، ایک دلچسپ سچ بیانی

سکے حلالہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی سرگزشت "سراب" فلمی دنیا کی معروف شخصیت کا زندگی نامہ "گولڈن وائس" اور بہت سی سچ بیانیاں سچے واقعات

اگر آپ معلوماتی واقعات اور دل میں اتر جانے والے حقائق پڑھنا چاہتے ہیں تو بس ایک بار سرگزشت کا مطالعہ کر لیں پھر آپ خود ہی اس کے شیدائی ہو جائیں گے

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

کر دیتی..... اس کی زندگی سے خزاں رخصت ہو گئی تھی۔ بہار..... سدا بہار بن کر اس کی زندگی کو گل و گلزار کر چکی تھی۔

ناممکن، ممکن ہو گیا..... دعائیں قبول ہو گئیں اسے مستجاب الدعوات ہونے کا شرف مل گیا تھا۔

رادھر سورج طلوع ہوتے وقت جھلک دکھاتا اُدھر غروب ہو جاتا..... دن اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ اسے حیرانی ہوتی۔ پچھلے سال اسی موسم میں یہ دن کاٹے نہ کٹتے تھے..... لگتا تھا گھڑی کی سوئیاں اس کے غم میں ساکت ہو چکی ہیں، وقت کی رفتار مدہم ہو چکی ہے..... کونل کے ترانوں میں بھی اسے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوتی..... "کیا ایک ہستی کی آمد کی خبر سے کائنات کی ہر چیز متاثر ہو جاتی ہے۔" اپنے سوال کا جواب، ہاں میں پا کر وہ دانتوں تلے انگلی دبالتی اور حیرانی سے کہتی "واقعی.....؟"

جب شادی کو ساڑھے آٹھ سال پورے ہوئے تو عبدالحسان سب کے دلوں کا محبوب بن کر اس کی گود میں آچکا تھا۔ مٹی، فیڈر سے لے کر کان صاف کرنے والی، کاشن بڈز تک اور ویٹ ٹھوز سے باکسنگ کریڈل پر ام تک بچے کی آمد سے پہلے موجود تھے۔

آنے والے آتے، تحفے تحائف سے زیادہ خوشیوں بھرے کھنکھتے لہجوں کے ساتھ، عینی نے بھی کمی نہیں چھوڑی، دونوں ہاتھوں سے لٹایا..... اگر مائیوں، دائیوں کو بے بہا دیا، مٹھی چاچی کرنے والوں کو مالا مال کیا تو نہیں، بھانجیاں، بھابھیاں، بھتیجیاں، نندیں، دیورائیاں، جھینٹانیاں بھی اس کے قیمتی تحائف سے لدی پھندی واپس لگیں..... بچہ دو اڑھائی ماہ کا ہوا تو اس نے دوسروں کو پکڑا نا شروع کیا..... وجہ دوسروں پر عدم اعتماد نہیں بلکہ وہ جان لیوا تکلیف تھی جس میں بچے کی پیدائش کے بعد وہ مبتلا رہی..... ویسے تو ہر عورت کا ہی دورانِ زچگی کفن سرہانے کے نیچے دھرا ہوتا ہے۔ ہر عورت ہی اوپر سے ہو کر نیچے آتی ہے اور بچے کو جنم دیتی ہے۔ لیکن

کی سسکیوں اور ہچکیوں سے آنکھ کھل جاتی تو دل بڑا خراب ہوتا۔

فروہ فجر کی نماز کے لیے ابھی تو عینی کی سوچی آنکھیں، بھاری آواز شب گزشتہ کی روداد سنا رہی تھیں۔ بھی تو وہ چھوٹی لیکن ہمت کر کے اس نے عینی سے کہہ ہی دیا۔

"عینی آپ کی کسی کا بچہ ایڈاپٹ کر لیں۔"

"وہ کیوں..... نہیں..... بالکل نہیں۔ اگر خدا مجھے دینا نہیں چاہتا تو میں کسی سے بھیک کیوں لوں....." اس نے فروہ کا فقرہ کانٹے ہوئے کہا۔

"عینی آپ، اس طرح تو آپ نفسیاتی مریض بن جائیں گی، دنیا میں بہت سے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی، وہ ایسے روگ تو نہیں لگاتے جیسے آپ نے لگایا ہے۔ کہیں جاتی ہیں نہ کسی کو بلاتی ہیں۔ آپ ایسے نہ کریں، اللہ جی آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔"

"تو اب کون سا راضی ہیں۔" جلتے لہجے میں عینی نے کہا۔

"عینی آپ....." فروہ نے قدمے غصے سے کہا۔ "اللہ جی اتنی جلدی کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔"

"اگر راضی ہیں تو میری مراد پوری کریں، میری دعائیں قبول کریں، مجھے بچے دیں، ایک دو تین چار..... پچھلے ہر سال دیں، جڑواں دیں، تڑوا دیں۔ دیں تو سہمی..... دیں تو سہمی۔" عینی بلک رہی تھی، رورہی تھی، ہسٹریا کی مریض بن گئی تھی۔ روتے، چیختے بے دم ہو کر بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔

☆☆☆

ہواؤں کی سختی، نرمی اور لطافت میں بدل گئی..... آگ اگلتا قہر برساتا سورج دھوپ چھاؤں کے کھیل میں گن تھا..... ہر چیز عینی کو آنکھیلیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی..... پتے جھولتے تو عینی بھی سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر جھومنے لگ جاتی..... کونل کو کتی تو عینی بھی اللہ ہو، اللہ ہو کے ترانے شروع

"آپ کی کیا ہوا.....؟ آپی میں پریکٹیکل نوٹ بک تیار کر رہی تھی، آپی لائٹ کیوں آف کی ہے؟" مگر تین چار کے بجائے وہ تین چار ہزار سوال بھی کرتی تو عینی نے چپ ہی رہنا تھا..... اب تو کیا میکا اور کیا سسرال ایک، ایک کو پتا چل گیا تھا کہ عینی بی بی کا موڈ کب خراب ہوتا ہے، کب وہ بولنا بند کرتی ہیں۔

سو اس وقت فروہ جانتی تھی کہ پس منظر بھی وہی مسئلہ ہے اور پیش منظر بھی..... اولاد نہ ہونے کا دکھ..... سات سال، تین ماہ اور پچیس دن کم تو نہیں ہوتے..... پہلے یقین کامل تھا کہ شادی کی سالگرہ بعد میں اور بچے کی آمد پہلے ہی ہوگی..... کتنے ہی لوگ اس کے ارد گرد بیٹے تھے جن کا پورا ریکارڈ اس کے پاس موجود تھا..... فائزہ کی شادی کراچی میں ہوئی تھی..... اس کی چچا زاد بہن، کہاں چکوال اور کہاں کراچی..... ویسے کے بعد جب وہ آئی تو ناک پر دو پتار کھا ہوا تھا..... ہر چیز میں بسا نہ سے طبیعت کی خرابی کی کار و نارتو، روتے واپس چلی گئی اور شادی کے آٹھ ماہ چار دن کے بعد گل تھو تھنے سے صاحبزادے کی اماں بن چکی تھی۔

اس کی کلاس فیولماتحت آخری پیر پورے کر گھر پہنچی تو مایوں مہندی کی تیاریاں تھیں..... بی ایس سی کارزلٹ آیا تو دوسرا رزلٹ بھی مل چکا تھا..... یعنی پازینورپورٹ والا.....

اللہ..... دو ماہ سے دو سال گزر گئے مگر کوئی دل خوش کن خبر نہ تھی..... شادی کے تیسرے سال یقین کامل، یقین پھر چوتھے سال آس، امید اور ساتویں سال مایوسی، محرومی، ڈپریشن میں بدل گیا۔

بن پوچھے ہی فروہ جانتی تھی کہ کہانی میں موضوع وہی ہوگا..... بے اولادی..... یا با نچھ پن.....

فروہ سوائے دعا اور کندھے اچکانے کے کیا کر سکتی تھی..... اس نے دل ہی دل میں اس کے لیے دعا مانگی اور پریکٹیکل نوٹ بک بنانے کے..... اپنے پروگرام پر فاتحہ پڑھ کر وہ بھی لیٹ گئی۔ کبھی کبھار عینی

تھی..... ڈاکٹر کے کمرے میں بند لفافے میں رپورٹ لے کر داخل ہوئی تو اتفاق سے مرینہ کے طور پر اب وہی تھی..... اس نے بغیر کہے رپورٹ ڈاکٹر کے آگے رکھ دی۔

”ہوں..... ہوں..... مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ پریکٹسٹ ہیں۔“ ڈاکٹر نے رپورٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

زمین و آسمان یکجا ہو کر دھماکے سے الگ ہو گئے۔

”ک..... کیا..... گھٹی، گھٹی آواز میں عینی نے کہا۔ آنسو بھل، بھل تیز رفتار چشمے کے پانی کی طرح آپوں آپ بہنے لگے۔

”ناکھ دیک ہے..... آپ کو اصل میں بچی کی فیڈ بھی اب چھڑوا دینی چاہیے، فریش جوسز، مٹن، دودھ کا استعمال.....“ یعنی شاید بہری ہو گئی تھی..... اس کو ڈاکٹر کا کہا کوئی لفظ نہیں سنائی دے رہا تھا..... اگر سن بھی رہی تھی تو صرف ایک فقرہ..... ایک جملہ..... آپ پریکٹسٹ ہو گئی ہیں۔“

”ابھی نہیں ڈاکٹر صاحب.....“ بہت دیر کے بعد اس کے منہ سے فقرہ برآمد ہو..... ”بچے بہت چھوٹے ہیں میرے.....“

وہ روئے جا رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔ وہ نہ تو ناشکری تھی نہ ہی بچے سے انکاری..... بس ایک دے، دو دے، تین دے، چاہے ہر سال دے..... کہتے ہوئے یہ ذہن میں نہیں رہا تھا کہ آدم کو جنت میں بھی آدم ہی کہا جاتا تھا..... ترکب اولیٰ ہوا ضعف کا شکار ہو گئے درخت کو ہاتھ لگا بیٹھے تو انسان کہلوائے تھے تو آدم ہی.....

آج عینی نے بھی آدمیت سے انسانیت کا سفر طے کر لیا تھا۔ اوپر فرشتے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے۔

”لو ایک اور..... انسان.....“

دکھ رہے تھے..... کئی دفعہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آیا..... اللہ نے مہربانی کی کہ گرتے، گرتے بچی..... جب بالکل ہی تھک کر بے دم ہو گئی تو ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا..... ڈاکٹر نے بچی کو خوب اچھی طرح چیک کیا..... انجیکشن لگایا، اینٹی بائیوٹک سرپ تجویز کیا..... نسخہ لکھتے، لکھتے ڈاکٹر نے ایک دم قلم روک کر پرے رکھ دیا اور عینی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بی بی آپ نے خود اپنا چیک اپ کروایا ہے؟ آپ کی تو اپنی حالت قابل ترس ہے۔“

عینی کو ہمدردی میں ڈوبا یہ فقرہ بھی طنزیہ لگا..... اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کونے کیلے ہو گئے، اس نے ہمت کر کے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، مجھے تھکاوٹ، نیند کی کمی ہے، بچے رات کو جگاتے ہیں، دن میں نیند پوری نہیں ہوتی۔“

”میرا خیال ہے آپ کسی لیڈی ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ لیں اور ضرور لیں، آپ کا رنگ کسی طرح بھی صحت مندوں والا نہیں ہے..... ہو سکے تو اپنا ایچ پی چیک کروائیں ضرور.....“ بچی کی دوا کا نسخہ پکڑ کر وہ کلینک سے نکلی..... پتا نہیں کیوں دل میں آیا کہ اپنا چیک اپ کروالے..... کوئی ملٹی وٹامن، آئرن، کیمیشیم ہی لکھ دے گی۔ لینے میں کیا حرج ہے؟ سامنے والی سڑک پر بڑے سے عائشہ اسپتال میں داخل ہوتے وقت اسے قطعاً علم نہیں تھا کہ کون سی روح فرسا خیر اس کی منتظر ہے..... بچی کی پیدائش کے بعد اس نے حفظ ماتقدم، احتیاطی بندوبست کیے ہوئے تھے گو کہ اس کے بعد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تاہم وہ مطمئن تھی۔ ایک دو سوال کرنے کے بعد ڈاکٹر نے آنکھیں بلکہ آنکھوں کے پونے چیک کیے ایک دو میٹ لکھ کر دیے..... اور نیکسٹ کے لیے تیل بجا دی.....

تھکے، تھکے قدموں سے عینی نے اپنا بلڈ اور یورین لیبارٹری میں دیا..... بچی پر ام میں سو رہی تھی..... شاید انجیکشن میں خواب آور دوا شامل

کی پرخار رہوں میں چل نکلی تھی..... لیکن جتنی بھی تنگی ہو، جتنی بھی مشقت ہو، خواہ کتنی ہی نیندیں اور آرام سچ دینا پڑے ایک سوچ، ایک خیال ایک امید چہرہ پر نور کر دیتی..... جنت ایسے ہی تو پاؤں کے نیچے نہیں آ جاتی ناں..... پھر سے تازہ دم ہو جاتی..... اور..... شکر خدا کا اس دفعہ حالات قابو میں رہے عبدالرحمان کی چھ ساڑھے چھ پونڈ وزن کی بہن دنیا میں آئی تو وہ ہوش و حواس میں ہی تھی اور پر والے کا کرم ہی کرم رہا کہ وہ پچھلی دفعہ جن حالات سے گزری تھی اس دفعہ اس کا عشرِ عشر بھی نہ تھا۔

بیٹے کے بعد بیٹی کی محبت، چاہت اور مصروفیت نے اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا..... جڑواں بچے ہوں تو دنیا والے تعاون کی..... ہی پیشکش کر دیتے ہیں لیکن کون جانے ایک سال میں پیدا ہونے والے دو بچے پالنا جڑواں بچوں سے کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ویسے بھی بچے اور بچی ہر دو کی عادات میں بہت فرق تھا..... ایک ہر وقت فیڈر کی طلب میں رہتا، دوسری فیڈر کو منہ میں لینا گوارا نہ کرتی..... ایک کو ہر گھنٹے بعد پیمپر، پیسی بدلوانے کی عادت تھی دوسری کئی، کئی گھنٹے گزار لیتی..... ایک روتا تو روئے چلا جاتا، نیلا بڑ جاتا دوسری رونے کے لیے منہ کھولتی اور گدگدی پر کھلکھلانے لگ جاتی۔ بس وہ تو انہی دو بچوں کی ہو کر رہ گئی۔ ساس قریبی گلی میں رہتی تھیں، میکا چند منٹ کے فاصلے پر تھا لیکن کئی، کئی ہفتے بیت جاتے وہ گھر سے قدم نہ نکال پاتی..... بیٹی کا نام اس نے ایسہ رکھا تھا..... ایسہ کو کئی دن سے سینے میں انجیکشن تھا..... بلغم، کھانسی، بخار نے چڑچڑاہٹ طاری کر دی تھی۔ ہر وقت ریں، ریں کرتی اور کندھے سے جڑی رہتی..... خود عینی کی اپنی حالت شاید جاگ، جاگ کر بہت خراب ہو چکی تھی..... بیماری کی وجہ سے بچی بار، بار فیڈ مانگتی اور بار، بار دودھ پلانے کی وجہ سے کندھے پھوڑے کی طرح

یعنی کے ساتھ کچھ نہیں سب کچھ انوکھا ہوا..... حکم ربی ہو تو تازی بھی بہترین کارکردگی کا شکیلیٹ لے سکتے ہیں..... بس ایک چھوٹی سی غلطی سے گیس بگڑ گیا اور آپریشن کے دوران اس کے جسم نے بے قابو ہو کر ہر بند مسام سے نکلنا چاہا.....

تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں..... موند لیں..... پھر کھولیں..... دائیں بائیں دیکھ کر بند کر لیں..... تیسری دفعہ آنکھیں کھلیں تو سرجن کے الفاظ اس کے کانوں میں سنائی دیے۔

”اب یہ عمل طور پر ہوش میں ہیں..... اللہ نے انہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔“

سو، عینی کی بھی نئی زندگی تھی اور اس کے بچے عبدالرحمان کی بھی..... ابھی اس نے ڈھنگ سے پیسی لگانا، فیڈر بنانا نہ سیکھا تھا کہ ایک اور ذی روح کی خبر مل گئی..... ارے اتنی جلدی.....؟ ابھی تو حتان ساڑھے چار ماہ کا ہوا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا..... لیکن اس نے آنے والے مہمان کو بھی بہت گرجوشی سے خوش آمدید کہا..... تاہم وہ خود جانتی تھی کہ اس دفعہ کے احساسات، کیفیات اور جذبات میں وہ شدت نہیں جو پہلی دفعہ تھی۔ پہلے بچے کی دفعہ تو وہ دن میں دس دفعہ آنے والے کی شکل صورت اور ناموں کا سوچتی تھی..... لڑکا ہوا تو کون، کون سے نام ز پر غور ہوں گے اور لڑکی ہونے کی صورت میں کون سے نام..... عقیقے کی رسم پر کس، کس کو مدعو کرنا ہے، کس، کس کو فون کر کے خود خوشخبری دینی ہے کن لوگوں کے ہاں مشائی بھجوانا ہے۔

اس دفعہ باقی سب باتیں تو دور کی بات یہ بھی نہ سوچا گیا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی..... سارا دن حتان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی گزر جاتا..... اپنا ہی ہوش نہ رہا..... سوتے میں بھی جاگتی رہی اور جاگتے میں بھی سوئی ہوئی پائی جاتی..... ایک وجود کو پال رہی تھی دوسرا پل رہا تھا..... زندگی تن آسانی سے مشقت

آئی کہ
رہی
تین
رہی
ل آ
اب
و
ور
ت
ر
ر

تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں..... موند لیں..... پھر کھولیں..... دائیں بائیں دیکھ کر بند کر لیں..... تیسری دفعہ آنکھیں کھلیں تو سرجن کے الفاظ اس کے کانوں میں سنائی دیے۔

”اب یہ عمل طور پر ہوش میں ہیں..... اللہ نے انہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔“

سو، عینی کی بھی نئی زندگی تھی اور اس کے بچے عبدالرحمان کی بھی..... ابھی اس نے ڈھنگ سے پیسی لگانا، فیڈر بنانا نہ سیکھا تھا کہ ایک اور ذی روح کی خبر مل گئی..... ارے اتنی جلدی.....؟ ابھی تو حتان ساڑھے چار ماہ کا ہوا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا..... لیکن اس نے آنے والے مہمان کو بھی بہت گرجوشی سے خوش آمدید کہا..... تاہم وہ خود جانتی تھی کہ اس دفعہ کے احساسات، کیفیات اور جذبات میں وہ شدت نہیں جو پہلی دفعہ تھی۔ پہلے بچے کی دفعہ تو وہ دن میں دس دفعہ آنے والے کی شکل صورت اور ناموں کا سوچتی تھی..... لڑکا ہوا تو کون، کون سے نام ز پر غور ہوں گے اور لڑکی ہونے کی صورت میں کون سے نام..... عقیقے کی رسم پر کس، کس کو مدعو کرنا ہے، کس، کس کو فون کر کے خود خوشخبری دینی ہے کن لوگوں کے ہاں مشائی بھجوانا ہے۔

اس دفعہ باقی سب باتیں تو دور کی بات یہ بھی نہ سوچا گیا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی..... سارا دن حتان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی گزر جاتا..... اپنا ہی ہوش نہ رہا..... سوتے میں بھی جاگتی رہی اور جاگتے میں بھی سوئی ہوئی پائی جاتی..... ایک وجود کو پال رہی تھی دوسرا پل رہا تھا..... زندگی تن آسانی سے مشقت



چھٹا حصہ

میرتاجِ دل

نبیلہ ابرار احباب

ایک قیامت خیز انتظار کے بعد لیبر روم کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے نرسز اور اس کے پیچھے ڈاکٹر باہر آئی..... شیریں بے تابی سے ان کی سمت بڑھیں..... ان کے پیچھے ڈبڑ بیکتا اور فوزیہ تھیں۔
”مبارک ہو..... آپ کی بیٹی نے خوب صورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا ہے مگر ابھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فی الحال آپ انتظار کریں جیسے ہی اس کی حالت سنبھلتی ہے آپ اُن سے مل لیجئے گا۔

رحم نہیں آتا۔ انسان ہی نہیں ہے کوئی ان کی نگر میں۔ اب تم بھی بے وقوفی میں آ کے خود فیڈ کروانا شروع نہ کر دینا۔ اب اس ڈر یکتا کو ہی دیکھ لو۔ ماں پیدا کرتے ہی مر گئی تھی تو کیا اسے ماں کا دودھ ملا تھا۔ فیڈر پی کے بڑی ہوئی۔ اب بھر پور جوان اور صحت مند ہے۔ بچے کو ماں جب اپنا دودھ پلاتی ہے تو بچے کی محبت ماں سے بڑھ جاتی ہے۔ کل کو جدائی اور دوری کا ثنا عذاب لگتا ہے۔ اس لیے بچے کو گلے کا ہارمت بناؤ۔ اپنے بارے میں سوچو..... اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو..... جو مائیں بچوں کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہیں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ارے یہ اولاد بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پال پوس کے بڑا کرو تو کسی احسان کو نہیں مانگی۔ خاص طور پر یہ لڑکے تو ماں کو خاطر میں لاتے ہی نہیں ہیں بیٹوہ پتا نہیں کون، کون سی منطلق سناری تھیں۔

”تم نے ابھی زندگی کی خوشی دیکھی ہی کہاں..... شادی ہوئی، سال بعد شاہ زیب تمہیں چھوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد تمہیں ماں بننے کا پتا چلا..... شادی کے ایک سال آٹھ ماہ بعد تم ماں بن گئیں۔ اس عرصے میں کیا خوشی دیکھی یا پائی تم نے؟ کچھ بھی تو نہیں..... ارے عورت کے لیے اس کا شوہر اور اپنا گھر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اپنی گزشتہ زندگی بھول جاؤ..... سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اور صرف خود کو یاد رکھو.....“ شیریں اپنا فلسفہ اس کے دماغ میں انڈیل رہی تھیں۔ ماہرہ سر ہلا رہی تھی۔ شیریں مطمئن تھیں کہ ان کی باتیں ماہرہ کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

عمر حسب معمول بیٹھے کسی غیر مرئی شے کو گھور رہے تھے۔ آج وہ بڑ بڑا بھی نہیں رہے تھے۔ کافی دیر سے خاموش تھے۔ ماہرہ اسپتال سے گھر آ چکی تھی۔ (ملازمہ زبین نے چھوٹے بچے کو اٹھایا ہوا تھا) ماہرہ تو لیٹی ہوئی تھی۔ انہیں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ وہ تو آتے ساتھ ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ شیریں

تھا۔ لا تعلقی سے ماہرہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ ڈر یکتا ہولے، ہولے رورہی تھی۔ فوزیہ نے اسے اپنے سے لگا لیا تھا۔

”اب کیوں روتی ہو؟ دیکھو کتنا خوب صورت بیٹا دیا ہے اللہ نے ماہرہ کو اور تم پچھو بن گئی ہو..... عمر بھائی جب دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی ذہنی صحت پر اچھا اثر پڑے..... پر یہ شیریں بھائی کا رویہ میری عقل سے بالاتر ہے۔ نواسے کو دیکھ کر ذرا خوش نہیں ہو میں۔ ٹھیک ہے ماہرہ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے پر.....“ فوزیہ بچی تاسف زدہ تھیں۔ ڈر یکتا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا..... وہ تو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی اگر شاہ زیب بھائی خود زندہ ہوتے تو اپنے بیٹے کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے..... پاپا اگر ٹھیک ہوتے تو وہ شاہ زیب کی نشانی کو پا کر اپنے سب دکھ بھول جاتے۔ اس کی زندگی میں کتنے ”اگر اور کتنے“ کاش جمع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نرس فیڈ کروانے کے لیے بچے کو ماہرہ کے پاس لائی تو اس کے پاس بیٹھی شیریں نے دھیرے سے انکار میں سر ہلایا اور ماہرہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔

”میری بیٹی کی حالت ابھی اس طرح کی نہیں ہے کہ وہ فیڈ کروا سکے۔ آپ اسے فی الحال اوپر کا دودھ ہی دے دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ نرس کچھ بولنا چاہ رہی تھی پر شیریں کا دودھ کا انداز دیکھ کر اٹنے قدموں لوٹ گئی۔ جب بچے کی ماں کو خود ہی بچے کی پروا نہیں تھی تو اسے کیا پڑی تھی کچھ بتانے کی یا ماں کے دودھ کے فوائد گنوانے کی..... ان بڑے لوگوں کے بڑے کام تھے۔ بڑی، بڑی سوچیں تھیں جو ان جیسے چھوٹے لوگوں سے نہیں ملتی تھیں۔

☆☆☆

نرس کے جانے کے بعد شیریں کچھ بڑبڑانے لگیں۔

”ارے جسے دیکھو سر پر چڑھا آرہا ہے بچے کا..... اب تم نے پہلے ہی اتنی تکلیف اٹھائی ہے، اب بچے کو فیڈ بھی کراؤ..... ان اسپتال والوں کو تو کسی پر بھی

شیریں بے تابی سے اندر ماہرہ کی طرف بھاگی..... فوزیہ اور ڈر یکتا اس کے پیچھے، پیچھے تھیں۔ ماہرہ کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی پر وہ ماں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ شیریں نے اس کے ماتھے پر جھک کے پیار کیا۔

”میری بیٹی کیسی ہے؟ اب کیسا محسوس کر رہی ہو.....؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ ماہرہ کی آواز میں نقاہت تھی۔ اتنے میں نرس ننھے سنے وجود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ان کی طرف بڑھی۔

”بہت ہی خوب صورت بچہ دیا ہے اللہ نے آپ کو..... شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی اور نواسا بالکل ٹھیک ہیں۔“ نرس نے بچہ شیریں کی طرف بڑھایا۔ اس نے منہ اپنی بیٹی کی طرف پھیر لیا تب ڈر یکتا نے آگے بڑھ کر بچے کو خود نرس کے ہاتھوں سے لیا۔ نرس کو تانی کے اس بگائی بھرے روئے پر زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں ملا..... وہ خوب صورت سی لڑکی، جس نے بچے کو اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔ بچے کو چومتے ہوئے روئے جاری تھی ساتھ کچھ بول رہی تھی۔ فوزیہ بچی نے تھوڑی دیر بعد بچہ ڈر یکتا کے ہاتھوں سے لے لیا۔

”کاشاء اللہ بہت خوب صورت ہے، لگتا ہے شاہ زیب نے دوسرا جنم لیا ہے۔ ہو بہو اس کی ہی کاپی ہے۔ بچپن میں شاہ زیب بالکل ایسا ہی تھا۔ دیکھیں تو شیریں بھائی اپنے نواسے کو ذرا.....“ فوزیہ نے بچہ ان کی طرف بڑھایا پر انہوں نے ہاتھ آگے نہیں کیے۔

”ڈر یکتا کو دو اسے..... میں ماہرہ کے پاس ہوں..... دیکھ نہیں رہیں وہ موت کی دہلیز کو چھو کے لوٹی ہے۔“ وہ مڑ کے ماہرہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ فوزیہ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں کندھے اچکائے۔ اتنے میں اسی نرس نے بچہ دوبارہ ان سے لے لیا تھا۔ فوزیہ اور ڈر یکتا دونوں سائڈ پر آ کے بیٹھ گئیں۔ ڈر یکتا، تانی شیریں کے روئے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے نواسے کو دیکھ کے کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا

ہاں آپ بے بی کو دیکھ سکتی ہیں۔“ وہ انہیں بتا کے دوبارہ لیبر روم کی طرف بڑھ گئی۔ شیریں کا جھگماتا پڑا امید چہرہ پھر سے بجھ گیا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی اور پھر سے ماضی میں پہنچ گئی۔ جب عمر زیب کی پہلی بیوی عائلہ نے درد اور کرب کے سمندر کو عبور کر کے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور خود داعی اجل کو بلید کہہ گئی تھی۔ اس کی دفعہ بھی ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے مگر ہم عائلہ کو نہیں بچا سکے۔

شیریں کو یوں لگا جیسے یہ الفاظ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ابھی ابھی اس کے کانوں میں کسی نے کہے ہوں..... ”مبارک ہو۔ اللہ نے بہت پیارا بیٹا دیا ہے..... مگر ہم ماہرہ کو نہیں بچا سکے.....“ آف ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا..... وہ کاریڈور میں ہی جھدے میں گر گئیں۔

”اے اللہ۔ میری ماہرہ کو سلامت رکھنا..... اسے زندہ رکھنا..... اسے کبھی زندگی دینا۔“ یہ ایک بے قرار ماں کے سینے سے نکلی ہوئی پکار تھی۔ اس پکار میں درد تھا، اضطراب تھا، آہیں تھی، آنسو تھے، جو عرش خداوندی سے ٹکرا رہے تھے۔ ماہرہ کی اکھڑی سانسیں رفتہ، رفتہ معمول پر آنے لگیں۔ شیریں کی دعا، ایک بے قرار ماں کے دل کی دعا رب نے سن لی تھی۔

ماہرہ کی بے ہوشی رفتہ، رفتہ ٹوٹنے لگی۔ دھند میں ڈوبا ذہن بیدار ہونے لگا۔ آہستہ، آہستہ اس کی آنکھیں کھلیں..... ڈاکٹر اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ماہرہ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ پیاری سی لڑکی جو پہلی بار ماں بنی تھی۔ اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا۔ ایک بار تو نرس اور ڈاکٹر بھی گھبرا گئی تھیں جو ماہرہ کے کیس کو ڈیل کر رہی تھیں۔ ماہرہ نئی زندگی کو وجود میں لاتے ہوئے ادھ موٹی ہوئی جاری تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں لیکن خدا نے کرم کیا تھا۔ ماہرہ کو مکمل طور پر ہوش آ گیا تھا۔ اب وہ خطرے سے باہر تھی۔

☆☆☆

کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔“ اس کے سمجھانے کا اثر کافی خوشگوار تھا۔ نوید باز آگئے تھے ان کا ضمیر بیدار تھا انہوں نے اورنگزیب بھائی سے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے عمر بھائی کی دولت میں سے کچھ نہیں چاہیے سو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور باقیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اورنگزیب تو خوش تھے کہ ڈوٹر یکتا کے امیدواروں میں سے ایک کی کمی ہو گئی تھی۔ باقی قاسم رہ گیا تھا۔ انہوں نے بالا ہی بالا خلع کے بعد اپنے بیٹے عاشر کے ساتھ ڈوٹر یکتا کے نکاح کا پلان بھی مکمل کر لیا تھا۔

نکاح کے بعد کسی نے کیا بگاڑ لیا تھا۔

عمر زیب نے ڈوٹر یکتا کا نکاح خاندان سے باہر اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ عمر کا فیصلہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی میں اورنگزیب بھی شامل تھے۔ وہ کوئی برا تو نہیں کر رہے تھے اگر ڈوٹر یکتا کی شادی پھر سے خاندان میں کرنے کی سوچ رہے تھے تو..... آخر انہوں نے بھی تو ماثرہ کی شادی خاندان میں کی تھی۔ پھر عمر کیوں خاندانی روایات سے بغاوت پر اتر اٹھا۔ اس بغاوت کی سزا سے ملنا ضروری تھی۔

شیریں کے دل میں زہر بھرا تھا اورنگزیب ان کی ہر بات مانتے تھے اب نہ عاشر ہی تھی اور نہ عمر جیسے جیسا ہوش مند رہا تھا پر شیریں کے دل میں وہی رنجش تھی کہ عمر نے دوبار ان کی بہن کو بیٹا کو ٹھکرایا اور اس کی سزا سے قدرت سے مل رہی تھی۔ (شیریں کے خیال میں)

☆☆☆

زمین روتے دھوتے بچے کو اٹھائے ماثرہ کی طرف گئی تو شیریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ ان کی آواز میں کڑک تھی۔

”جی، ماثرہ بی بی کی طرف لے کے جا رہی ہوں۔ یہ بہت دیر سے رو رہا ہے۔ جب سے سو کے اٹھا ہے روئے جا رہا ہے۔“

”تو ماثرہ کیا کرے گی؟ یہ رو رہا ہے تو..... جا کے ڈوٹر یکتا کے حوالے کرو..... اور تم نہیں سنبھال سکتیں

ملے..... میں تمہیں بہت لگی کہتی تھی کہ اتنا ڈینگ، پنڈم ہر بینڈ ہے پر اب افسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ میں نے سنا ہے کہ عمر چھپانے خود ان لوگوں کو تمہارے رشتے کا کہا تھا۔“ ساثرہ اس کی دلی حالت سے بے خبر اپنی ہانکے جاری تھی اور ڈوٹر یکتا کو اپنے رخسار احساس توہین سے لال ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ گویا یہ بات سب کو پتا چل گئی ہے۔ ساثرہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی پر ابھی اپنی اس کزن پہ اسے بہت ترس آ رہا تھا جسے اس کا شوہر رخصتی سے پہلے ہی چھوڑنے والا تھا۔ اس بات سے اسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شیریں نے کہا تھا کہ ادھر اشر لغاری سے خلع ملے ہی وہ ڈوٹر یکتا کو اپنی بہو بنا لیں گی۔

عاشر بھائی موٹے، غصیلے چڑچڑے، ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جانے والے، بھلا ڈوٹر یکتا ان کے ساتھ کسی لگے گی۔ وہ اکثر یہ تصور کرتی..... امی نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ فوزیہ اور فرح چچی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ اسی امید پر اپنا کوئی حصہ نہیں مانگ رہیں کہ اورنگزیب ڈوٹر یکتا کو خلع دلوا کے ان کے بیٹے کے ساتھ شادی کروائیں گے۔ انہوں نے دونوں بھائی، بھائیوں کو الگ، الگ یہ بات کہی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے قاسم یا اسجد میں سے ڈوٹر یکتا جس کی بھی بیوی بن جاتی اس کے دارے نیارے ہو جاتے۔ باقی کا حصہ اورنگزیب کا تھا آخر وہ بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ کچھ برا تو نہیں سوچ رہے تھے۔ ڈوٹر یکتا کی شادی اگر اپنے خاندان میں ہی ہو جاتی تو اس میں کیا برائی تھی۔ آخر کو اپنے تھے۔ خاندان کی جائداد بھی خاندان میں رہ جاتی۔

نوید اس دوڑ سے باہر ہو چکے تھے۔ اسجد نے صاف کہہ دیا تھا کہ ڈوٹر یکتا اس کے لیے بہن جیسی ہے۔ ”میں بھی اس سے شادی نہیں کروں گا۔“ وہ اس بات پر ماں، باپ سے لڑا بھی تھا۔ ”آپ کی سوچ کیسی ہے ایک بیٹی کی سازشوں سے خلع کروائیں گے اس سے آپ کو کیا ملے گا۔ میری بھی دو بہنیں ہیں، کل کو ان

دو ملازموں نے آکر ڈوٹر یکتا کو عمر زیب سے چھڑایا اور زمین نے بڑھ کر بری طرح سے روتے بچے کو اٹھایا اور تقریباً بھاگ کے وہاں سے نکلی۔ ڈوٹر یکتا کھانسی رہی تھی۔ عمر اس کا گلا دباتے رہے تھے۔ اس کی گردن پر نشان سے بڑھ گئے تھے۔ کوئی جا کے نوید کو بلا لایا تھا۔ انہوں نے عمر کو انکیشن لگایا تو وہ پرسکون ہوئے۔ ساثرہ، ڈوٹر یکتا کو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ جب وہ آوازیں سن کے ادھر آئی تو عمر ڈوٹر یکتا کا گلا دبا رہے تھے اور اس کی آنکھیں جیسے باہر کی طرف ابلی پڑ رہی تھیں۔ ساثرہ اسے وہاں سے لے آئی۔ ڈوٹر یکتا کے حلق میں بہت درد ہو رہا تھا۔ عمر نے تو جیسے سارا غصہ اور طاقت اسی پر صرف کر دی تھی۔

”تمہیں جب پتا ہے کہ عمر چھپا کو دورہ پڑتا ہے تو تم ان کے پاس کیوں جاتی ہو۔ میں تو حیران ہوں کہ تم اس کمرے میں رہتی کیسے ہو۔ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں.....“ ساثرہ حیرانی سے اس سے سوال کر رہی تھی۔ ڈوٹر یکتا کے چہرے پر ابھی تک تکلیف کے آثار تھے۔

”وہ میرے پاپا ہیں، میں انہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں اور مجھے کیا پتا کہ ان پر دورہ پڑ جائے گا۔ میں تو شاہ زیب بھائی کا بیٹا نہیں دکھانے لے گئی تھی کہ ہو سکتا ہے ان کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی آجائے..... پر کیا پتا تھا کہ ایسا ہوگا۔“

”لو یا گلوں کا کیا بھروسا..... کسی وقت بھی کیا کر جائیں۔ تمہیں خود احتیاط کرنی چاہیے۔“ ساثرہ نے بڑوں کی طرح فصاحت کی۔ ”ارے ہاں سنا ہے کہ ابو تمہارے سسرال جائیں گے اور خلع کی بات کریں گے کیونکہ ان کا رویہ بہت خراب ہے۔“ ساثرہ نے سنی سنائی بات اس کے سامنے ڈھرائی تو ڈوٹر یکتا کے سارے اعصاب تن سے گئے۔

”ویسے تمہارا ہر بینڈ ہے بہت ڈینگ..... دیکھنے میں تم سے سات آٹھ سال بڑا لگتا ہے پر اس کی پیچورٹی میں بھی بہت انکیشن ہے۔ میں نے جھٹ سے دعا مانگ لی کہ مجھے بھی ایسا ہی لائف پارٹنر

بھی تھکن کی شکایت کر رہی تھی۔ اس نے زمین کو اشارہ کیا کہ بچے کو یہاں سے لے جاؤ۔ وہ اٹھا کے باہر لے آئی۔ ڈوٹر یکتا نے دیکھا تو اسے لے لیا۔ عمر خاموش تھے۔ ڈوٹر یکتا خوش تھی کہ شاید پیا، شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے خوش ہو جائیں اور جس طرح قلموں میں ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ ایک بل میں ساری زندگی بدل دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ ایک دم ٹھیک ہو جائیں۔ اسی خوش فہمی اور ڈھیروں توقعات کے ساتھ وہ ننھے سے فرشتے کو لے کر پاپا کے پاس آئی۔ جو بالکل گم سم سے تھے۔

”پاپا یہ دیکھیں شاہ زیب کا بیٹا.....“ اس نے بچے کو ذرا سا اُن کی طرف آگے کیا تاکہ وہ اسے دیکھ سکیں پر وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ اسی غیر مرئی نکتے کو گھورتے رہے جس طرح اس کے آنے سے پہلے گھور رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پرامید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید خون کی کشش ہی اپنا اثر دکھا جائے پر ایسا کوئی مجزہ نہیں ہوا۔ ہاں البتہ بچے نے کسمسا کے رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے عمر زیب کا ارٹھکاڑوٹ گیا تب انہوں نے ڈوٹر یکتا اور بچے کی طرف دیکھا پر ان نگاہوں میں شناسائی یا پہچان کی کوئی رتق نہیں تھی۔ بلکہ ان کی آنکھوں میں عجیب سی جارحیت درآئی۔ انہوں نے ڈوٹر یکتا کے کچھ سوچنے سمجھنے سے بیشتر تقریباً جھپٹ کے بچے کو اس سے لے لیا۔ ڈوٹر یکتا نے گھبرا کر زور سے چیخ ماری۔ اس کے چیخ مارنے کی دیر تھی۔ عمر نے بچے کو وہیں بیڈ پر بچھا اور خود ڈوٹر یکتا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بچے نے زور، زور سے چلانا شروع کر دیا۔ یہ اس کی تکلیف کا اظہار تھا۔ ڈوٹر یکتا نے بری طرح چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ عمر نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور زور دار جھٹکا دیا۔ باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یہ دوسرے ملازم اور زمین تھے اور ساتھ ساثرہ بھی۔ بچے کے رونے کی آواز اور ڈوٹر یکتا کی چیخوں میں بے پناہ خوف اور درد تھا۔

گھر پر ہی حاضر ہو گیا۔ وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گئے..... طاہر بے تابی سے ان کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

اور نگزیب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں حیران و ریشان کر دیا۔

”میں ڈریکٹا کی خلع کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔“ وہ یوں کہہ رہے تھے جیسے عام سی بات ہو۔

اشعر کی کپٹنی کی دائیں رگ پھڑکنے لگی جو اس کے شدید غصے کا اظہار تھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اشعر غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ طاہر نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ انہیں صورت حال کی سنجیدگی اور اشعر کے غصے کا اچھی طرح پتا تھا۔

”میاں صاحبزادے آرام سے بیٹھو..... آپ سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سے

ڈھرا کر دیا۔ جیسے ساری نفرت، جلن، کڑھن اس تکلیف پر نکالنا چاہ رہا ہو.....

اب تو مائرہ سے ملنا بہت ضروری تھا۔ بہت ہی ضروری..... اس نے بڑا انتظار کیا تھا اس وقت کا.....

اور مائرہ کا پیچھا بھی اس بوجھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اب باسٹ نے اپنی سوچوں کو اپنے خوابوں کو تعبیر کی صورت دینی تھی۔

☆☆☆

اور نگزیب اور ان کے گھر.....؟ حیرت کی بات تھی..... ان کے انداز میں کینہ توڑی اور جارحیت تو اشعر نے اسی دن محسوس کر لی تھی جب عمر انکل کے آفس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی..... اور آج وہی کینہ توڑی چہرے پر سجائے وہ ان کے گھر چلے آئے تھے۔

اخلاق کے تقاضے تو پورے کرنے تھے۔ بہر حال ان کے تیوروں سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اچھی نیت سے ان کے پاس آئے ہیں۔ ملازم نے فوراً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کے انہیں اندر بٹھایا اور موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈریک اور لوازمات سمیت ان کے آگے لا کے رکھی۔ طاہر لغاری گھر میں ہی تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں اور نگزیب کے آنے کی خبر نہ ہو پاتی۔ وہ تو سنتے ہی خوش ہو گئے اور جلد ہی ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

وہ آگر بڑے خلوص سے اور نگزیب سے بغل گیر ہوئے مگر اور نگزیب کا رویہ قدرے سرد سا تھا۔ بالکل اس کولڈ ڈریک کی طرح جو اور نگزیب کے سامنے نیبل پر رکھی تھی۔ اور نگزیب نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

طاہر نے خود گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے گلاس پر بڑھایا۔

”کیسے آتا ہوا؟“ طاہر کی خوش مزاجی اور نگزیب کی سرد مہری کے باوجود عروج پر تھی۔

”میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں..... سوچا تو کچھ اور تھا پر وہ مناسب نہیں لگا سو اس لیے آپ کے

”اس بار بڑے دن لگا دیے۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھ میں تھامے دیکھ رہی تھی۔

”امی اب میں نے وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے ایک دوست کے ساتھ۔ اس لیے کافی روز بعد آیا ہوں۔ اپنا کاروبار ہے..... سو میری ڈتے داری بھی زیادہ ہے۔“

”اللہ تمہیں اور ترقی اور کامیابی دے۔ خیر بیٹھو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“ بیٹا جانے لگی تھی۔ باسٹ نے روک لیا۔

”امی اس وقت کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے..... میرے پاس بیٹھیں کچھ دیر.....“ وہ اسے تار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں حمزہ احمد بھی چلے آئے اور باسٹ کے باقی بھائی بہن بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے سب کو ان کے لیے لائے ہوئے تھنے دیے۔

”امی اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دو گھنٹے بعد مجھے جگا دیجیے گا۔ یہاں ایک بندے سے ملنا ہے اپنے کام کے سلسلے میں۔“ باسٹ نے صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔

”ہاں سو جاؤ جا کر..... ارے میں ایک بات بتانا بھول ہی گئی کہ مائرہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہت خوب صورت اور صحت مند ہے۔ میں ابھی تک اسے دیکھنے جا نہیں پائی ہوں۔ چلو میں اور تم اکٹھے چلیں گے۔“ بیٹا نے جاتے، جاتے اسے یہ اطلاع دی۔ وہ مائرہ کے گھر بیٹے کی پیدائش کا یوں خوش، خوشی بتا رہی تھی جیسے باسٹ بھی خوش ہو جائے گا۔ باسٹ کے دل میں ناپسندیدگی کی ایک لہریں اٹھی۔ جسے اس نے مشکل سے دبا یا۔

”ہاں امی ضرور چلیں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”مائرہ کے گھر بیٹا..... شاہ زیب اور اس کی قربتوں، شدتوں، چاہتوں کی یادگار..... جیتی جاگتی نشانی.....“ اس نے تکیہ دونوں بازوؤں میں دبا کے

چھنا تک بھر کے بیچے کو..... جھٹ مائرہ کی طرف بھاگتی ہو۔“ شیریں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ زمین کے منہ پر جڑا..... تو اپنی جھونک میں وہ لڑکھڑاسی گئی۔ ”نمک حرام کس بات کے پیسے لیتی ہے۔ اسے سنبھالنا تمہاری ڈتے داری ہے اور اس کی پھولی بھی نہیں ہے۔ اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ جب دیکھو مائرہ کے سر پر سوار ہو جاتی ہو۔ جاؤ اسے فیڈر بنا کے دو..... بھوکا ہوگا یہ اسی لیے رو رہا ہے، جاؤ شاباش۔“ آخر میں شیریں نے خود ہی لہجہ نرم کر لیا تو زمین کی جان میں جان آئی۔

ورنہ وہ تھپڑ کھا کے ہم گئی تھی۔

ابھی تک بیچے کا نام نہیں رکھا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے دلچسپی لی تھی۔ ڈریکٹا نے خود ہی اسے طیب کہہ کے بلانا شروع کر دیا تھا۔ آخر بیچے کا کوئی نام ہونا تو ضروری تھا۔ زمین کے لیے بھی آسانی ہو گئی تھی۔ اب وہ روتا تو وہ ڈریکٹا کے پاس آ کے کہتی کہ طیب رو رہا ہے۔ یہ کر رہا ہے، وہ کر رہا ہے۔ وہ روتا بھی تو بہت زیادہ تھا۔ جیسے بیچ، بیچ کے ماں کی بے رخی کا احتجاج کر رہا ہو۔ جس نے ابھی تک اسے غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔ شروع میں اسپتال سے آنے کے بعد کچھ دن طیب، مائرہ کے کمرے میں ہی سویا۔ ساتھ زمین بھی ہوتی۔ چار دن بعد شیریں نے حکم صادر کر دیا کہ طیب کو مائرہ کے پاس سے لے جاؤ۔ زمین کو مائرہ کے برابر والا کمرادے دیا گیا۔ اب وہ طیب کے رونے پر پہلے کی طرح مائرہ کی طرف نہیں بھاگتی تھی۔ خود ہی شانے سے لگائے تھکتی یا پھر ڈریکٹا کو بتاتی۔ وہ اسے مائرہ بی بی کی طرح جھڑکتی نہیں تھی بلکہ طیب کو اس کی گود سے لے لیتی اور حیرت انگیز طور پر طیب اس کے پاس جاتے ہی اس کے سینے سے لگ کے خاموش ہو جاتا اور زمین کو تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کا نادم مل جاتا۔

☆☆☆

بیٹا اسے سینے سے لگائے کتنی دیر اپنی ممتا اس پر نثار کرتی رہی۔ باسٹ آ گیا تھا، اس بار وہ کچھ دیر سے آیا تھا۔ اس لیے بیٹا بے قراری تھی۔

☆ یہ میرا بلتستان ☆ میرا

گلگت و ہنزہ ☆ سندر چترال

سلسلی اعوان کے یہ ملکی سفر نامے

اپنی خوبصورتیوں، اپنی رعنائیوں، اپنی

تہذیب و ثقافت، اپنے مسائل اور

اپنی تاریخ کے آئینوں میں جھانکتے

دل آویز شاہکار ہیں۔

الفیصل پبلیکیشنز 042-37230777

نظم

گھر، گھر میں
خوشیوں کی شہنائی ہے
عید آئی ہے
میری خاطر
کیا، کیا تحفے لائی ہے
عید آئی ہے
آنسو ہیں
یادیں ہیں
تنہائی ہے
عید آئی ہے

تمہیلہ لطیف، جوہر حالہ

سوچنے لگے۔

☆☆☆

جب سے عمر کو شدید دورہ پڑا تھا اس کے بعد نوید
چچانے ڈرٹریکٹا کو اپنا کرا الگ کرنے کو کہا تھا۔ ان کے
سمجھانے اور اپنی حفاظت کے نقطہ نظر سے تھوڑی سی
پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئی تھی۔ اس کے پیاب
اکیلے ہوتے تھے، ڈرٹریکٹا کو یہ بات پسند تو نہیں تھی پر
مجبوری تھی۔ وہ پیاب کے ساتھ ایک کمرے میں تھی تو اسے
ایک تحفظ کا احساس تھا جو الگ کمرے میں رہنے،
سونے سے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اور نگزیب تاپا اور شیریں تائی دونوں ڈرٹریکٹا کے
ارد گرد موجود تھے۔ انہوں نے آج کی ملاقات، ان
کے گھر جانے کی تفصیل زیب داستان کے ساتھ شیریں
اور ڈرٹریکٹا کو بتائی تھی۔

”ڈرٹریکٹا تم میرے لیے سائرہ اور مائرہ کی طرح
ہو..... میں تمہارا برا نہیں سوچ سکتا۔ اشعر ایک کرپٹ
پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ، ساتھ اخلاقی لحاظ سے

”ہماری طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ہے،
آپ میرے گھر بیٹھ کے میری توہین کر رہے ہیں۔
آپ عمر انکل کے بھائی ہیں، اس ناتے میں آپ کی
عزت کرتا ہوں۔ آپ کی جگہ یہ بات کوئی اور کرتا تو
میں اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔ بس بہت ہو چکا
ہے..... بات عدالت میں جائے یا کہیں اور..... میں
اپنی عزت اور اتنا کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار
ہوں۔ آپ آئندہ میرے گھر میں ڈرٹریکٹا کے ترجمان
بن کے مت آئیے گا اور نگزیب انکل..... ورنہ پھر
میں بھی آپ سے کسی اور طرح ملوں گا۔“ اشعر کا لہجہ کسی
کنزور دل انسان کے لیے برداشت کرنا مشکل
تھا..... اور نگزیب بھی ایک ٹائیے کے لیے سوچ
میں پڑ گئے..... پھر سر جھٹک کے اس کی طرف دیکھا اور
ظاہر لغاری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔

وہ ابھی تک پریشانی سے نظریں جمائے ڈرائنگ
روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں
سے ابھی، ابھی اور نگزیب نکل کے گئے تھے۔

”اشعر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر واپس کب آیا۔
مجھے پتا ہی نہیں چلا..... اور ڈرٹریکٹا..... وہ خلع کا مطالبہ
کیوں کر رہی ہے۔“ ظاہر لغاری حد سے زیادہ پریشانی
کا شکار تھے۔

”پیا سب پتا چل جائے گا کہ ایسا ویسا کیوں
ہو رہا ہے۔ یہ اور نگزیب انکل جن کو ان محترمہ نے
ترجمان بنا کے یہاں بھیجا وہ در پردہ دھمکی دے رہے
تھے عدالت جانے کی۔ میں عدالت سے نہیں ڈرتا۔“

”تم ڈراسکون سے مجھے سے بات کرنے دو خود
ڈرٹریکٹا سے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“ ظاہر لغاری
کو تھوڑی امید کی روشنی نظر آئی۔

”نہیں پیا، آپ کسی سے کوئی بات
نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے میں خود کروں گا۔ رشتہ
آپ کی مرضی سے طے ہوا ہے اور اسے میں اپنی مرضی
سے نبھاؤں گا۔ آپ کسی بات کی فکر مت کریں۔“ وہ
ضد کا شکار لگ رہا تھا۔ ظاہر لغاری خاموشی سے کچھ

دینا..... بس اگر میں نے کہہ دیا ہے کہ میں خلع نہیں
دوں گا تو نہیں دوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے پھر عدالت میں آجائیں آپ
دونوں.....“ اور نگزیب نے کھڑے ہو کر ظاہر لغاری
سے کہا اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا اور اشعر
نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ ”میں ہر ممکن کوشش کر رہا
ہوں کہ بات عدالت سے باہر ہی طے ہو جائے کیونکہ
اس نے مجھے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ میں فیصلہ کن جواب
لے کر آؤں۔ آپ بھی عزت دار ہیں اور ہم لوگ بھی
روایتی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری طرح ظاہر
صاحب آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ گھر کی باتیں
عدالت میں ڈسکس ہوں۔ آپ ماشاء اللہ سمجھدار ہیں
شعر کو بھی سمجھائیں۔“

”مجھے کچھ بھی بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں
ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہم
عزت اور غیرت کے پیچھے جان دینے والے لوگ ہیں
اور ڈرٹریکٹا صاحبہ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا پالا کس شخص
سے پڑا ہے۔ بہت جلد سمجھ جائے گی۔ میں خود آؤں گا
اسے سمجھانے۔“

ظاہر لغاری پریشانی سے کبھی اور نگزیب کو اور کبھی
اشعر کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں بہت ساری باتوں کا کچھ
پتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ الجھ رہے تھے۔ اشعر نے
انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ اب
اور نگزیب کے ذریعے انہیں وہ باتیں معلوم ہوتی تھیں۔
وہ اس سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ ڈرٹریکٹا اور عمر زب
کب آئے ہیں واپس مگر موضوع اس وقت اتنے کبھی
طریقے سے زیر بحث تھا کہ کوئی سوال کر ہی نہیں پارہے
تھے یا انہیں موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

”اچھا میں چلتا ہوں اگر صلح صفائی سے بات
طے ہو جاتی تو اچھا تھا پھر بھی میں انتظار کروں گا آپ
کے مثبت جواب کا کیونکہ میں جگ ہنسانی سے بچنا چاہ
رہا ہوں۔“ جاتے، جاتے اور نگزیب نے پھر کہا تو
اشعر پھر گیا۔

نہیں آیا ہوں اور نہ مجھے اس طرح آنے پر کوئی خوشی
ہے۔“ اور نگزیب کا لہجہ اب بالکل ہی بدل گیا۔ صورت
حالی کے مطابق انہوں نے اپنے رویے میں چلک پیدا
کر لی تھی۔

”تو پھر آپ کس کے کہنے پر یہاں آئے
ہیں؟“ اشعر کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

”میں ڈرٹریکٹا کے کہنے پر..... اس کے زور دینے
پر اور مجبور کرنے پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ وہ خلع
مانگ رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس تعلق کو مزید
مقرر رکھنا نہیں چاہتی۔ وہ عاقل و بالغ ہے، با اختیار
ہے..... کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے اور نہ وہ میری
سن رہی ہے..... میں نے اپنی اولاد اور اس میں کوئی
فرق نہیں رکھا..... اسے پیار سے کہا لاڈ سے کہا کہ یہ
اچھا نہیں ہے پر اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ اسے خلع
چاہیے۔ میں اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔ میری ایک
بچی اور بھی ہے۔ اس کے علاوہ میرے دو بھائیوں کی
بھی بیٹیاں ہیں اگر اس خلع کے بدلے آپ ان میں
سے جس کا بھی رشتہ طلب کریں میں حاضر ہوں کیونکہ
وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہی..... اور میں یہاں مجبور
ہوں۔“ اور نگزیب کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ وہ سچ سچ ایک
مجبور باپ نظر آ رہے تھے اور جس رعوت سمیت ان کے گھر
آئے تھے وہ اب کہیں سے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ظاہر لغاری سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے پر اشعر کے
چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔ وہ خاموش ہو کے بیٹھ
جانے والوں میں سے نہیں تھا۔

”آپ کو ڈرٹریکٹا نے یہاں میرے پاس بھیجا ہے
تاں تو سن لیں اور اسے بھی جا کے بتادیں کہ میں اسے
خلع نہیں دوں گا۔“ اس نے ایک، ایک لفظ پر زور
دیتے ہوئے کہا تو اور نگزیب نے ایک اور کوشش کی۔
”میرے سامنے کی بات ہے وہ تمہارے ساتھ بات
یک نہیں کرنا چاہتی۔ جب ایک فریق راضی ہی نہیں ہے تو
اس سے بندھن زبردستی جوڑے رکھنے کا کیا فائدہ.....؟“
”مجھے فائدے اور نقصان سے کچھ نہیں لینا

آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“
”ارے ڈرے دیکھتا ہے شوہر سے خلع مانگ رہی ہے۔“ شیریں اپنی بات کہنے کے بعد اب بیٹا کے چہرے پر اس کا ردعمل تلاش کر رہی تھی۔

”نہیں آپا..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے، ڈرے دیکھتا ایسی لگتی تو نہیں اور رخصتی سے پہلے ایسا کیا ہوا ہے جو وہ خلع مانگ رہی ہے؟“ بیٹا کی نگاہوں میں ڈرے دیکھتا کا حیران اور معصوم سا چہرہ گھوم گیا۔ جس پر وقت نے ابھی کوئی پختگی تحریر نہیں کی تھی۔ وہ ڈرے دیکھتا جس کی آنکھوں میں اب اداسی نے ڈرے ڈال لیے ہیں۔ وہ کیسے اتنی بڑی بات کر سکتی ہے۔

”بس تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔“ شیریں کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ انہوں نے یہ جملہ بہت آہستہ آواز میں کہا۔ ”عمر نے کسی کو ٹھکرایا تھا اور آج کوئی اس کی بیٹی کو ٹھکرا رہا ہے۔ عمر نے خود ڈرے دیکھتا کے رشتے کے لیے اپنے دوست سے کہا تھا اور بیٹی اب خود ہی اپنے منہ سے خلع مانگ رہی ہے۔“ شیریں نے اپنے تئیں جیسے کوئی عظیم انکشاف کیا تھا۔ بیٹا کو آپا کی یہ باتیں بہت بری لگیں۔ اتنے برس گزر گئے وہ ابھی تک پرانی کڑواہٹوں کو دل میں رکھے ہوئے تھیں۔ شکر تھا کہ باسط نے ان کے وہ جملے نہیں سنے جو آپا نے اس کے اور عمر زیب کے حوالے سے کہے تھے۔ وہ ماثرہ کے ساتھ باتوں میں لگا تھا جانے اس پر کیا اثر ہوتا۔ انہوں نے اپنے ماضی کے بد صورت باب کو اپنی اولاد سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔

بیٹا نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ جانے کیا بات تھی جو بات خلع تک آپنچی تھی۔
”ویسے آپا آپ کو سمجھانا چاہیے تھا اسے یہ حماقت نہ کرے۔“

”بھئی وہ خود مختار ہے، دولت و جائداد کا غرور ہے، فرح نے اپنے قاسم کے لیے امید لگائی ہوئی ہے کہ خلع ہو جائے تو وہ فائدہ اٹھائے۔ ویسے ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔ ارے وہ ڈرے دیکھتا کا شوہر کوئی اچھا لڑکا

تھا۔ نگاہوں میں شوق و وارفتگی، لگن اور ایک انجانا سا پیغام کتنا واضح تھا۔ اس خاموش پیغام کو ماثرہ نے بہت جلد پڑھ لیا تھا۔

”کیسے ہیں باسط آپ..... پاکستان کب آئے؟“ اس کا انداز مخاطب بدل چکا تھا۔ باسط کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ماثرہ نے اسے آپ کہہ کر مخاطب کیا۔ اس کی سماعتوں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔
”میں تو بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسی ہو۔“ وہ بہت شگفتہ لہجے میں مخاطب تھا۔ ماثرہ، باسط کے ساتھ ہی صوفے پر قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔

شیریں، بہن کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔
”ارے ماثرہ کا بیٹا کہاں ہے، ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔“ بیٹا کو خود ہی خیال آیا کہ انہیں آئے کانی دیر ہو گئی ہے مگر ابھی تک انہوں نے طیب کو نہیں دیکھا ہے۔

”وہ سو رہا ہوگا، میں زمین سے کہتی ہوں لے آئے۔“ شیریں آواز دینے لگی تھیں کہ بیٹا نے روک لیا۔
”رہنے دیں آپا جب جاگے گا تب ہی دیکھ لوں گی۔“
”چلو ٹھیک ہے۔“ شیریں نے شکر ادا کیا۔ ماثرہ کے بیٹے کے ذکر یہ باسط کا چہرہ عجیب سا ہو گیا جیسے اسے اچھا نہ لگا ہو.....

”آپا ڈرے دیکھتا کیسی ہے؟“ بیٹا نے جان بوجھ کے عمر کا نام لینے سے گریز کیا۔ ”وہ بھی ٹھیک ہے، کالج گئی ہوئی ہے پر میں آج کل بہت پریشان ہوں۔“ شیریں نے اپنے تاثرات میں تاسف پیدا کر ہی لیا تھا۔

”کیوں، اس کے کالج جانے سے آپ کیوں پریشان ہیں آپا۔“ بیٹا کو ڈرے دیکھتا کے کالج جانے اور شیریں کی پریشانی کی وجہ میں کوئی تال میل محسوس نہیں ہوا تھا۔

”ارے یہ کب کہا کہ میں اس کے کالج جانے سے پریشان ہوں۔ بات اصل میں کچھ اور ہے۔“ شیریں نے لہجے میں از حد پراسراریت بھری۔
”کیا بات ہے آپا..... میری سمجھ میں کچھ نہیں

بال سنوارنے کے بعد اس نے کپڑوں کا ہم رنگ دوپٹا اٹھا کے شانوں پر ڈالا اور خود کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ آج کتنے عرصے بعد خود کو یوں دیکھا تھا۔ ورنہ بھدے بے ڈول سر اپنے سوجے ہاتھ پاؤں، زرد رخساروں سمیت خود کو دیکھنے سے اسے ڈر لگتا رہا تھا۔ اب نہ تو اس کا سراپا بے ڈول اور بھدا تھا نہ ہاتھ پاؤں سوجے تھے اور نہ رخسار زرد تھے۔ اس کا جسم پرانی وضع قطع میں واپس آ چکا تھا۔ نازک کمر، پیٹ پہلے کی طرح اندر اور اضافی چربی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے گھوم، گھوم کے ہر زاویے سے خود کو دیکھا۔ کہیں سے بھی تو کوئی کی نہیں لگ رہی تھی اور نہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے تین ماہ پہلے کسی بچے کو جنم دیا ہے۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے ایک مغرور مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

باسط ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا۔ ماثرہ کو اطلاع مل چکی تھی پر ابھی تک وہ خالہ اور باسط سے جا کے ملی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ ان کے سامنے جانا چاہ رہی تھی۔ باسط کی بے تاب نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ پُر غرور چال چلتی خالہ بیٹا کے سامنے جارکی اور سلام کیا..... انہوں نے کھڑے ہو کے اس کا ہاتھ چوما اور کتنی دیر سینے سے لگائے رکھا۔ ماثرہ کو دیکھ، دیکھ کر بیٹا کا کلیجہ جیسے خون ہو جاتا تھا۔ اتنی کم عمری میں ماثرہ کو یہ داغ لگ گیا تھا اور ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ اس کا دکھ بیٹا دل میں محسوس کرتی تھی۔

میرون کپڑوں میں ملبوس کھلے بالوں اور دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ وہ اور شاہ زیب تقریباً ہم عمر تھے چند ماہ کا ہی فرق تھا۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں یہ دنیا چھوڑ گیا اور ماثرہ بھی یہ صدمہ برداشت کر گئی۔ ”اب آئندہ کے لیے اسے کوئی دکھ نہ دکھانا میرے رب.....“ بیٹا کے دل سے اس کے لیے دعا نکلی۔ ماثرہ، بیٹا خالہ سے ملنے کے بعد باسط کی طرف متوجہ ہوئی جو اسے ہی دیکھ رہا

بھی نہایت گیا گزرا انسان ہے۔ آج جب میں ان کے گھر گیا کہ آخر ان کے سرد روئے کا سبب کیا ہے تو انہوں نے مجھے بہت ذلیل کیا۔ میری تو عقل میں کچھ ما ہی نہیں رہا ہے کہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر نے آخر یہ غلطی کیوں کی..... اشعر لغاری نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ ملک سے باہر گزارا..... وہ وہاں کیا تھا، کیا کرتا تھا..... کیسے رہتا تھا، کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس کی سوسائٹی کیسی تھی۔ بھائی عمر کو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ بس۔۔۔ بلو قونی کی جو جلدی میں تمہارا نکاح وہاں کر دیا۔ ان باپ، بیٹے کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے صرف تمہاری اجازت درکار ہے۔ کیا میں عدالت میں خلع کی درخواست دائر کروں.....؟“ ڈرے دیکھتا خاموش تھی۔ اس سے شیریں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے یہ بہت ضروری ہے ورنہ اگر تمہاری مرضی یہ نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ دھوم دھام سے تمہیں رخصت کروں گا بیٹیوں کی طرح.....“

”نن ن، نہیں تایا جو آپ کہتے ہیں وہ ہی ٹھیک ہے۔“ ایک دم وہ ہڑ بڑا سی گئی۔ جیسے اس خیال سے ہی گھبرا گئی ہو..... اشعر کے ساتھ رخصت ہونے کے خیال سے ہی اس کے سینے چھوٹ گئے۔ اشعر کا غراہٹ بھرا لہجہ اور جنگلی گرفت اس کی یادداشت میں تازہ تھی۔ اسے کیا پڑی ہے ایک فضول اور کرپٹ شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کی۔ تایا جان اس کے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بڑے تھے بہتر جانتے تھے سب کچھ۔

اس کے ساتھ، ساتھ ذہن کے کسی چور گوشے میں کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا۔ یہ سوال بھی کھلبلی مچا رہا تھا۔

☆☆☆

شوخی رنگ کی میرون شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس ماثرہ نہا کے ابھی ابھی ہاتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ کیلے

نہیں ہے۔ پولیس آفیسر ہے اور تمہیں تو پتا ہے کہ پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے خاندان کا بھی نہیں ہے۔ اچھا بے دریکٹا کو ظلع مل جاتی ہے تو....."

چینا کو آ پا شیریں کی پل پل بدلتی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ کہاں تو پہلے وہ خوش ہو رہی تھی اور اب ڈر ٹیکٹا کو حق بجانب تصور کر رہی تھی۔ اس نے شکر کیا کہ گفتگو کا موضوع تبدیل ہوا۔

عمر زیب بھی اسی حویلی میں تھے پر چنا کو جرأت نہیں ہوئی کہ انہیں ایک نظر دیکھ سکے۔ سب کہتے تھے وہ پاگل ہو گئے ہیں، دیوانے ہو گئے ہیں۔ شاہ زیب کی موت نے انہیں ہوش سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اسے دکھ ہوتا تھا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عمر کو اس طرح اس حال میں دیکھنے کا..... بس دل مسوس کر رہ گئی۔

☆☆☆

باسط اور مائرہ باہر آ گئے تھے۔ باسط پرانی باؤلی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مائرہ کا کندھا اس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں ارد گرد سے بے خبر تھے۔

"پھر کیا سوچا آئندہ کا.....؟" بہت دیر کی چھائی خاموشی کو باسط نے ہی توڑا۔

"میں کیوں سوچوں آئندہ کا..... جس کا کام ہے وہ سوچے۔" مائرہ شانے پر آنچل درست کرتی اس سے دور ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کے بالوں اور ماتھے کو بوسہ دے رہی تھی۔ باسط ایک ٹک دیکھے گیا۔ کیا تھا اس چہرے میں..... کیسا سحر تھا اس وجود میں..... جس نے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہ اتنی فرصت دی تھی کہ کسی اور کو سوچے..... وہ پرانی ہو کے بھی پرانی نہیں تھی۔ باسط نے بارہا خوابوں، خیالوں میں اسے اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی لگن، اس کی چاہت کی شدت میں کچھ ایسا جنون کچھ ایسا خلوص ضرور تھا جو قدرت نے پھر سے باسط کے ساتھ مائرہ کے ملاپ کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ اپنے جذبے پر نازاں تھا۔ اپنی محبت پر غرور تھا اسے وہ اسے پھر سے حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اب کوئی

رکاوٹ نہیں تھی جو اسے مائرہ کے ساتھ ہونے سے روک سکتی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ سب رکاوٹوں کو عبور کر سکے۔ اب شیریں خالہ کی بھی تو یہی آرزو تھی کہ مائرہ، بیٹا کی بہو بن جائے۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ بیٹا کب اپنے منہ سے اس کا اظہار کرتی ہے۔ باسط کمار ہا تھا اور اچھا خاصا کمار ہا تھا۔ اس عمر میں ہی کماؤ پوت بن گیا تھا۔ جب لڑکے اپنے مستقبل کی ٹیک و دو میں لگے رہتے ہیں۔

"میں سوچ تو رہا ہوں۔"

"کیا.....؟" مائرہ بے تابی سے بولی۔

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے اس بار میں اسی لیے آیا ہوں۔" باسط نے واضح اشارہ دے دیا۔

مائرہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اب میرے پاس سب کچھ ہے، تمہیں حاصل کر سکتا ہوں۔" اپنی خوشی میں مائرہ کو باسط کی حقارت بھری نظر کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

"اب تو شیریں خالہ انکار بھی نہیں کریں گی بلکہ شکر کریں گی۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

باسط اس کی طرف جھکا۔ مائرہ انکار ہی نہیں کر سکی۔ بے بسی سے زمین کو ٹکنتے لگی۔

آج باسط نے اپنی فتح کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

مائرہ اب ناقابل حصول نہیں رہی تھی۔ ایک بچے کی ماں، جوان بیوہ، داغ لگا چاند..... باسط کا جی چاہ رہا تھا زور، زور سے قبضہ لگائے، اس کا پورا چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ سے روشن تھا۔

☆☆☆

نھا طیب بہت بے چین تھا۔ زمین سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے کندھے سے لگائے ٹہل، ٹہل کے تھک گئی تھی۔ ڈر ٹیکٹا اسائنمنٹ بنا رہی تھی۔ رات کو اسے پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ بچے کے رونے کی آواز اسے یہاں تک آ رہی تھی۔ اس نے بین بند کر کے رکھ دیا۔ اسے اس کے رونے سے

مجیب سی بے قراری ہو رہی تھی۔

اس نے بڑھ کر زمین کے ہاتھوں سے طیب کو لے لیا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ وہ ٹھیک سی ہو رہی تھی۔

"زمین یہ کیوں رو رہا ہے اتنا زیادہ.....؟"

"چھوٹی بی بی اس کو بخار ہے ساتھ موٹن بھی لگے ہوئے ہیں۔"

"تو کوئی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کے نہیں گیا.....؟" ڈر ٹیکٹا اب بچے کو تھک رہی تھی۔

"میں نے شیریں بی بی سے کہا کہ طیب کو بخار ہے انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کوئی ڈاکٹر ہوں جو مجھے بتا رہی ہو۔ کوئی دوائے دو..... تو فریج میں جو ایک سیرپ پڑا تھا وہ میں نے دے دیا۔" زمین نے سادگی سے بتایا تو ڈر ٹیکٹا سر پر ہاتھ مار کے رہ گئی۔

"تو تم مائرہ بھابی کو چاکے بتاتی ناں..... خود سے اسے سیرپ دینے کی کیا ضرورت تھی؟" ڈر ٹیکٹا اس پر غصے ہوئی تو زمین نے نہ سمجھ آنے والی نگاہوں سے اسے دیکھا کہیں وہ انجان پنے کا مظاہرہ تو نہیں کر رہی تھی۔ کیا اسے اپنے گرد و نواح میں ہوتے والی تبدیلیوں کی خبر نہیں ہے۔

"مجھے شیریں بی بی نے منع کیا ہوا ہے کہ بچے کے معاملے میں مائرہ بی بی سے کوئی بات نہیں کی جائے۔ جب سے ان کی بہن اور ان کا بیٹا آیا ہے انہوں نے سختی سے کہا ہے کہ طیب کو مائرہ بی بی کی طرف نہ لایا جائے۔ اب اس میں میری کیا غلطی ہے۔" وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں کیا دوش تھا ایک نوکرانی کا۔ وہ تو ایک معمولی سی تنخواہ بانے والی عورت تھی۔ مالکوں کو کیا کہہ سکتی تھی اور مالک مجیب بے حس، انسانیت سے عاری۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی تھی۔

مائرہ نے بچے کو کبھی خود فیڈ نہیں کرایا تھا۔ رات کو وہ زمین کے پاس ہوتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کو پیدا کر کے بھول گئی ہے۔ ایسی بے حس ماں..... اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

"اچھا تائی شیریں نے ایسا کہا ہے؟" ڈر ٹیکٹا

نے خود کھائی کی۔

"جی ہاں....." زمین نے اس کی ہلکی سی۔

بڑبڑاہٹ بھی سن لی تھی۔ "بیچارہ بچہ ساری رات روتا ہے چپ ہونے میں ہی نہیں آتا۔" زمین بیچارگی سے بولی۔

"میں اسے خود بہلا لوں گی، تم آرام کرو۔"

ڈر ٹیکٹا، طیب کو کندھے سے لگائے، لگائے اسی طرح اپنے کمرے میں آ گئی۔ زمین اس کے پیچھے، پیچھے طیب کا بستر بھی لے آئی۔ ڈر ٹیکٹا نے اس کی دیگر چیزیں بھی لانے کو کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ کیونکہ طیب بہت چڑچڑا پیچہ تھا۔ اپنی پیدائش کے وقت وہ موٹا تازہ اور سرخ و سپید تھا۔ پر اب دو تین ماہ میں وہ بالکل مرجھائے پھول جیسا زرد ہو گیا تھا۔ اوپر کا دودھ پینے سے اس کا پیٹ اکثر خراب ہی رہتا۔ رات کو بستر گیلیا کرتا تو زمین نیند کے نشے میں مدہوش ہوتی..... کبھی تو وہ تبدیل کرتی کبھی سوئی رہتی۔ وہ روتا رہتا اور خود ہی تھک کے ہار کے ٹڈ حال ہونے لگتا تو سو جاتا۔

زمین سب کچھ لے آئی۔ اس کی حرکات میں پھرتی تھی۔ "اب یہ رات کو میرے پاس ہی رہے گا۔ ہاں، دن کو تمہارے پاس ہوگا..... اس کا اچھے طریقے سے خیال رکھنا۔ میں کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی تم میرے ساتھ چلنا۔"

"ٹھیک ہے، میں ضرور چلوں گی۔" زمین نے سر ہلایا۔

☆☆☆

طیب اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا۔ ڈر ٹیکٹا اسے دیکھتے، دیکھتے رو پڑی۔ اس کے ایک، ایک نقش میں شاہ زیب کی شہادت تھی۔ ڈر ٹیکٹا کے بے آواز آنسو طیب کے معصوم چہرے پر گرے تو وہ کسمسانے لگا۔ ڈر ٹیکٹا نے انگلی کی پوروں سے اس کے چہرے سے آنسو صاف کیے تو وہ اپنی حیران آنکھیں کھولے اسے ٹکنتے لگا۔ ڈر ٹیکٹا نے اسے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیے۔ طیب اب ذرا کبھی نہیں رو رہا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ بے خبر سو گیا تو ڈر ٹیکٹا آہستگی

تھا۔ حالات خطرناک رخ اختیار کر رہے تھے۔
”اللہ عمر اور اس کے خاندان پر رحم کرنا۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔

☆☆☆

طاہر لغاری جلدی، جلدی ناشتا کر رہے تھے۔ ان کے برعکس اشعر آرام، آرام سے کھا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے جاگنگ کر کے آیا تھا نہا کے فریش ہونے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو پیا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی انہوں نے چائے کے لیے، لے لے گھونٹ بھرے اور سلاکس کے دو تین نوالے لیے۔

”پیا آج بہت جلدی میں ہیں کہیں جانا ہے؟“ اشعر ہاتھ روک کے انہیں تنگنے لگا۔

”ہاں، میں نے سیالکوٹ جانا ہے۔ فاروقی صاحب سے ملنے..... ایک ضروری کام ہے، ڈرائیور کے ساتھ ہی جاؤں گا اور رات تک آ جاؤں گا بلکہ پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ کون سا میں نے وہاں پہ قیام کرنا ہے۔“ وہ نظریں چرائے، چرائے بتا رہے تھے۔

”اوکے پیا میں بھی نکلتا ہوں، آفس کے لیے فاروقی انکل کو میرا بھی سلام کہیے گا۔“

”ہاں بیٹا ضرور کہوں گا۔“

”اوکے پیا اللہ حافظ۔“ اس نے ٹیبل سے موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔

”خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ۔“ لے چوڑے خوہر سے بیٹے کو انہوں نے دل سے دعا دی۔

ڈرائیور طاہر لغاری کے انتظار میں تھا۔ اشعر کے نکلتے ہی طاہر نے بھی اسے گاڑی اشارت کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

شیریں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ طاہر لغاری یہاں گاؤں ان کے گھر بھی آسکتے ہیں۔ نہ اورنگزیب نے اس حوالے سے انہیں گمان کیا تھا۔ انہیں سچے ہوئے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر وہ خود ڈریکٹا کے پاس آگئیں۔ اسے بتانا اور پڑھانا

”طاہر بھائی وہ نہیں ملنا چاہتی، بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اسی لیے تو آپ کو فون کیا ہے۔ اشعر جذباتی ہے، جوان خون ہے۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا..... اتنے چاؤ اور امانوں سے عمر نے یہ رشتہ، نکاح کیا اور اب ہم اسے ختم کر دیں..... آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں، یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں ہے.....“ وہ پرتاسف لہجے میں بول رہے تھے۔

”میں اشعر سے کس طرح کہوں کہ وہ خلع دے دے..... عمر اپنے حواسوں میں ہوتا تو اور بات تھی۔ ڈریکٹا کم سن ہے، بے وقوف ہے اور آپ بھی اس کی بے وقوفی میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔“ طاہر اب کے قدرے غصے میں آگئے تو دوسری طرف موجود اورنگزیب کے لیے بھی مزید اداکاری جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر اب عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔ آپ گھر کی بات گھر میں رکھنا چاہتے تو آپ کی مرضی.....“ انہوں نے کھٹاک سے فون ہی بند کر دیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اشعر نہیں تھا اور اس نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ورنہ اسے سنبھالنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پھرے ہوئے شیر کو واپس پنجرے میں داخل ہونے پر مجبور کرنا.....

ان کا ذہن مختلف سمتوں میں سوچ رہا تھا اور ہر سوچ ایک ہی بات پر ختم ہو رہی تھی کہ خلع کا فیصلہ ڈریکٹا کا اپنا نہیں ہے۔ اسے یقیناً مجبور کیا گیا ہے یا تو دھمکی دی گئی ہے یا کوئی اور بات ہوئی ہے جو وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی۔ طاہر لغاری اب ہر صورت اس سے ملنا چاہ رہے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے عزیز دوست کی بیٹی بلکہ ان کے بیٹے کی منکوحہ بھی تھی۔ کوئی انہیں اس سے ملنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بس یہ بات اشعر کو معلوم نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ ڈریکٹا سے ملنے گئے ہیں۔

وہ گاؤں میں حویلی میں تھی اور گاؤں اتنا دور نہیں تھا۔ اشعر سے کوئی مناسب سا بہانہ کیا جاسکتا

کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔

ہاں آنکھوں میں جیسے ریت چھو رہی تھی۔
ماڑہ اور باسط دوسری طرف مڑ گئے۔ ان کی پشت ڈریکٹا کی طرف تھی۔ باسط کا ہاتھ ماڑہ کی کمر پر تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس نے بے دھیانی میں یہ فعل سرانجام دیا ہے اور ماڑہ بھی بے خبر ہے۔

ڈریکٹا کے دماغ میں جیسے ایک خیال خود بہ خود ہی پختہ ہو گیا کہ طیب نے باپ کے بعد ماں کو بھی کھو دیا ہے۔ یہ خیال کتنا سفاک اور بے رحم تھا کوئی ڈریکٹا سے پوچھتا۔ اس کی ٹانگوں نے تو اس کا بوجھ ہی سہارنے سے انکار کر دیا..... وہ کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

”کہیں طیب جاگ نہ گیا ہو.....؟“ اس خیال نے اس کے حوصلوں کی گرتی دیوار کو مضبوط کیا اور وہ اٹھنے کے قابل ہوئی۔

طیب اسی طرح بے خبری کی نیند سویا ہوا اپنے ساتھ ہونے والے ظلم اور نا انصافی سے لاعلم تھا۔ کبھی، کبھی یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔

☆☆☆

طاہر لغاری فون کان سے لگائے دوسری طرف سے آتی آواز کو خاموشی سے سن رہے تھے۔

”طاہر بھائی میں اور آپ سے کیا کہوں..... عمر میرا چھوٹا بھائی ہے اس کے ناتے سے آپ میرے بھی چھوٹے بھائی ہو۔ اشعر میاں کو سمجھائیں کہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ میں نے ڈریکٹا کو بہت سمجھایا ہے، میں اسے مار تو نہیں سکتا نہ اس کے ساتھ زبردستی کر سکتا ہوں۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دونوں خاندانوں کی عزت عدالت میں اچھلے..... اشعر خود ہی خلع دے دے..... آپ بات گریں بیٹا ہے آپ کا.....“ اورنگزیب کی ایک ہی رٹ تھی۔

”میں خود ڈریکٹا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے ایک بار اس کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے بدظن کیوں ہو گئی ہے۔“

سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔ اس کا رخ برآمدے سے آگے باغ کی طرف تھا۔ اس وقت دل بے حد ٹھن کا شکار تھا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہ رہی تھی۔ محن سے آگے برآمدے کے اختتام پر دیوار تھی جس کے پیچوں بچھوٹا سا لکڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس دروازے کے دوسری طرف باغ تھا۔ کبھی کبھی وہ ادھر گھومنے چلی جاتی تھی۔ وہاں اسے سکون ملتا تھا۔ مگر رات کے اس وقت وہ سکون سے وہاں بیٹھ کے کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔ دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اس نے زیادہ غور نہیں کیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ کچھ فاصلے پر سنگ مرمر کی بیچ بنی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گئی اور پھر اپنے آپ کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر میں ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے ارد گرد کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ریزہ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ہلکی، ہلکی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرانی ساتھ ہی قدموں کی آواز ابھری۔ قدموں کی چاپ اسی طرف آتی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم کے مساموں نے ٹھنڈا پسینا لگنا شروع کر دیا۔

درختوں کے سائے سے دو ہیولے ابھرے.....
قریب آنے پر اس نے پہچان لیا کہ یہ ماڑہ اور اس کا کزن باسط ہے۔ کل شام ہی تو وہ لوگ آئے تھے اور دریکٹا ان سے ملی تھی۔ شیریں نے کچھ دن کے لیے یہیں رکنے پر اصرار کیا تھا سو وہ لوگ ادھر ہی تھے۔

ماڑہ کا نفرتی قبضہ ڈریکٹا کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ فوراً پیچھے ہو گئی ان دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ باتیں کرتے چلتے ہوئے دوسری سمت کی طرف مڑ گئے۔ دریکٹا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماڑہ کا کندھا چلتے ہوئے باسط سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ ہی تو چل رہے تھے۔ ڈریکٹا کی آنکھوں میں کچھ چھینے لگا۔ دل پہلے بھی ٹھن کا شکار تھا۔ اب اور بھی بوجھل ہونے لگا۔ دکھ، افسوس و حیرانی، بیچارگی، بے بسی یا کچھ اور..... وہ اس وقت اپنے احساسات کو



ضروری تھا۔ ورنہ ساری محنت پر پانی پھر جانا تھا۔
 "اٹھو ڈریکٹا میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک
 چلو..... طاہر لغاری آیا ہوا ہے، وہ تو لڑنے کے موڈ
 میں ہے۔ تم نے بس یہ کہنا ہے کہ تمہیں خلع چاہیے۔
 اگر اس موقع پر تم نرم پڑ گئیں تو ساری زندگی روتی
 رہو گی اور یہ لوگ تمہیں طعنے دے دے کر مار ڈالیں
 گے۔ پہلے خود اس کے بیٹے نے فارمگ کروائی
 تمہارے گھر..... پھر اور گزیرب سے بد تمیزی کی اور
 اب لڑنے کے لیے گھر چلے آئے ہیں۔ آؤ اپنا دل
 مضبوط کرو اور میں نے جو کہا ہے وہ سب طاہر لغاری
 سے کہہ دو تاکہ اسے یقین آجائے کہ تمہارے ساتھ
 کوئی زبردستی نہیں کر رہا..... ورنہ یہ لوگ ہماری جان کو
 آجائیں گے۔" شیریں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے
 ہوئے تھے۔ ورنہ وہ اس قدر اور اتنی جلدی حواس
 باختہ ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔

"ٹھیک ہے ہائی، آئیں میں آپ کے ساتھ چلتی
 ہوں۔" اپنی توہین کا احساس رگ، رگ میں جاگ پڑا
 تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ طاہر لغاری اسے
 دیکھ کے فرط محبت سے اس کی طرف بڑھے..... پر وہ
 ان سے بچتی ان سے گریزاں..... انہیں نظر انداز کرتی
 جا کے دور بیٹھ گئی۔ طاہر لغاری کے اٹھے ہوئے ہاتھ ان
 کے پہلو میں گر گئے۔

"کیسی ہو بیٹا؟" ان کے دل کا دکھ ان کے لہجے
 سے جھانک رہا تھا۔ ڈریکٹا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی
 میں سلا..... اسے لگا..... جیسے وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہے۔
 "ہاں بھائی صاحب، ڈریکٹا آگئی ہے۔ جو کہنا
 ہے کہیں جلدی۔" شیریں کا انداز اہانت آمیز تھا۔ طاہر
 کو بڑی مشکل سے ہنسم ہوا۔ نظر انداز کر کے وہ ڈریکٹا
 کی طرف متوجہ ہوئے جو سر جھکائے ہاتھ گود میں
 دھرے بیٹھی یہاں ہوتے ہوئے بھی اس ماحول اور اس
 منظر کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔

"بیٹا تمہیں مجھ سے یا اشعر سے کوئی شکایت ہے
 تو بتاؤ..... میں تمہارے خلع کے مطالبے سے بہت اپ

سیٹ ہوں اور اشعر بھی..... میں اسی لیے تمہارے پاس
 آیا ہوں کہ جو شکوے، شکایت تمہارے دل میں ہیں
 انہیں سنوں اور پھر دور کروں....." وہ کتنی محبت سے
 بول رہے تھے۔

"نہیں، نہیں، طاہر انکل ایسے نہیں ہو سکتے جس
 طرح اس نے سنا ہے۔" اس نے بے بسی سے سر
 دائیں، بائیں جھٹکا۔ شیریں کی ورائنگ دیتی نگاہ اس
 سے نگرانی تو جیسے اس ہوش آگیا۔ ساری سوچیں فنا
 ہو گئیں یاد رہا بھی تو اتنا کہ طاہر انکل اور اشعر کوئی اچھا
 انسان نہیں ہے۔ اس کی نوانیت اور عزت نفس کے
 نازک شیشے کو کرجی کرنا چاہتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک
 ہی نہیں تھا۔ دو بار کا تصادم ڈریکٹا کو ابھی تک یاد تھا۔
 اسپتال میں تو اس نے صاف دھمکی بھی دی تھی۔ اس
 نے اشعر کے منقہ عزائم کو بچھنے کی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔
 اس کا رویہ ہی منہ بولتا ثبوت تھا۔

"جی انکل مجھے خلع چاہیے..... میں اس رشتے کو
 مزید آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔ میری طرف سے اسے
 آج ختم سمجھیں۔ میرے ساتھ کسی نے زور زبردستی
 نہیں کی۔ یہ سراسر میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔" اس نے
 بہت صاف اور مضبوط لہجے میں کہا..... ایک، ایک لفظ
 کا مقہوم واضح تھا۔ کوئی ابہام نہیں تھا۔ اتنا کہہ کر ڈریکٹا
 باہر آگئی۔ اسے ایسے لگا کہ اگر کچھ دیر اور وہاں بیٹھی تو
 طاہر انکل کے دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ نہیں پائے
 گی۔ جہاں حیرت، بے یقینی مثبت ہو کے رہ گئی تھی۔

"بھائی صاحب آپ نے سن لیا ہے ناں ڈریکٹا
 کی زبان سے سب کچھ..... وہ یہاں بہت خوش ہے۔
 ہم سب اس کے اپنے ہیں۔ اس کے دکھ درد کے
 سانس..... یہاں آ کے وہ اپنے غم بھول گئی ہے۔ اسے عمر
 بھائی کا فیصلہ اپنے لیے نامناسب لگا تو اس نے لب
 کھولے کہ مجھے خلع چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے
 لیے جو بھی پسند کرے..... کوئی اس کے ساتھ زبردستی
 نہیں کر سکتا۔ ہمارا مذہب اسلام بھی لڑکی کو اپنی پسند نا
 پسند بتانے کا، بڑوں تک اپنی بات پہنچانے کا پورا، پورا

حق دیتا ہے۔ یہ کوئی پرانا زمانہ نہیں ہے جب لڑکیوں
 کے ساتھ زبردستی کی جاتی تھی۔ عمر بھائی نے اس سے
 بغیر پوچھے آپ کے بیٹے سے اس کا نکاح کر دیا..... اب
 وہ اس بات کا اختیار رکھتی ہے کہ چاہے تو اس نکاح کو
 برقرار رکھے، چاہے تو ختم کر دے۔ آخر وہ ایک پڑھی
 لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ اس کے انکار کی ایک وجہ اس کی
 اپنی پسند بھی ہے..... "شیریں کچھ دیر سانس لینے کے
 لیے رکیں تو طاہر لغاری بے تاب ہو گئے کہ جانے ان
 خاتون کے منہ سے کون سا انکشاف سامنے آئے۔

"وہ میرے بیٹے عاشر کو پسند کرتی ہے اور عاشر
 بھی....." طاہر کے حواس تھرا گئے۔ اس طرف تو ان کا
 خیال کبھی گیا ہی نہیں تھا کہ ڈریکٹا کسی کو پسند بھی کر سکتی
 ہے..... طاہر لغاری نے عمر زیب کے آفس میں ایک
 بار عاشر کو دیکھا تھا۔ چھوٹے قد کا موٹا سا لڑکا جو شکل
 سے ہی جھگڑالو اور چالاک نظر آتا تھا۔ اس میں کوئی
 ایسی خاص کشش نہیں تھی جو ڈریکٹا سے پسند کرتی۔ پر
 انہیں یقین دلایا جا رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ان کی
 طبیعت مکدر سی ہو گئی۔ جلد از جلد وہ یہاں سے نکلنا چاہ
 رہے تھے مگر جانے سے پہلے وہ ایک نظر عمر کو دیکھنا چاہ
 رہے تھے برساتے جو خاتون بیٹھی تھیں وہ اس خواہش کو
 پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ سو خاموشی سے حویلی کا آہنی گیٹ
 عبور کر کے باہر آ گئے۔

ڈرائیور خلاف توقع انہیں اتنا جلدی آتا دیکھ کر
 الارٹ ہو کے بیٹھ گیا اور گاڑی اشارت کر دی۔ طاہر
 خاموشی سے پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گئے جیسے میلوں
 دور سے پیدل چل کے آئے ہوں۔

واپسی کا سفر بڑا تکلیف دہ تھا۔ آتے ہوئے امید
 کے ہزاروں ننھے منے جگنو ان کی مٹھی میں تھے۔ جو
 راستے میں ہی کہیں رہ گئے تھے۔

اشعر کو کیسے بتائیں گے، کیا دلائل دیں گے کس
 طرح وہ ان کی بات مانے گا۔

اب یہی پریشانی ان کے دماغ پر سوار تھی۔

☆☆☆

مناع دل

ڈریکٹا، طیب کو کندھے سے لگائے ہل، ہل کر
 سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج پھر اس کی طبیعت خراب
 تھی اور وہ چڑچڑا ہورہا تھا۔ صبح سے الٹیاں کر کر کے
 بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے تائی شیریں کو بتایا تو انہوں
 نے بے پروائی سے زہین کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس
 جانے کا مشورہ دیا۔ مائرہ ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

"بھابی آپ طیب کو پکڑیں، میں چادر اوڑھ لوں
 پھر جاتی ہوں ڈاکٹر کے پاس۔" ڈریکٹا نے طیب کو
 مائرہ کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے طیب کو
 گود میں اٹھانے کے بجائے کہا۔

"یہاں صوفے پر لٹا دو۔" وہ اپنے ناخنوں کی
 تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔ ڈریکٹا ناچار طیب کو
 صوفے پر لٹا کے چادر لینے آئی۔ وہ جیسے ہی اسے لٹا کے
 مٹی اس نے پیچھے سے گلا پھاڑا، پھاڑ کر رونا شروع
 کر دیا۔ مائرہ نے روتے ہوئے طیب کو ایک نظر دیکھا۔
 اتنے میں شیریں نے زہین کو آوازیں دینی شروع
 کر دیں۔ وہ بھاگی، بھاگی آئی۔

"طیب کو اٹھاؤ رو رہا ہے، انہوں نے شان بے
 نیازی سے حکم دیا۔ اتنے میں ڈریکٹا واپس آگئی اور بچے کو
 زہین سے واپس لے لیا۔ مائرہ اسی بے نیازی سے ناخنوں
 کے ساتھ مصروف عمل تھی۔ اس اعلیٰ درجہ کی بے حسی کے
 مظاہرے پر ڈریکٹا دل ہی دل میں مل کھا کے رہ گئی۔

اس نے بیٹے کا پوچھا تک نہیں بس اپنے آپ
 میں گن تھی۔ جیسے اپنے ناخنوں کو صیپ دینے کے علاوہ
 کوئی ضروری کام ہے ہی نہیں۔

"ڈریکٹا نے طیب کو اچھے طریقے سے سنبھال لیا ہے۔
 زہین بھی ساتھ دیتی ہے اس کا۔" ان دونوں کے جانے کے
 بعد شیریں تعریفی لہجے میں بولیں تو مائرہ سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ
 دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی کہ باسٹ پٹنا خالہ کو کب بھیجے
 گا۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر، اندر ہی رشتے
 کے لیے آئیں گی۔ اسے گئے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے۔

"مائرہ تمہارا دھیان کہاں ہے میں کتنی دیر سے بول
 رہی ہوں۔" شیریں نے اس کی عدم توجہی محسوس کر لی۔

ہڑبڑا کے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کن سوچوں میں تم ہو؟“

”وہ امی.....“ مائرہ کہتے کہتے ذرا دیر رکی۔ ”باسط

نے کہا تھا کہ جا کے امی کو بھیجوں گارشتے کے لیے۔“

”ہاں، مجھے بھی اس نے ایسا اشارتا کہا تھا۔ اگر

ایسا ہو جاتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارے تو

نصیب کھل جائیں گے۔ باسط کا بزنس بہت اچھا ہے،

پتا نہیں حمزہ بھائی مانیں گے کہ نہیں۔“ شیریں، بہنوئی

کی طرف سے تھوڑا سا مایوس ہوئیں۔ پہلے انہوں نے

بہت چاؤ سے رشتہ مانگا تھا۔ اس وقت شیریں نے بہانہ

کیا کہ اورنگزیب اپنے بھائی کو زبان دے چکے ہیں

ساتھ یہ بھی کہ مائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔

تب شیریں کے بہنوئی حمزہ نے کہا تھا کہ باسط

بھی تو پڑھ رہا ہے ابھی..... ہم کون سا ابھی شادی

کرنے والے ہیں۔ حمزہ بھانپ گیا تھا کہ اس کی سالی

بہانہ کر رہی ہے۔ اب شیریں کو اسی بات کا ڈر تھا۔

”امی میرے دل میں بھی یہ بات تھی کہ ہو سکتا

ہے حمزہ خالونہ مانیں پر باسط نے کہا ہے کہ اس کی بات

ٹالنے کی جرات گھر والوں میں نہیں ہے۔“ شیریں کا

مرجھایا چہرہ کھل سا اٹھا۔

”یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ آخر کو کما کے سب کو

کھلا رہا ہے ہر سکھ دیا ہوا ہے ماں باپ اور بہن بھائیوں

کو..... اور پھر تم میں کیا کمی ہے جو کسی کو اعتراض ہوگا۔

بیٹے کی ماں اگر بنی ہو تو تمہارا بیٹا ڈر دیکتا سنبھال رہی

ہے۔ کون سا شادی کے بعد اسے ساتھ رکھو گی جو کوئی

اعتراض کرے گا۔ بیٹا اور حمزہ آئے تو میں یہ بات ان

کے کانوں میں ڈال دوں گی۔ اس سے اچھا اثر پڑے

گا۔“ مائرہ اپنی ماں کی عقل مندی پر دل میں داد دیے

بغیر نہ رہ سکی۔ وہ کتنی معاملہ فہم اور دور اندیش تھیں۔

☆☆☆

حمزہ احمد اور بیٹا حیرت سے باسط کی طرف دیکھ

رہے تھے جس نے ابھی، ابھی کچھ عجیب سی خواہش کا

”ابو میں مائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، وقت

کم ہے میرے پاس اس لیے آپ کو جلدی گاؤں جا

کے بات کرنی ہوگی۔“ اس کا انداز دو ٹوک اور غیر

فلکدار تھا۔

بیٹا کو یہ تو پتا تھا کہ باسط کسی زمانے میں مائرہ کو

پسند کرتا تھا..... پر وہ پسندیدگی اور جنون ابھی تک...

برقرار تھا، اس کا اندازہ آج سے پہلے اسے نہیں ہوا تھا۔

”ایک بات بتا دوں..... اگر مائرہ نہیں تو کوئی

بھی نہیں..... میں انکار اور مخالفت برداشت نہیں کروں

گا کسی بھی صورت..... اس لیے میری خوشی میں آپ

بھی خوش ہو جائیں۔“ وہ نہ جانے ان کی خاموشی سے

کیا سمجھا تھا کہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا۔

بیٹا نے شوہر کی طرف دیکھا..... وہ پہلے ہی ہار

تسلیم کر چکے تھے۔ باسط کا باپ ہونے کے ناتے اس کی

خند سے وہ اچھی طرح واقف تھے اور اب تو وہ ایسی

پوزیشن میں بھی تھا کہ اپنی ضد منوا بھی سکتا۔ یہاں

قدرت بھی اس کا پورا، پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سب

راستے ہموار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کسی جگہ کوئی

رکاوٹ نہیں تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا، ایک

خوشی کی اطلاع دہی سے اس کے پارٹنر نے بھی دی تھی

کہ اس دفعہ کا مال مارکیٹ میں بہت اچھے داموں بکا

ہے۔ انہیں اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن ضرورت سے زیادہ کم

ریٹ پہ ملی تھی اور وہی ہیروئن بعد میں ان کے

اندازے سے زیادہ مہنگے داموں فروخت ہوئی۔ باسط

کی خوشی حد سے سواتھی۔

اور اب امی ابو نے بھی خاموشی کی زبان میں

اقرار کر لیا تھا کہ انہیں اس کی خواہش اس کی خوشی ہر چیز

سے عزیز ہے۔

وہ شیریں خالہ کے گھر جانے کی تیاری کر رہے

تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش کے

عین مطابق.....

☆☆☆

”کیا قسمت پائی ہے مائرہ نے بھی۔“ بیٹا اور

حمزہ احمد اس وقت شیریں اور اورنگزیب کے گھر موجود

تھے اور اپنا مدعا زبان پر لایچکے تھے۔ شیریں نے سب کا

منہ میٹھا کر لیا۔ فرح اور فوزیہ بیک وقت مائرہ کے

بارے میں سوچ رہی تھیں۔ شیریں نے بڑے، بڑے

لڈوان دونوں کے منہ میں ٹھونسنے تھے۔

”اللہ اس بار مائرہ کے نصیب اچھے کرے۔“

فوزیہ نے پُر خلوص دعا دی تو شیریں نے دل کی گہرائی

سے آمین کہا۔

”پہلی بار بھی مائرہ کے لیے شاہ زیب کا رشتہ آیا

اور اب باسط کا..... کتنے اچھے نصیب پائے ہیں اس

نے۔“ فرح چچی نے آہستہ آواز میں انگھار خیال تو

فوزیہ نے ہاتھ دبا کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

شیریں سن لیں تو خواہ مخواہ نئی بحث چھڑ جاتی۔

فرح دیسے بھی آج کل شیریں اور اورنگزیب

سے کبیدہ خاطر ہو رہی تھی، نہ جانے کیوں اسے ان

دونوں کی نیت پر شک ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جانے باسط کو کیسے

قابو کیا ہے..... اور خود مائرہ کو تو اپنے محصوم بیٹے کی

کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ زمین کے حوالے کیا ہوا ہے۔

ایسی ماں ہم نے تو نہیں دیکھی۔“ فرح نے جملے دل

کے پھپھولے پھوڑے۔ فوزیہ دیکھ کے رہ گئی۔ کہہ تو وہ

ٹھیک ہی رہی تھی۔ مائرہ کو بیٹے کا ہوش ہی نہیں تھا۔

کبھی ڈر دیکتا تو کبھی زمین کے پاس ہوتا۔ شیریں کو بھی

تو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان ماں، بیٹی پر عجیب سی

بے حسی طاری تھی۔ ڈر دیکتا ٹھہری ایک کنواری نا تجربہ

کارلڑکی اسے بچے پالنے یا سنبھالنے کا وہ خاص سلیقہ

نہیں تھا جو قدرت کی طرف سے ایک ماں کو ودیعت

کیا جاتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ جو ہوتا، کرتی تھی پھر

بھی کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی تھی۔ طیب کبھی پیٹ کبھی

کان کے درد سے روتا تو ڈر دیکتا کو سمجھ ہی نہیں آتی۔ یہ

سب ایک ماں ہی جان سکتی تھی اپنے بچے کی

ادائیں، عادتیں، سونے، جاگنے کے اوقات اور طیب

لجھو بن عید

عید کے دن بھی میرے بچا

تجھ بن سونا میرے گھر کا اگلا

نہ کوئی نگلن پھولوں کا

نہ کوئی موسم جمولوں کا

نہ لب پر اپنے لالی ہے

آنکھ کا کا جل بیگا، بیگا

چپ، چپ کان کی بالی ہے

جب عید کا چاند لگتا ہے

پیار سے ہر کوئی ملتا ہے

ہوا بھی خوشبو لٹاتی ہے

سکھی گیت ملن کے گاتی ہے

میرے دل کو بڑا اثر پاتی ہے

جب عید سوال کی آتی ہے

شاعرہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

مرہم

دل جب درد نہ سہہ پائے

آنسو آنکھوں سے بہہ جائے

تو میری بھیگی پلکوں کو

اپنے ہونٹوں سے وہ چومے

ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہے

دھیرے سے بس یہ کہہ دے

تیرے سارے دکھ اب میرے

میرے سارے سکھ اب تیرے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

آہستہ سے

جانے کب تک تیری تصویر نگاہوں میں رہی

ہو گئی رات تیرے عکس کو سکتے، سکتے

میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں

تیری تصویر پر لب رکھ دیے آہستہ سے

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

کی ماں بے حس ہو چکی تھی۔

زمین نوکرائی تھی رات میں ڈر بیکتا سنبھال
لجی..... دن میں اسے ہی دیکھ بھال کرنی پڑتی۔ طیب
اس کے پاس آتے ہی گلا بھاڑ کر رونے لگتا۔ وہ اٹھا،
اٹھا کے زچ پڑ جاتی۔ اس کی کونھری میں انیم پڑی رہتی
تھی جو اس کامیاب استعمال کرتا۔ زمین چپکے سے تھوڑی
سی انیم طیب کو بھی چننا دیتی۔ وہ بھی سکون سے سویا رہتا
اور زمین بھی فارغ ہو جاتی۔

شیریں یا مائرہ میں سے کوئی بھی پوچھنے والا
نہیں تھا کہ طیب اتنی اتنی دیر کیوں سویا رہتا ہے۔ جس
دن ڈر بیکتا گھر میں ہوتی اس دن زمین، طیب کو انیم
نہیں چناتی تھی۔

☆☆☆

مائرہ شادی کی شاپنگ شروع کر چکی تھی۔ کبھی
فوزیہ یا فرح چچی میں سے کوئی ساتھ جاتی اور کبھی
شیریں جاتیں۔ زیادہ تر شیریں ہی ساتھ جاتیں۔
مائرہ بہت خوش تھی۔ ایک، ایک چیز اپنی پسند سے دیکھ
بھال کے لے رہی تھی۔ ٹائم بہت کم تھا کیونکہ باسط کو
واپس بھی جانا تھا۔ وہ لمبے بکھیڑوں کے حق میں
نہیں تھا۔ چاہتا تھا سیدھے، سیدھے نکاح کر کے مائرہ
کو گھر لے آئے۔

ماں کی حیثیت سے بیٹا کے دل میں باسط کی
چھوٹی بہنوں کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ انہوں
نے بڑے پروگرام بنا رکھے تھے۔ بھائی کی شادی
میں یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ..... کارڈ چھپنے
کے لیے دیے جا چکے تھے۔

☆☆☆

کل باسط کی مہندی تھی۔ دوستوں رشتے داروں
اور کزنز نے خود ہی سب کچھ ارنج کیا تھا۔ اس کے ذہن
پر ایک فکر سوار ہو گئی تھی کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا
ایک کارندہ اتر پورٹ پر ہیروئن لے جاتے ہوئے شک
کی پتا پر پکڑا گیا تھا بعد میں تلاشی لینے پر مشکوک اشیا
برآمد کر لی گئیں۔ اب وہ لاک اپ میں تھا اور پوچھ گچھ

کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ باسط کو خوف تھا کہ ایسا
نہ ہو وہ اس کا نام اگل دے..... اس کے پارٹنر نے یقین
دلایا تھا ایسا کچھ ہوا تو وہ سب سنبھال لے گا پر باسط پھر
بھی پوری طرح پراسکون نہیں تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لینا ہوا تھا۔ آنکھ ہی نہیں لگ
رہی تھی۔ سائنڈ میبل پر اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ باسط
کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وقت گزر رہی نہیں رہا تھا
اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔ اس نے مائرہ کو کال کر دی۔

وہ بھی اسی کی طرح جاگ رہی تھی۔ باسط بہت
دن سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا پر وہاں مائرہ کے ہاں
جانے کے باوجود اس سے وہ بات کہنے کا موقع
نہیں ملا..... آج اور ابھی وہ مائرہ سے اپنی وہی بات
کرنا چاہتا تھا۔

”مائرہ میں نے تمہیں تو اپنا لیا ہے مگر میں
تمہارے بچے کو ہرگز نہیں اپناؤں گا، تم نے میرے
ساتھ رہنا ہے تو اسے بچے کو وہیں چھوڑ کے آنا ہوگا.....
میں اسے قبول نہیں کر سکتا..... اسے دیکھ کر مجھے بہت
کچھ یاد آئے گا جو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا.....“
باسط نے صاف اور دونوک بات کی۔ اس کا خیال تھا
کہ مائرہ یہ بات سن کے روئے گی، اس کی منت کرے
گی کہ نہیں، نہیں مجھے میرے بچے سے الگ مت
کرو..... اسے بہت دکھ ہوگا پر مائرہ بولی تو اس کا لہجہ
بہت نارمل سا تھا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہو۔

”ٹھیک ہے باسط ایسا ہی ہوگا۔ طیب حویلی میں
ہی رہے گا۔“

باسط کے ذہن سے یہ بوجھ بھی اتر گیا۔ مائرہ نے
خلاف توقع آرام سے اس کی بات مان لی تھی۔

یہی بات باسط نے جب بیٹا کو بتائی تو کتنی دیر وہ
خاموش رہی اس سے بولا ہی نہیں گیا جیسے اسے رنج ہوا ہو۔

”باسط ایک بچے کو اس کی ماں سے مت الگ
کرو، اس کا دل بچے میں ہی اٹکا رہے گا وہ تمہیں خوش
نہیں رکھ پائے گی۔ اسے دو کشتیوں کا سوار مت بناؤ۔“
”امی پلیز..... یہ میری زندگی ہے۔ میں اس پر

کسی اور کے بچے کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ
میرا ظرف اتنا بڑا ہے کہ میں مائرہ کے بچے کو باپ کا
پیار دے سکوں میں اتنا عظیم نہیں ہوں۔“ اس نے ہاتھ
اٹھا کر انہیں مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔

☆☆☆

مائرہ کی رخصتی میں صرف دو دن باقی تھے اور اب
بھی اسے بہت سی وہ چیزیں یاد آ رہی تھیں جن کی
شاپنگ ضروری تھی، شیریں نے آج نہ جانے کس طرح
ڈر بیکتا کو بھی مائرہ کے ساتھ جانے کا کہہ دیا۔

”تم بھی جاؤ ساڑھے بھی جا رہی ہے اپنے لیے
کپڑے وغیرہ لے لینا جب سے تم گاؤں آئی ہو ایک
بار بھی شاپنگ کے لیے نہیں کہا ہے تم نے..... سو
ضروریات ہوتی ہے لڑکی ذات ہو کوئی اچھا سا سوٹ
لینا مائرہ کی رخصتی پہ پہننے کے لیے۔“ وہ اس کے دل کی
حالت سے بے خبر بولے جا رہی تھیں ڈر بیکتا نے نئی میں
سر ہلایا پر شیریں نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔ اسے یاد
آیا کہ طیب کے کپڑے تنگ، تنگ اور چھوٹے ہو گئے
ہیں کیوں نہ طیب کے لیے کچھ خریداری کر لی جائے
اس خیال سے وہ ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار
ہو گئی ورنہ دل اندر سے بے پناہ اداں تھا۔

شاپنگ کے بعد وہ لوگ اسی شاپنگ مال کے فوڈ
کورٹ میں آ گئے جہاں اور بہت سے لوگ بھی بیٹھے
ہوئے تھے ساڑھے اور مائرہ کی نظر دور پولیس یونیفارم
میں ملبوس بیٹھے اشعر پر پڑی اور ساڑھے لپک کر اس کی
طرف بڑھ گئی اور اس سے دعا سلام کی سامنے جا کر
ساڑھے اس کی شخصیت کے دل فریب بیچ و خم میں کھوس گئی۔
مائرہ نے اسے دور سے ہی ملاحتی نگاہوں سے گھورا
اور اپنی طرف واپس آنے کا اشارہ کیا، اتنے میں اشعر
بھی انہیں دیکھ چکا تھا وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ ڈر بیکتا
اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہی تھی کاش وہ کہیں چھپ سکتی
پتا نہیں کیوں وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔

اشعر اکثر یہاں لٹچ کرنے آتا تھا اس کا آفس
یہاں سے قریب ہی تھا۔ آج بالکل غیر متوقع طور پر

مناہ دل

اور مگر زیب کی بیٹیوں سے اس ریسٹورنٹ میں اس کا
سامنا ہو رہا تھا ان کے ساتھ وہ بھی تھی جس کا تصور
کرتے ہی اشعر کا جی چاہتا تھا کہ شوٹ کر دے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ اس کے سر پر کھڑا تھا اس
کا مخاطب مائرہ اور نگاہیں در بیکتا پر تھی جس نے ادھ کھایا
برگردا پس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

”مائرہ کی شادی ہو رہی ہے ہم شاپنگ کرنے
آئے ہیں۔“ ساڑھے مسلسل بول رہی تھی ادھر مائرہ نے
اخلاق کا تقاضا نبھایا اور بادل نا خواستہ اسے ہلو ہائے
کی۔ اشعر ساڑھے کی خالی کی گئی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس
کے دائیں طرف ڈر بیکتا تھی جس کا دل اس وقت پتے
کی طرح کانپ رہا تھا۔

”آپ نے پھر کسی کو ابھی تک بھیجا نہیں میرے
پاس ترجمان بنا کر..... خود ڈرتی ہیں مجھ سے بات
گرتے ہوئے۔“ ابھی یقیناً اس کا مخاطب ڈر بیکتا ہی تھی
اس نے امداد طلب نگاہوں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔
مائرہ نے نگاہیں چڑھیں وہ خود اشعر سے خائف تھی
باقی لوگ بھی آہستہ، آہستہ ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

”مجھ سے جو بات کرنی ہے ڈائریکٹ کریں
محترمہ..... مجھے اپنے تایا کے ذریعے عدالتوں کی
دھمکیاں مت دیں۔ میں ان سے ڈرنے والا نہیں
ہوں۔ خیر یہاں ان باتوں کا موقع نہیں ہے میں بہت
جلد آپ کے پاس آؤں گا۔“ اشعر کی آواز دھیمی پر لہجہ
بہت سخت تھا۔ ڈر بیکتا نے سہارے کے لیے مائرہ کا ہاتھ
پکڑ لیا اس کے چہرے پر پھیلتی گھبراہٹ اشعر کی نگاہوں
سے پوشیدہ نہیں تھی مزید تماشائے بننے کے خیال سے اشعر
وہاں سے اٹھ گیا اور جاتے، جاتے مائرہ کو شادی کی
مبارک بادوی۔

ساڑھے ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی اس کے جاتے
ہی مائرہ بہن کو ڈانٹنے لگی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے پاس جانے
کی۔ پتا تھا چکے ہیں کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے تم پھر
سلام کرنے پہنچ گئیں اس کے پاس۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، مارل کوالٹی، کمپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا۔
”پاپا مجھے ڈر لیکتا کو اس گھر میں لانا ہے۔ میری بیوی ہے وہ۔“
اور کمزرب عدالت کی دھمکیاں دے رہا تھا،
ڈر لیکتا نے خود کہہ دیا تھا کہ میں اس رشتے کو ختم کرنا
چاہتی ہوں اور اشعرا سے گھر میں لانے کی بات کر رہا
تھا۔ طاہر لغاری نے گاؤں جانے والی بات اشعرا کو نہیں
بتائی تھی کہ اسے اور غصہ آئے گا لیکن اب چھپانے کا
کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”گند پاپا آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں کہ آپ
گاؤں گئے تھے، کیا ضرورت تھی بتانے کی..... بہر حال
میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کو اس گھر میں
لانا ہے پاپا، اب یہ میری عزت، انا اور غیرت کا معاملہ
ہے۔ میں کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“

”اشعرا وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں، میں پہلے
بھی سمجھتا رہا کہ ڈر لیکتا کو ڈرایا گیا ہے خوف زدہ کیا گیا
ہے یہ سب کہنے کے لیے۔ میں اپنا شک دور کرنے
گاؤں گیا، مجھے خود ڈر لیکتا نے کہا کہ وہ اس رشتے کو ختم
کرنا چاہتی ہے بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میری
طرف سے اس رشتے کو ابھی اور اسی وقت ختم سمجھیں۔
اب تم بتاؤ جب وہ خود راضی نہیں ہے تو تم کیوں اپنا
خون جلا رہے ہو۔“ طاہر لغاری نے اس کے کندھے پر
ہاتھ رکھا اشعرا نے ہٹا دیا۔

”پاپا یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا، ہاں ڈر لیکتا ختم ہو سکتی
ہے۔“ اشعرا کا لہجہ بلا کا سفاک اور سرد تھا طاہر لغاری
دل گئے۔

”تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آکر اتنے سفاک ہو
گئے ہو مجھے نہیں پتا تھا۔“

”پاپا آپ جو بھی سوچیں، یہ رشتہ میری انا کے
لیے زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔ میں ایک عورت
کو اپنی مردانگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کسی
قیمت پر بھی نہیں۔“ اس کے لفظ، لفظ میں آہنی سختی تھی۔
(باقی آئندہ)

”اتنا ڈرنگ ہے، مجھے تو افسوس ہو رہا ہے۔“ ساڑھ
ذرا بھی اس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہیں لاری تھی۔
ڈر لیکتا خوف زدہ تھی اور مسلسل واپسی کا کہہ رہی
تھی۔ ساڑھ کو غصہ آ گیا۔

”تم اتنا ڈرتی کیوں ہو، وہ کوئی خون آشام بلا
تو نہیں ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہی تو ہے۔ تمہارا نکاح
ہوا ہے اس کے ساتھ کچھ دنوں تک یہ نکاح ختم ہو جائے
گا پھر بھی تم ڈرو گی؟“

ڈر لیکتا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ساڑھ کو
خوشی ہو رہی تھی ڈر لیکتا کے خوف اور اشعرا لغاری کے
انداز پر۔

”کیا زور دار جوان ہے، ایک مرد کو ایسا ہی
ہونا چاہیے۔“

”تم اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو جیسے بہت متاثر
ہو۔“ ماڑھ نے اس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔
”ہاں، میں پہلی بار ہی متاثر ہو گئی تھی۔ مجھے
ڈر لیکتا پر حیرت ہے جو اس سے خلع لے رہی ہے۔“
ساڑھ آہستہ آواز میں بولی پر ڈر لیکتا تو اپنے ہی خیالوں
میں گم تھی۔ ماڑھ نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

”بس کرو، ڈر لیکتا اتنی تعریفوں پر کیا سوچے گی۔“
شیریں تو عاشر کے لیے اس کے حوالے سے خواب دیکھ
رہی تھیں۔ ڈر لیکتا کو خلع مل جاتی تو اشعرا کے آسب سے
جان چھوٹ جاتی۔ عاشر سے شادی کے بعد طیب کی
ذتے داری کے بوجھ سے شیریں ہلکی ہو جاتیں۔
شیریں جاتی ماڑھ نے شادی کے بعد تو باسط کے ساتھ
چلے جاتا تھا۔ ساری عمر کے لیے طیب کو کون سنبھالتا۔ ننھا
سابقہ تھا اس کی عمر کے ابتدائی چار پانچ سال بہت
مشکل تھے، ڈر لیکتا شادی کے بعد اس گھر میں رہتی تو
شیریں کے لیے آسانی ہی آسانی تھی۔

☆☆☆

اشعرا بہت غصے میں تھا طاہر لغاری اس کا مطالبہ
ن کے چپ ہو گئے تھے۔ ڈر لیکتا کو ریسورٹ میں دیکھ
کر اشعرا کو جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً سے بھی بیشتر

WWW.PAKSOCIETY.COM

78 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015



ضرورت مند شائستہ انجم

بہت شوق تھا اسے کبھی کوئی دن مختلف بھی ہو۔
”ہو گیا ناں آج شوق پورا۔“ رخسانہ اپنی سوچوں
میں گم گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ گاڑی کی کچھلی سیٹ پر
اس کے دونٹھے منے بچے بیٹھے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ
آمنہ باجی کتنی خوش قسمت تھیں تعلیم مکمل کرنے کے فوراً
بعد ان کی شادی ہو گئی مگر انہوں نے بڑی کامیابی سے
اپنی لیکچررشپ جاری رکھی وجہ یہ تھی کہ اپنے بچے پالنے کا
انہیں کبھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بچے اماں کے پاس



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریٹ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

چھوڑ جاتیں اور بے فکر ہو کر جا ب کر تیں اماں کی بوریٹ بھی دور ہو گئی تھی اور بچے بھی بحفاظت پل گئے۔
رخسانہ مقامی کالج میں لیکچرار تھی اور بڑی بہن آمنہ سے کچھ ہی سال عمر میں چھوٹی تھی۔ شادی کے بعد اپنی ساس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے جا ب جاری رکھی پھر ساس نے بھی ہری جھنڈی دکھادی کہ ”ارے بھئی اپنے بیٹے خود ہی سنبھالو۔“ لہذا رخسانہ اب روزانہ صبح، سویرے اٹھتی دو سال کے حمزہ اور تین سال کی بیٹی کو تیار کر کے کالج جانے سے پہلے اپنی اماں کے حوالے کر جاتی اور پھر کالج سے واپسی پر انہیں واپس لے آتی۔ بچوں کے ساتھ ایک ٹوکری میں ان کی ضرورت کی چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء بھی ہوتیں اور بچوں کے ساتھ یہ سب بھی ڈھوکے لانا ہوتا یہ روز کا تھا کدینے والا معمول تھا مگر آج آٹھ بجے وہ اپنی اماں کے گھر بچوں کو لے کر پہنچی تو اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کچھ چڑچڑی بھی نظر آ رہی تھیں۔

بی ناں..... اس نے خود غرضی کی انتہا پہنچ کر سوچا۔ ”اگر اماں میرے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں تو سعدیہ کو تو کچھ خیال کر لینا چاہیے آخر میں دن بھراتی محنت کرتی ہوں۔ نوکری اور گھر سنبھالنا آسان کام تو نہیں..... مگر جال ہے جو کسی کو میرا خیال ہو یا مجھ پر ترس کھائے.....“ اس نے چھوٹی بہن سعدیہ کے متعلق سوچا جو سہیلیوں سے موبائل پر چیٹنگ کرتی رہتی یا کانوں میں ہینڈ فری کسمپوز نے گانے سنتی رہتی..... البتہ اپنے موبائل کی پوری گیلری... اس نے حمزہ اور بیٹی کی تصاویر سے بھر دیں۔ ”بس یہی اس کی محبت ہے میرے بچوں کے لیے.....“

”اور روٹی (اب اس نے چھوٹے بھائی کے متعلق سوچا) فارغ وقت میں ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کرتا رہتا ہے سب گھر والوں کو دکھا، دکھا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس سبج نامی لڑکے سے وہ دن رات دھڑلے سے ابو کے پاس بیٹھ کر چیٹنگ کرتا رہتا ہے وہ یقیناً سبج نہیں کوئی سمیعہ ہوگی..... گرمیوں میں چھت پر جا کر اور سردیوں میں ہاتھ روم جا کر کال سنتا رہتا ہے اور اماں انتہائی سادگی سے اس کی طرف داری کرتی ہیں کہ اس کے موبائل پر تو سگنلز ہی نہیں آتے کہ بچہ سکون سے ایک جگہ بیٹھ کر ضروری کال سن لے..... آفس والے تو اسے چین ہی نہیں لینے دیتے۔“ اور وہ صرف ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی۔ اسے موبائل کی ایجاد سے ہی پر خاش ہونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کچھ سال پہلے تک جب ہر کسی کے پاس موبائل نہیں تھا تو زندگی کتنی آسان تھی۔ سب کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ اب تو بھری مجلس میں بھی ہر شخص اپنی الگ ہی دنیا بسا کے بیٹھا ہے۔ چلو بیچارے تنہا اور ریٹائرڈ لوگوں کو بھی موبائل نے اکیلے پن سے بجالایا ہے۔ پھر اسے یاد آیا۔ شادی کے بعد جب وہ رخصت ہو کر سسرال پہنچی تو اس نے بھی اسی

وقت سے موبائل استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب بھی وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تو اپنے گھر والوں اور سہیلیوں کو سسرال کی رپورٹنگ کرتی کہ یہاں کون کیا کرتا ہے، کیا کھایا پکایا جاتا ہے وغیرہ تب تو موبائل بہت کارآمد شے تھا۔ بلکہ اس کے لاکھوں کے جہیز میں سب سے قیمتی اور اہم چیز موبائل ہی تھا..... میاں سے بھی مستقل رابطے میں رہنے کا اہم ذریعہ..... انہی سوچوں میں گم وہ مارکیٹ پہنچ گئی۔ اس نے مطلوبہ دکان کے سامنے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک خواجہ سرا جس نے اپنے سانولے چہرے پر میک اپ کی گہری تہ جھا رکھی تھی... اور تیز سرخ لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر بھی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ اس کی سانولی گردن سے بالکل میل نہیں کھا رہا تھا۔ کالی پھول دار شلواری قمیص میں ملبوس اور کالا ہی دوپٹا اوڑھے ہوئے وہ اس کے پاس چلا آیا اور انتہائی لجاجت اور مسکینیت سے بولا۔

”میری پیاری باجی کچھ خیرات دے دو۔“ رخسانہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ کوئی جواب دیے بغیر گاڑی سے اتری اور گاڑی لاک کے بغیر تیزی سے دکان میں داخل ہو گئی۔ چند ہی لمحوں میں وہی خواجہ سرا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے دکان میں داخل ہوا اور جلدی سے بولا۔

”پیاری باجی، پیاری باجی آپ کی گاڑی کی بریک نہیں لگی ہوئی اور وہ پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔“ ”کیا.....“ اس نے خوف سے چلا کر کہا۔ اسے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنے معصوم بچوں کا خیال آیا۔ وہ اپنے کاغذات جو فونو ٹوکاپی کرانے کے لیے لائی تھی وہیں چھوڑ چھاڑ جلدی سے دکان سے باہر نکلی..... خواجہ سرا بھی..... تیزی سے اس کے ساتھ آیا۔ گاڑی واقعی پیچھے کی جانب آہستہ، آہستہ کھسک رہی تھی اور بچے بالکل اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں معاملے کی سنگینی کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ رخسانہ سخت گھبرا گئی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ گاڑی

بارنگ والی جگہ سے کھسکتے بھسکتے سڑک پر آ رہی تھی اس کی گاڑی کسی بھی شخص یا مخالف سمت سے آنے والی گاڑی سے ٹکرائی تھی، حادثے کا اندیشہ منڈلا رہا تھا۔ وہ تو بالکل ہی بدحواس ہو گئی۔ خواجہ سرانے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے اچک کر پھرتی سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر فوراً بریک لگا کر گاڑی قابو میں کر لی..... شاید گاڑی سے اترنے سے پہلے وہ جلدی میں ہینڈ بریک لگانا بھول گئی تھی یا بچوں نے شرارت میں ہینڈ بریک نیچے کر دی تھی وہ سمجھ نہ پائی۔ خیر اس نازک وقت میں اس خواجہ سرانے رخسانہ کی بروقت مدد کر کے اسے حیران کر دیا بلکہ ارد گرد کے لوگ بھی اس خواجہ سرا کو تحسین کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جبکہ رخسانہ خوف اور شرمندگی سے پسینے، پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے اس بیچارے کا... بے حد شکر یہ ادا کیا۔ خواجہ سرانے اسی مسکینیت سے کہا۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

راہ گم

کبھی زخمی روح پر زخم لگانے اور کبھی معاشرتی ناسوروں پر چیرہ لگانے کے فن سے واقف

آپ کی محبوب قلم کار

ناہید سلطان اختر

قارئین کی دیرینہ خواہش پر

اگست 2015ء کے شمارے میں

آخری صفحات پر جلوہ گر

”مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں کہ بچوں کے پیچھے پیچھے بھاگ سکوں..... جب شادی شدہ ہو تو اپنی ذمے داریاں بھی خود ہی پوری کرو..... جا ب چھوڑ دو اور اپنی میاں کی تنخواہ پر گزارہ کرو اور اپنا گھر سنبھالو..... بھلا تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ انہوں نے صاف کہہ دیا اسے اماں پر سخت غصہ آیا تھا۔

”واہ جی واہ..... آمنہ باجی بہت لاڈلی تھیں ان کے بچے کتنے شوق سے اماں نے سنبھالے، ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے گھر کے بجلی، پانی اور گیس کے بل تو ابو ہی ہمیشہ جمع کرواتے اور اب میری باری آئی تو ان کی صحت جواب دے گئی۔ میں سب سمجھتی ہوں جب سے بھائی صاحب نے امریکا سے انہیں موبائل سیٹ بھیجا ہے۔ بس دن بھر موبائل پر تمام رشتے داروں اور سب سے گپ شب کے علاوہ اور کوئی کام نہیں..... آخر اماں کو بھلا موبائل کی کیا ضرورت تھی۔ گھر میں ٹیلی فون تو تھا

عظیم مبارک کوکچہ

عقیدہ حق

”سائرہ..... سائرہ..... اٹھو سائرہ.....“
 گہری نیند میں اسے سرگوشیاں خواب سی لگیں..... وہ سوئی رہی..... سرگوشیاں، آوازوں میں بدیں اور پھر آوازوں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا..... اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں کہ سارے دن کی تھکن کے بعد چور، چور بدن کے ساتھ بہت مشکل سے تو اسے نیند آئی تھی۔
 جب وہ سوئی تھی تو گھر خالی تھا، گھر میں خاموشی



ہونے کی اجازت چاہی اور پھر اسے اطلاع دی کہ کالج کے باہر گیٹ کے قریب کچھ نوجوان لڑکے خواہ مخواہ منڈلا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موبائل سے لڑکیوں کی تصاویر لینا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً چوکیدار کے ہمراہ کالج سے باہر نکلی جہاں ایک سرسبز گھنے شہوت کے درخت کے نیچے بظاہر بے نیازی سے کچھ لڑکے بیٹھے تھے اسے اور چوکیدار کو دیکھتے ہی لڑکوں نے قلا نہیں بھرس اور یہ جا وہ جا۔ سوائے ایک لڑکے جو شاید موبائل میں پیکس لوڈ کرنے میں اتنا مگن تھا کہ اسے بھاگنے میں دیر ہو گئی۔ وہ لڑکا کچھ جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا۔ چوکیدار نے اسے گردن سے دبوچا اور میڈم رخسانہ کے پاس لے آیا۔ رخسانہ نے اسے غور سے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا یہ تو صبح والا لڑکا تھا جو کچھ دیر پہلے خواجہ سرا کے روپ میں بھیک مانگ رہا تھا اور جس نے اس کی گاڑی کو بروقت بریک لگا کر اس پر اور اس کے بچوں پر احسان کیا تھا۔

”میڈم جی ان لڑکوں کو تو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے، یہ صرف لڑکیوں کے کالج کے آس پاس نہیں منڈلاتے بلکہ خواجہ سرا کے روپ دھار کر دن بھر بھیک بھی مانگتے ہیں۔“ چوکیدار نے غصے سے سرخ ٹماٹر ہو کر تیزی سے کہا۔

”میڈم جی کیا کروں پہلے گھریلو ڈرائیور کے طور پر کام کرتا تھا مگر آج کل بیروزگار ہوں۔ مجبوراً خواجہ سرا کا ججیس بدل کر بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ آخر اپنا اور موبائل کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے نا۔“ لڑکا اس کی بات پر جلدی سے بولا۔ رخسانہ نے تاسف سے سر ہلایا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔

وہ جو کالج لیکچرر کی حیثیت سے اپنی طرف سے نئی نسل کو آگے اور شعور دے رہی تھی مگر اس لڑکے کو جو کبھی خواجہ سرا کا روپ دھارے سامنے آیا تھا، کبھی نوجوان لڑکا بن کر، وہ اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ آخر کہتی بھی تو کیا.....

”کوئی بات نہیں پیاری باجی بس خیرات دے دو۔ اللہ بچوں کو زندگی اور صحت دے۔“ اس نے جھٹ پر سے پانچ سوکانوٹ نکالا اور اس کو پکڑا دیا۔ خواجہ سرا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

رخسانہ نے اللہ کا کروڑ ہا شکر ادا کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنے حواس بحال کرنے لگی پھر بچوں کی طرف دیکھا جو ہر بات سے بے خبر مطمئن بیٹھے تھے۔ اتنے میں اسی دکان سے دکاندار نکلا اور اس کے کاغذات اس کے حوالے کیے جو وہ جلدی میں دکان میں چھوڑ آئی تھی۔ گاڑی کے چکر میں وہ بھول گئی تھی کہ وہ کیا کرنے گاڑی سے دکان پر اتری تھی۔ ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ اس نے کالج پہنچنا تھا۔ حواس بحال کر کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دس پندرہ منٹ میں کالج پہنچ گئی۔ کالج پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے بچے کالج کی بوزھی آیا کے حوالے کیے اور خود اسٹاف روم پہنچی۔ کالج میں ڈسپلن انچارج ہونے کے تاتے وہ طالبات کے ہاتھوں میں موبائل کی موجودگی سے سخت زچ تھی اس بلوٹھ اور gprs نے بچوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کتابوں سے تو دلچسپی ختم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے بجائے معلومات کا ماخذ اب صرف گوگل کو ہی سمجھا جاتا ہے۔
 دراصل کالج میں آج فورتحہ ایئر کی الوداعی پارٹی بھی تھی۔ وہ تو چھٹی کرنا چاہتی تھی مگر ڈسپلن کی انچارج ہونے کی حیثیت سے اسے کالج میں اپنی خصوصی ڈتے داریاں پوری کرنا تھیں۔

آج لڑکیاں رنگے رنگے لباس میں پوری تیاری کے ساتھ تیلیوں کے مانند پورے کالج میں گھوم رہی تھیں۔ الوداعی پارٹی کا انتظام کالج کے گراؤنڈ میں کیا گیا تھا۔ حاضرین کو محفوظ کرنے کے لیے رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیے گئے تھے۔ اس نے اسٹاف روم میں آکر کرسی پر اپنا پرس رکھا اور بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ کالج کے تنومند چوکیدار نے اسٹاف روم میں داخل

تھی، سنا تھا لیکن اس وقت کرا بہت سارے مختلف چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ خوش، ہاش، ہنستے ہنکراتے چہرے، فکر مند چہرے، سوائیہ چہرے، خوشی اور جذبات سے بھرے چہرے۔

اس نے گھبرا کر ایک بار پھر سامنے کھڑی نمرہ بھابی کی طرف دیکھا اور پھر ان کے بولتے چہرے پر سے اس کی نظر پھلتی ہوئی ایک بار پھر ان کی کلائی پر ٹک گئی۔

اور پھر اس کی نظر دیوار پر لگی کلاک پر جم سی گئی..... وہ تقریباً دو گھنٹوں تک سوتی رہی تھی لیکن اس کا نصیب.....

☆☆☆

”ساری زندگی گزر گئی میکے اور سرال والوں کی جوتیاں سیدھی کرتے، کرتے اور ملا کیا، خالی ڈھول۔

ساری زندگی میں تو سب ہی کی سنتی رہی اور مانتی رہی لیکن جب چوڑا سفید ہو گیا تو کبھی میں آیاتہ بی بی..... زندگی اپنی مرضی سے گزارو..... کچھ نہیں ہوتا..... زندگی ان ہی کی گزرتی ہے جو لڑکیاں اپنی من مانی کرتی ہیں۔

ہماری اماں کہتی تھیں جو لڑکیاں میکوں میں عزت سے رہتی ہیں، باپ بھائیوں کی عزتوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں، خاندان کی ناک اونچی رکھنے کے لیے نہ اپنی آواز اونچی کرتی ہیں اور نہ ہی بیروں کی چاپ..... ان کے نصیبے بہت اچھے کھلتے ہیں۔ سو میں بھی ساری زندگی اماں، خالہ اور پھوپھو کے ارشادات گرامی پر عمل کرتی رہی اور ملا کیا.....؟“

”کیا ملا بیگم صاحبہ.....؟“ رخشنده بیگم جیسے ہی سانس لینے کے لیے رکیں تو فیتھ احمد جو کانوں میں تل ڈالے اخبار میں منہ گھسائے بیٹھے تھے ظاہر تو وہ بھی کر رہے تھے جیسے ان کی سانس کی رفتار بھی اس وقت زوجہ محترمہ کے غصے کے ساتھ چل رہی ہے لیکن درحقیقت ان کے غصے کی اصل وجہ جاننے کے باوجود

وہ ان کے غصے کو انجوائے ہی کر رہے تھے۔

”لو وہ پوچھ رہے ہیں کیا ملا.....؟“

”ارے آپ ملے، جو ملتے اور نہ ملتے تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا.....“ رخشنده بیگم ترخیں تو وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

آج نیلو فر کی منگنی ہوئی تھی زبردست افیئر کے بعد..... نہ نیلو فر کے گھر والے راضی اور نہ ہی فراز کے گھر والے راضی تھے لیکن دونوں کی ضد کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے..... سو نیلو فر کا موقف تھا جوڑے آسمانوں پر نہیں زمینوں پر بنتے ہیں جبکہ ردا بعد تھی نہیں جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں لیکن زمین پر ملتے ہیں۔ ردا اور نیلو فر کے ساتھ، ساتھ کچھ دوستیں اور بھی شامل ہو گئیں اور دوستوں کا وہ گروپ جو اتفاق، محبت اور دوستی میں مثالی تھا دو دھڑوں میں بٹ گیا۔

خاموش بیٹھی، ساڑھ کو بھی روانے شامل گفتگو کرنا چاہا جو صرف سن رہی تھی۔

”محترمہ ساڑھ صاحبہ..... آپ کیا فرماتی ہیں اس بارے میں.....؟“ ردا نے ایک، ایک لفظ چباتے ہوئے خاموش بیٹھی ساڑھ کو شامل گفتگو کیا۔

”جوڑے.....“ ساڑھ کے منہ سے آہستگی سے نکلا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے باریک، باریک پیاز کاٹی رہی، یہ پیاز بھی عورتوں کے لیے اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، کتنے آنسو اس پیاز کی آڑ میں عورت بہا لیتی ہے، کتنی دفعہ سرخ، ڈبڈبائی آنکھوں کا عورت ایک ہی جواب دیتی ہے۔

”ابھی پیاز کاٹی ہے۔“

لیکن موسم تو سارے اندر ہوتے ہیں، باہر کے موسم کا دار و مدار اندر کے موسم پر ہوتا ہے۔

اسے آج پیاز کے سہارے کی ضرورت پڑی

اور نہ ہی سرخ آنکھوں کے حوالے سے کوئی جھوٹی دلیل دینی پڑی۔

ساڑھ بھی آج بہت خوش تھی، آج انعم کی چوڑی مہندی آئی تھی اور افطار کے بعد سے انعم کے ساتھ مل کر سب تیاریاں مکمل کرتی تھیں۔

”باجی، آج انعم باجی کی چوڑی، مہندی آرہی ہے ناں؟“ لیکن میں اس کے ساتھ مدد کرتی ملازمہ نذیراں نے پوچھا۔

”ہاں.....“ ساڑھ کا جواب مختصر تھا۔

”باجی چوڑی، مہندی کیا ہوتی ہے؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”جیسے تم لوگ عیدی کہتے ہو، ہم دہلی والے اس رسم کو چوڑی مہندی کہتے ہیں۔ لڑکی کی سرال سے اس کا عید کا جوڑا، چوڑیاں، مہندی اور حیثیت کے مطابق کوئی سونے کی چیز بھی آجاتی ہے، دلہن کے ساتھ، ساتھ خاندان کی تمام لڑکیوں کے لیے بھی چوڑیاں آتی ہیں، بہت خوب صورت رسم ہے مجھے بہت پسند ہے..... اور.....“

”باجی، جی آپ کی تو کبھی چوڑی، مہندی نہیں آئی ناں..... اللہ آپ کا بھی کہیں رشتہ ملے کر دے تو اللہ آپ کی خواہش بھی پوری کرے اور بڑی باجی (رخشنده بیگم) کو بھی اطمینان ہوا۔“ نذیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں کہا تو ساڑھ کا دل چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔

”ارے میں کیا شادی کے لیے مرے جارہی ہوں.....“ لیکن پھر اس بیچاری کی محبت کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے..... وہ خاموش ہو گئی۔

گو کہ عمر کی چھبیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کا مقدر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی، موت، شادی بیاہ رزق سب اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے..... اس کے نصیب میں کون ہے یا وہ کس کی تقدیر میں لکھی ہوئی

عید مبارک

ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن ہاں وہ اس بات پر ایمان رکھتی تھی، ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب چاہے گا..... ان تمام حقیقتوں پر ایمان کی حد تک یقین رکھنے والی وہ تھی ایک تو لڑکی ہی ناں..... ریشم اور شہد سے گندھی، نرم و نازک، حساس دل رکھنے والی ایک لڑکی..... اور لڑکی تو بس لڑکی ہوتی ہے..... ہاں سب لڑکیوں کا دل ایک جیسا ہی تو ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس پھولوں سے ڈھکے چھوٹے سے محبت والا میں دو خاندان آباد تھے۔ نچلے پورشن میں توفیق احمد اور ان کی بیوی رخشنده بیگم رہتے تھے۔ توفیق احمد کے

سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای



ویکری بک شاپ

سپینس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

فون: 04-3961016 فیکس: 3961015
سوائل: 052-9695984
ای میل: welbooks@emirates.net.ae

بخرے بھی لگ رہے تھے۔

”کوئی کچھ نہیں پہن رہا، پہلے کہا تھا دو سال بعد شادی کریں گے اور اب تاریخ کی ضد کر بیٹھے اور تاریخ لے کر ہی غلے.....“ انعم کی نانی جو سب کی اماں جان تھیں نے محبت بھری نگلی کا اظہار کیا۔

رخشندہ بیگم کے دل میں ہوک سی اٹھی.....
”اچھا اماں جان میں سونے کے لیے جا رہی ہوں، اللہ سب کام خیر و خوبی سے کروائے..... سائرہ تم بھی جلدی نیچے آ جانا پھر سحری میں اٹھتے وقت تنگ کرتی ہو۔“ رخشندہ بیگم نے دل میں اٹھتی نہیں کو دباتے ہوئے پرسکون کچھ میں سب سے اجازت طلب کی اور کھڑی ہو گئیں۔

”میرے اللہ کوئی ایسا معجزہ کر دے، میری بیٹی، انعم سے پہلے بیاہ دی جائے..... بس اللہ میاں، میری یہ خواہش پوری کر دے، انعم تو بہت چھوٹی ہے۔“
ایک ممتا کی فریاد کا تب تقدیر نے بہت غور سے سنی..... اور معجزے تو ہر دور میں ہوتے ہیں ناں.....

☆☆☆

سارے گھر میں سکوت طاری تھا، رخشندہ بیگم کے کمرے کے دروازے کی جھری سے آتی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جاگ رہی ہیں۔ ہاتھ میں لفافہ لیے جاگ تو وہ بھی رہی تھی.....

زندگی میں پہلی بار اس کا دل، اس کی آنکھ اس تحریر کی سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کارڈ پر لکھا نام مٹ جائے.....

کارڈ پر لکھا جملہ اس کی مرضی کے مطابق تبدیل ہو جائے لیکن انسان کی مرضی اور خواہش کا تب تقدیر کی رضا کی محتاج ہوتی ہے اور کا تب تقدیر کی رضا..... کون جان سکتا تھا۔

☆☆☆

”جی کیا فرمایا آپ نے، میں اندر جا کر کیا کہوں؟“ وہ دروازے پر کھڑی اس کے جیلے پر

☆☆☆

بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں لیکن بہت سی مائیں انہیں بوجھ بنا دیتی ہیں..... شادی کے علاوہ بھی لڑکیوں کی بہت سی خواہشات اور ارمان ہوتے ہیں، کاش وہ مائیں سمجھ جائیں جو بیٹیوں کی شادی کو زندگی و موت کا مسئلہ بنا دیتی ہیں..... اور رخشندہ بیگم..... رخشندہ بیگم کا بس نہیں چلتا تھا کہ سائرہ کی شادی کے لیے اقوام متحدہ میں قرار داد پیش کر دیں..... ہر اس شامیانیے میں آگ لگا دیں جہاں بیٹیوں کا دل نہیں ہو.....

کبھی کبھی چپ چاپ بیٹھی رخشندہ بیگم سے کوئی سوال کرتا۔ ”کیا چھبیس سال اتنی بڑی عمر ہے؟“ تو ان کے اندر بیٹھی ایک عورت جو ماں نہیں ہے وہ سمجھداری سے کہتی ”نہیں.....“ لیکن ان کے اندر فوراً ارمانوں، خواہشوں سے لذی پھندی ماں کہتی۔ ”لڑکیوں کی چھبیس سال عمر، کوئی عمر نہیں ہوتی لیکن ”بیٹی“ کی عمر بہت بڑی ہوتی ہے۔“ اور سائرہ تو ان کی بیٹی تھی ناں.....

☆☆☆

”چچی جان دیکھیے تو سہی یہ دو پٹا کس قدر خوب صورت ہے، یہ تو انعم پر بہت ہی اچھا لگے گا۔“ سائرہ نے ملٹی شیڈ نسلی اور دیکے کے کام کا دو پٹا پھیلاتے ہوئے رقیہ خاتون سے کہا۔

”ہاں ماشاء اللہ سارا ہی سامان بہت اعلیٰ اور نفیس ہے۔“ کمرے میں موجود چند خواتین میں سے ایک خاتون بولیں جو غالباً رقیہ خاتون کی کالج کے زمانے کی دوست تھیں اور آج کل امریکا سے آئی ہوئی تھیں۔

”میں عید پر پہن لوں امی؟“ انعم نے لپچائی نظروں سے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ لڑکے والے جاچکے تھے اور اب سامان سلیقے سے رکھنے کے ساتھ، ساتھ قریبی عزیزوں کے حصے

تف ہے شادی نہ ہوئی، پاکستان میں لوڈ شیڈنگ کا مسئلہ ہو گیا..... جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا..... بجلی آرہی ہو جب بھی لوگ بجلی..... بجلی کر رہے ہوتے ہیں اور سب جانتے ہیں بجلی کا جب دل چاہے گا جائے گی اور جب دل چاہے گا آئے گی.....“ سائرہ نے جلدی، جلدی جگ کے ٹھنڈے پانی میں اور نچ ٹینگ گھولتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

اس کی اکلوتی بھابی میکے گئی ہوئی تھیں اور اسے آج اکیلے ہی سب سینٹا تھا اور وہ خاصی کام کا جو سلیقہ مند لڑکی تھی اس بات میں کوئی شک نہیں تھا.....

☆☆☆

رخشندہ بیگم کو سائرہ کی شادی کا بڑا ارمان تھا..... ایسا لگتا تھا جس دن سائرہ پیدا ہوئی تھی انہوں نے اس دن اس کے جینز کا صندوق خرید لیا تھا..... جو اب ان کے ارمانوں سے زیادہ اہل رہا تھا۔ رخشندہ سولہ سال کی عمر میں بیاہ کر توفیق احمد کے گھر میں پائل چھنکاتی پھرتی تھیں..... نرم و نازک، نیلی آنکھوں والی سائرہ کو دیکھ کر وہ سوچتیں کہ ان کی بیٹی اتنی حسین ہے کہ شاید بائبل کی دہلیز پر سولہ سال بھی پورے نہ کر پائے..... لیکن بیٹی کے چہرے کو دیکھ کر شاید وہ بھول گئی تھیں شادی بیاہ صورت شکل سے نہیں بلکہ نصیبوں سے ہوتے ہیں۔

سائرہ کا بیاہ سولہ سال کی عمر میں تو نہ ہو سکا لیکن وہ سولہ جماعتیں ضرور پڑھ گئی۔

”اماں..... ابا جلدی سے آ جائیں افطار میں بس چند منٹ رہتے ہیں۔“ دسترخوان پر سموسوں کی پلیٹ سجاتے ہوئے سائرہ نے صحن میں بیٹھے اماں، ابا کو آواز دی۔ اماں کے ماتھے کے بل بتا رہے تھے کہ موڈ قطعاً بحال نہیں ہوا۔

”ہائے میری پیاری اماں، مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔“ سائرہ نے ان کے غصے کو ایک مثبت پہلو سے سوچا.....

دو بیچے تھے بڑے بیٹے جاوید احمد، ایم بی اے کر کے ایک ملٹی میشل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے جبکہ بیٹی سائرہ زولوجی میں ایم فل کر رہی تھی۔

اوپر والے پورشن میں توفیق احمد کے چھوٹے بھائی راحت علی ان کی بیگم رقیہ اپنی چار بیٹیوں کے ساتھ رہے تھے..... راحت علی کی چاروں بیٹیاں درمیانی صورت شکل کی تھیں لیکن قسمت ایسی کہ بیس واں لگا نہیں اور سسرال سدھاریں اور اب سب سے چھوٹی بیٹی انعم بی ایس سی کی طالبہ ہی تھی کہ اس کی مگنٹی بھی ہو گئی۔

گوکہ رخشندہ بیگم اور رقیہ خاتون میں کبھی جھیشانی اور دیورانی والے روایتی معاملات نہیں رہے..... دونوں کا بہنا پامشہور تھا لیکن اب رخشندہ بیگم کے دل نے رقیہ خاتون سے خود ساختہ ناراضی باندھ لی ان کی سوچ تھی کہ انہوں نے کبھی سائرہ اور ان کی بیٹیوں میں فرق نہ سمجھا اور نہ کبھی کہا..... لیکن رشتے طے کرتے وقت رقیہ بیگم ڈنڈی مار گئیں..... اور انہوں نے سائرہ کی فکر نہیں کی۔

جبکہ رقیہ بیگم، درحقیقت سائرہ کو بے حد پسند کرتی تھیں اور اس کے لیے بہت کوشش بھی کرتی تھیں..... لیکن قسمت.....

☆☆☆

”شام کو اوپر چلنا ہے.....“ توفیق احمد نے رخشندہ بیگم سے کہا۔

”ارے میرا بس چلے تو بالکل ہی اوپر چلی جاؤں، میرا دل نہیں چاہ رہا..... میں نہیں جاؤں گی ویسے بھی آپ کی بیٹی منہ میں کھجور رکھتے ہی اوپر دوڑے گی..... سمجھاتے، سمجھاتے تھک گئی لیکن ہماری بیٹی..... ہماری بیٹی کو تو کسی کے چہرے پر ماسک ہی نظر نہیں آتا۔“

”تو بہ ہے اماں کی بدگمانیاں.....“ سائرہ کا دل برا ہوا۔

”اس قدر تو چچی جان مجھ سے محبت کرتی ہیں،

حیرانی سے دوبارہ پوچھ بیٹھی۔

چھ فٹ سے لگتا قد، کھلتا ہوا صاف رنگ، بڑی بڑی گہری کچھ بولتی شرارتی مسکراتی حسین آنکھیں..... آنکھوں سے مطابقت رکھتے گہرے براؤن بال، استیوں کے کف چڑھائے، بالوں سے ڈھکی مردانہ کلاٹیاں، کھلے گریبان سے جھلکتا چوڑا سینہ اور سینے پر جھولتی خوب صورت سونے کی چین..... یہ انسان ہے یا یونانی کہانیوں کا کوئی دیوتا..... سیاہ شلوار، قمیص میں ڈھکے سجے اس کے وجود سے ہوتی ساڑھ کی نظریا پشاور پشاور چیلوں میں بند اس کے حسین، گداز، سفید پیروں پر جیسے گڑھی گئیں۔

”محترمہ اگر آپ میرا جائزہ لے چکی ہوں تو میں آپ کی بات کا جواب دے دوں۔“ اس نوجوان نے اس کی چوری کو نہ صرف پکڑا بلکہ بتایا بھی۔ ساڑھ کو ایک عجیب سی شرمندگی نے آگھیرا.....

”لعت ہو ساڑھ..... ایسی بھی کیا بے خودی.....“ دماغ نے جھڑکا لیکن دل.....؟

”ہاں تو محترمہ آپ اندر جا کر کہیے کہ جن خاتون کا بیٹا سب سے زیادہ خوب صورت ہے وہ آجائیں کہ ان کا بیٹا نہیں لینے آیا ہے۔“

اور ساڑھ نے یہ کہہ بھی دیا تھا پھر واقعی اس کے جملے پر رقیہ خاتون کی سبکی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

”یا اللہ تجھ سے زیادہ دلوں کے بھید کون جانتا ہے، میں نصیب پر صابر اور شاکر رہنے والی لڑکی ہوں..... بچپن سے لے کر آج تک میں نے کبھی ضد نہیں کی..... کیونکہ مجھے تیری رحمت پر ایمان ہے.....

لیکن اللہ میاں جی آدمی اپنے پیاروں سے دینے والوں سے ہی تو ضد کرتا ہے ناں..... میرے اللہ مجھے بھی..... میرے نصیب میں حیدر کو لکھ دے..... اللہ میاں آپ کے لیے کون سی بات بڑی ہے، تقدیر کا قلم تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ

میاں، میری دعائیں سن لے.....“ وہ بہت جذب کے عالم میں موجود تھی۔ اس کی آنکھ سے چند آنسو اس کے چہرے پر سے ہوتے ہوئے اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

”جی امریکا میں رہتی ہیں، حیدر کمپیوٹر انجینئر ہے، جی بچپن ہی سے رشتہ طے ہے اب نکاح کرنے آئے ہیں تاکہ لڑکی کے پیپر تیار ہو سکیں۔“ رقیہ خاتون نے رخشدہ بیگم کے سوالوں کا جواب دیا.....

”تو تم ساڑھ کے لیے کوشش کرتیں.....“

رخشدہ بیگم کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”ارے بھابی، ساڑھ میری اپنی بچی ہے، یقین چاہیں اگر کوئی میرا بیٹا ہوتا تو میں ساڑھ کو کہیں جانے تھوڑی دیتی..... لیکن حیدر کا رشتہ بچپن ہی سے اس کی خالہ زاد کے ساتھ طے ہے جبکہ شہلا (حیدر کی ماں) کے میاں کی اس کے بہنوئی سے ذرا نہیں بنتی لیکن اس کے باوجود شہلا اور اس کی بہنیں اس رشتے کو گھسیٹ رہے ہیں.....“

پھر رخشدہ بیگم چپ ہو گئیں، جب سے انہوں نے حیدر کو دیکھا انہیں لگا ان کی پرپوں جیسی بیٹی کے لیے ایسا ہی لڑکا ہونا چاہیے اور زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں ساڑھ کے چہرے پر بھی ایک خواہش لکھی نظر آئی..... جو صرف ایک ماں ہی پڑھ سکتی ہے.....

اور رخشدہ بیگم نہ صرف پڑھ رہی تھیں بلکہ ساڑھ کے حق میں اللہ کے بہترین فیصلے کی دعا بھی کر رہی تھیں.....

☆☆☆

ساڑھ وہ لڑکی تھی جس نے اپنے اندر اٹھتے کسی غیر مرد کی محبت یا پسندیدگی کے جذبے کو ہمیشہ پکلا لیکن حیدر وہ سارے ارادے توڑتا اس کے اندر براجمان ہو گیا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار وہ مرد پسند آیا جس کی

زندگی میں وہ کہیں نہیں تھی لیکن کیا واقعی، ساڑھ، حیدر کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔

☆☆☆

”میں تم سے بات کر رہی ہوں اور تم..... تم نہ جانے کہاں گم ہو۔“ میریٹ کے بیخ بستہ ماحول میں بوبی نے غصے سے کہا..... سیدھی سادی شلوار قمیص پر، سینے پر بڑا سا دوپٹا پھیلائے..... کمر پر جھولتی لمبی چوٹی سے نکلتی شریر لٹوں کو بار بار باربے دردی سے کانوں کے پیچھے اڑتی، آنکھوں میں حیرت لیے دروازے کے پٹ کو تھامے سوال کرتی حیران حیران سی مسکراتی وہ لڑکی، جس کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا اسے سونے نہیں دے رہی تھی..... اور اس کا تو آج کل وہ حال تھا بقول مومن.....

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

گہرے نیلے رنگ کی کھلے گریبان کی ٹاپ اور

جنیز layers میں کٹے بال اور خوب صورتی سے

کئے گئے میک میں وہ اچھی لگ رہی تھی..... اور چند

دن پہلے تک بوبی اسے بہت خوب صورت لگتی تھی اور

آج صرف اچھی لگ رہی تھی۔

وہ تیزی سے بدلتی اپنی ٹینگو پر حیران تھا۔

”حیدر..... میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں۔“

بوبی نے اپنی خوب صورت سی ناک سکڑی۔

”سن رہا ہوں یار..... سن رہا ہوں لیکن یہ

حقیقت ہے کہ تم الجھتی بہت ہو.....“

”تم کیسے مدلل کلاس مردوں جیسا بی ہو کرنے

لگے ہو حیدر، میں چند دن سے نوٹ کر رہی ہوں.....

جیسے آج تمہیں میری شرٹ کی فننگ پر اعتراض ہو رہا

ہے اور..... remember یہ شرٹ تم ہی نے بھیجی

تھی۔“ بوبی کو ابھی تک اس بات پر غصہ تھا کہ اس کی

تعریف کرنے کے بجائے حیدر نے اس کی تیاری پر

آج زندگی میں پہلی بار اعتراض کیا.....

کاہل

دیکھو میری آنکھ کا کاہل
بھگ رہا ہے کیسے ہل ہل
دیکھو میری ذات سندر
جس کا نہ ہے کوئی ساحل
دیکھو میرا صحرا جیون
جس میں سایہ نہ ہی بادل
دیکھو ہم تو ایک ازل سے
دور ہوا کیوں میرا سانول
یاد ہے پورے چاند کی شب تھی
میں اور تم، اور پاگل سا دل
دیکھو زیست کا عنوان تم ہو
تم بن ہے یہ زیست لا حاصل
شاعرہ: غل شاہین، رحیم یار خان

نظم

ماں مجھے نیند کیوں نہیں آتی

یک دم اک دلقریب مدھری آواز

جیسے کلیوں کے پختے کی صدا

پتے جھرنوں کی صدا

میری سماعتوں کو چھونے لگی

لوری ستانی، سہلائی اور گد گداتی

میں نے چونک کر آنکھ کھولی تو رو رو ماں کو پایا

مسکراتی ہنستی ہوئی، تہقہ لگاتی فرما رہی تھی

میں تیرے پہلو میں ہوں..... تیری سوچ اور

خیالوں میں بھی

میری بانہوں کے جھولے میں، سرود محرتک سو جاؤ

میری رانی، میری جانی

آج بھی تاریک راتوں میں

تاروں اور چاند کی گھاتوں میں

اپنے تصور میں جب ماں کی رفاقت کو پاتی ہوں

تو پل میں میٹھی نیند میں چلی جاتی ہوں

شاعرہ: رفاقت جاوید، اسلام آباد

ہر مرد اندر سے کنز روٹھ ہی ہوتا ہے وہ لاکھ عشق چلائے، منہ مارتا پھرے لیکن بیوی اسے ڈھکی چھپی ہی اچھی لگتی ہے..... وہ لاکھ فائیو اشار ہوٹل میں کھانا کھائے لیکن کچن میں دال کو بگھارتی، توے پر روٹی سینکتی عورت ہی مرد کو اچھی لگتی ہے..... کیونکہ اس دال روٹی میں اس کی محبت..... اس کا خلوص اور وقاشاں ہوتی ہے۔

مرد لاکھ حسن پرست ہو لیکن اسے اپنے لیے وہ عورت جو صرف اس کے لیے جتی، سنورتی ہو..... وہی اچھی لگتی ہے۔ یوپی مسلسل بول رہی تھی اور حیدر..... حیدر جو ایک ماڈرن لڑکا تھا اس کا دل معجزاتی طور پر بدل رہا تھا۔

☆☆☆

”تم بھی چلو ساڑھ، انہوں نے بہت محبت اور تاکید سے بلایا ہے۔“
”نہیں اماں میں بہت تھک گئی ہوں، سارا دن کام کرتے، کرتے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔ آپ بھابی کو لے جائیں پھر چچا جان کی بھی تو پوری فیملی جارہی ہے۔“

”ہاں، ہاں نمبرہ بھی جارہی ہے۔“ رخشدہ بیگم نے اپنی اکلوتی بہو کے حوالے سے کہا۔
آج عید تھی اور اتفاقاً چاند تیس کا ہو گیا تو عین عید والے دن بارات ٹھہری سو سب حیدر کی بارات کے ساتھ جارہے تھے اور پھر سب کے اصرار کے باوجود وہ نہ جاسکی..... کہ وہ حساس دل رکھنے والی ایک لڑکی تھی۔

ہوسکتا ہے وہ حیدر کو یاد بھی نہ ہو..... وہ بھول چکا ہو کہ ان چند دنوں میں اس پتھر جیسی لڑکی کے وجود میں اس کی محبتوں نے دراڑیں ڈال دیں۔
وہ حیدر کی شادی میں شریک ہو نہیں سکتی تھی، اسے اندھی محبت ہوئی تھی، بکیوں میں سردیے وہ اس شخص کے لیے رو رہی تھی۔ اللہ سے اسے مانگ رہی تھی۔

وہ اس سے مانگ رہی تھی جسے پھیلے ہوئے ہاتھ پسند ہیں اور وہ پھیلے ہوئے ہاتھ بھرتا ہے.....
وہ اسے مانگ رہی تھی جسے اس نے دوبارہ دیکھا تک نہیں تھی..... لیکن اس سے محبت کی دعویدار تھی..... وہ اس کی محبت کی اس کی رفاقت کی طلبگار تھی۔
وہ سجدے میں اپنی بے نام کیفیت پر رو رہی تھی اور کاتب تقدیر اس کے آنسوؤں پر ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ سب کیا ہے بھابی.....“ سب کمرے سے باہر جا چکے تھے اور نمبرہ اسے ہاتھ روم کی طرف دھکیل رہی تھی اور انعم جلدی، جلدی سرخ حسین دیکے، سلمی اور نگینے سے سجا گئی غرارہ سوٹ استری کر رہی تھی۔

”آپ کی آج بارات ہے، ابھی اسی وقت آپ کی رخصتی ہے، جتنی دیر کریں گی، آپ کا اپنا ذاتی نقصان ہے لہذا فوراً ہاتھ روم میں گھس جائیں اور پانچ منٹ میں شاہور لے کر باہر آ جائیں۔“
”رخصتی ہے..... مگر کیسے؟ اور کس کے ساتھ.....؟“ ساڑھ سراپا سوال تھی۔

☆☆☆

”ارے بس بات تو کچھ بھی نہیں تھی حیدر میاں امریکا میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، بچپن کی منگنی تھی، عین نکاح کے وقت حیدر میاں نے شرط رکھ دی کہ لڑکی کو وہ برقع اڑھائیں گے گو کہ بات معمولی تھی لیکن بہت بڑھ گئی..... نہ حیدر میاں اپنی بات سے ہٹنے کے لیے تیار اور بھی لڑکی کا باپ بھی بہت ضدی آدمی تھا۔

سو بارات لوٹا دی گئی..... شہلا بیگم کہتی تھیں، بغیر دلہن کے گھر جاؤں گی تو بہت مسکی ہوگی..... میں تو چپ چاپ بیٹھی سب دیکھ رہی تھی میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... حیدر میاں خود..... ہاں، ہاں خود میرے پاس چل کر آئے اور مجھ سے ساڑھ کو مانگا.....

سو بس حیدر میاں کے منہ سے نکلنا تھا کہ سب

ہی میرے اور ساڑھ کے ابا کے پیچھے پڑ گئے..... اور ہاں کروا کر ہی چھوڑی..... ہاں بس ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ لڑکیاں، بالیاں ساڑھ کو تیار کر رہی ہیں، پوری بارات گھر میں بیٹھی ہے، میرے تو ہاتھ بھر پھولے جارہے ہیں، تم بس فوراً چلی آؤ..... ہاں..... ہاں رخصت انجمنی کر رہی ہوں..... جہیز انشاء اللہ دو دن بعد بھیجوں گی..... بس جلدی چلی آؤ اور بڑے بھیا کو بھی کہہ دو ان کا فون نہیں مل رہا۔“ رخشدہ بیگم نے ساری تفصیل اپنی چھوٹی بہن کو فون پر بتائی۔

☆☆☆

”مبارک ہو..... لو بھیجی..... عید ہو تو ایسی.....“

نمبرہ نے جی سنوری، حیدر کے پہلو میں بیٹھی، ساڑھ کو اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچے ہوئے نکاح کی مبارک باد دے دی.....

”اور یہ مٹھائی بھی کھاؤ..... جو نماز کے بعد جب ابالائے تو آپ نے یہ کہہ کر مٹھائی واپس رکھ دی کہ اس عید پر مٹھائی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا..... اور اب.....؟“ انعم نے ہنستے ہوئے برنی کا نکلنا از بردستی ساڑھ کے منہ میں ٹھونسا.....

”اور اب، اب تو دل چاہ رہا ہے، ساری مٹھائی میں ہی کھا جاؤں۔ شاید آج شہر میں ساری مٹھائی میری خوشیوں کے لیے بنائی گئی اور خریدی گئی.....“ ساڑھ کے دل نے گواہی دی۔

حیدر نے محبت سے پہلو میں بیٹھی اپنی رفیقہ حیات ساڑھ کا محبت سے ہاتھ تھام لیا، جس کے لیے زندگی میں شاید پہلی بار اس نے سجدے میں گر کر اللہ سے معجزے کی التجا کی.....

ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے، دولہا، دلہن بنے دونوں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دوسرے سے کوئی عہد و پیمان کیے بغیر دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا..... کوئی جانے یا نہ جانے لیکن آسمان کی

وسعتوں میں بیٹھا کاتب تقدیر بخوبی جانتا تھا۔
”میں نے صحیح کہا ناں ردا کہ جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں اور معجزے بھی اس دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔ بغض اوقات ہم کسی سے ملتے ہیں اور اس کو طلب کر بیٹھتے ہیں، وہ ہم کو آسمان والے کی رحمت سے ملتا ہے اور ہم کفر بولنے لگتے ہیں کہ ہم نے چاہا، ہم نے پالیا اور جوڑے زمین پر ہی بنتے ہیں، نہیں، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں، جس نے میری دعا سنی، جس نے میری طلب کو میری تقدیر میں لکھ دیا۔ افسانے ناول پڑھ کر میں کتنا ہنستی تھی کہ زندگی میں ایسا کہیں کچھ نہیں ہوتا لیکن ہوتا ہے۔“ آدھی رات کو بستر سے سوتے، سوتے اٹھ کر دلہن بنی ساڑھ نے کن اکھیوں سے ہنستے مسکراتے ہوئے انعم کی چھیڑ خانوں کا جواب دیتے، گھونٹ کی آڑ سے نظر آتے حیدر کو دیکھتے ہوئے پیسے اپنے آپ سے کہا اور سر جھکا کر مسکرا دی۔

☆☆☆

رخشدہ بیگم نے جی سنوری مطمئن خوش، حیدر کے پہلو میں بیٹھی بیٹی کو دیکھا.....

”واقعی شریف لڑکیوں کے نصیب سرخ ریشمی رومال میں لکھے ہوتے ہیں، شریف، صابر اور با حیا لڑکی کا نصیب قابل دید ہوتا ہے اور ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اللہ تو اتنا بڑا منصف ہے کہ میرے بدگمان دل کو صاف کرنے کے لیے رشتہ بھی رقیہ کے توسط سے جوڑا۔ میرے مالک مجھے معاف کر دے، میں بہت ناشکری اور بدگمان ہو گئی تھی۔“
رخشدہ بیگم نے اپنے آپ کو سرزنش کی..... رات کے ڈھائی بج رہے تھے، شہلا رخصتی کا شور مچا رہی تھیں۔ ہر طرف خوشیاں تھیں، تہنقبے تھے، مسکراہٹیں تھیں اور رخشدہ بیگم بے ساختہ رقیہ بیگم کو سینے سے لگا کر کہہ رہی تھیں..... عید مبارک.....





زندگی خاک تھی؟

شیریں حیدر

دوسرا حصہ



میری جگہ کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تو عمر کی تپسی پر رکھی ہوتی انگوٹھی اور ریوالور میں سے ریوالور نہ اٹھاتی..... میں عمر کی محبت کی شدت سے متاثر صرف متاثر ہی نہیں ہوتی بلکہ ڈر گئی تھی، ان کی اتنے دھڑلے اور دھونس کی محبت کا اور بھلا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا..... مجھے عمر کے جذبولوں کی سچائی کو مانتا پڑا..... اس کے بعد کا مرحلہ سب سے اہم تھا یعنی اس بات کا انکشاف میرے باپا اور ماما کے سامنے کرنا اور انہیں منانا۔ عمر کو اپنے



جذبوں کی صداقت پر یقین تھا اور وہ کہتے تھے کہ میری رضا کو اپنی رضا میں شامل کرنا ان کے لیے مشکل ترین مرحلہ تھا، میرے ماں باپ کو وہ اسی طرح متاثر نہیں جس طرح وہ اپنی اماں سے بحث و محبت کر کے انہیں متاثر کرتے تھے..... جانے کہاں، کہاں سے رابطے ڈھونڈ نکال کر انہوں نے میرے باپ کو کھلوا دیا اور اپنے لیے بات کرنے کی راہ ہموار کی۔

کاروباری حلقوں میں اگر باپ کا بڑا نام تھا تو عمر بھی کچھ کم نہ تھی، وہ تو جیمبر آف کامرس کے صدر بھی تھے اور اتنی ہی عمر میں ان کی کامیابیاں کاروباری حلقوں میں بہت رشک سے دیکھی جاتی تھیں۔ عمر نے اپنے انہی دوستوں اور کاروباری حلقوں کے روابط کو استعمال کیا تھا اور باپ تک اپنا مسئلہ ان دوستوں کے ذریعے پہنچایا تھا۔ باپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ شاید وہ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں مگر میرا عندیہ دریافت کیا تو میں نے اپنی رضامندی دے کر ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا تھا۔ یہ شہر کی ایک بڑی کاروباری شادی تھی۔ دو بڑے بزنس ٹائیکون آپس میں نئے رشتے میں بندھ رہے تھے، برسوں تک لوگوں نے اس شادی کو یاد رکھا تھا، سسرال میں بھی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

عمر سے میری بات طے ہونے اور ہماری شادی کے درمیان بہت تھوڑا عرصہ تھا، میری رخصتی سے پہلے ہی عمر نے اماں کے کہنے پر علیہ کو فارغ کر دیا تھا، انہوں نے عمر سے کہا تھا کہ علیہ اس گھر میں یوں بھی فالتو سامان کی طرح پڑی رہتی تھی، عمر کی نئی شادی کے بعد اس کی حیثیت اور بھی کم تر ہو جاتی، عمر شرعی طور پر دو شادیاں تو کر سکتے تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھے کہ دو بیویوں کے ساتھ ایک سا سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس نا انصافی کے لیے انہیں اللہ کے روبرو جواب دہ ہونا ہو گا اس لیے بہتر ہے کہ علیہ کو اس کی زندگی اپنے ڈھب سے چھینے کا اختیار دیا جائے۔ ماں تھی ناں۔ قطعاً نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا آخرت

میں بھی اپنے کسی کیسے کے ہاتھوں خدا کے حضور شرمندہ کھڑا ہو۔ ہماری شادی کے چند ماہ کے بعد علیہ کی اپنے خاندان میں ہی ایک امیر رنڈو سے شادی ہو گئی تھی، بچے پہلے ہر ہفتے ماں سے ملنے جاتے تھے مگر آہستہ، آہستہ اس میں وقفہ بڑھنے لگا تھا، ہفتے، مہینے میں اور مہینہ کئی مہینوں میں بدل گیا۔

شادی کی پہلی رات ہی عمر نے اپنی وارثگیوں کے اظہار کے ساتھ مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے ان کی ہم سفر اور ہموار بن کر رہنا ہے اور مزید بچوں کی خواہش نہیں کرنی، ان کے علیہ سے چار بچے تھے اور اسی گھر میں رہتے تھے، بڑی بیٹی ہادیہ جسے سب بلی کہتے تھے اور اس کے بعد تین بیٹے..... سکندر، حاشر اور خضر تھے، خضر سب سے چھوٹا بھی ہماری شادی کے وقت پانچ برس کا تھا، مزید بچوں کی خواہش نہ تھی۔ اس وقت تو میں بھی عمر کے اس حصے میں تھی کہ ایک پیار کرنے والا جیون ساتھی پا کر یہ کچھ بیٹھی تھی کہ دنیا میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی..... اس لیے عمر کا مطالبہ مجھے نہ اتنا اہم لگا اور نہ ہی بے جا۔

محبت کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا، عمر نے کوئی خواہش میرے منہ سے نکلنے دی نہ دل میں پنپنے، اس سے پہلے ہی سب کچھ میرے قدموں میں ڈھیر کر دیتے تھے، کوئی عورت اور کیا خواہش کر سکتی ہے..... انہیں محبت کے سارے ڈھنگ آتے تھے۔ جو مجھ سے کوئی پوچھتا کہ میری کوئی ادھوری خواہش تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا، دنیا کی کون سی خوب صورت جگہ ہے جہاں عمر مجھے لے کر نہیں گئے..... رانیہ کے بیٹے مصطفیٰ کی پیمپروں کی سرجری تھی تو وہ مجھے اپنے ساتھ کینیڈا لے کر گئے، جب تک رانیہ ہسپتال میں رہی ہم دونوں ایک ہوٹل میں رہے، دن بھر میں رانیہ کے ساتھ وقت گزارتی اور رات کو ہم واپس لوٹ آتے..... مصطفیٰ ہسپتال سے فارغ ہوا تو ہم سیر و تفریح کے لیے نکلے اور کئی ملکوں سے گھومتے گھاتے واپس وطن لوٹے تھے۔

میری بہنوں کی شادیوں پر عمر نے بڑے بھائی کی کمی پوری کر دی، باپا کے ساتھ وہ ہر کام میں پیش پیش ہوتے بلکہ باپا کو آرام کرنے کا کہتے اور خود کام کرتے۔ ماما اور باپا کو اپنے فیصلے پر اگر کوئی کسک تھی تو عمر کے روپے نے انہیں سب کچھ بھلا دیا۔ میں خوش تھی، عمر میری... خوشی کا خیال کرتے تھے تو بدلے میں مجھے ان کا، ان کی اماں کا اور ان کے بچوں کا خیال رکھنا تھا۔ بچوں سے میری دوستی ہو گئی تھی، عمر نے ہماری شادی سے قبل اپنے بچوں کو بھی اعتماد میں لیا تھا..... عمروں میں کم عمر ماں باپ کے حالات کی وجہ سے وقت نے انہیں پہلے ہی سمجھدار بنا دیا تھا اور میں نے بھی ان سے کبھی سوتیلی ماں کی طرح برتاؤ نہیں کیا تھا بلکہ مجھے ان پر ترس آتا تھا کہ ماں اور باپ دونوں نے دوسری، دوسری شادی کر لی تھی، انہیں پیار کی ضرورت تھی۔ میں ماں نہیں بنی تھی مگر میرے اندر ماما تو تھی سو میں ان پر لٹاتی۔

میری ساس بھی مجھ سے خوش تھیں۔ ساس بہو کے مسائل وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں غالباً مالی مسائل ہوتے ہوں گے، اس گھر میں ہر چیز واقف تھی اس لیے کسی کو کسی سے بغض تھا نہ اختلاف۔ ماں گھر میں اگر علیہ بھی ہوتی تو چاہے وہ گھر میں کسی فالتو چیز کی طرح پڑی ہوتی مگر اس کا وجود غالباً مجھے مانند خار نکلتا رہتا کہ بچوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت تو بہر طور قائم رہتی اور بچوں کی زندگیوں کے بارے میں فیصلے کرتے وقت اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ عمر نے زندگی کو بہت اعتدال میں رکھا تھا، ماں کی رضا سے خاندان میں شادی کر کے اولاد بھی پیدا کر لی تھی اور بعد میں ان کی رضا حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لی تھی جس سے ان کے اپنے دل کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی اور ان کے بچوں کو ایک پڑھی لکھی ماں مل گئی تھی۔

ماما ان دنوں صدف کی اچانک طے پا جانے والی شادی کے لیے پریشان ہو رہی تھیں تو میں ان کی مدد کے خیال سے وہاں چلی گئی۔ تانیہ خالہ بھی ملتان

انجنگی خالہ نہ تھی

سے آئی ہوئی تھیں، میری اور خالہ کی عمروں میں چند ایک سال کا تفاوت ہی تھا، ماما سب سے بڑی بہن تھیں پھر چار بھائیوں کے بعد تانیہ خالہ اس وقت پیدا ہوئیں جب ماما جوان ہو چکی تھیں اور ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی..... ماما نے تانیہ خالہ کو اس طرح پیار دیا اور پالا تھا جیسے وہ ان کی بیٹی ہوں۔ خالہ اور میں نے مل کر صدف کی شادی کی تیاری کے سلسلے میں ماما کی مدد کی تھی۔ باپا کاروباری سلسلے میں ملتان گئے تھے تو واپسی پر خالہ کو لے آئے تھے..... ماما کے لیے کام ڈھیروں کام تھا، رانیہ پاکستان نہیں آ سکتی تھی، صدف اپنے ویزے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہی تھی اور فاطش اپنی پڑھائی میں مصروف.....

پڑھائی میں مصروف فاطش کی کتابوں اور کاپیوں کے سچ..... سارا دن اس کے موبائل بریک، تک کی آواز آتی رہتی، میں نے اس سے پوچھا بھی مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ہم نے تو اپنی زندگی ماں باپ سے ڈر کر، ان کے احترام میں اور ان کی عزت کا پاس کرنے میں گزار دی تھی مگر اب یہ موبائل ٹیلی فون جانے کس طرح کاروگ ہے جو ہماری پوری نسل کو برباد کر رہا ہے۔

”اپنی دوستوں سے پڑھائی کے سلسلے میں ہی دن بھر کچھ نہ کچھ پوچھنا پڑتا ہے یا، تم کیوں پریشان ہوتی ہو.....“ اس نے مجھے بہلا دیا مگر میں اس کے بدلے انداز دیکھ رہی تھی۔ میری اور رانیہ کی شادیوں کی نسبت، صدف کی شادی تو بالکل سادگی سے ہوئی تھی، اس کا لندن میں داخلہ ہو گیا تھا جہاں ماما بالخصوص اسے تنہا نہیں بھیجتا چاہتی تھیں، احمد سے اس کی منگنی تو بہت سال پہلے ہو چکی تھی، دونوں کزن ہی نہیں، نکاس فیلو بھی تھے سو فوراً نکاح اور رخصتی کا پلان بنا اور نکاح کی تقریب کے تین دن کے بعد وہ دونوں لندن روانہ ہوئے۔ میں نے اس دوران فاطش کا عجیب و غریب سا رویہ دیکھا، باپا کے ساتھ، ماما کے ساتھ اور خالہ کے ساتھ بھی۔

خالہ اپنا گھریا چھوڑ چھاڑ کر ماما کی مدد کے خیال سے اپنا سب کچھ بھلا کر ہمارے ہاں اٹھ آئی تھیں اور



فاطش ان سے اتنی بد مزاجی سے بات کرتی تو مجھے دل سے دکھ محسوس ہوتا، وہ کیا سوچتی ہوں گی، مجھے خیال آتا مگر فاطش کی کزوی سبکی باتوں کے جواب میں خالہ کے ماتھے پر ہل بھی نہ آتا۔ خالہ کو تو اللہ نے اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا تھا..... ان کا دکھ کون سمجھ سکتا تھا، میں اب خود بھی اپنی اس محرومی کو بہت بری طرح محسوس کرتی تھی، اس لیے میں خالہ کی دلی کیفیت کو محسوس کر سکتی تھی۔

صدف اور احمد کے نکاح کے اگلے روز ہی عمر نے ماما پاپا اور احمد کے گھر والوں کی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں شاندار دعوت کی تھی۔ میرے خاندان کے سب لوگ عمر کی عادات اور اخلاق کے گرویدہ تھے، ان میں صلاحیت بھی تھی دوسروں کے دل جیتنے کی..... میرا دل بھی تو انہوں نے اسی طرح جیتا تھا۔ کھانے کے دوران فاطش میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی، وہاں بھی میز کے نیچے اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور اس پر مسلسل ٹک، ٹک، ٹک ہورہی تھی۔ ماما سے بات کرنی پڑے گی، یقیناً فاطش بھی کسی چکر میں مبتلا ہو گئی ہے، یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، ممکن ہے کہ کسی لڑکے کے جال میں پھنس گئی ہو..... مجھ میں اور اس میں عمروں کے تفاوت کے باعث ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ میں سب سے بڑی اور وہ سب سے چھوٹی..... صدف کو لندن چلے جانا تھا۔ جانے کون فاطش سے باز پرس کر سکتا ہے۔ ماما! میں نے سوچا۔ ”ہاں..... ماما کو بتانا پڑے گا کہ انہیں فاطش پر نظر رکھنی چاہیے، اس کی سرگرمیوں پر اور اس کے فون کے استعمال پر بھی۔“

☆☆☆

”رانیہ آئی!“ پیغام کی ٹون بجی تو میں نے فون آن کیا، صدف کا پیغام تھا۔ ”جاگ رہی ہیں؟“ عابد نے اگلے ہی دن میری سم اپنے ایک پرانے فون سیٹ میں ڈال دی تھی مگر پہلا فون دھل جانے کے باعث مجھے سارے فون نمبرز ایک ایک کر کے اس میں محفوظ کرنا تھے یا پھر وقت ملتا تو کمپیوٹر سے اس میں سارا ڈیٹا

نقل کرتی، پہلے مرحلے میں، میں نے گھر والوں کے فون نمبر اس میں ڈالے اور باقی کام میں نے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا۔

”تمہارے تورات کے دو بچے ہیں، تم کیوں جاگ رہی ہو ابھی تک.....؟“ میں نے بستر چھوڑتے ہوئے سوال لکھا۔

”بس پریشانی میں نیند ہی نہیں آئی آئی.....“

”خیریت ہے میری جان؟“ میں گھبرا گئی۔

”سب ٹھیک تو ہے نا، احمد ٹھیک ہے؟“

”میں اور احمد تو ٹھیک ہیں آئی، ماما کی طرف سے پریشانی ہے.....“ اس نے کہا تو میں نے گہری سانس لی۔

”ہم م.....“ میں نے کچھ سوچ کر پیغام ٹائپ کیا۔ ”کیا ہوا ماما کو؟“

”ماما نے ایک عجیب سی بات کی ہے آئی!“ اس نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ انہوں نے آپ سے بھی وہ بات کی ہو، اگر نہیں بھی کی تو بھی مجھے سب سے پہلے خیال آیا کہ میں آپ سے بات کروں.....“

”کیا عجیب بات کی ہے ماما نے؟“ تو گویا جو کچھ ماما نے مجھ سے کہا تھا وہ صدف سے بھی کہا تھا، اس کا مطلب ہے کہ یہ مذاق نہیں ہو سکتا..... مگر پھر بھی میں صدف سے پوچھ کر تصدیق کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماما نے اسے کوئی اور پیغام بھیجا ہو۔

”ماما نے.....“ وہ کچھ کہتے، کہتے رکے۔ ”عابد بھائی کہاں ہیں؟“

”عابد چلے گئے ہیں اور میں بھی تھوڑی دیر میں نکلنے والی ہوں.....“

”کوئی اور تو پاس نہیں آپ کے..... فون کا اسپیکر تو آن نہیں؟“

”بے فکر ہو کر بات کرو صدف، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”ماما نے میرے ساتھ بات کی تھی کل اسکا پ پر..... اچانک کہنے لگیں کہ انہوں نے پاپا سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے.....“ بات کرتے ہی وہ دھواں دار

رونے لگی جبکہ میرے خاموش نوحے آنسوؤں کی صورت میرے گالوں پر پھسل رہے تھے۔

”آیا تھا مجھے بھی ماما کا پیغام.....“ میں نے آنسو ہاتھ کی پشت سے مسل کر صاف کیے، برش پر ٹوٹھ پیسٹ لگایا۔ ”میں دفتر پہنچ کر تم سے بات کروں گی جب تمہارے صبح کے سات بجیں گے، تم یونیورسٹی نہیں جا رہی ہو کیا؟“

”ہاں مجھے جانا ہے، اس وقت میں ٹیوب میں ہوں گی.....“ اس کا جواب آیا۔ ”مگر میں کوئی بہانہ کر کے آج احمد سے فون لے جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے اب تم سونے کی کوشش کرو، مجھے بھی تیار ہونا ہے.....“ میں نے کہا۔ ”لو یو میری جان!“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آئی، نیند بھی نہیں آ رہی۔“ وہ ہچکیوں سے رورہی تھی۔

”احمد کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا، حیران تھی کہ وہ کس طرح بات کر رہی ہے، کیا وہ احمد کے سامنے ہی بات کر رہی تھی۔

”احمد کی آج رات کی ڈیوٹی ہے، صبح چار بجے آ جائے گا۔“

”درد و شریف پڑھو اور کوشش کرو تو نیند آ جائے گی۔“ میں نے کہہ کر فون بند کیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آئینہ دیکھنے لگی۔ آخر ایسا کیوں کہا ماما نے؟ میں نے دل میں سوچا! اس وقت تو شام ہوگی وہاں اور پاپا بھی گھر پر ہوں گے، کیا انہیں فون کر کے پوچھوں..... نہیں، شام کو کروں گی جب ان کی صبح ہوگی۔

”مجھے واپسی پر نہ لینے آئیے گا عابد، مجھے کسی کولیگ کے ساتھ کافی پر جانا ہے، وہی مجھے گھر پر چھوڑ دے گی۔“ میں نے عابد کو پیغام بھیجا۔

”تم وقت بتا دو اور کہاں سے لینا ہے، میں تمہیں لے لوں گا، کسی اور کو کیوں زحمت دیتی ہو۔“ ان کا جواب آیا۔

”نہیں آپ مصطفیٰ کو لے کر پھر گھر پر ہی رہیں، اسے سردی میں بار، بار باہر نہ نکالیں۔“ میں نے گھر

لاک کر کے باہر نکلتے ہوئے پیغام بھیجا۔ میں نے سوچا تھا کہ کہیں باہر سے ماما کو کال کروں گی جس وقت پاپا گھر پر نہ ہوں..... فاصلوں اور اوقات کے فرق نے ایک مسئلے پر بات کرنے کو بھی مشکل بنا دیا تھا۔

اپنے دفتر پہنچ کر فون کی گھنٹی کی آواز بند کی تاکہ معمول کے دفتر کے کام کا آغاز کر سکوں، فون بیگ میں رکھا تھا، گیارہ بجے کافی کا وقفہ ہوا تو مجھے فون کا خیال آیا کہ مجھے تو صدف کو فون کرنا تھا، فون باہر نکالا تو اس پر نیلم کی کئی مسڈ کالیں تھیں اور فاطش کا پیغام..... ”آئی آپ سے کس وقت بات کی جا سکتی ہے؟“ تو گویا معاملہ بہت سنجیدہ تھا، میں نے ماما سے جلد ہی بات کرنے کا سوچا اور پہلے صدف کا نمبر ملانے لگی، کئی بار گھنٹی بجتی رہی مگر اس نے فون نہ اٹھایا، میں نے وقت دیکھا، اس وقت تو یقیناً وہ اپنی کلاس میں ہوگی..... بعد میں کال کرنے کا سوچ کر میں کافی ختم کر کے اپنے کام پر لگ گئی۔

☆☆☆

”عمر مجھے ماما کی طرف جانا تھا.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”خیریت؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”خیریت ہی ہے.....“ میں مسکرائی، اس مسکراہٹ نے کتنے ہی آنسوؤں کو اپنے قدموں تلے روندنا تھا۔ ”ماما اس ہو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ میں چکر لگا لوں ان کی طرف۔“

”ان کے یہاں آنے پر پابندی تو نہیں..... میں انہیں واپسی پر لیتا ہوا آؤں گا۔“ چائے کا کپ رکھ کر انہوں نے کہا۔

”نہیں، نہیں.....“ میں نے فوراً کہا۔ ”وہ نہیں آئیں گی۔“ ان کے یہاں آنے پر کوئی پابندی تھی نہ انہیں آنے پر کوئی اعتراض ہوتا، عمر جاتے تو وہ انہیں انکار بھی نہ کرتیں..... مگر مسئلہ یہ تھا کہ نہ تو ماما نے کال کر کے مجھے آنے کو کہا تھا اور نہ ہی ان کے میرے گھر آنے پر میں ان کے ساتھ کھل کر اس مسئلے پر بات کر سکتی تھی۔

حالت میں اندر نہ آئیں۔

”پاپا گھر پر نہیں ہیں کیا؟“ میں نے گیت کھٹے پر پاپا کی گاڑی وہاں نہ پا کر چونک کر پوچھا۔

”وہ شہر سے باہر گئے ہیں بیٹا!“

”آج ہی گئے ہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”دو تین دن ہو گئے ہیں بیٹا!“ میری اس روز نما سے بات ہی نہ ہوئی تھی نہ ہی ممانے بتایا تھا کہ پاپا گھر پر نہیں ہیں۔ گھر کے اندر داخل ہوئی تو ممانے کو میں

اسود کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔

”اسود سکول نہیں گیا ماما؟“ میں نے پوچھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟“

”اسے بخار ہے بیٹا، فاطمہ کا کالج جانا بہت ضروری تھا، اس کا کوئی اہم لیکچر تھا، جلدی واپس آ جائے گی۔“ ممانے آہستہ سے کہا۔ ”کیسی ہو تم، کیسے آتا ہوا یوں صبح سویرے؟“

”آپ ٹھیک ہیں ماما، مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی؟“ میں نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تمام لیا۔

”میرے ساتھ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے بیٹا، ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔“ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میں نے انہیں ایسا کنزور اور بے بس لگتی محسوس نہیں کیا تھا۔

”میں آپ سے ملنے کو بہت بے چین تھی ماما، آپ کے فون نے میری نیندیں اڑا دیں ہیں ماما۔“

ایسا کیا ہو گیا ہے اچانک آپ کی پرسکون زندگی میں؟“

”میری زندگی تو طوفانوں کا مجموعہ ہے بیٹا، اس میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے، میں نے ہر طوفان کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں ہمیشہ چھپا چھپا کر رکھا بیٹا

مگر برداشت کا بھی ایک نکتہ انتہا ہوتا ہے، پتا نہ حد سے زیادہ بھر جائے تو لبریز ہو کر پھٹنے لگتا ہے، میں نے بھی

عمر بھر خود پر سب جھیلا اور برداشت کیا ہے مگر اب سوچا ہے کہ اپنی زندگی کو اپنے لیے جیوں، اس کے لیے

مجھے تم سب کو اپنا فیصلہ بتانا پڑا، تم سب اب سمجھا رہو، شادی شدہ ہو۔۔۔۔۔ اب تم لوگ میری زندگی کے

رہتے ہیں اور اس کا اپنا کوئی گھر یہاں نہیں ہے سو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری بیٹی کے نصیب اس گھر میں نہ تھے تو کیا ہوا۔ اللہ نے اس کے لیے کچھ بہت اچھا رکھا ہوگا، تم اس کی ماں ہو دو عا کیا کرو۔“ عمر کے کہنے پر میرا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

”کیا معلوم کہ ہماری بیٹی کے نصیب کتنے اچھے ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا معلوم کہ اللہ کو آپ کی کون سی ادا پسند آگئی کہ اس نے آپ کی خواہش کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیے۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ کیا اماں نے بلی کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈا ہے جس کا مجھے علم نہیں؟“

”آپ کی خواہش تھی ماں کہ بلی کا رشتہ نیل سے ہو۔۔۔۔۔ میں رکی۔“ تو اللہ نے آپ کی سن لی ہے اور

ناہید آپی اسی لیے پاکستان آ رہی ہیں کہ آپ کے سامنے بلی کے لیے دوبارہ دست سوال دراز کریں۔“

گاڑی کے ناز چرچاے اور پوری قوت سے بریک لگا کر عمر نے گاڑی روکی۔

”کیا کہا تم نے؟“ عمر نے نہایت حرمت سے پوچھا۔

”ہاں نیل۔۔۔۔۔ وہی کہا ہے میں نے جو آپ نے سنا ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ نیل نے ڈرائیور کو

گاڑی سے باہر نکلنے کو کہا، وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

”آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر مجھے تسبیہ کی۔ ”دوبارہ اس گھر میں اس موضوع پر کوئی اور بات نہ کرے۔۔۔۔۔ ایسا مذاق مجھے بالکل پسند نہیں!“

”میں مذاق نہیں کر رہی عمر!“ میں نے یہ مشکل تھوک نکتے ہوئے کہا۔

”مذاق نہیں تو پھر بھی اس موضوع کو ہمیں بند کر دو!“ اس کے بعد انہوں نے اپنے لب سختی سے پہنچ

لیے، گاڑی دوبارہ اشارت کی ڈرائیور سے اندر بیٹھنے کو کہا اور مجھے ماما کے گھر کے گیٹ کے سامنے باہر ہی اتار کر چل دیے، میں بھی چاہتی تھی کہ وہ اس غصے کی

اس گھر کی فرد نہیں یا میں اس قابل نہیں کہ مجھ سے آپ اپنے بچوں کے بارے میں بات کریں۔۔۔۔۔ اتنے سال سے میرا اور آپ کا ساتھ ہے، کیا میرے کسی عمل سے آپ کو ایسا لگا کہ میں ان بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھتی؟“ میرے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

”اسی کوئی بات نہیں نیل پیاری۔۔۔۔۔“ عمر نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ ”مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کسی کو یہ علم ہو کہ میں نے خود بول کر ناہید سے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور خود میں نے اماں سے کہلویا تھا۔ ناہید کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا اور وہ خوشی، خوشی پاکستان آئی، ارادہ تھا کہ نیل اور بلی کی معافی کر دیں گے، ہم دونوں بہن بھائی سارا پروگرام طے کر چکے تھے، معافی کی تاریخ تک مقرر ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ اسی دوران وہ اپنے سسرال والوں سے ملنے کے لیے گئی اور وہاں جا کر اس کے بیٹے کو۔۔۔۔۔“

”جانتی ہوں سب عمر۔۔۔۔۔ میں نے انہیں ٹوکا۔“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر آپ نے اپنی طرف سے خواہش کا اظہار کر دیا؟“

”بیٹیوں کے باپ اپنے منہ سے بھلا کب کہتے ہیں ایسی بات؟“ عمر نے فوراً کہا۔

”آپ کو معلوم ہے ماں عمر۔۔۔۔۔ کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو شادی کا پیغام حضرت خدیجہ نے خود بھجوایا تھا، وہ ان سے شادی کی خواہش مند تھیں، کہیں

ایسا نہیں لکھا ہوا ہے کہ لڑکی کی طرف سے شادی کا پیغام نہیں دیا جاسکتا۔۔۔۔۔ ایک رواج بن گیا ہے ہمارے ہاں مگر لڑکی والوں کی طرف سے شادی کی خواہش کا اظہار کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔“

”اب گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔“

عمر نے بے دلی سے کہا۔ ”اب تو وہ نیل کی شادی کرنے کے لیے آ رہی ہے سو آئے، کرے، اور واپس جائے۔۔۔۔۔ اسے غالباً ہمارے گھر میں رہ کر ہی شادی کرنا پڑے گی کیونکہ اس کی سسرال کا گھر چھوٹا ہے اس کے علاوہ اس میں اس کی سسرال کے ڈھیروں لوگ

”تمہیں معلوم ہے ماں کہ کل ناہید آ رہی ہے؟“

عمر نے سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بتایا تھا اماں نے مجھے۔۔۔۔۔ اسی لیے سوچ رہی ہوں کہ جا کر ماما کو مل آؤں کہ اس کے بعد چند دن تک ٹکنا مشکل ہوگا۔“

”چلو پھر فوراً تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہوں۔“

”آپ کو دیر ہو جائے گی، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی اور مجھے ابھی اماں سے اجازت بھی لینی ہے۔“

”اماں سے میں بات کر لیتا ہوں اور ڈرائیور میرے ساتھ جا رہا ہے اس لیے تم تیار ہو جاؤ جلدی سے۔“ عمر کے اصرار پر مجھے کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا۔

”میری بھی ملاقات ہو جائے گی انکل اور آئی سے، آخر وہ میرے لیے بھی تو اداس ہوں گی ماں۔“

میرے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی سو تیار ہونے چل دی۔

گاڑی میں بیٹھی ہی مجھے یاد آیا کہ چند روز قبل اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ ناہید کے بیٹے نیل کے متعلق عمر سے بات کروں، مجھے یہ وقت اور موقع مناسب لگا۔۔۔۔۔

”عمر آپ کو علم ہے کہ ناہید آپی کیوں آ رہی ہیں؟“

میں نے انگریزی میں سوال کیا کیونکہ عقلمی نشست پر ڈرائیور بھی بیٹھا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ نیل کی شادی کرنے کے لیے آ رہی ہوں گی!“ عمر کا لہجہ اور انداز دونوں سرسری تھے۔

”اماں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی خواہش تھی کہ ناہید آپی نیل کے لیے بلی کا رشتہ لیتیں؟“ میری بات ختم ہوتے ہی عمر نے سرگھا کر میری طرف دیکھا، ان کے چہرے پر تازہ تھا۔

”تم میری محبت، میری چاہت اور میری من پسند بیوی سہی مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اماں نے تم سے اس مسئلے پر بات کی اور تمہیں بتایا کہ۔۔۔۔۔“ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔

”کیوں اس میں کیا قباحت ہے۔۔۔۔۔ کیا میں

معاملات کی نزاکت کو سمجھ سکوگی۔ انہوں نے اپنا سر صوفے کی بیک سے لگا لیا اور خاموش ہو گئیں، میں نے انہیں کچھ نہ کہا، میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا دل خود کھول کر میرے سامنے رکھیں۔

☆☆☆

لنچ بریک کے بعد میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو صدف نے تیسری چوتھی گھنٹی پر فون اٹھالیا، سلام کیا اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، میں فون کے دوسری طرف ہونے والی کھڑ پڑ کون رہی تھی، وہ غالباً کلاس میں تھی، میں نے اسے استاد سے اجازت لیتے ہوئے بھی سنا اور پھر وہ کلاس سے باہر آ گئی۔

”آپ ٹھیک ہیں آپ؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں، تم ساؤ!“

”آپی میں تو بہت پریشان ہوں، بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں..... جانے کیا ہونے والا ہے، کیسا طوفان آنے والا ہے..... اس عمر میں..... شادی کے اتنے سالوں کے بعد اور ہم سب کی شادیاں کر کے..... ماما کو کیا ہو گیا ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ کہیں ماما کی ذہنی حالت تو خراب نہیں ہو گئی؟“ وہ رورہی تھی۔

”تم خود کو سنبھالو صدف میری جان! میں دو ایک دن میں فاطمہ سے بات کرتی ہوں اور پھر ماما سے بھی، ٹیلی فون پر تو بات اسی طرح ہو سکتی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر ماما نے ایسا سوچا کیونکر آپ؟“ اس کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ”آپ خلیم سے بات کریں اور اسے کہیں کہ وہ ماما سے بات کرے جا کر، ماما اس سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ ماما سب سے زیادہ تم سے پیار کرتی ہیں..... میں نے پنسنے کی ناکام کوشش کی۔“ ہم سب سے ماما اتنا ہی پیار کرتی ہیں پیاری کہ کس سے زیادہ اور کس سے کم کا حین نہیں کیا جاسکتا۔“

”پھر میں ماما سے پوچھوں کہ کیوں ایسا فیصلہ کر رہی ہیں وہ؟“ صدف نے فوراً پوچھا۔ ”مگر میرے

لیے احمد کے فون سے اتنی لمبی کال کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا سب پر بات کا وقت بھی عموماً تنہائی میں نہیں ملتا۔“

”تم خود کو پریشان نہ کرو میری جان، تمہارا آخری سسٹر ہے اور تمہاری چار سال کی محنت ضائع جائے گی جو تم نے خود کو دماغی طور پر پڑ سکون نہ کیا تو۔“

میں نے اسے سمجھایا، مجھے علم تھا کہ وہ امتیازی نمبروں سے ڈگری حاصل کرنے جا رہی تھی، فائنل سسٹر میں اس طرح کی پریشانی اس کی کارکردگی کو متاثر کر سکتی تھی۔ میں نے اسے مطمئن کر کے فون بند کیا، کرسی کی پشت سے سر لگایا اور آنکھیں موند لیں، میرے آنسو میری آنکھوں کے گوشوں سے بہنے لگے، ماما نے ایسا فیصلہ اب کیوں کرنے کا سوچا، انہیں تو یہ فیصلہ برسوں پہلے کر لیتا چاہیے تھا، میری بند آنکھوں کے اندر فلم چلنے لگی..... میں غالباً سات آٹھ برس کی تھی، پاپا اور ماما کی دوست راحیلہ آنٹی، ہمارے گھر کا ڈرائنگ روم، ماما گھر پر نہ تھیں، جانے میں کیوں ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی، مجھے پاپا اور راحیلہ آنٹی کو دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا

چاہے اصل صورت حال کی سمجھ نہ آئی تھی، انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا..... مگر مجھے میری چھٹی حس نے یہ ضرور بتا دیا کہ کچھ غلط ہو رہا تھا۔ راحیلہ آنٹی، ماما کی انتہائی قریبی سہیلی تھیں اور بہت عرصے سے تھیں، ان کا ایسے وقت میں ہمارے گھر آنا جس وقت ماما گھر پر نہیں ہوتی تھیں، وہی عجیب تھا اور وہ بھی اکیلے۔

”ماما..... مجھے راحیلہ آنٹی بہت گندی لگتی ہیں۔“ میں نے اپنی معصومیت میں ماما سے کہا تھا۔

”وہ تو میری بہت پیاری دوست ہے چندا..... ہم بچپن سے بہنوں کی طرح ساتھ رہی ہیں اسکول، کالج اور پھر اب تک ہماری دوستی قائم ہے..... ہماری شادیاں ہوئیں تو ہم ایک دوسرے سے جیسے پھڑکنیں مگر بعد میں جب انکل فطین کی آپ کے پاپا سے دوستی ہو گئی تو اب تو ہمارا یہ دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔“

”نہیں ماما..... میں معرتھی۔“ وہ اچھی نہیں ہیں پلیز!“

”اچھا چلیں اگر وہ میری بیٹی کو اچھی نہیں لگتیں تو

میں اپنی بیٹی کو ان سے ملنے پر مجبور نہیں کروں گی۔“ ماما نے مجھے بہلایا۔ ”مگر وہ میری بیٹی کو اچھی کیوں نہیں لگتیں؟“ انہوں نے میرا سر سہلا کر پوچھا۔

”نہیں ماما..... آپ ان کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیں، وہ ہمارے گھر میں نہ آئیں۔“ میری آنکھوں سے ماما کی شفقت کے باعث آنسو جاری ہو گئے، مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ میری ماما کے علم میں نہ تھا۔

”یہ تو بڑی گستاخی کی بات کی ہے میری بیٹی نے..... میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔“ ماما کے چہرے پر ناراضی مثبت تھی، میں اس ناراضی سے خوفزدہ رہتی تھی، وہ مجھ سے بات نہ کرتیں تو میرے دل کی دنیا اٹھل پھٹل ہو جاتی۔

”ماما..... میں نے ان کا ہاتھ تھام کر، انہیں وہ سب بتا دیا تھا جو میں نے دیکھا تھا، معصوم عمر تھی، میں ان معاملات کی نزاکتوں کو نہ سمجھتی تھی اس لیے میں نے کچھ نہ چھپایا تھا، ان کا چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا، میں خود ساری داستان سنا کر ان کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”بس..... اب میری بیٹی نے مجھے تو بتا دیا ہے مگر کسی اور کو کچھ نہیں بتانا..... کسی کو بھی نہیں بیٹا!“ ماما نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ”میں آئندہ خیال رکھوں گی کہ راحیلہ آنٹی میرے گھر میں نہ آئیں۔“ ماما نے میرے گال پر بوسہ دیا، میں نے ان کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستارے دیکھے تھے۔ جانے بعد میں ماما نے راحیلہ آنٹی سے کیا کہا ہوگا، ان کا ہمارے ہاں آنا جانا بند ہو گیا، ماما بھی ان کے ہاں نہ جاتیں اور وہ ہر روز کی گھنٹوں لمبی کالیں بھی منقطع ہو گئیں، نہ صرف راحیلہ

آنٹی کے ہاں..... ماما نے تو گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا، ان کا آنا جانا اپنی ویلفیئر تنظیم کے کاموں کے سلسلے میں ہوتا تھا مگر اس کے بعد انہوں نے جانا چھوڑ دیا اور تنظیم کے کاموں کو گھر سے ہی چلانے لگیں۔

”ارے بھئی کہاں گئیں وہ آپ کی سہیلی..... کیا نام تھا ان کا..... راحیلہ!“ پاپا نے ایک دن لاؤنج میں

زندگی خاک نہ تھی

بیٹھے ہوئے ماما سے بڑی بے نیازی سے پوچھا، میں اس وقت وہیں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔

”میری یا آپ کی؟“ ماما کے مختصر سوال نے پاپا کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”بچی کے سامنے کیسی بے ہودہ بات کر رہی ہیں آپ؟“ پاپا نے غصے سے ماما سے کہا۔

”آپ نے جو کچھ بچی کے سامنے اس گھر کے ڈرائنگ روم میں کیا ہے، راحیلہ کے ساتھ..... وہ میری اس بات سے کہیں زیادہ بے ہودہ ہے..... میں بے نیازی سے اپنا کام کر رہی تھی، ان کی گفتگو میں سن تو رہی تھی مگر ان کے مطالب سے کافی حد تک نا آشنا۔

”میں نے کچھ ایسا نہیں کیا، اسے کیا سمجھ ہے جھوٹی سی بچی ہی تو ہے، جانے کیا سمجھتی تھی، مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں کبھی راحیلہ کے ساتھ تھا..... پاپا کی زبان ان کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”میں نے خود دیکھا تھا پاپا..... آپ اور آنٹی..... میں نے پاپا کے سامنے نقشہ کھینچا تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”وہ اصل میں.....“ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ اس کے پیٹ میں درد تھا.....“ وہ بہانے گھڑ رہے تھے۔

”رانی آپ جاؤ بیٹا، اپنے کمرے میں جا کر کام کرو بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر۔“ ماما نے حکم دیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر ماما میں نے آپ سے سوال سمجھنا تھا۔“

تعمیراتی

یاد دہانی

ہے۔ خالہ کے بارے میں بہت بچپن سے ہی میری یادیں ایسی خوشگوار نہیں ہیں حالانکہ خالہ سب بہنوں میں مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ کئی کئی دن ہمارے باں آ کر رہیں، خالہ بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھیں مگر ان کی شادی جس خاندان میں ہوئی اس خاندان میں غالباً ان کے سوا کوئی اور خاتون پڑھی لکھی نہ تھی، مردوں میں بھی تعلیم کا رواج نہ تھا کہ اپنے خاندانی کاروبار تھے۔ خالو کا بھی منڈی میں آڑھت کا کام تھا، روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اس لیے خالہ اچھا پہنتی اور تھی تھیں۔

پاپا کا ملتان میں آٹھ دس دن کا کام تھا، خالہ نے کال کر کے ماما سے کہا کہ فاطمہ کو بھجوادیں، میں اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتی تھی غالباً..... پاپا کے ساتھ خوشی، خوشی چلی گئی۔ پاپا کو مجھے خالہ کے گھر چھوڑ کر ہونٹ میں قیام کے لیے جانا تھا مگر خالو اور ان کے والدین نے اصرار کیا کہ وہ بھی وہیں گھر پر رکھیں تو پاپا

انگلے روز مجھے کچھ سکون آور دوائیں دے کر ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا، ابھی تک مجھے سمجھ میں نہ آیا تھا کہ مجھے نروس بریک ڈاؤن کیوں ہوا تھا، میں احمد سے پوچھتی تو وہ ٹال جاتے تھے۔ کیا میں نے ماما کی بات کا اتنا اثر لیا تھا یا کچھ اور ہوا تھا؟

☆☆☆
میری بہنوں کو مجھ سے اس بات کا گلہ ہے کہ میں ان سے اپنے دل کی باتیں شہیر نہیں کرتی، پر میں سوچتی ہوں وہ سب اپنے، اپنے گھروں میں خوش ہیں، انہیں میرے مسائل سے کیا غرض..... اور ان سے اگر کہہ دوں گی تو کیا میری تکالیف اور میرے مسائل، میری سوچیں ختم ہو جائیں گی؟

نیلیم تو مجھ سے بارہا تقریباً لڑ چکی ہے کہ میں تانیہ خالہ کے ساتھ بہت برا رویہ رکھتی ہوں..... مگر کیا کروں، جس خالہ کو ہم نے اپنے گھر میں بہنوں کی طرح دیکھا اور سمجھا اب، وہی خالہ.....؟ کیا کہے کوئی، ان کے بارے میں بات کر دو تو اپنا پیٹ ہی تنگا ہوتا

”تم بے ہوشی میں کچھ بڑا بڑا بھی رہی تھیں.....“
”اچھا.....“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”کیا؟“
”تم اپنی ماما کو بہت یاد کر رہی تھیں.....“ احمد نے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں چند ہفتوں کے لیے پاکستان بھیج دوں، میں تو جانیں سکتا، بڑی مشکل سے اتنی اچھی ملازمت ملی ہے اور شام میں میری کلاسز ہوتی ہیں تو میں وقت نہیں نکال سکتا، تم جا کر چند ہفتے ماما کے پاس رہ کر آ جاؤ، طبیعت بہتر ہو جائے گی اور اس کے بعد چونکہ ہم نے اپنی فیملی شروع کرنا ہے پھر تو تم کافی عرصے کے لیے نہیں جاسکو گی۔“ شادی کے اتنے سالوں کے بعد بھی احمد کی اس بات پر میرے کان گرم ہو گئے تھے۔

”نہیں احمد، ابھی میں پاکستان جانا انور ڈ نہیں کر سکتی، بہت اخراجات ہو جاتے ہیں۔“ میں نے تاویل پیش کی۔ ”اب تو ہمارے اپارٹمنٹ کی قسط بھی جایا کرے گی اور ہم نے تمہیں کیا ہے کہ اپنے والدین سے اب کوئی مدد نہیں لیں گے.....“

”سب جانتا ہوں، میرے پاس کچھ بچت ہے جو تمہارے اکیلے پاکستان جانے کے لیے کافی ہے، تم بے فکر ہو کر جاؤ میری جان۔“ احمد نے اصرار کیا تو میں خاموش ہو گئی۔

دل میں خیال بھی آیا کہ احمد کی امی یعنی میری پھوپھی سوچیں گی کہ میں نے اپنے والدین سے ملنے کے لیے آنے میں خود غرضی دکھائی ہے۔ ”پھر دونوں چلتے ہیں احمد!“

”ابھی نہیں ڈیر!“
”میں آخری بار پاپا سے رقم منگوا لیتی ہوں احمد!“
”رقم منگوانا یا نہ منگوانا اہم نہیں..... ابھی میں اپنی نئی ملازمت سے چھٹی نہیں لے سکتا ورنہ مستقل چھٹی مل جائے گی..... ہزاروں، ایسی ملازمتوں کے انتظار میں فارغ بیٹھے ہیں، کسی اور کو رکھ لیں گے کہہنی والے.....“
احمد کی اس دلیل کا جواب نہ تھا میرے پاس۔

حالات اس کے بعد بالکل نارمل ہو گئے تھے، کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا نہ کوئی اور ناگوار واقعہ، کم از کم میرے سامنے نہیں، باقی بہنیں تو اس وقت کافی چھوٹی تھیں۔ اب میری یاد کے نہاں خانوں میں اس بھولے بھولے واقعے کی یاد تازہ ہو گئی تھی، میں اس منظر کو اب یاد کرتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پاپا اور راحیلہ آنٹی کے بیچ کچھ بہت غلط تھا یا غالباً پہلی اور آخری بار ایسا ہوا ہوگا، ماما کا ظرف بہت بڑا تھا جو پاپا کو معاف کر دیا۔ انہوں نے پاپا کو اس وقت معاف کر دیا تھا جو ان کی جوانی کی عمر کی ایک بڑی غلطی تھی بلکہ بہت بڑا گناہ تھا..... تو اب پاپا نے اس سے برا کیا کر دیا ہے جو ماما نے ان سے خلق لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ سوچ کی حدیں یہاں آ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

☆☆☆
رانی آپی سے بات کر کے بھی دل کو سکون نہیں ملا تھا، بے چینی بڑھ گئی تھی، اتنی کہ رگوں میں سننا ہٹ سی ہونے لگی۔ میں گھر پر اکیلی تھی، شاید سو گئی تھی، آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر پر نہ تھی، عجیب سا کمر تھا، سفید سفید اور مانوس سی خوشبو والا۔ میں کسی ہسپتال میں تھی۔ ”کیا ہوا تھا مجھے؟“ میں نے سوچا تو ساتھ ہی احمد کا چہرہ نظر آیا۔

”کیسی ہو میری جان؟“

”میں کہاں ہوں احمد؟“ میں نے کہا تو مجھے لگا کہ میری آواز کسی کنویں سے آرہی ہو۔
”تم اس وقت ہسپتال میں ہو، میں گھر لوٹا تو تم گھر پر بے ہوش پڑی ہوئی تھیں، میں نے ایرجنسی میں کال کر کے ایسولینس منگوائی اور تمہیں یہاں لے آیا۔“

”میں بے ہوش کیوں ہو گئی تھی؟“ حیرت سی حیرت تھی۔
”میں تو سمجھا کہ تم نے کچھ کھایا نہیں ہے مگر ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔“ احمد میرا ہاتھ سہلا رہا تھا۔
”نروس بریک ڈاؤن؟“ میں سوچ کر رہ گئی۔
”مگر..... کیوں!“

سینئر سائنس دان
ہلو سم ہریسٹ ڈولپنگ ایجوٹا ٹیکنالوجی گریڈ (ہرٹل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی زنی کو دور کر کے نئی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔
گلیسیسی
یونانی کریم

0345-7000088
051-5502903-5533528
042-7666264
Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com

”آپ صرف خالو کے ساتھ ہی نہیں بلکہ میری ماما کے ساتھ بھی دھوکا کر رہی ہیں، وہ آپ سے اتنا پیار کرتی ہیں اور آپ بدلے میں.....“ میری آواز بھرا گئی۔

”کیا بات کر رہی ہو فاطش..... کچھ عقل ہے تم میں کہ بڑوں کے ساتھ بات کس طرح کرتے ہیں؟“

خالہ کی آواز بلند ہونے لگی۔

”اب میں وہ چھوٹی بچی نہیں رہی خالہ..... جس کے دودھ میں آپ جانے کیا ملا کر اسے سلائی تھیں..... مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دودھ ہضم نہیں ہوتا خالہ اور تے ہو جاتی ہے۔ شاید قدرت نے کسی بچی کو شعور دینا ہوتا ہے، اسے زندگی کی بدترین سچائی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے..... تے ہو جائے خالہ تو بے ہوشی کی دوا اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ تے کے ساتھ نکل جاتی ہے اور کمرے میں کوئی عجیب سی آواز آنے تو بھی بچی کی نیند ٹوٹ جاتی ہے..... کمرے میں اندھیرا بھی ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں..... دو لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں بھی آتی ہیں اور آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے پر وہ اتنی بھیانک حقیقت دیکھتی ہیں کہ کیا ہی کوئی خواب ایسا بھیانک ہوگا.....“

”میں تمہاری بات کو کبھی نہیں فاطش.....“ وہ میری بات کو سمجھ کر بھی انجان بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ اچھی طرح سمجھ رہی ہیں خالہ.....“ میں نے غصے سے کہا۔ ”تب میں آپ کی اور پاپا کی ایسی قربت کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر اب سمجھتی ہوں.....“

”تم بہت عجیب اور بے ہودہ الزامات لگا رہی ہو مجھ پر۔“ وہ چنچیں۔

”میں اپنی ماما کو کچھ بتا کر انہیں دکھ نہیں دینا چاہتی، بہتر ہے کہ آپ خود کو درست کر لیں..... پاپا سے اپنا تعلق ختم کر لیں۔“ میں نے سفاکی سے کہا۔ ”ورنہ میں کسی دن آپ کو اور پاپا کو ماما کے سامنے کھڑا کر دوں گی اور دونوں سے اس سوال کا جواب مانگوں گی۔“

”دکھ ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر.....“ ان کی

ہوتا کہ ماما کو خالہ کو بھی وقت دینا چاہیے۔

ہم ساری بہنیں خالہ کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا کرتیں، پاپا بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے، ماما گھر پر ہوتی تو اور بھی سماں بندھتا، میں نے اکثر کھیل اور ہلے گلے کے دوران پاپا اور خالہ کو زبانی اور عملی مذاق کرتے ہوئے پکڑا مگر کچھ کہہ نہ سکی، باقی کسی اور کوشش نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے کبھی وہ نہ دیکھا تھا جو میں نے دیکھا تھا، اب وہ سب ایک دھندلی سی یاد کی طرح میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تھا مگر میرا دل خالہ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہوا تھا۔ جب آپ کسی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں تو شک کی تسکین کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، میں نے بارہا خالہ اور پاپا کو ماما کی گھر میں عدم موجودگی میں مختلف اوقات میں یوں اکٹھے کسی نہ کسی کمرے میں دیکھا جہاں انہیں نہیں ہونا چاہیے تھا..... یا کم از کم ان کمروں کے دروازے لاک نہیں ہونا چاہیے تھے۔ کبھی کبھار سوچتی کہ بہنوں سے شہر کروں مگر رک جاتی، جانے وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آتیں، ماما کیا سوچیں کہ میں پاپا اور ان کی بہن پر بہتان لگا رہی ہوں۔

☆☆☆

”خالہ.....“ میں دسویں جماعت میں تھی جب ایک بار میں نے خود ہی خالہ سے بات کرنے کا سوچا تھا، اس کے بعد میری ہمت نہ بڑی کہ میں کسی اور کے سامنے بات کرتی۔ ”خالو میں کیا کمی ہے؟“

”تمہارے خالو میں نہیں بلکہ مجھ میں کمی ہے فاطش بیٹا..... میں نے تو انہیں بارہا کہا ہے کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر لیں مگر وہ مانتے ہی نہیں۔“ خالہ نے فخر سے بتایا۔ ”مجھ سے وہ پیار ہی اتنا کرتے ہیں.....“

”اگر وہ آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں تو آپ بدلے میں ان کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟“ میں نے ابرو اچکا کر ان سے پوچھا۔

”میں نے کیا، کیا ہے بدلے میں؟“ انہوں نے جواباً ابرو اچکا کر میری طرف دیکھا۔

ہم جانے کو تیار تھے، گھر سے نکلنے وقت میں گاڑی میں آگے پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی اور خالہ پچھلی سیٹ پر تھیں..... شہر کی حدود سے نکلنے ہی پاپا نے گاڑی روکی اور خالہ سے آگے آنے کو کہا، خالہ نے گاڑی سے نکل کر مجھے باہر نکالا، خود پہلے بیٹھیں اور اس کے بعد کھڑکی کی طرف مجھے بٹھایا.....

”میری بیٹی کھڑکی سے باہر دیکھے گی۔“ خالہ نے کہا تو مگر میرا تجسس مجھے بار، بار اندر دیکھنے پر مجبور کر دیتا، مجھے چاہے لاکھ برا لگ رہا تھا مگر میں کچھ کہہ نہ سکی۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ہی پاپا نے گاڑی روکی اور خالہ واپس پچھلی سیٹ پر چلی گئیں۔

میں نے انہیں بارہا پاپا کے بہت قریب دیکھا، ماما کے سامنے تو پاپا، خالہ کو اپنی بیٹیوں کی طرح کہتے تھے مگر نہیں..... کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، میں چھوٹی سی بچی سی مگر ماما کے ساتھ دھوکا ہو رہا تھا یہ بات میں سمجھ رہی تھی۔ اپنے گھر میں اتنے دھڑلے سے وہ پاپا کے ساتھ..... مجھے بھی غالباً وہ دودھ میں کچھ ملا کر دیتی تھیں کہ جب میں جاگتی تھی تو میں اس طرح تازہ اور چاق و چوبند نہیں ہوتی تھی جیسی میں اپنے گھر میں ہوتی تھی۔ پاپا کی خالہ کے ساتھ ”شفقت“ مجھے عروج پر نظر آتی۔ ہمارے گھر میں بھی میں نے کئی مواقع پر انہیں غلط انداز میں دیکھا تھا۔

بڑی ہوئی تو دیکھا کہ اکثر ہی خالہ میکے آئی ہوتیں کیونکہ ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی اس لیے وہ بچوں کی پڑھائی کی مجبوری میں بھی نہ بندھ سکی تھیں، دو ایک دن ثانی کے پاس رہ کر وہ اپنے باقی ماندہ دن ہمارے ہاں گزارتیں۔ خالہ آجاتیں تو ماما کے کئی رکنے ہوئے کام شروع ہو جاتے، ان کے ہوتے ہوئے وہ اپنی دوستوں سے ملتیں، پارٹیاں اٹینڈ کرتیں، اپنے رفاہی کاموں کے منصوبوں کو وقت دیتیں، خریداری کرتیں، گھر کے کئی رکنے ہوئے کام شروع ہو جاتے اور ماما اتنی مصروف ہو جاتیں کہ سارا گھر تانہ خالہ کے کندھوں پر آن پڑتا۔ شروع شروع میں مجھے محسوس

کو ”مجبوراً“ رکنا پڑا تھا، خالو صبح کے گئے رات کی خبر لاتے، خالہ کے سانس سر جانے کیا کھا کر سوتے تھے کہ دن بھر سوئے رہتے، پاپا تیار ہو کر نکلے، شاید کوئی کام کرنے جاتے ہوں گے مگر جلد ہی لوٹ آتے اور باقی دن گھر میں گزارتے، شام کو خالو کے آنے سے پہلے دوبارہ چلے جاتے اور رات گئے لوٹتے۔ میں صبح دیر تک سوئی تھی، اکثر میری آنکھ کھلتی تو اس وقت کمرے میں میرے علاوہ پاپا اور خالہ بھی ہوتے تھے، میری اس وقت سے متعلق کوئی اچھی یادیں نہیں تھیں، خالہ مجھے کچھ عجیب سی لگتیں، اپنے گھر میں بھی وہ اکثر اسی کمرے میں ہوتی تھیں جس میں میں اور پاپا سو رہے ہوتے تھے۔

ملتان سے واپسی پر خالہ ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں، خالو سے انہوں نے اجازت طلب کی، خالو اس روز گھر پر ہی تھے.....

”ابھی تو فاطش تمہارے پاس کچھ دن گزار کر جا رہی ہے، چند دن کے بعد میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا، ابھی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....“ خالو نے کہا تھا۔

”فاطش بہت اصرار کر رہی ہے.....“ خالہ منمنائی تھیں۔ ”اماں کو تو مستقل کوئی نہ کوئی مرض رہتا ہے، ان کی وجہ سے کیا میں پابند ہو کر رہ جاؤں؟ ابھی تو دانیال بھائی آئے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ چلی جاؤں گی، بعد میں.....“ خالہ نے خاصا اصرار کیا تھا۔

”میں چلا جاؤں گا تمہارے ساتھ۔“ خالو نے پیش کش کی۔

”کہاں سے آئے گا ایسا دن جب آپ کو میرے ساتھ جانے کی فرصت ملے گی، آج تک تو سورج کسی ایسی سمت سے نکلا نہیں کہ ایک مختلف دن طلوع ہو۔“ خالہ نے طنز کے تیر چلائے، ساری گفتگو ہمارے سامنے ہو رہی تھی۔

”بھئی بھیج دیں ناں ہماری بیٹی کو ہمارے ساتھ۔“ پاپا کا کہا خالو ٹال نہ سکے۔ خالہ نے اپنا سامان پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا۔ ”اجازت“ ملنے کی دیر تھی کہ

ہوتا ہے ہر روز

بہت مصروف ہوں میں
وقت بالکل بھی نہیں ملتا
کبھی بچوں کے جھگڑے ہیں.....
کبھی گھر کی پریشانی.....
کبھی ہیں جاب کے مسئلے.....
کبھی نمچرڈ کی من مانی.....
صبح سے شام ہو جاتی ہے
کیا کھانا پکانا ہے؟
اور یہ سوچوں بھی کہ
بچوں کے سنگ
کیا بچ جانا ہے؟
کیا اسکول کا بھی کام
یا
مجھ کو کرانا ہے
قضا ہو جاتی ہے اکثر نماز
اس جیل و جنت میں
میاں بھی ہوتے ہیں شامل
برابر اس فضیحت میں
میں تھک کر سو رہا تھا
کس لیے مجھ کو جگاتی ہو
پرانی دشمنی ہے کیا؟
جو ہنگامہ بچانی ہو
یوں ہی دن ڈوبتا ہے
رات کا آغاز ہوتا ہے
نئے دن کے لیے ایک
سوچ کا آغاز ہوتا ہے
پھر تھک کر لیٹتی ہوں
سوچ کو خاموش کرتی ہوں
تھکاوٹ سے میں سونے کو
یہ آنکھیں موند لیتی ہوں

شاعرہ: خولہ عرفان، کراچی

مستند ہوتی ہے، چاہے آپ اس کے مستحق ہوں یا نہ ہوں۔“ میری آنکھوں میں خواہ مخواہ آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆

”مما..... اتنی بڑی بات آپ نے کیونکر سوچ لی، ہوا کیا ہے؟“ میں نے اسود کے سو جانے کے بعد اسے ماما کے کمرے میں لٹا کر واپس آ کر ماما سے پوچھا۔
”میں برسوں سے سوچ رہی تھی بیٹا، بہت برداشت کے ساتھ رہ رہی تھی، اب مجھ میں مزید برداشت کی گنجائش نہیں رہی۔“ ماما نے گہری سانس لی۔
”پھر بھی ماما، ایسا کیا مختلف ہوا ہے اب آپ کے اور پاپا کے بیچ؟“ میں نے ماما سے پھر سوال کیا۔
”ہم دونوں میں بظاہر جتنی دہنی ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ دوسروں کو نظر آتی ہے بیٹا، اندر سے ہم دریا کے ان دو کناروں کی طرح ہیں جو عمر بھر ساتھ، ساتھ چلتے ہیں مگر کہیں مل نہیں پاتے، جہاں دریا کے کنارے ملتے ہیں وہ دریا کا اختتام ہوتا ہے.....“
”میں کبھی نہیں ماما!“

”تمہارے پاپا نے ہر راہ جاتی عورت سے مراسم رکھے ہیں بیٹا..... میں ہی کافی عرصہ لاعلم رہی، اب معلوم ہوا ہے تو اندازہ ہوا کہ میں تو ان کی زندگی میں کہیں تھی ہی نہیں۔“ ماما کی آنکھیں نم تھیں۔ انہوں نے نہ تو کوئی کیٹلی چھوڑی ہے میری، نہ رشتے دار اور نہ ہی کوئی ملازمہ..... مجھے تو تم سے یہ سب باتیں کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے مگر میں کس سے بات کروں، نہ کروں تو دل پھٹ جائے گا میرا!“

”مما..... آپ مجھ سے جو بات بھی کریں گی وہ ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی، مگر نہ کریں، آپ یقین رکھیں کہ ہم سب بیٹیاں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔“ میں نے یقین دلایا۔ مجھے بھرپور اعتماد اور یقین تھا کہ جب سب بیٹیاں ماما کی بات کو سنیں گی تو انہیں حق بجانب سمجھیں گی۔ ماما کی آخری بات پر مجھے ہنسنے یاد آیا۔ ”ماما کیا نام تھا ہماری اس ملازمہ کا جسے آپ نے گھر سے نکال دیا تھا؟“

تاجہ کی ہے، مجھے اشعر کے بارے میں کچھ اچھی رپورٹیں نہیں ملیں، سنا ہے کہ اشعر اور طرح کا نوجوان ہے، دل پھینک سا، لا ابالی سا..... اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔“

”مردوں کا کیا ہے پاپا، انہیں دوسری عورتوں سے دوستیاں پالنے کے لیے تو کسی جواز، کسی وجہ اور کسی عمر کی قید نہیں..... لڑکپن میں بھی پالتے ہیں، بیاہ سے پہلے بھی اور بیاہ کے بعد بھی، سچے نہ ہوں تب بھی اور ہوں تب بھی..... گھر میں چار، چار بیٹیاں ہوں تو بھی بیوی کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتے ہیں۔“ پاپا جانے میرے اشاروں کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر انہوں نے اس رشتے کی مخالفت کرنا چھوڑ دی۔ بعد میں انہوں نے ہی ماما کو قائل کر لیا تھا۔

”جس شخص کے بارے میں شادی سے پہلے سے ہی علم ہو کہ وہ ایسا ہے..... ایسا تو آنکھ دیکھی کبھی نکلنے کے برابر ہے بیٹا؟ پاپا نے دلیل دی۔
”کم از کم اعتماد کرنے والے کو دھوکا دینے سے تو کم بڑا جرم ہے یہ پاپا.....“ میں نے کہا۔ ”جانتی ہوں گی کہ وہ ایسا ہے تو اس پر نظر رکھوں گی..... ماما کی طرح جو عورتیں اپنے شوہروں پر اندھا اعتماد کرتی ہیں ان کے ساتھ کیا اچھا ہوتا ہے پاپا؟ ان کے شوہر انہیں دھوکا نہیں دیتے کیا؟“

”تم کیا اول فول بات کر رہی ہو بیٹا..... اس معاملے میں جو بات ہو رہی ہے اس پر میں نے اپنی رائے دی ہے.....“

”میری رائے بھی آپ کی رائے کا جواب ہے پاپا!“ میں نے ان کی طرف دیکھ کر دھک سے کہا۔
”میں کوشش کروں گا بیٹا کہ تمہاری ماما کو اس معاملے میں قائل کر سکوں.....“ پاپا نے خود ہتھیار ڈالے اور مدعا ماما پر ڈال دیا۔

”ماما آپ پر اعتماد کرتی ہیں پاپا اور آپ کی بات مانتی ہیں..... وہ آپ کو خدا کے بعد اس دنیا میں سب سے معتبر سمجھتی ہیں، آپ کی بات ان کے لیے

آنکھوں میں آنسو تھے۔“ وہ میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں، بیٹا کہتے ہیں مجھے اور اپنی بیٹیوں جیسا ہی سمجھتے بھی ہیں اور اسی طرح میں ان کی عزت کرتی ہوں، تم نے ایسا سوچا بھی کیونکر؟“ وہ ہنسیوں سے رونے لگیں، ماما جانے اس غلط وقت پر کیوں کمرے میں آ گئیں۔

”کیا ہوا تانو میری جان، کیوں رو رہی ہو بیٹا؟“ انہوں نے بیٹھ کر خالہ کو گلے سے لگا لیا، وہی خالہ جو ان کی پیٹھ میں نجر گھونپ رہی تھیں۔

”کچھ نہیں حنا آ پی..... بابا یاد آ گئے تھے..... میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی دانیال بھائی کو باپ جیسا دیکھا ہے، اسی لیے بھاگ کر یہاں آئی ہوں کہ یہ گھر مجھے اپنے میکے جیسا لگتا ہے.....“

”ہے ناں تمہارا میکا.....“ ماما بھی جذباتی ہو گئیں۔ ”کس نے کہا ہے کہ نہیں ہے ایسا؟“

”یونہی دل میں خیال آیا کہ کہیں کسی کو میرا یہاں آنا، یہاں آ کر کئی، کئی دن تک رہنا کھٹکتا نہ ہو!“

”ارے کیوں پانگلوں جیسی سوچ پالنے بیٹھی ہو تم، میں اور دانیال دونوں تمہیں اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں اور بچیاں سب کی سب تم پر جان دیتی ہیں۔“ ماما نے پیار سے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، خالہ مکاری سے آنسو بہا رہی تھیں..... اس کے بعد میری کسی سے کچھ کہنے کی کیا تاب ہوتی۔

☆☆☆

پاپا کے ساتھ بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اس پر بات ہو چکی تھی..... جب اشعر کا معاملہ میں نے گھر پر اٹھایا تو ماما اور پاپا دونوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، پاپا ہم بیٹیوں کے معاملے میں نسبتاً دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اس لیے میں نے انہیں ہی قائل کرنے کا سوچا، وہ مان جاتے تو ماما کو خود ہی منا لیتے۔ میں نے ماما اور پاپا کے درمیان شروع سے ہی انتہا کی دہنی ہم آہنگی دیکھی تھی، ماما کو پاپا پر بے حد اعتماد تھا، جس کے شوق ہونے میں مجھے شکوک تھے۔

”بیٹا..... میں نے اس کے بارے میں پوچھ

”پائل..... نام تھا اس کا!“ ماما جیسے نیند میں بولی تھیں، انہوں نے ذہن پر ایک لمحے کو بھی زور نہیں ڈالا۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں اس کی یاد اتنی بری طرح ثبت تھی کہ اس کی تفصیل یاد آتے ہی میرے جسم کا سارا لہو گرم ہونے لگتا، کیسی بے حیا لڑکی تھی وہ، میں ہمیشہ سوچتی۔ اس زمانے میں ماما تو ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے بوتلک چلی جاتیں اور ہم ساری بہنیں اپنے اسکول کاٹ چکی جاتیں تو اس وقت وہ آیا کرتی تھی، ہم اسے صرف اپنی چھٹی کے دن دیکھتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب گھر پر ہوتیں اور ماما کے جاتے ہی اپنا، اپنا کام لے کر لاؤنج میں بیٹھ جاتیں، پاپا تیار ہو کر نکلتے، ہم سب کے ساتھ بیٹھتے، وہیں لاؤنج میں ناشتا کر کے ہم سب کے ساتھ تھوڑی دیر گپ شپ لگاتے۔ پائل آتی تو وہ اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم میں چلے جاتے اور اوپر سے آواز لگاتے۔

”پائل! جلدی سے آ کر میرے اسٹڈی روم کی صفائی کر دو، پھر مجھے جانا بھی ہے..... میری چیزیں یہاں ترتیب سے پڑی ہوتی ہیں، میری عدم موجودگی میں کوئی صفائی کرے تو سب الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔“

پائل صفائی کا سامان اٹھا کر اوپر چلی جاتی۔ ہم سب بہنیں لاؤنج میں ہی بیٹھ کر اپنا کام کرتیں، جب کمرے کی صفائی کر کے پائل نیچے آ جاتی تو پاپا اس کمرے کو لاک کر کے، نیچے آ کر ہم سب بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر دفتر چلے جاتے، پائل باقی گھر کی صفائی کا کام اس کے بعد کرتی تھی۔ پاپا کے کمرے کی صفائی کے بعد میں نے بارہا اس کے گریبان سے جھانکتے لال، لال نوٹ دیکھے، جو فرش پر جھاڑو پوچھا لگاتے ہوئے اس کی قمیصوں کے بھاڑ سے گلوں میں سے جھانک رہے ہوتے تھے۔ کبھی کبھار میں سوچتی کہ اس سے پوچھوں کہ کیا اس نے وہ نوٹ کہیں سے چوری کر کے اپنے گریبان میں چھپائے ہیں مگر کبھی پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

اس روز میں لاؤنج میں باقی بہنوں کے ساتھ کام کرنے کے بجائے نہانے کے لیے چلی گئی، نہا کر آئی تو باقی سب لاؤنج میں حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھیں، نصف سڑھیوں تک پہنچ کر مجھے اسٹڈی روم میں سے گھٹی، گھٹی آوازیں سنائی دیں، میں نے دروازے کو ہلکا سا دبا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا..... کاش میں نے اس دروازے کو نہ کھولا ہوتا تو میں عمر بھر اس تاثر میں رہتی کہ میرے پاپا فرشتوں جیسے ہیں..... میں لاکھ چاہ کر بھی کسی سے وہ بات شیر نہ کر سکی، ماما کو بتانا چاہتی تھی مگر سوچا کہ وہ بہت دکھی ہوں گی۔ پھر وہ دن بھی یاد ہے جب اسے ممانے چیخ، چیخ کر گھر سے نکالا تھا، تب مجھے سمجھ میں آیا کہ ممانے ضرور اس کی چوری پکڑی ہوگی، ہم بہنوں نے ماما سے پوچھا بھی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا، ہم بھی اس واقعے کو بھول بھال گئے تھے، آج اتنے سالوں کے بعد ممانے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ پاپا نے کسی ملازمہ کو بھی نہیں چھوڑا تو مجھے یاد آ گیا۔

☆☆☆

”صفد کوزوں بریک ڈاؤن کیوں ہوا احمد؟“ میں جانتا چاہتی تھی کہ اس نے ماما کی بات کا ہی اتنا اثر لیا تھا یا کچھ اور مسئلہ تھا، صبح جاگتے ہی فون کو آن کیا تو اسکرین پر احمد کے نام کا پیغام تھا، میں نے اسے پڑھا اور میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ وہ ماما کے سب سے قریب تھی، اسے ماما سے بہت زیادہ پیار تھا اور ماما بھی اسے بہت چاہتی تھیں، وہ ہم سب سے الگ سی تھی، حساس طبیعت رکھنے والی اور اسے اچانک زوں بریک ڈاؤن ہونا باعث تشویش تو تھا ہی۔

”کچھ معلوم نہیں رانیہ آپ!.....“ احمد نے کہا۔

”بس بے ہوشی میں بہت عجیب، عجیب باتیں دہراتی رہی ہے، ماما کے لیے اداس ہے شاید!“

”ہوں!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سنا نہیں غور سے کہ وہ بے ہوشی میں کیا بڑبڑاتی رہی ہے؟“ میں نے یہ جاننے کو کہ کہیں صفد نے..... بے ہوشی میں اس راز کو فاش نہ کر دیا ہو جسے ہم خود سے بھی

چھپاتی پھر رہی تھیں۔

”بس آپ!، وہ یہی کہہ رہی تھی کہ ماما آپ اداس نہ ہوں، پریشان نہ ہوں، اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کچھ ہفتوں کے لیے پاکستان بھجوادوں آپ!“

”ہوں!“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میں تو اس کا سن کر پریشان ہو گئی تھی اور عابد سے کہہ رہی تھی کہ دو ایک دن کے لیے میں اسے دیکھنے کے لیے لندن چلی جاؤں، مصطفیٰ کو عابد کے پاس چھوڑ آؤں گی.....“ میں نے احمد کو اپنا پروگرام بتایا۔

”اچھا.....“ احمد نے کہا۔ ”آپ بھی پاکستان کا پروگرام کیوں نہیں بنا لیتیں آپ؟“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”ممائی جان کو آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے!“

”کیوں..... ماما کو ہماری مدد کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، شک ہو رہا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ علم تو ہے۔

”وہ صفد ہی بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی کہ ماما پریشانی میں اکیلی ہیں، انہیں میری ضرورت ہے، وہ تنہا ہیں..... اور ایسی ہی کئی باتیں۔“ اس کے انکشاف نے میرے شک کو تقویت دی کہ صفد نے اس سے بڑھ کر بھی کچھ نہ کچھ انکشافات کیے ہوں گے۔

”ماما کیوں تنہا ہوں گی احمد..... پاپا جو ہیں وہاں، گھر میں فاطمہ ہے، اسود ہے..... اور بابا ماما کا کتنا خیال رکھتے ہیں، تم سے بڑھ کر اپنے ماموں کو کون جانتا ہوگا۔“ میں نے رساں سے کہا۔

”کبھی کبھار لوگوں کی بھیڑ اور میلے میں بھی انسان تنہا ہو جاتا ہے آپ!“ اس نے فلسفہ بھگا رہا تھا۔

”ارے ماما بہت زندہ دل خاتون ہیں، تم تو جانتے ہی نہیں کہ ماما ہم سب سے بہادر ہیں، ہم سب مل کر بھی اتنی بہادر نہیں ہو سکتیں۔“

”بہادری کا دلوں کی شکست و ریخت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا آپ!“

”صفد کی بیماری نے تو تمہیں فلسفی بنا دیا ہے۔“

زندگی خاکہ بہ تھی

میں نے ہنس کر اس کی بات کو اڑایا۔ ”چلو دیکھ لو کیا پروگرام بنتا ہے صدف کا، پھر بتانا مجھے.....“

”صدف کی تو اس ویک اینڈ کی فلائٹ پر سیٹ بک کروادی ہے میں نے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ فاطمہ اور نیلم تو وہیں ہیں..... صدف بھی چلی جائے گی، میں دیکھتی ہوں اگر ایک ہفتے کی چھٹی مل جائے تو میں بھی چلی جاتی ہوں، ماما جانے کس مشکل میں ہیں“ میں نے سوچا۔

☆☆☆

”شکر ہے کہ آپ کا واپس آنے کو من چاہا۔“ رات دیر سے لونی تو عمر نے مذاق سے کہا تھا۔

”میرا تو من چاہ ہی نہیں رہا تھا واپس آنے کو، بس ناہید آپ کے آنے کا سوچ کر واپس آ گئی۔“ میں نے بھی جواباً مذاق سے کہا۔

”اچھا.....“ انہوں نے لمبی سی اچھا کی۔ ”کیا ضرورت ہے اتنی پروا کرنے کی ناہید آپ کی بھی، چلی جانا واپس صبح سویرے۔“

”کرنا پڑتی ہے ناں پروا پاپا!“ میں نے ان کے شانے سے سر لگا کر کہا۔

”کیوں، اتنی مجبوری ہے پروا کرنے کی؟“

”وہ میرے جان سے پیارے شوہر کی جان سے پیاری بہن جو ہیں.....“ میں نے ادائے دلربائی سے کہا، شاید یہ وقت تھا ان سے اپنی بات منوانے کا۔ ماما سے مل کر آئی تو حد درجہ پریشان تھی مگر ماما کا ہی سکھایا ہوا سبق تھا کہ سسرال کے مسائل کو میسکے ساتھ نہ لے کر آؤ اور میسکے کے مسائل کی فکر میں دبے ہوتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو متاثر نہ کرو، اسی لیے میں نے ماما کی پریشانی میں اپنے ڈوبتے ہوئے دل کی بھی پروا نہ کی اور عمر سے اس پیار سے بات کی..... جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جو بھی کچھ ماما اور بابا کے بیچ چل رہا تھا وہ جانے کس طرح ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتا مگر اب ہمیں اپنے، اپنے گھروں میں خود ہی نارمل رہنے کی کوشش کرنا تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی شتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی مائریل کوالٹی، کپی رائٹ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

زندگی کبھی کبھی کن راہوں پر لاکھڑا کرتی ہے کہ راستے سامنے نظر آتے ہوئے بھی قدم نہیں اٹھتے..... ایسی ہی ایک عورت کی کہانی کا اگلا قدم..... آئندہ شمارے میں پڑھیے۔

ہو جاتی ہے وہاں کچھ نظر نہیں آتا، جہاں ماں باپ اپنی اولاد کی نظروں میں پسندیدگی دیکھ لیتے ہیں وہاں باقی سب کچھ پس پشت چلا جاتا ہے....." میری بات ابھی جاری تھی کہ عمر نے کروٹ بدلی اور اپنی سائڈ نیبل کی دراز کھولی، میرا دل دھڑکنے لگا کہ اب جانے اس میں سے کیا نکلے گا، شاید ریوالور! میں اندر سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی، انہوں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

"تمہیں بلی نے خود بتایا ہے کہ اسے نیبل پسند ہے یا اماں نے تمہیں بتایا ہے؟" ان کا سوال انتہائی پیچ دار تھا، میں بلی کا کہتی تو وہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور اس سے پوچھتے، اماں کا کہتی تو جا کر اماں سے جواب طلبی کرتے، دونوں ہی مشکل صورت حال تھیں کیونکہ اماں نے کہا تھا کہ ان کا ذریعہ میں نہ آئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کسی دوسرے کے کیس کو لڑنا، وہ بھی اس صورت میں کہ مدعی خود سامنے نہ آنا چاہتا ہو، کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

"کیا میں بلی کی ماں نہیں عمر؟ کم سن لڑکیوں کے دلوں کی گیلی مٹی میں جب محبت کا بیج گرتا ہے تو مائیں فوراً محسوس کر لیتی ہیں....." میں نے دل کڑا کر کہہ دیا کہ جو فوری طور پر میرے ذہن میں آیا تھا۔ "کیا ایک ماں کو بیٹی کے دل کا حال جاننے کے لیے اسی کی زبان سے سننا ہوتا ہے؟" عمر گہری نظر سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔

"کون سی ماں..... کس کی ماں؟" عمر پوچھ رہے تھے..... "تم یا اماں؟"

"اچھا....." عمر نے مسکرا کر مجھے اپنے قریب کر لیا۔ "میری جان سے پیاری نیل!" میرے اندر سکون اترنے لگا اور میں ہر فکر کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گئی۔

"عمر....." میں نے ہولے سے پکارا۔ "جان عمر!" جواب آیا۔ "اگر میں آپ سے کہوں کہ بلی بھی نیبل کو پسند کرتی ہے تو؟" میں نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ جواباً عمر نے اپنی آنکھیں موند کر سینے کی گہرائی سے سانس لی، ان کے لب بھینچے ہوئے تھے۔

"میں ایک بار بہت بے عزت ہو چکا ہوں نیل....." انہوں نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کے بیٹے نے ایک بار میری بیٹی کو پسند کیا۔ پھر اسے ٹھکرایا، اب کسی کے ہاتھوں وہ خود ٹھکرایا گیا ہے تو اسے دوبارہ میری بیٹی پسند آنے لگی ہے؟"

"اس نے تو جو کیا سو کیا عمر..... میں تو بلی کے دل کی بات کر رہی ہوں۔" میں نے پھر کہا۔ "لڑکیوں کی آنکھوں میں کئی عمروں میں جو خواب سج جاتے ہیں عمر، وہ پورے نہ ہوں تو لڑکیاں کم ہی خوش رہتی ہیں۔" میں اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص سے نہیں بیاہ سکتا نیل جس کے دل پر، سوچوں پر، میری بیٹی سے پہلے کسی اور کا قبضہ رہا ہو..... میری بیٹی کسی کی دوسری چوائس ہو، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"برداشت تو انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے عمر!" انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے ہمت جمع کی۔ "لوگ اپنی کنواری بیٹیوں کی شادیاں ایسی جگہ بھی تو کر دیتے ہیں جہاں نہ صرف دل اور سوچوں پر کسی اور کا قبضہ رہا ہوتا ہے بلکہ ان کے تعلق کی کئی، کئی نشانیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔" میری بات عمر کو یوں لگی جیسے کسی پر آسانی بجلی گرتی ہے..... "مگر ماں باپ ایسا کرنے کو اس لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے جہاں محبت



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-



- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیک سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایف سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ ہر ای بک کو الٹی، ہر ای بک کو الٹی، کپی ریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نے بھی ہوش سنبھالتے ہی اس قیمتی خزانے کی قدم، قدم پر حفاظت کی تھی۔ کسی کی میلی آنکھ کی چبھتی تیز نظر بھی برداشت نہیں کی تھی۔ اس کا مزاج بھی فطرتاً تیکھا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وقت کے دھارے

ماں نے کہا تھا کہ اس دنیا میں ہر شے کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔ سوائے عزت کے..... عزت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ یہ انمول شے ہوتی ہے۔ کسی قیمتی خزانے کی طرح..... اور ماں کی تربیت میں اس



میں بیٹے، گھات لگائے حالات کی تندی دہشت کے
تھیڑے ایک دن اس کے مضبوط قدم ڈگمگادیں گے
یا شاید مامتا کا جذبہ، اولاد کی محبت ہی اتنی زور آور
ہوتی ہے۔ وہ مضبوط سے مضبوط ارادوں کی چٹانوں
میں شکاف ڈال دیتی ہے۔

چنداں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ لیکن اس
نے حالات کی سختی کو مجبوری کی بیڑی بنانے کے
 بجائے حالات کو اپنے فیصلے کی ثابت قدمی سے
ٹکست دے دی۔

☆☆☆

لال حویلی میں آج کل جشن کا سماں رہتا تھا۔
چھوٹے ملک یا اور خان کے بیاہ کا سلسلہ چل رہا تھا۔
سو گاؤں کے ہر گھر کی بیٹھک سے لے کر چوپال اور
چوپال سے لے کر چوک اور تھڑوں پر ملک یا اور خان
کے بیاہ کا چرچا رونق لگائے تھا۔ ہر زبان پر ملک یا اور
کے بیاہ کا قصہ تھا۔ چھوٹے ملک کا بیاہ ساتھ والے
گاؤں کے زمیندار چوہدری دلدار خان کی اکلوتی بیٹی
شہزادی سے طے ہوا تھا۔ جو جہیز میں پورے پچاس
مربع زمین ساتھ لارہی تھی۔ جس کے باعث بڑے
ملک کے ساتھ، ساتھ چھوٹے ملک کا سینہ بھی فخر سے
پھولا، پھولا رہنے لگا تھا۔

ماں، باپ کی آنکھ کا تارا شہزادی بڑی بھاگوں
والی تھی۔ مکے کی طرح اب سسرال میں بھی بختاں
والی مشہور ہوئی تھی۔ چھوٹے ملک کے تو خوشی سے
پاؤں ہی زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ برادری میں
اس بیاہ کے بعد اس کی حیثیت مزید با اثر اور مستحکم
ہونے جا رہی تھی تو دوسری طرف اس کے باپ
بڑے ملک سخاوت کا بھی شملہ اور اونچا ہو گیا تھا۔
شہزادی صرف نام کی شہزادی نہ تھی۔ روپ
سروپ میں بھی شاہوں کے محلوں کی رانیوں جیسی آن
بان رکھنے والی حسینہ تھی۔ سو یا اور ملک اپنے بیاہ پر
بہت خوش تھا۔

البتہ گاؤں کے ایک غریب کے مکان
میں رہنے والے مختارے اور ریشماں کی اکلوتی بیٹی
چنداں بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی اپنے ماں،
باپ کے لیے..... جنہوں نے اسے رانی کی طرح
نازوں سے پالا تھا۔

وہ اپنے ماں، باپ کی لاڈلی، دونوں کی آنکھوں
تار تھی۔ ریشماں ان پڑھ تھی مگر اس نے چنداں کی
بہت اچھی تربیت کی تھی۔ اور چنداں تو سارے
گاؤں میں اپنے سوہنے روپ سروپ کی وجہ سے
مشہور بھی تھی۔ نام چنداں رکھا تھا ماں، باپ نے تو
وہ بھی چاند کی طرح راج کے سوہنی تھی۔ اوپر سے
دونوں کے لاڈ پیار نے اس کے مزاج بھی شاہانہ
کر دیے تھے۔ وہ سارے گاؤں میں اپنی سہیلیوں
کے ساتھ راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے اٹھیلیاں
کرتی پھرتی تھی۔

کم سنی اور بے فکری کی زندگی نے اس کی
ساتھی ہم جولیاں کو اس پر رشک بھری نگاہوں سے
دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں گاؤں کے
لڑکے بالے بھی چنداں سے بات کرنے کے بہانے
ڈھونڈا کرتے تھے۔

لال حویلی میں چھوٹے ملک کے بیاہ کی وجہ
سے حویلی کے کاموں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سو بڑی
ملکانی نے حویلی کی ملازماؤں پر حکم صادر کر دیا کہ اپنے
اپنے گھروں سے حویلی کے کام کاج کے لیے اپنی
بیٹیوں کو ساتھ لے کر کام پر آئیں تاکہ حویلی میں پھیلے
بیاہ کے بکھیڑوں کے چھوٹے بڑے سارے کام
جلدی، جلدی نیٹ جائیں۔ ریشماں اور شاداں کو
بھی یہی تاکید کی گئی تھی جو آپس میں نند بھانج تھیں۔
ریشماں اور شاداں کے مرد گاؤں کے سرخ اینٹوں
کے بھنے پر کام کرتے تھے۔ اور گاؤں کے صدیوں
پرانے رواج کے مطابق گاؤں کے غریب مرد ملکوں
کے کھیت کھلیانوں کی ذتے داری سنبھالتے تھے اور

ان کی عورتیں حویلی کے بکھیڑے بناتے بناتے سویر
اندھیرے سے شام کرتی تھیں۔ اس لیے ریشماں
اور شاداں بھی یہ بیگاری کرنے پر مجبور تھیں۔ اب یہ
زمیندار کی بیگاری تھی یا پشتی غلامی جو گاؤں کے ہر
ہر غریب پر حویلی کی چاکری لازم تھی۔ گاؤں
میں پیدا ہونے والا ہر غریب گاؤں کے زمیندار کا
پیدا کسی غلام تھا۔ اور یہ غلامی ان کا مقدر بن چکی تھی۔
بڑی ملکانی کی حکم عدولی کی بھلا کسے جرات تھی
مگر ریشماں اور شاداں پریشان ہو گئی تھیں۔ شاداں
کی بیٹی رانی تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔ صرف گیارہ
برس کی جبکہ ریشماں کی لاڈورانی چنداں سولہ برس کی
ہو کر بھی بچوں کی طرح ماں، باپ سے لاڈ اٹھواتی
تھی۔ لہذا ریشماں اور مختارے نے بھی اس کی کوئی
خواہش بھی رو نہیں کی تھی۔

شاید ماں، باپ کی طرف سے طے پیار و محبت
نے چنداں کی ذات میں حد درجہ خود اعتمادی پیدا
کر دی تھی۔ وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ وہ خود کو اپنے
ماں، باپ کے گھر کی رانی سمجھتی تھی۔ دوسرے
قدرت نے روپ سروپ بھی جی کھول کر فیاضی سے
عطا کیا تھا۔ دودھیارنگت پر سرخ ٹھاڑ جیسے گال اور
ہونٹوں کی لالی نے چنداں کے نو خیز حسن کو جو تازگی و
رعنائی دی تھی۔ عمر کی اس نو خیزی اور جوانی کے الہڑ
پن نے اس کی دو شینگی میں خاص کشش پیدا کر دی
تھی۔ جس پر گاؤں کا ہر گھرو جوان مرٹھے کو تیار تھا
لیکن چنداں کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ کچھ ماں کی
تربیت کا اثر تھا تو کچھ کمالے کی محبت کا خمار تھا۔ جس
نے ہمہ وقت چنداں کے دل و دماغ کو اپنے حصار
میں لے رکھا تھا۔ کمال اس کی پھوپھو شاداں کا بیٹا تھا۔
شاداں اور رحیم داد کے دو ہی بچے تھے۔ بڑا بیٹا کمال
جسے پیار سے سب کمالے کہتے تھے۔ اور چھوٹی بیٹی
رانی..... کمال اٹھارہ برس کا گھرو جوان تھا۔ شاداں
اور رحیم نے بچپن میں ہی چنداں کو کمال کے لیے مختار

انمول دولت

اور ریشماں سے مانگ لیا تھا۔ یوں وہ بچپن سے
کمالے کی منگ (منگیترا) تھی۔

کمال بھی باپ اور ماموں کی طرح گاؤں کے
اینٹوں کے بھنے پر مزدوری کرتا تھا مگر چنداں سے
اسے بہت پیار تھا۔ چنداں بھی اسے جی جان سے
پسند کرتی تھی۔ اگلے سال ان کا بیاہ بھی طے تھا۔ یوں
وہ دونوں ہی ایک، ایک دن گن رہے تھے کہ اب
اچانک بڑی ملکانی کے حکم نے ریشماں کو تذبذب
میں مبتلا کر دیا۔ وہ تو یہ سوچ، سوچ کر ہلکان ہوئی
چار ہی تھی کہ وہ چنداں کو اپنے ساتھ حویلی کام پر لے
جانے کے لیے کیسے تیار کرے گی۔ شاداں بھی یہ
بات جانتی تھی لیکن وہ ریشماں اور چنداں کے لیے
چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ ریشماں کو تسلی
ضروری تھی مگر گھر آ کر بھی ریشماں پریشان ہی رہی
تھی۔ مختارے کو پتا چلا تو وہ بھی چنداں کے لیے فکر
مند ہو گیا تھا وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ
بڑے، بڑے زمین دار، جاگیر دار صرف اور صرف
خالق و جابر نہیں ہوتے بلکہ ان کی حکم عدولی کی
سزا میں بھی بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ بدن سے روح
کھینچ لیتی ہیں۔ جیتے جاگتے گوشت پوست کے
انسانوں کو مٹی میں ڈال دیتی ہیں۔ جیسے وہ زمین پر
ریٹکنے والے حقیر سے کیڑے مکوڑے ہوں۔

غرض زمین پر اس خدائی فوج دار کا بڑا ادب یہ تھا
غریب انسانوں پر جو چوہدری سخاوت کی غلامی کی
موٹی، موٹی مضبوط زنجیروں میں آج بھی جکڑے
ہوئے بے بس و کمزور تھے۔

سو ریشماں اور مختار بھی اسی خوف میں مبتلا
تھے۔ جس کی دھاک بڑے ملک کے مظالم نے
پورے گاؤں کے غریبوں پر بٹھا رکھی تھی۔

ریشماں نے جب حویلی سے واپسی پر گھر آ کر
مختارے سے بات کی تو وہ بھی حقے کی نے چھوڑ کے
گم سم ریشماں کے تھکے ہوئے چہرے کے ماتھے کی

میلا ہوتا ہے۔ نوری کہہ رہی تھی۔ یہ وڈی حویلی ہے ملکوں کی۔ چنداں نے معصومیت سے کہا تھا۔ اس نے حویلی اندر سے نہیں دیکھی تھی مگر اب نوری کی زبانی حویلی دیکھنے کا اشتیاق اسے بھی ہونے لگا تھا لیکن اس معصوم نے حویلی کے کینوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتی تو کبھی ان پتھر کی اونچی ظالم دیواروں کی طرف رخ کرنے کا کبھی سوچتی بھی نہ.....!

چار پائی سے اٹھ کر صحن کی ایک طرف بنے چولھے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اور مختارے نے کمر سیدھی کرنے کے لیے کروٹ لی تھی۔ دن بھر سرخ اینٹوں کے بھٹے کی گرمی اور سختی اس کے سانولے چہرے پر تھکن کی صورت بکھری پڑی تھی۔ اب اس نے مغرب کے بعد روٹی کھانے کے لیے ہی اٹھنا تھا۔ ریشماں مطمئن ہو کر کام میں جُت گئی۔

☆☆☆

”اماں..... لال حویلی میں تو بڑی رونق میلا لگا ہوگا۔ ڈھولک رت جگا بھی ہوگا..... اور بیٹھے گڑ والے گولے بھی بنیں گے..... جیسے بڑی ملکائی کی دھی رانی کے بیاہ پر بنے تھے۔ نوری نے بتایا تھا مجھے..... ہے ناں اماں.....“ چنداں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تھا۔ جواباً ریشماں مسکرانے لگی تھی۔

”ہاں وہ تو روز ہی ہوتا ہے، بڑی رونق لگی ہے حویلی میں۔“

چنداں رسوئی میں روٹی پکاتی ریشماں کے پاس بڑی چوکی پر بیٹھی اشتیاق سے ریشماں سے حویلی میں ہونے والے بیاہ کی تیاریوں کے بارے میں ریشماں کی باتیں سن رہی تھی۔ اور ریشماں نے بھی بڑی سمجھداری سے کام لے کر چنداں کو حویلی ساتھ لے جانے کے لیے کام کاج کی بات گول کر کے چھوٹے ملک کے بیاہ کے جشن میلے کی لالچ دی تھی۔

”ہاں دھی رانی..... بیٹھے گڑ کے گولے بھی بنیں گے اور نمکین بیٹھے چاول بھی..... کھوئے والی مٹھائی بھی بنے گی پھر تو کل سویرے ساتھ حویلی چلے گی ناں.....“ ریشماں نے چنداں کی اشتیاق اور خوشی سے چمکتی آنکھوں کی معصوم روشنی سے نگاہیں چراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ضرور چلوں گی اماں..... مجھے ڈھولک رت جگا دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ نوری بتا رہی تھی بڑا رونق

ہوگئی ہے۔ ہم تو جدی پشتی غلام ہیں ملکوں..... (زمینداروں) کے!“ مختارے نے بے بسی سے کہا تھا۔ وہ چار پائی کے کونے پر ٹیک لگائے بیٹھا حقے کی منہ میں دبائے کش لے رہا تھا۔ پریشانی سے اور بے مزہ ہو کر حقے کو پرے کیا تھا اس نے.....

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں چنداں کے ابا..... چنداں سے کیسے بات کروں صرف چھوٹے ملک کے بیاہ تک کی تو بات ہے۔ پھر ہم نے کون سا اسے ساری عمر حویلی کی چاکری کے لیے بھیجنا ہے۔“ ریشماں نے بالآخر تھکے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ مسئلے کا حل نکالا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر تو خود ہی اپنی لاڈورانی سے بات کر لینا مگر میں نے تو سوچ لیا ہے۔ اس بڑے تہوار پر شاداں، بہن اور رحیم بھاسے کمال اور چنداں کے بیاہ کی پکی تاریخ مانگ لوں گا۔ لڑکی ذات بڑی بھاری ذتے داری ہوتی ہے۔ اب چنداں کا بیاہ بھی ہو جانا چاہیے۔ بیٹی کو وقت پر رخصت کر دینا ہی سمجھداری ہے۔ ہمیں بھی اپنے کاندھوں کو جلد ہی اس ذتے داری سے ہلکا کر لینا چاہیے۔“ مختارے نے اپنی سوچ کے مطابق سمجھداری کی بات کی تھی اور ریشماں بھی جہاندیدہ عورت تھی۔ مختارے کی بات کی گہرائی میں چھپے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی جبکہ مختارے نے حقہ ایک طرف کر کے پاؤں سپارے تھے۔

”بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے چنداں کے ابا..... میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اس عید تہوار پر چنداں کے ہاتھ پیلے ہو جانے چاہئیں..... پر تو فکر مت کر حویلی جانے کے لیے اپنی دھی رانی کو آپے ہی منالوں گی۔ کام کاج نہ سہی، پر بیاہ کے گھر کی رونق، میلے کاسن کر چنداں مان ہی جائے گی۔ تو بے فکر ہو کر آرام کر..... میں تب تک رات کے لیے روٹی ڈال لوں جا کر..... پھر اس سے بات بھی کر لوں گی۔“ ریشماں اپنے دکھتے ہوئے کھٹنوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے

لکیریں گننے لگا۔

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا چنداں کی ماں..... یہ کیسے ہوگا..... اپنی چنداں تو حویلی جانے کے لیے کبھی نہیں مانے گی..... اور تو نے تو اسے حویلی کا چھالا بنا کے رکھا ہے..... وہ نمائی بھلا حویلی کے ڈھیروں کام کیا کرے گی۔ اسی لیے تجھ سے کہتا تھا..... لڑکی ذات ہے وہ..... کل کو اسے بیاہ کر سسرال بھی روانہ کرنا پڑے گا..... مگر تو میری سستی کب تھی۔“ مختارے نے چار پائی کے کونے پر پریشان بیٹھی ریشماں کو شکایتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”مجھے پتا ہے..... لڑکی ذات ہے وہ..... پر وہ میری ایک تو دھی رانی ہے، بڑے نازوں سے پالا ہے اسے..... مگر حویلی کی چاکری نہیں کرانی ہے ہم نے..... رہی بات چولھا چوکی کی تو بیاہ کے بعد ہر لڑکی کو یہ ذتے داری اٹھانا ہی پڑتی ہے پر وہ اس کے گھر کا کام ہوتا ہے، اپنی چنداں بھی وقت آنے پر کر لے گی۔“ اور ریشماں کے کورے جواب پر مختار فکر مندی سے سوچنے لگا تھا۔

”مگر اب بڑی ملکائی جی کے حکم کا کیا ہوگا؟“

”ہوتا کیا ہے..... کل سے چنداں کو حویلی ساتھ لے کر جانا پڑے گا۔ بڑی ملکائی کے غصے سے بڑا خوف آتا ہے مجھے..... اس لیے مجبوری ہے، چنداں کو راضی کرنا ہی پڑے گا..... لیکن ڈر لگ رہا ہے مختارے..... بیاہ والا گھر ہے، اگر ہماری چنداں سے کوئی غلطی ہوگئی تو بڑی ملکائی کے غصے کو تو، تو جانتا ہے۔“ ریشماں کے خدشوں میں گھرے دل کا ہراس اس کے کملائے چہرے سے صاف جھانک رہا تھا۔

”کہہ تو تو ٹھیک رہی ہے چنداں کی ماں..... اور اپنی چنداں کو حویلی میں جانے کے لیے راضی کون کرے گا..... وہ تو کبھی نہیں مانے گی۔ اسے حویلی والوں کی چاکری سے تپ چڑھتی ہے، جانے ہم غریبوں کے جھونپڑے میں ایسے شاہانہ مزاج والی کہاں سے پیدا

قارئین متوجہ ہوں

پہچان نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **پک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور ضلع کے نام۔**

☆ **مکمل پتہ اور پک اسٹال PTCL یا سہولت کار فون نمبر۔**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرت

C-63 نیشنل ڈسٹری بیوٹرز اتھارٹی میں کوئی رزرو کر رہی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سنو

عید کے روز اور عید کے بعد بھی
خوشیاں منانے سے
فرمت ملے تو
اتنا سوچنا ضرور
تمہاری یاد کا لمحہ، لمحہ
کسی کے ساتھ رہا ہے

از: صبا نور، لہ

حادی آنے نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت مختارے کی بیٹی چنداں کو دن دیہاڑے گھر سے اغوا کر کے بھوکے کتوں کے آگے ڈال سکتا تھا۔ مگر وہ ایسی فاش غلطی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ہوا کے دوش پر سفر کرتی کوشوں چڑھ کے بولنے لگتی تھی۔ اور پھر چنداں تو جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ اگر وہ چھوٹے ملک کی دست درازی کے قصے کو زبان زد عام کر کے گاؤں کی پنچایت تک لے جاتی تو ساتھ والے گاؤں کے زمیندار اور چھوٹے ملک کے ساسرے (سسرال) سے چھوٹے ملک کی دلہن کی ڈولی کے بجائے چھوٹے ملک کی ذلت کا جنازہ اٹھایا جاتا۔ وہ اپنے بیاہ کے موقع پر چنداں کو اس کی جرات کی سزا دے کر گھائے کا سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر یہ خبر ساتھ والے گاؤں کے زمیندار و لدار خان تک پہنچ جاتی تو چھوٹے ملک بیاہ کی گھوڑی چڑھنے سے پہلے ہی بدنامی کی اڑتی گرد میں مٹی رُل جاتا۔ اس نے جوش پر ہوش کو ترجیح دیتے اپنے اندر رگوں میں ایلٹے آتش فشانی بگولوں کو ٹھنڈا رکھنے میں ہی عافیت سمجھی..... مگر چنداں کی سزا کا یقین اس نے اپنے حساب کتاب میں اسی وقت درج کر لیا تھا۔ بس اب موقع کا انتظار تھا۔ دوسری جانب چنداں کے گھر پہنچنے پر مختارے اور ریشماں کے گھر میں قیامت برپا تھی۔ مختار تو ملکوں کے غیظ و غضب کا سوچ کر ہی تھر، تھر کانپ رہا تھا۔ جیسے دسمبر کی تیخ ٹھنڈے اس کے بدن پر ریشماں طاری کر دیا ہو۔

کچھ کہا تھا۔ ملازمہ گھبرا کر بد کی تھی مگر چھوٹے ملک کی لال، لال ڈوروں والی آنکھوں پر نظر پڑتے ہی خوف زدہ ہو کر اٹھے قدموں جوہلی کے زنان خانے والے حصے کی جانب بھاگی تھی۔ جہاں چنداں اس وقت ڈھولک کی تھاپ پر گیت گانے والی عورتوں کے پاس بیٹھی تھی۔ شاداں اور ریشماں کچھ دیر پہلے ہی کسی کام سے جوہلی کے..... زنان خانے بڑی ملکائی کے کمرے تک گئی تھیں۔ اور ملازمہ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ معصوم چنداں جوہلی کے عیاش مردوں کی روایتوں سے کب واقف تھی۔ ملازمہ نے چنداں کے پاس پہنچ کر اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اور چنداں اٹھ کر ملازمہ کے ساتھ چل پڑی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ چھوٹے ملک کے حکم پر وہ جوہلی کی جس ملازمہ کے ساتھ آنکھ بند کر کے جوہلی کے مردان خانے کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں شکاری معصوم چڑیا کے شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے مگر وہ چنداں تھی۔ جس کی تربیت میں ریشماں نے عزت کے سبق کو سب سے اوپر رکھا تھا۔ اور چنداں نے ماں کی تربیت کو بے مول ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ ملازمہ تو اسے چھوٹے ملک کے کمرے میں دھکیل کر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

چھوٹا ملک جوہلی کے مردان خانے کے مخصوص کمرے میں اترے شیر کی طرح غراتا پھر رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جوہلی میں کام کرنے والی دو نکلے کی غریب مختارے کی بیٹی چنداں اتنی بڑی جرات کا مظاہرہ کرے گی۔ اپنے گال پر چنداں کے زوردار تھپڑ کی گونج اب بھی چھوٹے ملک کے کانوں میں گونجتی اسے غصے سے دیوانہ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس کی رگوں میں ابلتا خون اسے آپے سے باہر کرنے اور انتہائی قدم اٹھانے پر اکسار رہا تھا مگر ہوش مندی کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے غصے کو اپنی جوانی اور طاقت کے غرور پر

ہونے کی وجہ سے بڑی ملکائی سے معذرت کر لی تھی کہ رانی کے بدلے وہ شام دیر تک کام کر لے گی اور بڑی ملکائی کو کام سے غرض تھی۔

شام میں جوہلی کے کاموں سے فارغ ہو کر ملازماں ڈھولک رت جگا کی رونق لگاتی تھیں۔ اس لیے چنداں بھی بے چینی سے شام ہونے کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ اور پھر شام ہوتے ہی جوہلی کے قدرے الگ تھلگ حصے میں بڑے سے دالان کے چکنے فرش پر پچھی سرخ اور سبز چٹائیوں پر جوہلی کی نوجوان، بوڑھی ملازماں اور گانے بجانے والی نرنکیاں، بیٹھ کر (گانے بجانے والی عورتیں) ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے ریلے گیت گانے لگیں۔ چنداں بھی ان کے درمیان بیٹھ کر جوش و خروش سے تالیاں پیٹنے لگی۔ شاداں اور ریشماں ایک طرف بیٹھی چنداں کا خوشی سے چمکتا چہرہ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ بیٹیاں کتنی معصوم اور نمائی ہوتی ہیں۔ دن بھر چھوٹی ملکائی کے ساتھ بیٹھ کر دیر تک سر کھپانے کے باوجود اس وقت چنداں کے چہرے پر ٹھکن کے آثار تک نہیں تھے۔

تب ہی مردان خانے سے چھوٹا ملک یا اور ادھر نکل آیا تھا۔ کھانے کے بعد جام کا شمار تھا یا پھر ہوا کے دوش پر سفر کرتی سُرلی آوازوں کا جادو جو چھوٹا ملک جوہلی کے زنان خانے میں کھنچا چلا آیا تھا اور دالان میں بیٹھی جوہلی کی ملازماؤں کے درمیان گلابی جوڑے میں ملبوس بے پروائی سے گلے میں دو پٹا ڈالے جوش و خروش سے تالیاں پیٹتی چنداں کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔ اس کی بے اختیار اٹھنے والی نگاہیں چنداں کے روپ سروپ سے پلٹنے پر انکاری ہو گئی تھیں۔ وہ دور کھڑا چنداں کے پیٹھے روپ سروپ کی سے کو آنکھوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔ شراب اور شباب کا نشہ مستی بن کر اس کے وجود پر چھانے لگا۔

اس نے پاس سے گزرتی ملازمہ کو آواز دے کر

اور چنداں کی ہاں سن کر ریشماں نے خوش ہو کر کہا تھا۔

”ٹھیک ہے، کل تو سویرے اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جانا۔ کل سے تجھے بھی میرے ساتھ لال جوہلی جانا ہوگا۔“

حالانکہ ریشماں نے چہرے پر مسکان جبراً سجائی تھی۔

”اچھا..... تو جا کر اپنے ابا کو اٹھا دے۔ صحن میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔ سیانے کہتے ہیں، اس وقت بندے کا سونا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”اچھا اماں..... ابھی جاتی ہوں۔“ چنداں جوہلی سے اٹھ کر سوئی سے باہر چلی گئی تو ریشماں باقی کی روٹیاں جلدی، جلدی بنانے لگی۔ ابھی مغرب کی نماز بھی پڑھنی تھی۔ پھر مختارے اور چنداں کو روٹی کھلانے کے بعد ہی سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اسے کمر سیدھی کرنا نصیب ہوتا..... اس لیے ریشماں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

☆☆☆

جوہلی کے مردان خانے میں اس وقت چھوٹے ملک کے دوستوں کی محفل تھی۔ ریشماں سویرے ہی چنداں کو اپنے ساتھ جوہلی لے آئی تھی اور چھوٹی ملکائی کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ چنداں پانچ جماعتیں پاس تھی۔ اس لیے چھوٹی ملکائی اپنے پاس بھائے بری میں چڑھائے بھاری بھر کم جوڑوں اور زیورات کے ساتھ چھوٹے ملک کے ساسرے (سسرال) والوں کو لینے دینے کے سامان کا حساب کتاب لکھوار ہی تھی۔ اس لیے ریشماں بے فکر ہو کر شاداں کے ساتھ زنان خانے میں رسوئی کے کاموں میں مصروف تھی۔

چھوٹے ملک کے دوست شکار سے واپس آئے تھے۔ اب کھانے پینے اور مشروبات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ جبکہ شاداں نے رانی کی طبیعت خراب

مشکل آزمائش میں کمال اس کے ساتھ تھا۔ اس کا محافظ اس کی ڈھال بننے والا۔ اس کی ذمے داری اٹھانے والا..... اسے ملکوں کی لال حویلی کی ملازمہ کبھی نہیں بننا تھا۔

☆☆☆

زندگی چنداں کے لیے بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ کمال نے جہاں اسے پلکوں پر بٹھایا تھا تو ساس، سر بھی بہو کے بیٹی کی طرح لاڈ اٹھا رہے تھے تو پھر چنداں نے بھی ان کی ماں، باپ کی طرح خدمت اور عزت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چنداں چھوٹی نندرائی کا بھی بہت خیال رکھتی تھی اور اس نے شاداں کو صاف منع کر دیا تھا کہ رانی کو اپنے ساتھ حویلی کام پر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رحیم دادا اور شاداں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سال کے اندر، اندر چنداں کا پاؤں بھاری ہو گیا تو میسے اور ساسرے (سسرال) میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

کمال کے ساتھ، ساتھ ساس، سسر نے بھی اسے ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالا۔ شروع کے چند ماہ تو شاداں نے سچ سچ چنداں کو پنگ سے پاؤں اتارنے نہ دیا۔ پہلا بچہ تھا، احتیاط ضروری تھی۔ اس کے بعد چنداں نے خود ہی گھر کی ذمے داری اٹھالی تھی۔

اور پھر بیاہ کے دس ماہ بعد ہنستا مسکراتا گول مٹول جمال اس کی گود میں آیا تو سارا گھر اس چابی کے گڈے کا دیوانہ ہو گیا۔ رانی تو سارا دن اس کے آس پاس پروانے کی طرح منڈلاتی رہتی۔ شاداں حویلی سے واپس آ کر گھنٹوں جمال کو گود میں لیے بیٹھے رہتی۔ رات کو بھی اپنے پاس ہی سلاتی تھی تاکہ چنداں اور کمال کی نیند خراب نہ ہو..... چنداں تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ خوشیوں کی مدت تو بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ دکھ اور مصائب و حالات انسان کی آزمائش میں کمال اس کے ساتھ ہیں۔

باتیں سن کر سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنے غریب ماں، باپ کو کس آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور یوں سرخ حویلی کی پراسرار خاموشی سے فائدہ اٹھا کر ریشماں اور مختار نے چنداں کے بیاہ میں دیر نہیں کی۔ دو دن کے اندر، اندر چنداں کو کمال کے ساتھ بیاہ کر عزت سے رخصت کر دیا۔ ادھر حویلی میں چھوٹے ملک کی دلہن کی ڈولی اتری تھی۔ اور ادھر غریب کمال کے چھوٹے سے آنگن میں چنداں نے اپنے بخت آور قدم رکھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمال کے چھوٹے سے آنگن میں خوشیوں کی بارات اتر آئی۔ کمال کی تو خوشی کا ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی اس کے من کی مراد بر آئے گی۔ اس کا اور چنداں کا بیاہ تو عید تہوار پر طے ہوا تھا۔ اور تب سے اب تک کمال دن گن، گن کر کاٹ رہا تھا۔ اور اب اجا تک چنداں مہینوں پہلے ہی دلہن بن کر اس کے گھر آ چکی تھی۔

بیاہ والی رات کمال نے سرخ جوڑے میں لپٹی ارمائوں بھری دلہن چنداں کے زرتار آچل میں اپنی سچی محبت کے اتنے اقرار ستاروں کی طرح ٹانگے پیٹے۔ چنداں تو جیسے ایک ہی رات میں سیراب ہو گئی تھی۔ کمال کی محبت نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ وہ ہر غم و فکر اور خوف سے آزاد ہو گئی۔ جب کمال نے اپنے پیار کا اقرار نامہ اس کے ہاتھوں میں تھمایا۔

”سچ کہہ رہا ہوں چنداں..... مجھے تو اپنی قسمت پر رشک آرہا ہے، تو ہمیشہ کے لیے میری بن چکی ہے، اب تجھے مجھ سے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھ سے..... تیری آنکھ میں کبھی نمکین پانی آنے نہیں دوں گا۔“ کمال نے لال جوڑے میں حیا سے کٹی بیٹھی چنداں کا ہاتھ تھام کر پیار کا عہد نبھایا تھا۔ اور چنداں لمن کی ان اصول گھڑیوں میں سارے واہے، خدشے بھلا کر کمال کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر پُرسکون ہو گئی۔ اب اس کی ہر

اور ریشماں کے جواب نے مختار کے کمزور پڑتے حوصلوں کو یک دم ہی سہارا دیا تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھا۔ ملکوں کا ظلم مشہور تھا۔ وہ تو حویلی کا جانور مارنے پر بھی معاف نہیں کرتے..... یہاں تو معاملہ چھوٹے ملک کی عزت و وقار کا تھا۔ مختار دل میں حیران تھا کہ حویلی کی خاموشی اسے حیرانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کے اندازوں کے مطابق تو اب تک لال حویلی سے اٹھنے والی کالی آندھی نے اس کے کچے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ یا شاید یہ طوفان کی آمد سے پہلے والی خاموشی تھی۔ اسی لیے مختار طوفان کی آمد سے پہلے کی خاموشی پر بند باندھنا چاہتا تھا۔ اس لیے ریشماں کو راہ دکھائی تھی۔ وہ حویلی والوں کی سزا کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

”دیکھ چنداں کی ماں..... ہم غریب، مسکین اور کمزور ہیں، حویلی والوں کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی عزت بھی بچانی ہے اور جان بھی..... اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم اسی ہنٹے چنداں اور کمال کا بیاہ کر دیں گے۔ جوان بیٹی کی ذمے داری اب میرے کانڈھوں کو توڑ ڈالے گی..... اس سے پہلے کہ حویلی والوں کے غضب کا طوفان ہماری عزت و جان کی بلی چڑھادے ہم امانت دار کو اس کی امانت پہنچا دیتے ہیں۔ میں کل صبح ہی رحیم بھائی سے جا کر چنداں کے بیاہ کی بات پکی کرتا ہوں۔“

مختار نے کی بات ریشماں کے دل کو بھی لگی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ طاقتور، کمزور پر غلبہ پا کے ہی رہتا ہے اور ریشماں اس سچائی سے بہادر ہو کر بھی منہ موڑ نہیں سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے چنداں کے ابا..... ہماری تیاری تو پوری ہے اور حالات کو دیکھ کر آپا شاداں اور رحیم بھائی انکار نہیں کریں گے۔ ہمیں واقعی دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

اور اندر کمرے میں بیٹھی چنداں ماں، باپ کی

چنداں کی جرات نے اسے خوف و اندیشوں کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ جس کے باہر کالے طوفان والی آندھی بڑی تیزی سے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ کیونکہ چنداں حویلی کے دروازے سے اپنی عزت کا جنازہ ساتھ اٹھا کر لانے کے بجائے چھوٹے ملک کی مردانہ غیرت پر تازیانہ لگا کے آئی تھی۔ چنداں کے تھپڑ کی گونج حویلی کی دیواروں نے بھی بڑی حیرت سے سنی ہوگی۔ چھوٹے ملک کی دست درازی کی کوشش پر چنداں کے غیظ و غصے میں بھرے ایک ہی تھپڑ نے چھوٹے ملک کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں لڑکھڑا کے مردان خانے کے خاص کمرے کے بیچوں بیچ میں گرا تھا اور چنداں وہاں سے بھاگ آئی تھی گھر آ کر اس نے ساری بات ماں، باپ کو بتادی تھی۔ جس کے بعد مختار نے اور ریشماں اس وقت لال حویلی سے اٹھنے والی لال آندھی کو لمحہ، لمحہ اپنے کچے مکان کی دلہیز کی جانب بڑھتے ہر اسان دیکھ رہے تھے۔

”اب کیا ہوگا چنداں کی ماں..... تجھے ضرورت کیا تھی چنداں کو حویلی لے جانے کی۔ کوئی بہانہ کر دیتی بڑی ملکانی سے۔ میں تو کہتا ہوں سامان باندھ لے، ہم راتوں رات یہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔“ مختار نے خوف زدہ لہجے میں چار پائی کے کونے پر دم سادھے بیٹھی ریشماں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ مگر ریشماں بولی تو مختار کے کوسانپ سوگھ گیا۔ وہ مرد ہو کر حویلی والے ملکوں کے غیظ و غضب سے کانپ رہا تھا اور ریشماں کے لہجے میں کمزور عورت ہو کر بھی مردوں والا دبہ بول رہا تھا۔

”ہم کیوں گاؤں چھوڑ کے بھاگیں گے چنداں کے ابا..... ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے..... اگر چھوٹا ملک زبان کھولے گا تو بات دور تک جائے گی۔ گاؤں کی پنچایت بیٹھے گی..... اور میں اپنی بیٹی کی ڈھال بنوں گی۔ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔“

زندگی کے میلے میں

کب کوئی ساتھ چلتا ہے
ساتھ چھوٹ جاتے ہیں
اپنے روٹھ جاتے ہیں
وقت گزرتا جاتا ہے
کب کوئی پلٹ کے آتا ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
نیندیں روٹھ جاتی ہیں
زندگی کے میلے میں
پھول کھلتے رہتے ہیں
زخم ملتے رہتے ہیں
اک بار جو چھڑ جائیں تو یہ
بھلا پھر وہ کب ملتے ہیں

مرسلہ: بشری باجوہ..... اوکاڑہ

مابوس خالی ہاتھ گھر واپس آتے دیکھ کر فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اسے جمال کی زندگی کے لیے اپنا عہد توڑنا تھا۔ اسے لال حویلی جانا تھا۔ وہ جمال کو کمالے کے حوالے کر کے اُس حویلی چلی آئی۔

کمالے نے اس سے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اب اپنی جان کے جگر گوشے کو موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رہی بات چنداں کی تو وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے چنداں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

لال حویلی کے پھانک کے باہر کھڑی چنداں سوچ رہی تھی کہ سال بھر پہلے اس نے یہاں بھی نہ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اولاد کی محبت نے اس کے کپے فیصلے کو کچھ مٹی کی طرح ڈھا دیا تھا۔ وہ بڑی ملکائی کے پاس قرض کے طور پر کچھ مانگنے آئی تھی تاکہ جمال کو شہر والے اسپتال لے جا کر علاج کرا سکے۔ یہاں آکر پتا چلا کہ چھوٹی اور بڑی ملکائی تو چھوٹے ملک کی سسرال جا چکی ہیں۔ چھوٹے ملک کی بیوی شہزادی نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

اسی خوشی میں وہ..... بہورانی کے میسرے روانہ ہوئی تھیں۔ سو چنداں مابوس ہو کر پلٹنے لگی تھی۔ چھوٹی حویلی کی پرانی ملازمہ مائی آکاں نے بتایا تھا کہ چھوٹا ملک حویلی میں موجود ہے۔ چنداں اپنی عرض اس کے حضور پیش کر سکتی ہے اور چنداں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ کیا اسے چھوٹے ملک کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے؟

چنداں کو خاموش دیکھ کر مائی آکاں حویلی کے مردان خانے چلی گئی تھی۔ مائی آکاں نے اس کی عرض چھوٹے ملک تک پہنچادی تھی۔ اور چنداں مابوس ہو کر پلٹنے لگی تھی کہ مائی آکاں نے آکر بتایا کہ چھوٹا ملک اسے بلارہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سال بھر پہلے والا واقعہ چنداں کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کے پاؤں پھر سے زمین نے جکڑ لیے

ماں، باپ کی اندوہ ناک موت نے اسے راتوں رات تیشی کی سیلی چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ کمالے نے بڑی مشکل سے عم سے تڑھال چنداں کو سنبھالا تھا۔ اس کی گود میں چند دنوں کا بیٹا تھا۔ جس کی ابھی خوشی جشن بھی منانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ریشماں نے اس کے سوا مہینے پر بچے کے لیے کیا کچھ اکھٹا نہ کیا تھا مگر موت کے خونی پنجوں نے مہلت ہی نہیں دی تھی خوشی منانے کی.....

اور پھر اچانک ہی ننھے جمال کی بیماری..... وہ سیلابی آلودگیوں کا شکار ہو کر گاؤں میں پھیلنے والی وبائی بیماری کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

جمال کو بھی ڈاکٹر نے ڈائریا کی شکایت بتائی تھی۔ چند دنوں میں پھول سا بچہ سوکھ کر کاٹا بن گیا تھا۔ گاؤں کی واحد ڈسپنسری سے جمال کا گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح علاج چل رہا تھا۔ ضروری ادویات گاؤں کی ڈسپنسری میں ناکافی تھیں۔ شہروں سے پہنچنے والی امداد کی ترسیل ست رومی کا شکار تھی۔ کچھ انتظامیہ کی ازلی غفلت بھی تھی۔ ڈاکٹر نے جمال کو شہر کے بڑے اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔

چنداں کے جہیز کی ایک، ایک چیز جمال کے علاج پر خرچ ہو چکی تھی۔ اب تو کہیں سے ادھار، قرض کا آسرا بھی نہیں تھا۔ اتنے ارمانوں سے بنایا چنداں کا جہیز ایک، ایک کر کے بیٹے کی زندگی پر قربان ہو گیا مگر ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

جمال کی حالت بدستور بگڑتی جا رہی تھی۔ جمال کو اچھے علاج کے لیے شہر لے جانا تھا اور اس کے لیے کمالے کو رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی کہیں سے قرض کا انتظام کرنے کی مگر سیلاب زدہ علاقے میں بے سروسامانی میں آدھا گاؤں عارضی نقل مکانی سے خالی ہو چکا تھا اور چنداں اپنی گود میں روز بروز موت کی طرف بڑھتے جمال کو سسکتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ کمالے کو روز

اور شاید غریب کی خوشیوں کے دن بھی تھوڑے دنوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ چنداں اور کمالے کی خوشیوں کو بھی کسی بد نظر کی کالی نظر کھا گئی۔

☆☆☆

دوسری جانب چھوٹے ملک یاور خان کی بیوی شہزادی پہلے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں اپنے میسے روانہ ہو چکی تھی۔ رواج کے مطابق پہلا بچہ میسے میں تولد ہونا تھا۔ بس آج کل میں خوش خبری متوقع تھی۔ حویلی میں ایک بار پھر جشن، میلے کا سماں تھا۔ جیسے سال بھر پہلے چھوٹے ملک یاور کے بیاہ پر ہوا تھا۔ یاور بہت خوش تھا کیونکہ الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے مطابق شہزادی کے یہاں بیٹے کی آمد متوقع تھی۔ لہذا حویلی میں بھی بڑی اور چھوٹی ملکائی حویلی کے نئے وارث کی آمد کی خوشی میں تیاریاں کرنے میں مصروف تھیں۔ اور بیٹے کی خوش خبری نے چھوٹے ملک کا سراور سینہ فخر و انبساط سے پھلا دیا تھا مگر اس سینے میں جلتے بھانھڑوں کی آگ اب تک سرد نہیں پڑی تھی۔ چنداں کے تھپڑ کا حساب بے باق ہونا باقی تھا۔

شکاری گھات لگائے بیٹھا تھا۔ کب وہ اپنے اندر جلتے اچلتے انتقام کی آگ کو چنداں کے جھکے ہوئے... شرمسار سر کی جھکی گردن کی سرنگوں صراحی سے بدلے کی آگ کو بجھا سکے گا۔

اور حالات کی ستم ظریفی وہ وقت بہت قریب لے آئی تھی۔ اس برس ساون ٹوٹ کر برس تھا۔ چنداں کے گاؤں میں بھی بارشوں نے سیلابی تباہ کاریاں مچائی تھیں اور اس طوفانی آفت کا لقمہ اجل چنداں کے ماں، باپ بھی بنے تھے۔ وہ ساسرے (سسرال) میں چھلے میں بیٹھی تھی۔ جب گھر سے ریشماں اور مختارے کی موت کی خبر آئی تھی۔ سیلابی پانی ان کے کچے مکان میں داخل ہو گیا تھا۔ کرنٹ لگنے پر ریشماں اور مختار موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔

چنداں پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ بیک وقت



مہرو کی عید

نزہت جسبیں ضیا

سارا غصہ بیسن پر نکال رہی تھیں۔

”لو بتاؤ مہرالنسانہ ہوئیں کوئی بچوں کا کھلونا ہو گئیں۔ جب دل چاہا کھیل لیا، جب دل چاہا پھینک دیا، سمجھ کیا رکھا ہے ہمیں ریاست بیک نے.....؟“

مہرو پچھو آج وقت سے تھوڑا پہلے ہی افطار کی تیاری کے لیے کچن میں گھس گئی تھیں..... اس وقت پکوڑوں کے لیے بیسن گھولتے ہوئے مسلسل... ٹرڈار ہی تھیں۔ آج ان کا موڈ خاصا خراب تھا اور وہ

شاید زندگی کی تلخ حقیقتوں کی سچائی ایسی ہی کڑوی ہوتی ہے۔ کوئی بھی ممتا کی ماری عورت ان حالات میں یہی کرتی شاید چنداں کی کہانی کا انجام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر بات چنداں کی ماں کی تربیت کی تھی۔ چنداں کے عزم و جوش اور اعتماد کی تھی جس پر اس کی ذات کا وقار ہر قیمتی شے پر مقدم تھا۔ چھوٹے ملک نے اگرچہ اس کی مجبوری کو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا چارہ بنانا چاہا تھا۔ اس نے فیصلہ چنداں پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اولاد کی زندگی بچاتی ہے یا اپنی عزت کی انمول دولت..... اور آج بھی چنداں کا فیصلہ وہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر خدانے اس کے بچے کی زندگی لکھی ہے تو کوئی اسے زندگی سے محروم نہیں کر سکتا۔ اولاد چلی بھی گئی تو وہ رب کی رضامان کر سکتا ہو جائے گی۔ مگر عزت جیسی دولت ایک بار لٹ جائے تو کبھی کمائی نہیں جاسکتی۔

ایک بار پھر شراب اور طاقت کے نشے میں چور چھوٹے ملک کی میلی نگاہوں کے جواب میں حویلی کے مردان خانے کے خاص کمرے کی دیواروں نے ایک بار پھر چنداں کے تھپڑ کی گونج بڑی شرمساری سے سر جھکا کے سنی تھی۔ یہ چھوٹے ملک کی سودے بازی کے جواب میں چنداں کا جواب تھا۔ چنداں کے تھپڑ کی بازگشت اونچی دیواروں نے اپنے اندر سمیٹ لی تھی خاموشی سے..... کیونکہ وہ چھوٹے ملک پر ہنس نہیں سکتی تھیں۔ اگر یہ بازگشت حویلی کے باہر چلی جاتی تو بدنامی و رسوائی حویلی کے ماتھے کا داغ بن جاتی۔ چنداں ایک بار پھر چھوٹے ملک کو صدے سے گنگ حالت مرگ میں مبتلا چھوڑ کے بڑے فخر کے ساتھ حویلی کی دہلیز پار کر کے سرخرو ہو کر بھرے دل کے ساتھ خالی ہاتھ نکل آئی تھی۔

آج کی چنداں (عورت) کی کہانی کا یہی انجام ہونا تھا۔



چھوٹا ملک اونچے رنگین پایوں والی مسہری پر غرور سے گردن تانے بیٹھا موچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ سامنے چنداں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ تو پہلے سے زیادہ جاذب نظر ہو چکی تھی۔ چہرے پر ممتا کے نور کی چمک پھیلی تھی مگر چھوٹے ملک کو اس کی اٹھی ہوئی گردن نوکیلی سلاخ کی طرح اندر چبھ رہی تھی۔ وہ وقار سے اٹھی اس گردن کو شرمساری سے جھکا دیکھنے کا متمنی تھا۔

”میں جانتا ہوں اس وقت اپنے بچے کے علاج کے لیے گروی رکھنے کے لیے تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر ایک چیز اب بھی تیری دسترس میں ہے۔ جسے تو گروی رکھ کر اپنے مرتے ہوئے بچے کو موت کے خونی بچے سے آزاد کر سکتی ہے۔ اب فیصلہ تجھے کرنا ہے۔“ اپنی بات ختم کر کے چھوٹا ملک خیانت سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس تھی۔ وہ تحقیر بھری نوکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے چنداں کے فیصلے کا منتظر تھا اور لحوں میں ممتا کی ماری چنداں کی گیلی ساون آنکھوں میں جمال کی بند ہوتی آنکھوں کے منظر نے فیصلہ خود بخود دکر دیا تھا۔

گھات لگائے شکاری کی جیت ہوئی تھی اور ممتا کی ماری عورت ہار گئی۔ چھوٹے ملک نے سال بھر پہلے چنداں کے تھپڑ کا بدلہ لے لیا تھا۔ ریشماں کی تربیت میں سیکھے عزت کے انمول ہونے کا سبق رٹنے والی چنداں کی عزت صرف ایک سبز نوٹ کے عوض بے مول ہو گئی تھی۔ لال حویلی کے مردان خانے کے خاص کمرے کے ٹھنڈے فرش پر اجڑی بیٹھی ممتا کی ماری چنداں اولاد کی محبت کی خاطر بے مول ٹھہری تھی۔ اس کی انمول عزت کی قیمت صرف پانچ سو کا ہرانوٹ تھا۔ جو جانے کتنے لحوں سے اس کی گیلی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ جسے جاتے ہوئے چھوٹا ملک بڑی حقارت سے اس کی خالی مٹھی میں دبا گیا تھا۔

☆☆☆

اتنے گرے پڑے ہیں ہم کہ ہمیں اپنی مرضی سے جینے کا حق بھی نہیں، جب ضرورت نہ ہو تو اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا، جب ضرورت پڑی تو اٹھا کر سینے سے لگا لیا واہ جی واہ.....! یہ بھی خوب رہی..... نہیں ضرورت ہے ہمیں کسی سہارے کی، جی لیں گے جیسے جیتے آئے ہیں۔" مہر و پچھو کا غصہ عروج پر تھا ویسے میں نے انہیں اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اب ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں نے کچن میں جانا مناسب نہ سمجھا..... بس خاموشی سے فریج سے فروس نکال لائی اور باہر تخت پر بیٹھ کر فروٹ چاٹ بنانے لگی۔ چاٹ تیار کر کے فریج میں رکھی پھر شربت بنایا اور کام نمنا کر لان کی طرف آگئی سامنے گارڈن جینز پر ریاست ماموں بیٹھے تھے..... سر جھکائے سوچوں میں گم..... مجھے دیکھا تو مسکرا دیے پر بے جان اور پھکی مسکراہٹ.....

"آؤ گڑیا بیٹھو....." کرسی کی طرف اشارہ کیا..... میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ماموں آپ سچ سچ دہی لوٹ جائیں گے ہمیشہ کے لیے.....؟" میں ان کے بچھے، بچھے چہرے کی طرف تاسف سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی گڑیا..... کیا کروں گا یہاں رہ کر کون جس کے لیے آیا تھا وہ مقصد تو پورا نہ ہوا۔" ان کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔ میرا دل بھر آیا اگر مجھے مہر و پچھو سے بہت پیار تھا تو ریاست ماموں سے بھی دلی لگاؤ تھا..... میں تاسف سے انہیں دیکھنے لگی ان کے چہرے پر دکھ کے سائے رقصاں تھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا مگر میں دادا جی، دادو، ماما، پاپا، عاتکہ آپا، نوروز بھیا اور مہر و پچھو کو دیکھا تھا..... مہر و پچھو دادا جی کے کزن کی بیٹی تھیں۔ والدین کی ڈیڑھ ہو چکی تھی کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا۔ دادا جی کو اپنی وہ کزن بہت عزیز تھیں اس لیے دادا جی مہر و پچھو کو اپنے گھر لے آئے۔ مہر و پچھو جن کا اصل نام مہر لٹا

تھا..... دادا جی نے مہر و پچھو کو اپنی بیٹی کی طرح سے ہی رکھا تھا۔ انہیں کبھی اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہیں۔ نازک سی، دہلی، پتلی دراز قد، سفید رنگت، بھوری آنکھوں، سلج چہرے والی مہر و پچھو مجھے بہت پیاری لگتی تھیں۔ دھیسے لہجے میں بولنے والی، چہرے پر ہمیشہ بیٹھی سی مسکان تھی ہوتی، محصوم سے انداز میں وہ جب بات کرتیں اور خصوصاً جب وہ خود کو ہم کہتیں تو مجھے ان پر پیار آ جاتا..... ہمیشہ میں نے انہیں چوڑی دار پاجاموں کے ساتھ کلیوں والے لہجے، لہجے کرتے پہنے دیکھا، بڑے بڑے لمبل کے دوپٹوں میں ان کا چہرہ اور بھی حسین لگتا..... میں ان کو دیکھے جاتی۔ میں گھر میں سب سے زیادہ ان سے اٹیچ تھی۔ سر جھکائے وہ سارا دن کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔ نوروز بھیا اور عاتکہ آپا میں دو سال کا فرق تھا جبکہ میں عاتکہ آپا سے چند سال چھوٹی تھی۔ مہر و پچھو گھر کے کام کاج کرتیں، سلائی کڑھائی اور پکوان میں باہر تھیں اور تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنی میروں مٹلی ڈائری لے کر بیٹھ جاتیں میں ان کے ساتھ چپکی رہتی۔

پھر گھر میں ریاست ماموں آ گئے، ویسے بھی بڑا سا برانے طرز کا بنا ہوا یہ گھر دادا جی نے ہر ایک کے لیے کھلا رکھا تھا۔ ریاست ماموں، دادو کے دور پرے کے رشتے دار تھے۔ بیچارے مالی لحاظ سے کچھ کمزور تھے۔ والد حیات تھے، ہمیں والدہ اور ایک بڑی معذور بہن کے ساتھ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ دادا جی نے ریاست ماموں کے لیے یہاں اچھی جاب کا بندوبست کیا تو وہ بھی مختصر سے سامان کے ساتھ ہمارے یہاں شفٹ ہو گئے..... دراز قد اسمارٹ سے ریاست بیگ جن کے چہرے پر ہمیشہ ایک تمکنت، ایک وقار ہوتا..... گریس فل اور جاذب نظر تھے۔ مجھے ریاست ماموں بھی بہت اچھے لگے کیونکہ وہ میرے لیے چاکلیٹس، آکس کریم اور پاپ

کارن بولتے تھے۔ مجھے گھمانے کبھی، کبھی قریبی پارک بھی لے جاتے، میں وہاں جا کر بہت خوش ہوتی۔ وہاں میری عمر کی بہت سی بچیاں ہوتیں، ہم لوگ گول گے کھاتے، آکس کریم کھاتے، میں جھولوں میں بیٹھتی اور پھر واپس آ جاتے، گھر میں ریاست ماموں کے آنے سے اپنے ساتھ، ساتھ میں نے مہر و پچھو میں بھی خاصا چینیج دیکھا۔ مہر و پچھو کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ بات، بات پر مسکراتی رہتیں..... کبھی کبھی دھیرے، دھیرے گنگنائی تو میں ان کی آواز کے سحر میں ڈوب جاتی ان کی آواز بھی ان کی شخصیت کی طرح مسحور کن تھی۔ گوکہ میں بہت چھوٹی تھی مگر مجھے یہ تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔

جون کی پختی دوپہر میں جب پاپا، دادا جی اور بھیا آفس میں ہوتے، دادو، ماما اور آپا دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے، اپنے کمروں میں سو رہی ہوتیں تب میں مہر و پچھو کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی ہو م ورک کر رہی ہوتی..... مہر و پچھو مجھے پڑھاتی بھی تھیں ساتھ، ساتھ اپنی میروں ڈائری پر نہ جانے کیا، کیا لکھتی رہتیں۔ اس پر رٹن پینسلوں سے خوب صورت تیل بوئے بھی بناتی رہتیں۔ مجھے ان کی وہ ڈائری بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اکثر پوچھتی کہ پچھو آپ کیا لکھتی رہتی ہیں، وہ مسکراتیں، میرے گالوں پر ہلکے سے چٹکی بھر کر کہتیں۔

"گڑیا تم ابھی بہت چھوٹی ہو جب بڑی ہو جاؤ گی تب سمجھ آئے گی تم کو۔" اور میں پیار سے ان کے چہرے کو ٹکا کرتی جہاں بے شمار خوب صورت رنگ دکھائی دیتے۔ عاتکہ آپا اور نوروز بھائی کی شادیاں طے ہو چکی تھیں۔ اس عرصے میں مہر و پچھو کے لیے رشتے آئے مگر انہوں نے منع کر دیا کہ ابھی کچھ وقت چاہیے، پہلے ان دونوں کی شادیاں کر دیں، عاتکہ چلی جائے گی تو بھابی (میری ماما) اکیلی

ہو جائیں گی اس لیے میری شادی کی جلدی نہ کریں۔ دادا جی نے ان کی مرضی کے آگے اپنا کوئی فیصلہ مسلط نہ کیا پھر ریاست ماموں کچھ عرصہ چھٹی لے کر گھر جانے لگے تب میں نے مہر و پچھو کے چہرے پر گہری اداسی اور آنکھوں میں نمی دیکھی عجیب سی بے چینی کا شکار تھیں وہ میں نے پوچھا بھی.....

"پچھو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا.....؟"

"جی گڑیا....." دھیرے سے جواب دیا اس رات میں نے مہر و پچھو اور ریاست ماموں کو لان میں دیر تک باتیں کرتے بھی دیکھا تھا پھر ریاست ماموں چلے گئے اور مہر و پچھو دن بھر سارے گھر میں بولائی، بولائی پھرتیں..... ایسے لگتا جیسے کوئی چیز کم ہو گئی ہو میں خاموشی سے مہر و پچھو کو دیکھتی رہتی اور پھر ہفتے بعد ریاست ماموں لوٹ آئے تو گویا مہر و پچھو کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جب ریاست ماموں ہوں تب پچھو خوش رہتی ہیں، ہنستی اور گنگنائی اور بھی حسین لگتی ہیں۔

پھر گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ عاتکہ آپا اور نوروز بھیا کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مہر و پچھو، ماما سے زیادہ گھن چکر بن کر رہ گئیں۔ بازاروں کے چکر، کپڑوں کی سلائی، جینز کی تیاری اور بری کے لوازمات ہر بات کی ذمے داری، ہر چیز کا پتا مہر و پچھو کو تھا۔ انہوں نے ہر ذمے داری بڑی اچھی طرح سے سنبھالی تھی۔ ماما اور دادو انہیں دعائیں دیتے نہ تھکتیں..... مگر وہ اتنا سب کچھ کرتے، کرتے بھی مسکراتی رہتیں کبھی تھکن، جھنجھلاہٹ یا بیزارگی کی رمتن ان کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے میں ریاست ماموں نے بھی گھر کے فرد کی طرح پاپا کا ساتھ دیا۔ مہر و پچھو کام کے ساتھ، ساتھ ریاست ماموں کی شوخ نظروں کے حصار میں رہتیں، اس لمحے ان کے چہرے پر شرمیلیں

ہمارے تارے اور

ظلم کے اندھیرے سائے ہیں
خوف کے مارے دل سبے ہیں
کیوں گلشن اجڑا اجڑا ہے
پنچھی اس کو چھوڑ گئے ہیں
چڑیوں کی چبکار کہاں ہے
ان کا دل بھی افسردہ ہے
مہکی، مہکی سی وہ ہوائیں
دھواں، دھواں سی کیوں لگتی ہیں
ماؤں کا دل چھلنی، چھلنی.....
باپوں کے کندھے جھک سے گئے ہیں
اپنے لبو سے محسوسوں نے
دھرتی کو سیراب کیا ہے
دھرتی ماں کے سینے سے
اب کے نئی فصل اُگے گی
زندہ رہیں گے یہ شہزادے
تابندہ رہیں گے دیس کے تارے

کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

”کب آئیں گے.....“ مہر و پھول کا دل نہ
جانے کیوں انجانے خدشات سے گھر رہا تھا۔
”جیسے ہی اماں کی طبیعت سنبھلی لوٹ
آؤں گا۔“ انہوں نے تسلی دی تھی..... نہ جانے
کیوں مہر و پھول کو رونا آئے چلا جاتا تھا۔ انہیں لگ رہا
تھا کہ ریاست ماموں اب آگئے تو لوٹ کر نہ آئیں
گے بے شمار دعاؤں کے حصار میں انہوں نے دل
میں ہزاروں خدشات لیے انہیں رخصت کیا اور
ریاست ماموں واقعی ایسے گئے کہ لوٹ کر نہ
آئے..... ہفتہ، دو ہفتہ، مہینہ اور پھر دو مہینے..... پاپا
نے رابطہ کیا، نہ جانے کیا بات ہوئی کیا ہوا کہ
سارے گھر والے اداس ہو گئے..... مہر و پھول کے
ہاتھ سے رنگ برنگی کھکتی چوڑیاں اتر گئیں، اب
انہوں نے آنکھوں میں کاجل لگانا بھی چھوڑ دیا تھا،
ان کی مسکراتی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو نظر آنے لگے۔
ان کے حسین اور مسکراتے چہرے پر اداسیوں نے
ڈیرے ڈال لیے۔ ان کی گنگنا نہیں کہیں کھو گئیں۔
ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی۔ ان کے چہرے پر
کرب اور محرومی نظر آنے لگی۔

”یہ سب کیا ہوا..... کیسے ہوا.....؟ ریاست
ماموں واپس کیوں نہیں آئے.....؟“ مجھے کسی نے
کچھ نہ بتایا۔ دادا جی اور دادو، مہر و پھول سے شرمندہ
رہنے لگے تھے جیسے ساری غلطی ان کی ہی ہو..... مجھ
سے مہر و پھول کی یہ حالت دیکھی نہ جانی تھی، میں ان
سے لپٹ کر رو دیتی تھی۔

”پھول کیا ہوا.....؟“ آپ چپ چاپ کیوں رہتی
ہیں؟ ریاست ماموں کیوں نہیں آئے.....؟“ میرے
سوال کے جواب میں وہ مجھے سینے میں بھینچ لیتیں۔

”نہ گڑیا روتے نہیں..... ہم بھلا کب روتے
ہیں ہم لڑکیاں ہیں ناں.....؟ لوگ ہمارے پیدا
ہونے پر فخر مند کیوں ہوتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ ہم
بیٹیاں پیدا ہوئیں بلکہ اس لیے کہ ہمارے نصیب نہ

وہ بے سادگی کے سہارے چلتی تھیں، مہر و پھول
خاصی تھی۔ ان کا ایک پیر بہت پتلا اور بے جان تھا
میں نے انہیں غور سے دیکھا تو مجھے ان پر ترس آ گیا۔
رسم والے دن مہر و پھول نے آتش کی کام کا سوٹ پہنا تھا
وہ ہلکے میک اپ میں تھیں ممانے ان کو اپنا جڑا ڈیوٹ
پہنایا تھا۔ ریاست ماموں نے..... واٹ کرتا
پاجامہ پہنا تھا ہائے مجھے دونوں بالکل گڈے، گڑیا
جیسے لگ رہے تھے اتنے حسین کہ میں دیوانوں کی
طرح انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

ریاست ماموں کی والدہ اور تمثیلہ آپا ایک ہفتے
بعد واپس حیدرآباد چلی گئیں۔ جاتے، جاتے پایا اور ماما
کو تاکید کر گئیں۔ ”آپ لوگ کہیں نہ کہیں تمثیلہ کے
لیے بھی شادی کی بات چلائیں۔ میں دل کی مریضہ
ہوں بڑی فکر رہتی ہے کہ کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو.....“
”اللہ نہ کرے.....“ ممانے ان کی بات
کاٹی۔ ”اللہ پاک بہتر کرے گا آپ فکر نہ کریں۔“
پھر وہ لوگ لوٹ گئے۔

مہر و پھول اپنے جہیز کی تیاریوں میں لگ گئیں،
بیڈ شیٹیں، دوپٹے، سوٹ، سب کچھ گھر میں تیار
کر رہی تھیں۔ بہت سرور اور شاداں رہتی تھیں۔ اور
خدا کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتیں کہ جسے چاہا اللہ نے
اسے اپنا بنانے کی امید دلادی تھی، میں چوبیس گھنٹے
ان کے ساتھ لگی رہتی۔ ہر چیز کے بارے میں
پوچھتی۔ ہر چیز میں دلچسپی لیتی اور وہ مسکرا، مسکرا کر
مجھے سب بتاتیں۔ دن بہت اچھے گزر رہے تھے تو اسی
دوران نوروز بھیا کو دہائی جا ب آفر ہوئی اور وہ
وہاں شفٹ ہو گئے۔ گھر میں تھوڑی سی ٹینشن ہوئی
پھر رفتہ، رفتہ حالات معمول پر آتے گئے۔ اچانک
ریاست ماموں کو حیدرآباد جانا پڑا کیونکہ تمثیلہ آپا کا
فون آیا تھا کہ اماں کی طبیعت خراب ہے، وہ بیچارے
پریشان ہو کر غلت میں حیدرآباد روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

مسکراہٹ انہیں اور زیادہ حسین بنا دیتی۔ عاتکہ آپا
شادی کے بعد ارسلان بھائی کے ساتھ وہی شفٹ
ہو گئیں۔ اسی دوران ریاست ماموں نے باقاعدہ اپنا
رشتہ مہر و پھول کے لیے دیا، دادا جی سے بات کی اور
باقی باتیں ریاست ماموں کی والدہ نے طے کر لیں۔
ان دنوں مہر و پھول کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر دم مسکراتا گو
کہ ان کی فطرت تھی مگر اب اس مسکراہٹ میں شرم
ہوتی۔ آنکھوں میں ان گنت خوب صورت سینے
سجائے وہ مجھے اتنی حسین لگتیں کہ میرا دل چاہتا ان کو
چومتی رہوں اور میرا دل چاہتا کہ ریاست ماموں کو
بہت ساری دعاؤں دوں کہ ان کی وجہ سے میری مہر و
پھول اتنی خوش رہنے لگی تھیں مگر کبھی، کبھی میں یہ سوچ کر
پریشان ہو جاتی ہوں کہ مہر و پھول بھی ریاست ماموں
کے ساتھ ایک دن یہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی جیسے
کہ عاتکہ آپا، ارسلان بھائی کے ساتھ چلی گئیں
ہیں۔ تب مہر و پھول مجھے سینے سے لگا کر مسکرا کر کہتیں۔
”نہیں گڑیا..... ہم کہیں نہیں جائیں گے اپنی
گڑیا کو چھوڑ کر..... ہم یہیں رہیں گے اپنی گڑیا کے
ساتھ.....“

”ہاں گڑیا..... تمہارے ریاست ماموں بھی
یہیں رہ جائیں گے گھر داماد بن کر۔“ ریاست ماموں
نکڑا لگاتے تو ان کی شوخی پر مہر و پھول انہیں گھور کر
دیکھتیں۔ اس لمحے ان کے چہرے پر قوس قزح پھیل
جاتی اور میں اپنی پریشانی بھول کر دونوں کو ہنسی رہتی۔ مہر و
پھول کی ڈائری رنگ برنگی نیل بوٹوں اور خوب صورت
اشعار سے بھرتی چلی گئی۔ جون کی گرم دوپہروں اور
سردیوں کی سرد شاموں میں، میں انہیں ڈائری لکھتے
دیکھا کرتی مگر سمجھ نہ پاتی کہ وہ کیا لکھتی ہیں؟

پھر دادا جی نے مہر و پھول اور ریاست ماموں کی
باقاعدہ رسم کی اس پر ریاست ماموں کی والدہ اور
ان کی بڑی بہن تمثیلہ آپا بھی آئیں۔ ہائے بیچاری
تمثیلہ آپا دیکھنے میں تو اچھی بھلی خوب صورت تھیں مگر

ہوئے، انہیں ٹھکراتے ہوئے آپ کو ایک پل احساس تک نہیں ہوا.....؟ یوں بھی کرتا ہے کوئی.....؟ آپ تو اس طرح غائب ہو گئے کہ پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا....." میری برداشت ختم ہوئی تو میں پھٹ پڑی.....

"گڑیا تمہارا کہنا بجا ہے لیکن میں جس حالات سے گزرا ہوں، جتنی اذیت میں نے سہی ہے..... تمہیں اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے نا..... اس لیے مجھے الزام دے رہی ہو۔"

تب ہی ہم سب کی نظر دروازے پر جم گئی..... وہاں مہرہ پھوپھو کھڑی تھیں سفید چوڑی دار پاجامہ، فیروزہ اور سفید کرتا ڈائٹ ملل کا دو پٹا اور لمبے بالوں سے لپکتے ہوئے پانی کے قطروں کے ساتھ آج بھی وہ ریاست بیگ کے دل میں اترتی چلی گئیں۔ ریاست بیگ نے انہیں غور سے دیکھا..... ان کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ نفرت نمایاں تھی۔ ان کے چہرے پر غصے کی وجہ سے پسینے کے ننھے، ننھے قطرے نظر آرہے تھے ضبط کی کوششوں میں ناکام وہ چیخ پڑیں۔

"بھابھو! ان سے کہو یہ یہاں سے واپس لوٹ جائیں اب اس گھر کو ان کی صورت اور ان کا وجود برداشت کرنے کی عادت نہیں رہی۔"

"مہرہ پلینز.....! میری بات تو سنو....." ریاست ماموں کھڑے ہو گئے اور ننھی لہجے میں گویا ہوئے۔

"بس ایک لفظ بھی سننے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے آپ جیسے آئے ہیں ویسے ہی لوٹ جائیں۔" اتنا کہہ کر مہرہ پھوپھو واپس پلٹ گئیں۔ میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

مہرہ پھوپھو افطار کے وقت پر بھی کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ پاپا بھی آگئے تھے، میں مہرہ پھوپھو سے چپکی ہوئی تھی۔ ممانے ان کا کھانا کمرے میں ہی بھیج دیا تھا۔ مہرہ پھوپھو بالکل خاموش تھیں چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا اور میں بے چین کیونکہ مجھے ریاست ماموں

ہو گئی تھی۔

"ریاست..... ماموں..... آپ! میں اتنی زور سے چلائی کہ ممدوڑی چلی آئیں۔

"مما..... ماما..... یہ..... اب..... یہاں کیوں آئے ہیں.....؟" اچانک میرے لہجے میں نفرت اٹھ آئی۔ ریاست ماموں نے بیچارگی سے پہلے مجھے اور پھر ماما کو دیکھا۔

"اندر آ جاؤ۔" ممانے مجھے گھور کر دیکھا اور ان کے لیے راستہ بنایا، میں تن تن کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ممانے کو لے کر ڈرائنگ روم چلی گئیں۔

"بھابی پلینز، آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔" ریاست بیگ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب پتا ہے ریاست....." ماما کے ایک جملے پر ان کے چہرے پر ڈھیروں اطمینان اتر آیا گویا کہ ممانے کی مجبور یوں سے واقف تھیں۔ پاپا نے ان کو سب کچھ بتا دیا تھا کیونکہ وہ باتیں صرف پاپا جانتے تھے۔

"ماما....." میں نے ڈرائنگ روم میں جا کر ماما کو آواز دی۔

"گڑیا..... اپنے ماموں کی بات نہیں سنو گی.....؟ کیا تم اپنے ماموں کو اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو.....؟" ان کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا میں کھلنے لگی۔

"مجھے تو کچھ پتا نہیں ماموں لیکن آپ نے جو مہرہ پھوپھو کے ساتھ کیا وہ قابل معافی نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ماموں کہ پھوپھو نے گزشتہ چودہ سال کس اذیت میں گزارے..... بہت اذیت ناک ہیں وہ پل جو میں نے دیکھے ہیں، وہ راتیں وہ دوپہریں اور شامیں..... جب میں نے پھوپھو کو تڑپتے دیکھا ہے، انہوں نے خوشیوں کے تمام دروازے خود پر بند کر لیے صرف اور صرف آپ کی وجہ سے..... اور آپ..... ایسے خود غرض نکلے کہ جاتے

تھی مگر اب بھی بہت سے لوگ ان سے شادی کے خواہاں تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مہرہ پھوپھو میں ایک وقار، ایک تحملت آ گئی تھی۔ ریاست ماموں کے بعد مہرہ پھوپھو نے کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کی سوچ کو بھی خود پر حرام کر لیا تھا ان کا کہنا تھا کہ "جس کو دل سے دماغ سے اور ہر طرح سے اپنا مان لیا تھا جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر لیا تھا اب اس کے بعد کسی اور کے ساتھ گزارہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی کیونکہ میں کسی کے ساتھ شاید وہ انصاف نہ کر پاؤں جو اس رشتے کا متقاضی ہے۔" بس یہ سن کر ماما، پاپا چپ ہو گئے۔

☆☆☆

رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا۔ عید کے بعد میری شادی ہو جاتی تھی۔ میں آج بھی ریاست ماموں والے معاملے کی حقیقت سے ناواقف تھی اور کسی حد تک ان سے نفرت بھی کرنے لگی تھی۔ پھوپھو میری شادی میں بھی بھر پور حصہ لے رہی تھیں ہر چیز کی تیاری اپنے ہاتھوں سے کر رہی تھیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر بار بار رونا آ جاتا کہ میں خود اس گھر سے جانے والی ہوں۔ پھوپھو کا کیا بنے گا.....؟ میرے لیے بھی یہ سوچ معنی رکھتی تھی۔

عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے مہرہ پھوپھو نہا رہی تھیں۔ ماما قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں تھی۔ پاپا بازار گئے ہوئے تھے کہ کال بیل بجی، میں نے جا کر دروازہ کھولا..... سامنے..... غیر متوقع طور پر ریاست ماموں کھڑے تھے..... میں نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے انہیں دیکھا..... میں بھونچکا رہ گئی تقریباً چودہ سال بعد وہ میرے سامنے تھے..... وقت کی گرد نے ماموں پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ کپٹی کے بال سفید ہو گئے تھے..... آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سر کے بال کچھ کم اور جسامت تھوڑی بھاری

کر کہتے ہوئے ان کی آواز زندہ جاتی اور خود کو نارمل ظاہر کرتے وہ ضبط کی حدوں کو چھونے لگتیں تو میں ان کی اس حالت پر تڑپ جاتی۔

"پھوپھو ایسا کیوں ہوا.....؟ کیا ہو گیا.....؟" میرا معصوم سا ذہن کچھ سمجھنے سے قاصر تھا بس اتنا جانتی تھی کہ جو کچھ ہوا غلط ہوا، بہت غلط ہوا۔ میری پھوپھو دکھی ہیں، ان کی ہنستی مسکراتی آنکھیں اداس ہیں، ان کے چہرے کی ہنسی نہ جانے کہاں کھو گئی۔ ان کی میروں ڈائری بند ہو گئی.....

"ضروری نہیں کہ ہم جو چاہیں وہی سب ہمارے مقدر میں بھی ہو جو بعض اوقات انسان اپنی اوقات سے بڑھ کر مانگ لیتا ہے یہ سوچے سمجھے بنا کہ اس کے لیے بہتر ہے لیکن ہمارا رب تو سب کچھ جانتا ہے وہ جو ہمارے لیے بہتر ہے۔ وہ جو ہمارے لیے ضروری ہے۔ بظاہر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو ہمارے ساتھ ہوا درست نہیں ہماری مرضی اور منشا کے خلاف ہے مگر..... وہ جو ہے ناں ہمارا رب..... وہ کہیں نہ کہیں ہماری بہتری چاہتا ہے۔" بس اسی سوچ کے ساتھ مہرہ پھوپھو نے مجھے سمجھانا چاہا میں ابن کا منہ نکلنے لگی۔

☆☆☆

ڈھیر سارے دن گزرتے چلے گئے اس عرصے میں دادا جی اور دادو کا انتقال ہو گیا۔ پاپا ریٹائرڈ ہو گئے نوروز بھائی بہت اچھی طرح اپنی بیوی اور دو عدد پیارے سے بچوں کے ساتھ امریکا سٹیل ہو گئے اور اب ماما اور پاپا کو بھی بلوانا چاہتے تھے۔ عاتکہ آپا کے چار بچے تھے وہ اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ پاپا اور ماما نے کتنا چاہا کہ مہرہ پھوپھو کی شادی کر دی جائے لیکن وہ کسی صورت نہ مانیں۔ اب جبکہ میری شادی بھی طے ہو چکی تھی۔ ماما، پاپا امریکا جانے کو تھے ایسے میں سب اس بات کی وجہ سے فکر مند تھے کہ پھوپھو بھلا اس طرح کیسے تھا رہیں گی۔ اب عمر بھی خاصی ڈھل چکی

کی آنکھوں میں بھی مجبوریاں نظر آئی تھیں مجھے وہ بھی کہیں نہ کہیں بے قصور لگے تھے۔ رات کو وقت سے پہلے ہی پھپھو کراہند کر کے سونے لیٹ گئیں نہ جانے یہ کیسا احتجاج تھا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی..... میں بھی اپنے کمرے میں بے چین تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے لان میں دیکھا۔ ریاست ماموں تنہا بیٹھے تھے، میں بھی اٹھ کر باہر آگئی۔

”آ جاؤ گڑیا.....“ انہوں نے پھکی مسکراہٹ سے کہا تو میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”مبارک ہو، ہماری منی سی گڑیا کی بھی شادی ہونے والی ہے۔“ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

”ریاست ماموں! آپ نے ایسا کیوں کیا.....؟“ برسوں سے جو سوال میرے دل و دماغ میں چھپایا ہوا تھا۔ آج پھر میرے لبوں پر آ گیا۔

”آپ نے پھپھو کے ساتھ ایسا کیوں کیا.....؟“

”ہاں گڑیا.....! میں تمہیں سب کچھ بتانے والا تھا اس وقت تو تم بہت چھوٹی تھیں ناں مگر تم کو یاد ہوگا کہ میری ایک بہن تھیں تمہیلہ آپا.....؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”جی.....! وہ جن کو پیروں کا مسئلہ بھی تھا ناں شاید.....“ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”میری آپا کی شادی کا بہت مسئلہ تھا اور اس وقت بھی ان کی عمر 30 سال سے زیادہ تھی۔ میرے

ابا جی تو تھے نہیں اماں تھیں، وہ بھی ہارٹ پیسٹ.....

جب اماں، تمہیلہ آپا کی طرف سے مایوس ہو گئیں تو بادل ناخواستہ میری شادی طے کر دی۔ پھر اچانک

مجھے حیدرآباد جانا پڑا۔ عین اس وقت جبکہ شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ میں، مہر و کو دل و جان سے چاہتا تھا اور بہت خوش تھا کہ ہم لوگ ہمیشہ،

ہمیشہ کے لیے ایک ہونے والے ہیں پھر اچانک تمہیلہ آپا کی کال پر کہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے مجھے ایمر جنسی میں حیدرآباد جانا پڑا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک طرف میری اماں بیمار تھیں اور دوسری

طرف ایک نیا مسئلہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میری آپا کے لیے کوئی رشتہ آیا تھا لیکن ان کی شرط تھی کہ لڑکے

کی بہن کی شادی مجھ سے ہوا۔ ماں نے مجھ سے بات کی تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں ایسا کسی

صورت نہیں کر سکتا۔ میں کسی معصوم کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اماں نے رو، رو کر مجھے سمجھایا کہ مہرالتسا حسین

ہے، جوان ہے اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے، تمہاری بہن معذور ہے، صورت شکل بھی واجبی سی

ہے، عمر بھی زیادہ ہے اسے آنے والا پہلا رشتہ ہی آخری ثابت ہوگا اگر ہم نے انکار کر دیا تو ساری عمر

تمہاری بہن کنواری رہے گی۔ میں چین سے مر بھی نہیں سکوں گی۔ میری حالت پر رحم کرو میرے

بچے..... میری حالت تو پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ ایک طرف میری بیمار ماں تھی، دوسری طرف معذور بہن تو

دوسری طرف میرا پیارا..... میری زندگی..... میرا سب کچھ..... میری نیند، چین، کھانا، پینا سب کچھ ختم

ہو چکا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں یکسر ختم ہو چکی تھیں۔ میری نظروں میں ہر وقت مہر و کا چہرہ

رہتا، ہمیں اس سے بے وفائی کرنے کا قصور بھی نہیں کر سکتا وہ مجھے دل و جان سے عزیز تھی۔ پھر

اچانک اماں کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ ہمارا نکاح ایمر جنسی میں سادگی سے کر دیا گیا، تمہیلہ آپا رخصت

ہو گئیں اور میرا میرے گھر آگئی۔ اسی رات اماں کا انتقال ہو گیا..... یہ سب کچھ اتنے ڈرامائی انداز سے

میری زندگی میں رونما ہو چکا تھا کہ میرا دل اور دماغ بھی یہ ماننے سے انکاری تھا۔ اماں چلی گئیں، جیتے

جی مہر و میری زندگی سے نکل گئی اور..... اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرا میری زندگی میں آگئی۔ میرا نے پہلے

دن ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ایک ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہے جس کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع ہے، مجھے کیا کرنا تھا۔ مجھے تو بس اماں اور تمہیلہ آپا کی

صورت سے اس رشتے کو نبھانا تھا جو میرے لیے زبردستی کا تھا مگر رفتہ رفتہ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میرا کی

دوستوں کی فہرست میں لڑکیاں تو نہیں لڑکے زیادہ ہیں ہر وقت لڑکوں سے باتیں کرتی رہتی۔ نہ گھر کی فکر

ہوتی نہ کھانے پکانے اور نہ میری پروا ہوتی، میں آفس سے آتا تو کوئی نہ کوئی دوست گھر پر موجود ہوتا

جب محلے والوں نے مجھے احساس دلایا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں بھی مرد تھا کہاں تک برداشت کرتا

دو سالوں میں ہی میں عاجز آ گیا تھا۔ آخر میں نے اس پر سختی شروع کی نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے میرا گھر چھوڑ

دیا۔ بقول اس کے اسے پابندیوں میں رہنے کی عادت نہیں، وہ آزاد رہی ہے اس لیے اسے آزاد

کرو..... وہ اپنے گھر گئی تو تمہیلہ آپا کو طلاق کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ میں نے بھی طلاق بھجوا دی یوں

زندگی کا یہ سچ باب ختم ہوا۔ مگر اب بھی کچھ امتحانات باقی تھے۔ میرے دل و دماغ پر مہر و کا راج ہی تھا میں

شدت سے اس کی کمی محسوس کرتا..... تمہیلہ آپا گھٹ، گھٹ کر جیسے لگیں۔ نتیجتاً ان کو کیئر جیسا موڈی مرض

ہو گیا اور ایک دن انہوں نے اماں کی طرح میرا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ میرا دل وہاں سے اچاٹ ہو چکا

تھا۔ مگر یہاں آنے کا منہ نہیں تھا۔ مہر و کے پاس آنا کس منہ سے اور پھر مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ اس کی

شادی ہوئی بھی یا نہیں..... میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ تب ایک دوست کے ذریعے میں دعویٰ چلا گیا اور

گزشتہ دس سال سے وہیں ہوں..... پھر کچھ دن پہلے میری ملاقات دعویٰ کے ایک شاپنگ مال میں

عائکہ سے ہوئی تب مجھے یہاں کے بارے میں پتا چلا..... عائکہ نے ہی اصرار کیا کہ آپ ایک بار وہاں جا کر دیکھیں..... تو میں بڑی امید کے ساتھ یہاں آیا

اقرار

میرے دل کے کورے کاغذ پر

دھیرے سے

چپکے سے

کوئی ایک لفظ نقش کر گیا ہے

اپنی چاہت کا اقرار کر کے

میرے خوابیدہ جذلوں کو بیدار کر گیا ہے

اک نئے احساس سے روشناس کر کے

اپنے جذلوں کا اظہار کر کے

کوئی یہ تحریر کر گیا ہے

مجھے تم سے محبت ہے.....

مجھے تم سے محبت ہے.....

شاعرہ: نیا سکین اقبال، لاہور

اکثر

اس بھتی تہائی میں

عمر گزر رہی ہے

اداسی چپکے سے سانسوں میں

اتر رہی ہے

تہائی اور ہو کا عالم

اور تیری یاد

ایسے میں وہ لمحے ادھوری ملاقاتوں کے

ماہ و انجم کی پاکیزہ روشنی میں

شعر و نغمہ بن کے دل پہ چھاتے ہیں

اندرون دل گنگتاتے ہیں

خیالات کے جزیروں میں

تیرا چہرہ بن کے جھلکاتے ہیں

وہ لمحے ادھوری ملاقاتوں کے

اکثر مجھے یاد آتے ہیں

شاعرہ: حیات ترندی، کاغان

تھا..... مگر.....“ وہ کچھ دیر کو رکے..... ان کی بڑی، بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی واضح تھی اور لہجے میں بے پناہ یاسیت تھی۔ میں جو دم سادھے سب کچھ سن رہی تھی غیر محسوس طریقے سے میری آنکھیں ان کے حالات سن کر مسلسل بہ رہی تھیں۔

”نہ گڑیا، تم کیوں روتی ہو.....؟ ہم بہت رو لے ناں.....“ ان کے ٹوٹے لہجے پر میں مزید تڑپ گئی۔

”میرے پاس آج دنیا کی ہر آسائش ہے لیکن سکون نہیں ہے میں صدق دل سے مہرو سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتا ہوں، اسے اپنانا چاہتا ہوں..... گڑیا تم بتاؤ میرا قصور کہاں ہے.....؟“ ان کے سوال پر میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا واقعی..... مجھے ریاست ماموں بھی دنیا کے مظلوم ترین انسان لگے جو حالات کی چکی میں بری طرح پستے، پستے اس مقام تک پہنچے تھے اور اتنا سب کچھ کر کے بھی وہ تہی دامان تھے۔

”گڑیا! تم اپنے ماموں کی ہیلپ کرو گی ناں.....؟“ ان کے معصومانہ سوال پر میں نے غور سے انہیں دیکھا سوالیہ نظروں سے وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔

”جی ماموں ضرور.....“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

ممانے پھپھو سے ریاست ماموں کے حوالے سے بات کی تو ان کو پتے لگ گئے اور اسی غصے کے اظہار کے طور پر آج دوپہر سے ہی وہ کچن میں گھسی اظہاری تیار کر رہی تھیں۔ ان کی سرد مہری اور مسلسل انکار پر ریاست ماموں بری طرح ٹوٹ چکے تھے اور وہ واپس لوٹ جانا چاہتے تھے۔

عید میں دو دن باقی تھے پھر سے گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر میں نے مہرو پھپھو سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”گڑیا تم بھی ایسے کرو گی.....؟“ میں نے

بات اشارت کی تو مہرو پھپھو نے غم، غم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا.....

”جی..... کیونکہ مجھے سچائی کا پتا چل گیا ہے پھپھو پلیز! آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں، کہاں پر ریاست ماموں غلط ہیں؟ اگر آپ ان کی جگہ پر ہوتیں تو کیا کرتیں؟“

”مگر..... ہمارے چودہ سال.....؟“ انہوں نے بڑی، بڑی آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔

”اب اس عمر میں شادیاں رجاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی ہمیں.....؟ نہیں، نہیں گڑیا اس موضوع پر ہم سے آئندہ کچھ نہ بولنا.....“ کہہ کر انہوں نے گویا بات ختم کر دی میں اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

میں مایوس ہو گئی، میرے دل میں ایک پھانس سی چھ گئی تھی ایک جانب ریاست ماموں بیچارے لگتے تو دوسری جانب سے پیاری پھپھو کے گزشتہ چودہ سالوں کو یاد کر کے مجھے رونا آ جاتا۔

”پاک پروردگار میرے ماموں اور پھپھو پر اپنا کرم کرنا، میرے مولا ان دونوں کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ دونوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے کوئی سبیل نکال لے میرے اللہ.....“ میں نے صدق دل سے دونوں کے لیے دعا مانگی۔

چاند نظر آ گیا تھا ہر جانب شور تھا، ہنگامہ تھا، خوشیاں منائی جا رہی تھیں میرے دل پر عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا، میرا دل بھی نہیں کیا کہ چھت پر جا کر چاند دیکھوں میں نے یونہی دونوں کے لیے دل سے دعائیں مانگ لیں۔ مہرو پھپھو اکیلی چھت پر تھیں اور ہمیشہ کی طرح چاند دیکھ کر نہ جانے کیا، کیا دعائیں مانگ لی تھیں۔

دعا مانگ کر جیسے ہی پلٹیں تو عین سامنے ریاست بیگ کھڑے تھے۔ مہرو سٹ پٹا کنٹیں اور راستہ کا ثنا چاہا۔

”مہرو! میری ایک بات سن لو پلیز.....“ ریاست بیگ کی التجا پر ان کے بڑھتے قدم رک گئے۔

”اب کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا ریاست.....“

”مہرو تم..... تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں ایک بار ٹھنڈے دل سے میرے حالات کو اپنے سامنے رکھ کر سوچو اس کے بعد فیصلہ کرنا، میں شرمندہ ہوں کہ تمہارے ساتھ۔“

”بس کرو ریاست.....! اب اس شرمندگی سے کیا فائدہ.....؟ کیا آپ ہمیں ہمارے چودہ سال لوٹا سکتے ہیں؟ ہمارا کیا تصور تھا.....؟ ہمیں کس گناہ کی سزا ملی.....؟ ہمیں کیوں تڑپایا گیا؟ ہم سے ہماری جوانی کیوں چھین لی گئی۔“ وہ پھر کر پلٹی تھیں۔

”مہرو! میں ان سب کو تاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں..... میں وہ وقت واپس تو نہیں لا سکتا لیکن..... لیکن..... کوشش کر سکتا ہوں کہ تم ماضی کی تمام تلخیوں کو بھول جاؤ..... میں چاند، تارے توڑنے کا وعدہ نہیں کرتا مگر تم کو ہر آسائش دینے کا وعدہ ضرور کرتا ہوں..... میں تمہاری زندگی کو محبتوں سے آباد کر دوں گا..... تمہارے لیے.....“

”بس کرو ریاست بیگ اس عمر میں یہ سب کرنا نہ تمہیں زیب دیتا ہے نہ ہی ہمیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔“

”مہرو..... ایک بار، ایک بار ہماری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بات اپنے دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ کہہ دو کہ تمہارے لیے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

”ہاں، ہاں نہیں رکھتے تم ہمارے لیے اہمیت..... ہمیں ضرورت نہیں ہے تمہاری..... ہم بہت خوش ہیں اپنی دنیا میں، ہم اس زندگی سے مطمئن بھی ہیں اور خوش بھی..... ہمیں اسی طرح جینے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب ہماری زندگی میں تمہاری ضرورت ہے نہ اہمیت.....“

”پھر..... پھر آج بھی تم راتوں کو کس کے لیے

روتی ہو..... آج بھی راتوں کو اٹھ، اٹھ کر عملی ڈائری میں کیا لکھتی رہتی ہو..... ہمارے نام پر تمہاری خوب صورت آنکھیں کیوں جھلکانے لگتی ہیں.....؟ بولو جواب دو.....“ ریاست بیگ دو قدم آگے آگئے تھے اور ان کو کاندھے سے تھام کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کر رہے تھے۔

”اُف!“ مہرو نے ان کی آنکھوں میں دیکھا..... وہ لا جواب ہو گئی تھیں۔

”ریاست..... ریاست.....“ ریاست بیگ کو دونوں ہاتھوں سے برے دھکیلا پر دوسرے لمحے ان کے بازوؤں میں بکھر گئیں۔

”تم بہت برے ہو ریاست بہت برے مگر.....؟“ روتے، روتے وہ خاموش ہو گئیں۔

”مگر کیا.....؟“ ریاست بیگ جو اچانک اس حرکت پر خوشی سے حیران تھے ان کے چپ ہو جانے پر تجسس سے سوال کر بیٹھے۔

”مگر پھر بھی ہماری جان ہو۔“ مہرو یہ مشکل کہہ سکیں..... ہنستے مسکراتے اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے وہ اس حسین احتجاج میں ریاست بیگ کے دل میں اترتی چلی گئیں۔

”تھینک گاڈ.....!“ ریاست بیگ نے طویل سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔

”ہرا..... عید مبارک، ملن مبارک..... واہ جی مہرو پھپھو کی عید تو زبردست ہو گئی۔“ میں کب سے سیڑھیوں پر کھڑی ڈراپ سین کی منتظر تھی آخر برداشت نہ کر سکی اور خوشی سے زور، زور سے تالیاں بجانے لگی۔ دفعتاً دونوں چوٹے۔

”شریر.....“ ریاست ماموں زندگی سے... مہرو پھپھو ہنسی کے ساتھ میرے سر پر چپٹ لگا کر بولے جبکہ مہرو پھپھو شرم سے جھپٹی، جھپٹی اس وقت ریاست ماموں کے ہوش و حواس پر بجلیاں گرا رہی تھیں۔



قسط: 2

آخری امید

قیصرہ حیات

مکان فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
ایک ایسی لڑکی کی کہانی... جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی
ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالنے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن
شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب
صورت اور پُر اثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔
اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات
مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایدناز مصنفہ کے سفر و اندازِ بیباں کا

ایک اور شاہکار

تمہیں مسکراتی ہوئی دکھائی دے گی۔" بیرن نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کا آرنیکل کھول کر دیکھنے لگی۔ کیتھی اسے تجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا لگ رہا ہے..... میں اسے جلد میگزین میں شائع کروں گی۔" بیرن نے مسکرا کر اسے سائڈ پر رکھے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ..... آپ میرے لیے بہت بڑی inspiration ہیں..... مجھ میں یہ پہنچ آپ کی وجہ سے آیا ہے۔ اینڈ آئی ہوپ مجھے آگے لانے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔" کیتھی نے مسکرا کر کہا تو بیرن بھی مسکرائے گی۔ "یہ سنڈے تم نے میرے ساتھ گزارنا ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں....." بیرن نے مسکرا کر پوچھا۔ "ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" کیتھی نے مسکرا کر جواب دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر آفس سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

جوائے بڑے خوشگوار موڈ میں مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا تو بیرن بھی مسکراتے ہوئے موبائل آف کر رہی تھی۔ جوائے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"مام..... کس کا فون تھا۔ آپ بہت خوش دکھائی دے رہی ہیں۔" جوائے نے مسکرا کر پوچھا۔

"میری ایک بہت پرانی فرینڈ زیب گل پاکستان سے جرمنی آئی ہے۔ ابھی اسی کا فون آیا تھا۔ وہ ہم سے ملنے ہمارے گھر بھی آئے گی۔" بیرن نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیا وہ مسلم ہے؟" جوائے نے ایک دم حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، کیوں.....؟" بیرن نے چونک کر جواب دیا۔

"کیا آپ کسی مسلم کو اپنے گھر آنے کی اجازت دیں گی؟ اس امیگزنگ..... کیا آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنے برے لوگ ہوتے ہیں۔" جوائے نے ننگی سے منہ بنا کر پوچھا۔

"ہاں..... لیکن میں زیب کو منع نہیں کر سکتی کیونکہ اس نے مجھے اور تمہیں مشکل وقت میں جرمنی بھیجے میں ہماری مدد کی تھی۔" بیرن نے نظریں جراتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا تو جوائے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مام..... جم انکل تو انہیں hypocrite (دورے) کہتے ہیں اور آپ بھی انکل کے ساتھ مل کر مسلم پر ہنسی تمہیں تو پھر آپ اپنی فرینڈ کو کیسے اپنے گھر میں respect دیں گی؟" جوائے نے حیرت سے پوچھا تو بیرن بری طرح بوکھلا گئی۔

"سب مسلم برے نہیں ہوتے۔" نادانستہ بیرن کے منہ سے نکلا تو جوائے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور بیرن اس سے نظریں چراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جوائے اس کی بات سن کر گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سنڈے مارننگ کو کیتھی جلدی، جلدی تیار ہونے لگی تو اسے یاد آنے لگا کہ ایلین کی زندگی میں وہ ہر سنڈے کو یونہی چرچ جانے کے لیے تیار ہوا کرتی تھی..... اور تب تیار ہوتے ہوئے اس کے اندر ایک خوف اور خوشی بھی ہوتی تھی مگر آج وہ صرف خوش تھی..... اس نے اچھا سا ڈریس پہنا اور لاگ کوٹ کے ساتھ کیب پہن کر باہر نکل گئی۔ باہر برف باری ہو رہی تھی مگر اس موسم میں جانا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جب بیرن کے گھر پہنچی تو جوائے اور بیرن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ کیتھی کو دیکھ کر بیرن انتہائی خوشی اور محبت سے ملی اور جوائے کے ساتھ اس کا تعارف کروایا۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہائے کہا۔ بیرن نے اسے اپنے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر ہی ناشتے کے لیے بٹھالیا۔ اور سب مل کر ناشتا کرنے لگے..... ناشتے کے دوران ہی جوائے اور کیتھی ایک

کافی روز بعد کیتھی کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تھی اور وہ اپنے اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے میں مصروف تھی..... (ایلین) مام کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اُن کی الماری میں سے کچھ اور لیٹرز بھی ملے تھے جو ایلین نے جارج کے نام لکھے تھے مگر انہیں کبھی پوسٹ نہیں کیا تھا۔ کیتھی انہیں کھول کر پڑھنے لگی..... اور پڑھتے ہوئے اسے پھر شدید رونا آ گیا..... کیونکہ اس کی مام نے ہر خط میں جارج سے شکوہ کیا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ بہت بے وفائی کی تھی۔ اور اس کی بے وفائی نے اس کی زندگی سے ہر قسم کا یقین اور اعتماد چھین لیا تھا۔ اس نے سارے خطوط پڑھ کر انہیں پھاڑ ڈالا اور ماں کی ساری چیزوں کو ایک باکس میں بند کر کے اسٹور میں رکھ دیا۔ اس نے دوسری غیر ضروری چیزیں بھی اٹھا کر اسٹور میں رکھیں، وہ یہ اپارٹمنٹ مسٹر جیکسن کے بھائی کو دے رہی تھی اُس نے اپنے لیے صرف ایک چھوٹا کمر رکھا تھا..... اور خود ایک آرٹ کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ بیرن کی باتوں نے اس کے اندر بہت امید پیدا کر دی تھی اور اس نے اپنے ذہن کو اچھی طرح سمجھا کر زندگی میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تھا..... وہ اپنے آپ کو فنانسنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نئی راہیں منتخب کرنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ نہ جانے زندگی نے اس کے لیے کیا پلان کر رکھا ہے، اسے وہ تلاش کرنا ہے وہ قدرے مطمئن تھی..... اور اس نے بیرن کا میگزین بھی جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مسٹر اینڈ مسز جیکسن اس میں یہ پہنچ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیتھی نے ایک چھوٹا سا آرنیکل "نیولائف" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اور وہ کافی فریش موڈ میں اسے لے کر بیرن کے آفس میں گئی تو جم، بیرن کے ساتھ کسی ڈسکشن میں مصروف تھا۔ کیتھی آفس میں داخل ہوئی تو بیرن اسے ایک دم فریش دیکھ کر انتہائی خوش ہو گئی..... کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"جم..... یہ کیتھی ہے۔" بیرن نے بڑی رسائیت سے کیتھی کا جم سے تعارف کراتے ہوئے کہا..... تو جم نے بھی مسکرا کر اسے ہائے کہا۔

"کیتھی..... میں نے تمہیں جم کے بارے میں بتایا تھا ناں..... یہ میرے کولیگ بھی ہیں اور بہت اچھے فیملی فرینڈ بھی۔" بیرن نے جم کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا..... کیتھی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو جم نے بھی مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"اوکے..... تم لوگ باتیں کرو، مجھے کچھ آرنیکلز پاس کے ساتھ بھی ڈسکس کرنے ہیں۔" جم نے کیتھی اور بیرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور قائل اٹھا کر باہر چلا گیا۔ بیرن، کیتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "آج تم بہت خوش اور فریش لگ رہی ہو اور میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہوں۔" بیرن نے کیتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... اب میں نے لائف کے بارے میں بازیو ہو کر سوچنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے آرٹ کالج میں ایڈمیشن بھی لیا ہے اور آپ کے میگزین کے لیے ریگولر لی لکھنے کا بھی سوچا ہے۔" کیتھی نے اپنے بیگ میں سے آرنیکل نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تو بیرن ایک دم انتہائی خوش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیش ویری گڈ..... اب تم دیکھنا لائف تمہیں کتنی اچھی طرح ٹریٹ کرے گی۔" بیرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ کیسے.....؟" کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

"جب ہم کسی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں..... تو یقیناً دیکھنے والا بھی ہماری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح زندگی ہے جب ہم مسکرا کر اس کے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے ہیں تو ہمیں اور نئی، نئی راہیں ملتی ہیں..... مگر جب ہم مایوس ہو کر اپنے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے ناامیدی سے بیٹھ جاتے ہیں تو کمرے میں تاریکی کے ساتھ، ساتھ ڈپریشن بھی بڑھنے لگتا ہے۔ اس لیے اپنی سوچ کو پازٹیو رکھ کر زندگی کی طرف مسکرا کر دیکھو ہر چیز

اگر یہ ہو جاتا تھا۔ کیتھی بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”میم..... آپ کی فرینڈ سے جوئے کو کیوں ٹینشن ہو رہی ہے..... کیا یہ ان سے ناراض ہے؟“ کیتھی نے جوئے کے جانے کے بعد انتہائی حیرت سے پوچھا تو بیرن بری طرح ہڑبڑا گئی۔

”نہیں..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں، اچھے بھائی وہ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو برداشت نہیں کرتا اس لیے ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ تم فکر نہیں کرو..... چلو آؤ ہم بکن میں چلتے ہیں تاکہ میں اپنی فرینڈ کے لیے کچھ کوکنگ کر لوں۔“

بیرن نے جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا اور بکن میں چلی گئی۔ کوکنگ کرتے ہوئے کیتھی اس کے ساتھ کام بھی کرتی رہی اور باتیں بھی..... کافی دیر بعد زیب لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس نے لاگ کوٹ کے ساتھ اسکارف اس طرح لے رکھا تھا کہ اس کا سارا چہرہ چھپا ہوا تھا صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بیرن جب اسے پاکستان آخری بار مل کر آئی تھی وہ بہت لمبی اور دلی تھی۔ مگر اب وہ قدرے صحت مند اور موٹی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ دراز قد اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ بیرن انتہائی محبت اور گرم جوشی سے اس سے ملی اور کیتھی کو بھی اپنی little friend کہہ کر تعریف کروایا۔ زیب نے بہت محبت سے کیتھی کو جو ماورا اپنے ساتھ لگایا تو کیتھی کو اس سے انتہائی خوش کن محبت بھرا ہنہایت کا احساس ملا..... کیتھی اس سے بہت متاثر ہونے لگی۔ زیب اور بیرن آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کیتھی ٹرائی میں اس کے لیے کافی کے ساتھ مختلف لوازمات لے کر آئی۔ زیب انتہائی خوشگوار موڈ میں بیرن کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور اس سے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ کیتھی تجسس ہو کر دونوں کی باتیں سننے لگی۔

”بیرن کیا تم نے کبھی اب دوبارہ پاکستان آنے کا نہیں سوچا..... اور جوئے کہاں ہے..... وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا.....؟“ زیب نے کافی پیٹے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا تو بیرن ایک دم بوکھلا گئی۔

”آج سنڈے ہے نا، وہ اپنے ایک انکل سے ملنے گیا ہے۔“ بیرن نے جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اب تو وہ کافی بڑا ہو چکا ہوگا۔“ زیب نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... بہت بیک اینڈ اسمارٹ.....“ بیرن نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میرے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ جنہیں میں اماں جان کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔“ زیب نے مسکرا کر بتایا۔

”اور تمہارے بابا جان کیسے ہیں..... اکثر مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں اگر وہ میری مدد نہ کرتے تو میں کبھی یہاں نہیں آسکتی تھی۔“ بیرن نے تشکرانہ انداز میں زیب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو زیب مسکرائے لگی۔

”زیب..... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ اگر تم اپنے بابا جان کو کونوٹس نہ کرتیں..... تو شاید میں کبھی یہاں نہ آپاتی۔“ بیرن نے زیب کا ہاتھ پکڑ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ارے ایسا مت کہو..... تم میری بہت اچھی فرینڈ ہو۔“ زیب نے محبت سے بیرن کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی..... کیتھی انتہائی حیرت سے زیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کا لہجہ بہت نرم تھا اور باتیں کرتے ہوئے اس کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت نرم دل اور محبت کرنے والی خاتون ہو..... زیب نے اچانک اپنی رسٹ واپج دیکھی..... اور اپنے جوتے اور موزے اتارتے ہوئے بولی۔

”عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے اور مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ زیب نے ننگے پاؤں اٹھتے ہوئے کہا۔

”اوکے..... تم واش روم میں جا کر وضو کر لو لیکن آئی ایم سوری ہمارے گھر میں کوئی prayer mat نہیں.....“ بیرن نے آہستہ آواز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں..... کوئی چٹائی یا چھوٹا کارپٹ ہے یا پھر کوئی صاف بیڈ شیٹ تو میں اس پر نماز پڑھ لیتی

دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان گئے تھے۔

”جوئے، کیتھی بہت زبردست آرٹسٹ ہے اور بہت اچھی پینٹنگز بھی کرتی ہے۔ تم اسے اپنی بھی ساری پینٹنگز دکھاؤ۔ میں اتنی دیر میں لائٹری سے ہو کر آتی ہوں۔“ بیرن نے کہا تو کیتھی، جوئے کے ہمراہ اس کے کمرے میں چلی گئی..... جوئے خوشی، خوشی اسے اپنی مختلف پینٹنگز اور اسکیزو دکھانے لگا۔ کیتھی بھی کافی دلچسپی لے کر ان پینٹنگز کو دیکھ رہی تھی اور آرٹ سے متعلق مختلف سوالات کر رہی تھی۔ کیتھی کا آرٹ میں انٹرسٹ اور تاج دیکھ کر جوئے بہت خوش ہو رہا تھا اور قدرے ایکسٹنڈ ہو کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

دونوں بہت زیادہ خوش تھے۔ کیتھی کو بھی بہت عرصے بعد کوئی ایسا فرینڈ ملا تھا جس کے ساتھ وقت گزار کے وہ بہت انجوائے کر رہی تھی۔ اسی ایکسٹنٹ میں کیتھی نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر اس کا پینٹل اسکیچ بنا ڈالا..... وہ جوئے کے چہرے کو ہر اینگل سے آزر کر رہی تھی۔ اور جوئے اس کی اس observation سے محظوظ ہو رہا تھا۔ جب اس نے اسکیچ کاپیٹ کر کے جوئے کو دکھایا تو وہ بہت حیران ہوا اور کیتھی کو بہت زیادہ appreciat کرنے لگا۔

”یو آراے ونڈر فل آرٹسٹ..... تم نے تو مجھ سے بھی زیادہ اچھا اسکیچ بنا لیا ہے۔ ریلی آئی ڈونٹ بلیواٹ.....“

جوئے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرائے لگی۔

”تھینک یو..... اب تم میرا اسکیچ بناؤ.....“ کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ جوئے مسکرا، مسکرا کر اس کا اسکیچ بنانے لگا۔ باتوں ہی باتوں میں دونوں یوں ایک دوسرے سے فریک ہو کر باتیں کرنے لگے جیسے ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہوں۔ جوئے نے اس کا اسکیچ مکمل کیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس کی تعریفیں کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد بیرن واپس آگئی اور دونوں کے ایک دوسرے کے بنائے گئے اسکیچ دیکھ کر ان کی تعریفیں کرنے لگی۔ کیتھی آج بہت زیادہ خوش تھی اور یہ خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ بیرن کا موبائل بجا تھا دوسری طرف زیب اس سے اس کا ایڈریس پوچھ رہی تھی۔ بیرن مسکرا کر اسے ایڈریس سمجھانے لگی۔

”گلتا ہے آج کوئی اور گیٹ بھی آ رہا ہے؟“ کیتھی نے مسکراتے ہوئے بیرن سے پوچھا۔

”ہاں..... میری ایک اولڈ فرینڈ آ رہی ہے۔“ بیرن نے کہہ کر ایک دم جوئے کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات پھیل گئے۔

”آئی تھنک مجھے جم انکل کی طرف چلے جانا چاہیے۔“ وہ منہ بنا کر بولا تو کیتھی اور بیرن نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں.....؟“ بیرن نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ..... وجہ جانتی ہیں۔“ جوئے نے کہا..... اور جم کو فون کرنے لگا کہ وہ اس کی طرف آ رہا ہے۔ بیرن کو اس کا attitude دیکھ کر شاک سا لگا۔

”جوئے بیٹا..... یہ ٹھیک بات نہیں..... جو بھی ہے، وہ ہماری گیٹ ہیں اور ہمیں بھر پور پروٹوکول دینا چاہیے۔“ بیرن نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم ناٹ اے، ہپو کریٹ.....“ جوئے نے الفاظ چباتے ہوئے کہا اور منہ بنا کر ایک بیک میں کچھ چیزیں ڈال کر وہاں سے چلا گیا۔ بیرن حیرت اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے روکے..... اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جب بھی جوئے کو کسی بات سے زبردستی روکنے کی کوشش کرتی تو وہ بہت زیادہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کو الٹی، کپی رائٹ کو الٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety  twitter.com/paksociety1

ہوں.....“ زیب نے قدرے نرمی سے کہا۔
 ”میں لاتی ہوں۔“ بیرون اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تو زیب بھی واش روم میں جا کر وضو کرنے لگی۔ کیتھی انتہائی متحس ہو کر اس کے پیچھے گئی اور واش روم کے دروازے کے پاس کھڑی ہو کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ زیب بہت اہتمام سے وضو کر کے باہر نکلی تو بیرون نے اسے ایک چھوٹی سی چٹائی پکڑائی۔ وہ تھینک یو کہہ کر چٹائی بچھانا چاہ رہی تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس رخ سے بچھائے۔
 ”آئی ایم سوری..... مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں کہ یہاں لوگ کس طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔“ بیرون نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو زیب نے جلدی سے اپنا موبائل پکڑ کر اس پر ڈائریکشن معلوم کی اور لاؤنج کے ایک کونے میں چٹائی بچھائی مگر اس کونے میں دیوار پر جوئے اور بیرون کی کچھ تصویریں لگی تھیں۔ زیب نے انہیں اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھا جب دیوار بالکل خالی ہو گئی تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگی۔ کیتھی اس کے پیچھے بیٹھ کر انتہائی حیرت سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگی۔ بیرون کچن میں چلی گئی تھی مگر کیتھی وہیں بیٹھی رہی اور جب نماز ختم کر کے زیب دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا پڑھنے میں مصروف تھی تو اس کے چہرے سے بہت اطمینان اور سکون جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں..... مگر ہونٹ تیزی سے بل رہے تھے۔ اس کے چہرے سے ایسی روشنی پھوٹ رہی تھی کہ کیتھی کتنی ہی دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ جب زیب نماز پڑھ کر اور چٹائی کو لپیٹ کر اٹھی تو اچانک اس کی نظر کیتھی پر پڑی..... اسے اپنی طرف یوں محو دیکھ کر وہ ایک دم چونکی اور مسکرا کر پوچھنے لگی۔
 ”اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟“ زیب نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔
 ”prayer میں پانچ بار ہم مسلم نماز پڑھتے ہیں۔ ساری دنیا کے سب مسلمان ایسے ہی نماز پڑھتے ہیں۔“ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”یوں دیوار کی طرف منہ کر کے.....؟“ کیتھی نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 ”نہیں..... دیوار کی طرف نہیں، کعبہ کی طرف..... جو اللہ کا گھر ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اللہ کے گھر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔“ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”اللہ کے گھر کی طرف کیوں؟“ کیتھی نے پھر حیرت سے پوچھا۔
 ”کیونکہ وہ ہی سب کا (گاڈ) اللہ ہے۔ اور اس زمین پر صرف اس کا ایک ہی گھر ہے خانہ کعبہ جس کی طرف اس نے سب مسلمانوں کو منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ہم اپنی مرضی سے نہیں کرتے اس کے حکم سے کرتے ہیں۔ اگر اپنی مرضی سے کریں تو کوئی کسی طرف منہ کرے تو کوئی کسی اور طرف.....“ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے اسے بتایا۔
 ”کیوں..... اس میں کیا لاجک ہے؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔
 ”اسلام میں unity (وحدت) پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دنیا کے مسلمان کہیں بھی رہتے ہوں اسی طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اللہ پر ایک جیسا (یقین) faith رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ ہر ایک کے پاس موجود ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے اور وہ ہر عبادت میں وہ نظم و ضبط چاہتا ہے۔ دنیا کے سب مسلمان ایک جیسی ہی نماز پڑھتے ہیں۔ ایک جیسے روزے رکھتے ہیں، ایک جیسا حج اور عمرہ کرتے ہیں اور خدا پر بھی ایک جیسا ہی ایمان رکھتے ہیں۔“ زیب نے قدرے سنجیدگی سے بتایا تو کیتھی حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”آپ نے اس دیوار سے جوئے اور میم کی پکچرز کیوں اتاریں؟“ کیتھی نے پھر متحس ہو کر پوچھا۔
 ”وہ اس لیے کہ اسلام میں امیج کی پوجا کرنا حرام ہے۔ اللہ یعنی کہ گاڈ دنیا کے تمام امیج اور shapes سے



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ضلعہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بہت بڑا ہے۔ انسان کی عقل اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ اس کی ہستی بہت بڑی ہے، ہم اسے اس کی نشانیوں سے پہچانتے ہیں جب ہم دنیا کی ہر چیز میں اسے آبرو کرتے ہیں تو ہمارا یقین چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیکھ کر جب بڑی تک پہنچتا ہے تو اس کے بارے میں صرف ایک سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اس کا خدا بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ وہ پوری کائنات اور اس میں بسنے والی ساری مخلوق کو لچھوں میں سمیٹ سکتا ہے۔“ زیب اسے انتہائی محبت سے گاڈ کے بارے میں بتانے لگی تو وہ اس کی ہر بات کو انتہائی حیرت سے سننے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زیب کی ایک، ایک بات اس کے دل پر انتہائی شدت سے اثر کر رہی ہو..... اسی لمحے پیرن پچن سے آئی اور زیب سے پھر باتیں کرنا شروع ہو گئی مگر کیتھی اپنی جگہ پر یونہی بیٹھی رہی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش پیرن پچن سے نہ آئی تو وہ اس کی باتیں یونہی سنتی رہتی۔ نہ جانے اس کی باتوں میں کیسا سحر تھا کہ کیتھی کا دل مضطرب ہونے لگا اور وہ خواہش کرنے لگی کہ کاش زیب پھر سے اکیلی ہو اور وہ اس کی باتیں سنے..... وہ اسی انتظار میں بیٹھی رہی..... مگر پیرن اور زیب آپس میں انتہائی محو ہو کر اپنی فیملی اور یونیورسٹی لائف کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ مغرب کی نماز کا ٹائم ہو گیا..... زیب پھر اٹھی اور وضو کر کے پہلے کی طرح نماز پڑھنے لگی..... کیتھی پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ پیرن موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زیب کی یہ نماز پہلے سے کچھ لمبی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر جب وہ صوفے پر بیٹھی تو کیتھی جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

”آپ بار، بار ایک جیسی نماز کیوں پڑھتی ہیں..... کیا ایک ہی کافی نہیں۔“ کیتھی نے قدرے متحسب ہو کر پوچھا۔

”ہم دن میں کھانا بھی تو بار، بار کھاتے ہیں نا..... کیا ایک بار کھانا کافی نہیں؟“ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کھانے کا نماز سے کیا تعلق.....؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

”کھانا جسم کی غذا ہے اور نماز روح کی.....“ زیب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ کیسے.....؟“ کیتھی نے پھر چونک کر پوچھا۔

”انسان دو چیزوں سے بنا ہے جسم اور روح..... اگر جسم کو بھوک لگتی ہے تو روح کو بھی اس سے زیادہ بھوک لگتی ہے۔“ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے.....؟“ میری روح کو تو کبھی بھوک نہیں لگی۔“ کیتھی نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا تمہارے دل نے خدا سے کبھی محبت نہیں کی؟“ زیب نے پوچھا تو کیتھی ایک دم چونکی۔

”کیا جیسز کرائسٹ سے؟“ کیتھی نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں گاڈ سے..... جیسز کرائسٹ..... گاڈ نہیں وہ صرف ایک prophet یا Messenger ہیں۔ جس طرح ہمارے prophet حضرت محمد ﷺ ہیں اسی طرح کرپتزر کے prophet جیسز کرائسٹ ہیں اور جیوز کے prophet حضرت موسیٰ Moses ہیں۔ گاڈ کو prophets کے ساتھ مت ملاؤ..... وہ صرف ایک ہے، جس نے ساری دنیا کے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اس نے ہر انسان کے دل میں اپنی محبت اور تلاش رکھی ہے۔ جب انسان کا تعلق اس کے ساتھ بندھ جاتا ہے تو پھر جسم کی بھوک کی طرح روح کی بھوک بھی بڑھنے لگتی ہے۔ اور جب انسان اس کی عبادت کرتا ہے تو اس کی یہ بھوک satisfaction (طمینان) میں بدل جاتی ہے۔ تم بھی گاڈ سے سچی محبت کر کے دیکھو..... تو پھر خود بخود تمہیں سب سمجھ میں آ جائے گا۔“ زیب نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا تو کیتھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور نادانستہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چومنے لگی۔ زیب نے بھی محبت سے اس کی پیشانی کو چوما۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ محبت کا انتہائی دلغریب احساس اور بس اس کی روح کو چھو گیا ہو۔

زیب کا موبائل بجنے لگا تھا جیسی پیرن اپنے کمرے سے باہر نکلی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کپی رایت کو الٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آخری امید

”او کے پیرن..... تھینک یو ویری مچ فار یور کمپنی..... میرے ہسینڈ مجھے لینے آرہے ہیں۔ اب مجھے جانا ہے۔“
 زیب نے مسکراتے ہوئے موزے، جوتے پہنے پھر کوٹ پہن کر اسکارف کو اچھی طرح لیا..... کیتھی نہایت حیرت سے اس کی ایک، ایک حرکت کو دیکھ رہی تھی۔
 ”زیب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہو اور اب واپس بھی جا رہی ہو۔ تمہیں میرے پاس stay کرنا چاہیے۔“ پیرن نے مصنوعی خشکی سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں پھر آؤں گی۔ جوئے سے ملے بغیر میں کیسے جا سکتی ہوں۔ میرا اس سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔“
 اوہ، میں تو بھول ہی گئی۔ میں اس کے لیے گفٹس لائی تھی۔“ اور اس نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے چاکلیٹس کے کئی پیکٹ نکالے اور انہیں ٹیبل پر رکھا اور مسکرا کر ایک پیکٹ کیتھی کو پکڑا اتے ہوئے بولی۔
 ”یہ ہماری لعل فرینڈ کے لیے.....“ زیب نے نہایت محبت سے چاکلیٹ کا پیکٹ کیتھی کو پکڑا یا تو وہ انتہائی خوش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”تھینک یو ویری مچ، یو آر سو سوٹ.....“ کیتھی نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے وہ لے لیا۔
 ”پیرن یہ سب چاکلیٹس جوئے کو دینا اور اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا۔“ زیب نے محبت سے کہا تو پیرن ایک دم بوکھلا گئی۔
 ”وائے ناٹ شیور.....“ پیرن جلدی سے بولی۔ اتنے میں زیب کے موبائل پر مس کال آئی۔
 ”میرے ہسینڈ آگئے ہیں..... میں اب چلتی ہوں۔“ زیب اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”کیا وہ اندر نہیں آئیں گے؟“ پیرن نے حیرت سے پوچھا۔
 ”نہیں.....“ زیب نے مسکرا کر کہا اور اسکارف سے اپنے چہرے کو اچھی طرح کور کیا اور دونوں سے مل کر باہر چلی گئی۔

"she is a wonderful lady...very sweet more then my mom"

کیتھی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو پیرن نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔
 ”میم..... میں حیران ہوں کہ جوئے ان سے کیوں چڑ کر گھر سے چلا گیا ہے۔ وہ کیا ان سے پہلے بھی ملا ہے؟“ کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”نہیں.....“ پیرن نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

”اسی لیے.....“ کیتھی نے فوراً کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

”اگر وہ ان سے پہلے بھی ملتا تو اس کی رائے بالکل مختلف ہوتی۔ میں آج ان سے پہلی بار ملی ہوں اور بہت امپریس ہوئی ہوں۔ میں نے ان سے زیادہ پیار کرنے والی سویٹ لیڈی کبھی نہیں دیکھی۔“ کیتھی نے انتہائی خوش ہو کر جذباتی انداز میں زیب کی تعریفیں کرتے ہوئے کہا۔ پیرن پھر خاموش ہو گئی۔

”میم مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جوئے انہیں کیوں اتنا پسند کرتا ہے؟“ کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"because she is a Muslims and joy hates muslims"
 سے اچانک بے ساختہ نکلا تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں.....؟ آپ کی فرینڈ تو بہت اچھی ہیں تو پھر وہ مسلمانوں سے کیوں نفرت کرتا ہے؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔
 ”سب مسلمان اچھے نہیں ہوتے۔“ پیرن نے منہ بنا کر جواب دیا۔



نفرت نہیں کرتیں؟“ جوائے نے غصے سے پوچھا۔

”کرتی ہوں.....“ بیرون نے کہا۔

”کیا اتنی نفرت کے باوجود بھی آپ یہ چاکلیٹس کھائیں گی.....؟“ جوائے نے غصے سے پوچھا تو بیرون نے چونک کر اسے دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ جوائے نے غصے میں سارے چاکلیٹس ڈسٹ بن میں پھینکے اور چلانے لگا۔

”آئی ہیٹ مسلمز.....“ وہ چلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیرون حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کہتی تھی جب سے بیرون کے گھر سے لوٹی تھی زیب گل اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی..... اس کا محبت بھرا لہجہ..... بیٹھی باتیں اس کی نماز اور پھر اپنے گاڑ کے بارے میں باتوں نے اس کے دل اور ذہن پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ وہ رات کو بیڈ پر لیٹی تو زیب کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

”صبر کرائسٹ گاڈ نہیں..... وہ تو بس پرائٹ ہیں..... مسیجر..... پرائٹس کو گاڈ کے ساتھ مت ملاؤ..... بیرون میم نے بھی یہی کہا تھا۔ شاید اس میں میری ہی کوئی غلطی ہے کہ میں گاڈ کو صبر کے ساتھ ملاتی رہی شاید اس لیے کہ مجھے گاڈ کے بارے میں ٹھیک طرح سے مانع بھی تو نہیں.....“ اس نے آہ بھر کر سوچا۔

”تم گاڈ سے سچی محبت کر کے تو دیکھو پھر تمہیں خود بخود سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔“ زیب کے الفاظ پھر اس کے ذہن میں گونجے.....

”اس کا مطلب ہے مجھے گاڈ کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ وہ آنکھیں بند کر کے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

شام ہو رہی تھی۔ جب کہتی تھی، بیرون سے ملنے اس کے گھر آئی تو بیرون کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور وہ دور روز سے آفس بھی نہیں جا رہی تھی۔ کہتی تھی نے ایک abstract پینٹنگ بنائی تھی اور وہ اسے جوائے کو دکھانا چاہتی تھی۔

بیرون اپنے بیڈروم میں میڈیٹیشن کر رہی تھی جبکہ جوائے لاؤنج میں بیٹھا ایک انگلش سووی دیکھ رہا تھا۔ کہتی تھی کو دیکھ کر وہ ایک دم خوش ہو گیا اور وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کہتی تھی نے بیٹھے ہی اسے اپنی پینٹنگ دکھائی تو وہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کی بہت زیادہ تعریفیں کرنے لگا..... کہتی تھی بہت زیادہ خوش ہوئی اور خوشی سے پھولی نہ

سارہی تھی وہ اس پینٹنگ کے مختلف meaning نکال کر اسے بتا رہا تھا اور وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہو رہی تھی۔ جوائے نے اسے بتایا کہ وہ بھی بہت جلد اس کے آرٹ کالج میں ایڈمیشن لینے جا رہا ہے تو یہ خبر سن کر کہتی تھی کی خوشی کی انتہا

نہ رہی۔ باتیں کرتے ہوئے کہتی تھی نے اپنے بیک میں سے چاکلیٹس کا وہ ڈبا نکالا جو اسے زیب نے گفٹ کیا تھا۔ اس نے ان میں سے کچھ چاکلیٹس کھائی تھیں اور باقی ویسے ہی پڑی تھیں۔ اس نے مسکرا کر ڈبا اس کی طرف بھی بڑھایا اور

اسے چاکلیٹ کھانے کی آفر دی۔

”تھینک یو.....“ جوائے نے مسکرا کر کہا..... اور چاکلیٹ کارپر کھولنے لگا۔

”یہ چاکلیٹس بہت ٹیسٹی ہیں۔ اس روز زیب آنٹی نے مجھے گفٹ کی تھیں۔“ کہتی تھی نے مسکرا کر بتایا تو جوائے ایک دم رپر کھولتے ہوئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”mom کی فرینڈ..... جو پاکستان سے آئی تھیں..... اس نے تمہیں بھی دی تھیں۔“ جوائے نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں..... اور انہوں نے تمہیں بھی تو گفٹ کی تھیں..... کیا تم نے نہیں کھائیں؟“ کہتی تھی نے مسکرا کر چاکلیٹ

”تو کیا ایک کی وجہ سے پھر سب سے ہی نفرت کرنی چاہیے؟“ کہتی تھی نے حیرت سے پوچھا تو بیرون ایک دم بوکھا گئی اور نظریں چرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”آئی تھینک رات ہو رہی ہے۔ اب تمہیں بھی گھر جانا چاہیے۔“ بیرون نے جلدی سے کہا تو کہتی تھی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

”یس..... آئی تھینک سو.....“ اس نے اپنا لاگ کوٹ پہنتے ہوئے کہا اور جاتے ہوئے بیرون کے گلے ملتے ہوئے بولی۔

”تھینک یو ویری میچ، آج آپ کے ساتھ اچھا دن گزرا ہے اور اسپوشلی آپ کی فرینڈ کے ساتھ..... میں انہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ کہتی تھی مسکراتے ہوئے بولی اور لاؤنج سے باہر چلی گئی..... بیرون ایک سرد آہ بھر کر صوفے پر بیٹھی گہری سوچوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

جب جوائے جم کے پارٹنٹ میں پہنچا تو جم کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جوائے کو دیکھ کر وہ حیرت سے چونکا۔

”کیا بات ہے..... تمہارا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے؟“ جم نے مسکرا کر پوچھا۔

”مام کی ایک مسلم فرینڈ ان سے ملنے آ رہی تھیں تو میں آپ کے پاس آ گیا۔“ جوائے نے منہ بنا کر کہا۔

”کیوں..... اس لیے کہ تم اس کا سامنا نہیں کر سکتے؟“ جم نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں..... اس لیے کہ مسلمز سے مجھے شدید نفرت ہے..... ان کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے اور بہت بدتمیزی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ماما اپنی فرینڈ کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں..... مجھے ٹیل ہونے لگا کہ میں ان سے بدتمیزی کروں گا..... اس لیے یہاں چلا آیا.....“ جوائے نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”اچھا کیا..... ویسے تم مسلمز کے بارے میں جو کچھ ٹیل کرتے ہو..... بالکل ٹھیک کرتے ہو..... muslims deserve hate“ جم دانت کچکچا کر بولا تو جوائے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا..... آپ کہیں جا رہے ہیں؟“ جوائے نے اسے شوز اور کوٹ پہنتے دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں..... کیا تم میرے ساتھ چلو گے.....؟“ جم نے مسکرا کر پوچھا۔

”کہاں.....؟“ جوائے نے حیرت سے پوچھا۔

”جہاں..... میں جا رہا ہوں.....“ جم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اوکے.....“ جوائے نے مسکرا کر کہا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ رات گئے جوائے گھر لوٹا تو لاؤنج میں ٹیبل پر چاکلیٹس کے ڈبے اور کچھ تحائف پڑے تھے۔ جوائے نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا..... بیرون صوفے پر بیٹھی

لیپ ٹاپ پر کچھ کام کرنے میں مصروف تھی۔

”مام..... یہ چاکلیٹس اور گفٹس کہاں سے آئے ہیں؟“ جوائے نے قدرے مشکوک انداز میں پوچھا۔

”زیب لائی ہے..... تمہارے لیے.....“ بیرون نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے.....؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے کیسے ایک مسلم سے یہ چیزیں لے لیں۔ کیا آپ نہیں جانتی کہ مسلمز کیسے ہوتے ہیں۔“ وہ غصے میں دانت کچکچا کر نفرت سے بولا۔

”زیب بہت اچھی ہے جوائے.....“ بیرون نے نرم لہجے میں کہا۔

”جھوٹ..... دنیا کے سب مسلمز بہت برے ہوتے ہیں اور میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ کیا آپ ان سے

کسی..... تم اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا.....“ زیب بہت محبت سے اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ کبھی کافی کے ساتھ کوئیز لے کر آگئی اور اس کے قریب رکھی ساؤنڈ ٹیبل پر ٹرے کو رکھا اور بیرون کو باہر نکالتے ہوئے سننے لگی۔ سو بائیں آف کر کے بیرون نے کیتھی کی طرف دیکھا۔

”کیا زیب آئی کا فون تھا؟“ کیتھی نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں، وہ آج رات واپس جا رہی ہیں۔“ بیرون نے بتایا۔

”اوہ تو کیا وہ آپ سے ملنے اب کبھی نہیں آئیں گی؟“ کیتھی نے افسردگی سے پوچھا۔

”نہیں.....“ بیرون نے کہہ کر کافی کا گگ ہاتھ میں پکڑا اور خاموشی سے پینے لگی۔

”ویری سیڈ..... میری بہت خواہش تھی کہ میں دوبارہ ان سے ملتی..... شی از ویری ٹائٹس پرسن..... لیکن معلوم نہیں جوئے نہیں کیوں اتنا ناپسند کرتا ہے۔“ کیتھی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو بیرون نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

”میم..... وہ مسلمانوں سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟“ کیتھی نے بیرون کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک دم بوکھلائی مگر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”میم..... کیا آپ بھی جوئے کی طرح مسلمانوں سے اتنی ہی نفرت کرتی ہیں؟“ کیتھی نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو بیرون ایک دم بڑبڑا گئی اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا..... کیتھی حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی..... جوئے کا سوڈ بھی کافی آف تھا۔ کیتھی نے اسے ایک ٹک دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ واپسی پر سارا راستہ وہ گہری سوچ میں گم رہی اسے جوئے اور بیرون کے رویوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے زیب کے بارے میں بھی بہت سوچا تھا..... اسے زیب کے بارے میں کوئی منفی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی اس کے ذہن میں آتی تو ایک خوشگوار تاثر اس کے ذہن میں ابھرنے لگتا۔

”اتنی اچھی انسان سے جوئے صرف اس لیے نفرت کر رہا ہے کہ وہ مسلم ہے اور کیا واقعی مسلمان اتنے برے ہوتے ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔“ اس کا ذہن بری طرح الجھنے لگا..... اسے زندگی میں پہلے کبھی ایسا کوئی موقع نہیں ملا تھا جب وہ مسلمان کے ساتھ ان سچ ہوتی..... اسے ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھار، اچانک کسی مسلم کا ذکر سننے کو ملتا تو وہ کوئی خاص توجہ نہیں دیتی..... لیکن اب اس کے اندر عجیب سے خیالات جنم لے رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار زیب کی صورت میں کسی مسلم سے ملی تھی اور وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی مگر بیرون اور جوئے کے رویے نے اسے ان کے بارے میں بہت مشکوک کر دیا تھا۔ بیرون کے خیال میں..... ”سب مسلمان اچھے نہیں ہوتے۔“ اور جوئے کے خیال میں ”مسلمان دنیا کے سب سے برے لوگ ہیں۔“ اور اس کے اپنے خیال میں ”زیب سے بڑھ کر اچھی عورت اسے زندگی میں نہیں ملی تھی۔“ وہ بہت پریشان ہونے لگی اور اسی الجھن میں گھر پہنچی تو مسز لسن (اس کی پے انگ گیٹ) جو ایک اسکول ٹیچر تھیں اور لاؤنج میں بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھیں۔ کیتھی نے انہیں ہائے کہا اور قدرے تھکے ہوئے انداز میں اپنا بیگ چیمبر پر رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ مسز لسن نے اپنی نظر کی عینک اتار کر اسے حیرت سے دیکھا۔

”کیا بات ہے..... کیا تم بہت تھک گئی ہو..... یا پھر کسی وجہ سے اپ سیٹ ہو؟“ مسز لسن نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

”ہاں“ کیتھی نے آہ بھر کر جواب دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیوں.....؟“ مسز لسن نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسز لسن میں ایک بات سے بہت الجھن کا شکار ہوں کہ دنیا میں کتنے religions ہیں..... اور کون سا

کھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں نے وہ ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔“ جوئے نے قدرے خشکی سے منہ بنا کر اپنے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ ٹیبل پر رکھی تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ڈسٹ بن میں کیوں.....؟“ کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”آئی ہیٹ مسلمان..... اور مجھے مسلمانوں سے کوئی چیز لینا پسند نہیں۔“ جوئے نے قدرے غصے سے کہا۔

”لیکن میں نے تو ان سے اچھی لیڈی آج تک نہیں دیکھی۔ وہ تو میری مام سے بھی زیادہ لوگ اور سوئٹ ہیں۔ میں تو ان سے مل کر بہت امپریس ہوئی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ تم ان سے کیوں نفرت کرتے ہو؟“ کیتھی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”muslims are always hypocrites“ وہ تمہارے سامنے اچھا بن کر تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں گی..... لیکن حقیقت میں وہ اتنی اچھی نہیں ہوں گی۔ یہ سب مسلمانوں جھوٹے ہوتے ہیں۔“ جوئے نے غصے سے دانت کچکا کر کہا۔

”نہیں، نہیں جوئے..... مجھے وہ بالکل ایسی دکھائی نہیں دیں۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کاش تم ان سے ایک بار ملتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی اچھی خاتون ہیں.....“ کیتھی نے پھر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”پلیز اسٹاپ..... میرے سامنے اتنی تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں..... تمہاری یہ باتیں میرے دل سے مسلمانوں کے لیے نفرت کو کبھی شتم نہیں کر سکتیں۔“ جوئے نے انتہائی خشکی سے منہ بنا کر..... کہا تو کیتھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی اور اس کا سوڈ آف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ”جوئے.....“ بیرون نے اپنے کمرے سے اسے آواز دی تو جوئے نے چونک کر کمرے کی طرف دیکھا۔

”mam is calling me“ جوئے اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف جانے لگا تو کیتھی بھی اس کے ہمراہ کمرے میں چلی گئی۔ بیرون دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔

”جوئے مجھے ایک کپ کافی لاکر دو.....“ بیرون نے جوئے سے کہا تو کیتھی جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”میں آپ کے لیے لے کر آتی ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر چلی گئی..... تو بیرون نے جوئے کی طرف دیکھا..... اس کے چہرے پر اب بھی خشکی کے تاثرات تھے۔

”کیا ہوا؟ تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔“ بیرون نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں.....“ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا..... بیرون اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی مگر خاموش رہی ساؤنڈ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل بجا تو اس نے اٹھ کر موبائل کان سے لگایا اور آہستہ آواز میں ہیلو کہا۔

”اوہ..... ہائے زیب..... تم کیسی ہو.....؟“ بیرون نے جیسے ہی زیب کہا تو جوئے نے خشکی سے ماں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا..... بیرون کے چہرے پر خشکی اور حیرت کے طے جلے تاثرات نمایاں ہونے لگے..... مگر وہ زیب سے نارل سوڈ میں باتیں کرتی رہی۔

”آئی ایم سوری..... بیرون میں تم سے دوبارہ ملنے نہیں آسکوں گی کیونکہ آج رات کو میں پاکستان واپس جا رہی ہوں۔“ زیب نے بتایا تو بیرون ایک دم چونکی.....

”کیوں..... اتنی جلدی.....؟“ بیرون نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میرے بچے کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اور مجھے بابا جان نے واپس آنے کو کہا ہے..... مجھے بہت افسوس ہے کہ میں جوئے سے ملنے نہیں آسکوں گی..... مجھے اس سے ملنے کا بہت شوق تھا لیکن..... خیر پھر کبھی

خاتون تھیں جو بہت کم کسی سے شکوے شکایت کرتیں..... زیادہ تر وقت ان کا کتابیں پڑھنے میں گزارتا..... کیتھی نے ایلن کی ڈیڑھ کے بعد انہیں بے انگ گیسٹ رکھ لیا تھا اور ان کی کیتھی سے بہت دوستی بھی ہو گئی تھی..... وہ کیتھی کو اپنی بیٹی الزبتھ کی طرح چاہنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز کیتھی کالج گئی تو جوئے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جوئے اس کا کالج فیلو تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کافی دیر بیٹھ کر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ آرٹ کو بھی ڈسکس کرتے رہے۔ کیتھی کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جوئے اس میں بہت انٹرسٹ لے رہا ہو۔ اسے ہر بات میں گانڈ کرنے کی کوشش کرتا اور دونوں کالج میں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہوتے..... دونوں میں رفتہ رفتہ دوستی بہت زیادہ گہری ہونے لگی تھی۔ اگر کیتھی اسے کہیں دکھائی نہ دیتی تو وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا..... اور جیسے ہی وہ نظر آ جاتی تو وہ ایک دم خوش ہو جاتا چند ہی دنوں میں ان کی دوستی بہت زیادہ گہری ہو گئی تھی یا پھر شاید دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہونے لگی تھی۔ دونوں اکٹھے بیٹھ کر پینٹنگز بناتے پھر ایک دوسرے کے ساتھ ان کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتے..... لیکن کیتھی نے ایک بات آرزو کی تھی کہ جوئے نے اس کے ساتھ اپنے دل کی باتیں بھی شیئر نہیں کی تھیں۔ اکثر باتوں، باتوں میں کیتھی نے اس سے مسلمانوں سے نفرت کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہر بار ان کے خلاف زہرا گل کر خاموش ہو جاتا اور کیتھی اس کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتی اور پھر کچھ نہ پوچھتی.....

کیتھی کالج سے جب بھی فارغ ہوتی تو لائبریری چلی جاتی اور وہاں جا کر ریسرچ کرتی..... اس نے دنیا میں انسان کے آغاز سے ہی جنم لینے والے religions کا مطالعہ شروع کیا تو وہ یہ جان کر انتہائی حیران رہ گئی کہ

religion سب سے زیادہ ٹھیک ہے؟ اور کس کے (پیروکار) followers سب سے زیادہ اچھے لوگ ہیں۔“ کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا تو مسزولسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو..... آریو او کے.....؟“ مسزولسن نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں..... میرا ذہن بہت زیادہ الجھنے لگا ہے اور میں بہت زیادہ کنفیوز ہونے لگی ہوں، آپ تو ایک ٹیچر ہیں اور آپ نے اپنی زندگی میں مختلف تجربے حاصل کیے ہیں..... پلیز آپ مجھے گانڈ کریں کہ کون سا دین سب سے زیادہ ٹھیک ہے؟“ کیتھی نے قدرے بے صبری سے پوچھا..... اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو مسزولسن کو اس کے اندر کے اضطراب کا کچھ اندازہ ہونے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے دنیا میں تقریباً 45 یا اس سے بھی زیادہ religions ہیں اور ہر مذہب کے لوگ اپنے ہی دین کو ٹھیک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں وہی religion ٹھیک ہے جس میں خدا کا concept (تصور) بالکل واضح اور کلیئر ہے..... ایسا تصور جس کو جان کر انسان کا دل فوری طور پر اسے قبول کر لے اور پھر اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہے۔“ مسزولسن نے گہری سانس لے کر کہا تو کیتھی ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”مسزولسن کیا آپ نے اس پر کوئی ریسرچ کی ہے اور کیا آپ کو اس حقیقت کا پتا چل گیا ہے؟“ کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن میں ابھی تمہیں کچھ بتا کر تمہارے ذہن پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرنا نہیں چاہتی..... اگر یہ سوال تمہارے ذہن میں پیدا ہوا ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی تم خود ہی تلاش کرو اور جب اپنی سوچ اور جدوجہد سے تم اس سوال کا جواب پا لو گی تو پھر دنیا کی کوئی اور طاقت تمہارے نظریات کو چیلنج نہیں کر سکے گی۔“ مسزولسن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو کیتھی انتہائی تجسس ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب مل جائے گا؟“ کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... اس لیے کہ گاڈ کا اصل تصور انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ جس طرح مقناطیس، لوہے کی ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح انسان کے اندر موجود خدا کا تصور پوری طرح کائنات میں پھیلی ان تمام چیزوں..... سوچ اور حقائق کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس تصور سے ٹپلی کرتے ہیں..... اس لیے تم اپنے مانڈ کو بالکل (غیر جانب دار) نیوٹرل ہو کر یہ فیصلہ کرنے دینا اور پھر جب حقیقت تمہیں مل جائے تو اسے قبول کر لینا پھر تم خود ہی مطمئن ہو جاؤ گی۔“ مسزولسن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ بات ابھی واضح نہیں تھی۔

”مسزولسن کیا آپ اس سلسلے میں مجھے تھوڑا گانڈ کر سکتی ہیں کہ میں یہ ریسرچ کیسے شروع کروں؟“ کیتھی نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... تم لائبریری میں جاؤ، انٹرنیٹ پر ریسرچ کرو اور جو تم ریسرچ کرو..... اس کے مطابق اپنے ارد گرد ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کرو جو اس religion کے ماننے والے ہیں۔“ مسزولسن نے کہا..... اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اس کا دل ان کی بات سن کر کچھ قائل ہو گیا۔

”اوکے..... میں ضرور ایسا ہی کروں گی۔“ کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور قدمیے مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی مسزولسن بھی مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

مسزولسن..... بہت اچھی..... نرم مزاج..... پچاس، پچپن سالہ پڑھی لکھی عورت تھیں۔ ان کی اپنی ایک بیٹی بیٹی تھی جو امریکا ہارٹ اسٹیڈیز کے لیے گئی ہوئی تھی۔ مسزولسن (ان کے شوہر) ایک بیمار آدمی تھے جو زیادہ تر اپنے کمرے میں بیڈ پر سوئے رہتے اور مسزولسن جا ب کے ساتھ ساتھ ان کی بہت دیکھ بھال کرتیں وہ ایک مطمئن اور پریکون

راہ گم

شیطانی کمیل کیلئے والے چند بزدل لوگوں کا قصہ، آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی سوغات

رموز شاہی

تاریخ کے اوراق سے ایک اور یادگار داستان.....

الیاس سیتا پوری کا سحر انگیز انداز

سودائے جنوں

میںہونی سازشوں سے پردہ چاک کرتی لڑخیز داستان.....

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے آخری پڑاؤ

ماروی

بھٹکے ہوئے مسافروں کے بے سمت سفر کا قصہ

محی الدین نواب کے قلم کا جادو

اگست 2015 کا دلچسپ

شمارہ عید کے لمحات کے سنگ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسر دلچسپ

ماہنامہ

مزید

عظیما کی محفل

محفل شہرِ حرم اور

ملک مسند حیات کی تائید ازلی



اس کے علاوہ

کاشف ذہن، مریم کے خان، ابراہیم جمالی، ابی ضیا اقبال

ڈاکٹر شیر شاہ سید، سلیم انور اور تنویر ریاض کی کیلی، کیلی کہانیاں

”کیوں.....؟“ مسزولسن نے حیرت سے پوچھا۔

”ان میں گاڈ کا تصور اتنا پیچیدہ اور کنفیوزنگ ہے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے ماننے والے کس طرح ان باتوں پر یقین کیے بیٹھے ہیں کہ جنہیں سنتے یا پڑھتے ہی عقل بالکل قبول نہیں کرتی۔“ کیتھی نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔ تو مسزولسن نے مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

”انسان کا عقیدہ ایک نسل سے دوسری نسل میں ایک امانت کی صورت میں منتقل ہوتا ہے جس کو آنے والی نسلیں اپنی عزت اور جان سے بھی زیادہ سنبھال کر رکھتی ہیں اور اکثر لوگ بہت سی باتوں کو غلط مانتے ہوئے بھی ان پر صرف اس لیے قائم رہتے ہیں کیونکہ ان کے باپ دادا ان پر عمل کرتے آئے ہیں۔“ مسزولسن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہر انسان کی اپنی زندگی ہے..... اپنی سوچ ہے اور اپنی ہی عقل ہے۔ وہ دوسروں کی آنکھوں کو استعمال کر کے خود اپنے لیے راستہ کیسے تلاش کر سکتا ہے؟“ کیتھی نے قدرے حیرت سے کہا۔

”یہ تم کہہ رہی ہونا کیونکہ تم بچے خدا کی تلاش میں نکلی ہو..... مگر جو لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ تحقیق میں یا بحث میں نہیں ہوتے تو وہ اپنے خاندانی عقیدے کے ساتھ چھٹے رہتے ہیں۔ کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے..... وہ اس بحث میں نہیں پڑتے۔ وہ اپنے بڑوں کے راستے سے ہٹ کر اپنے لیے کوئی نیا راستہ اس لیے منتخب نہیں کرتے کیونکہ یہ بہت مشکل اور ٹھن کام ہے۔ جب کوئی ایک religion سے دوسرے میں convert ہوتا ہے تو اسے پورے خاندان کی مخالفت مول لینی پڑتی ہے۔ یورپ میں پچھلے مختلف ہے مگر ساؤتھ ایشین کنٹریز میں جہاں سوشل اور کاسٹ سسٹم (ذات بات) مضبوط اور غالب ہے وہاں ایسی مخالفتیں مول لینا بہت مشکل ہوتا ہے..... ہمارے اسکول میں ایک سکھ ٹیچر مسلم ہوئی تھی تو اس کے وطن میں اس کی ساری فیملی نے اس کا بائیکاٹ کر دیا اور پھر وہ دوبارہ کبھی وہاں نہیں گئی۔“ مسزولسن نے بتایا۔

”مسلم.....؟“ کیتھی حیرت سے بڑبڑائی۔

”ہاں..... یورپ میں اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور عیسائیت کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا مذہب بن گیا ہے۔ ایک عام تحقیق کے مطابق پوری دنیا میں کرپچنز 31.59 فیصد ہیں جبکہ مسلمز 23.2 فیصد ہیں اور اسلام اتنا پرانا مذہب بھی نہیں۔“ (یہ ایک کرپچن خاتون کے اپنے نظریات تھے) مسزولسن نے کہا تو کیتھی مجسم ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”رسلی..... اسلام کیوں اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے.....؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کے بارے میں تم خود ریسرچ کرو اور اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرنا۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو کیتھی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”تو پھر کیوں نہ میں اسلام سے ہی ریسرچ شروع کروں.....؟“ کیتھی نے کہا۔

”اس اپ ٹو یولیکن ہر ریسرچ میں ہسٹری کارول بہت اہم ہے۔ کسی چیز کی ہسٹری کو جاننے بغیر ہم اس کے ٹھیک یا غلط ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ مسزولسن نے اسے گائڈ کیا تو وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

ہفتے کی صبح تھی۔ جم کی چھٹی تھی اور وہ prayer لیے جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس نے بلیک پیٹ کوٹ پہنا..... اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے جوائے کا نمبر ملایا۔ جوائے ناشتا ہانے میں مصروف تھا۔ جیرن آفس گئی ہوئی تھی..... جم نے اسے تیار ہونے کو کہا کہ وہ اسے کہیں لے کر جانا چاہتا ہے۔ جوائے نے پہلے تو جانے سے انکار

انسان نے جس چیز کو بھی تھوڑا سا طاقتور دیکھا تو اسے خدا بنا کر پوجنے لگا اگر سورج کی روشنی اور اس کی حرارت سے متاثر ہوا تو اسے اپنا خدا بنا لیا..... اگر زمین کی وسعت اور اس میں پیدا ہونے والے اناج اور زمین میں چھپے خزانوں کو پایا تو زمین کو اپنی دیوی ماں مان کر اس کی عبادت کرنے لگا۔ اگر آگ کے روشن الاؤ کو دیکھا تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا..... اور جب دل چاہا تو لکڑی، پتھر، مٹی، لوہے اور مختلف دھاتوں کی انسانی یا جانوروں کی شکلیں بنا کر ان بتوں کو پوجنا شروع کر دیا..... اور کبھی انہیں خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھنے لگا..... کسی نے بادل، ہوا، آندھی، بارش، چاند، سورج، ستارے اور پہاڑوں غرضیکہ ہر وہ شے جس تک ان کی پہنچ ممکن نہیں تھی..... ان سب کو اپنا خدا بنا لیا..... صرف ہندومت میں اسے 14,321 دیوتاؤں کی موجودگی نے حیران کر دیا..... لیکن اس کا دل ان سب کے بارے میں تفصیل پڑھ کر بہت بے قرار اور مضطرب ہونے لگا اور اس کے اندر موجود حق کی آواز نے انہیں فوراً مسترد کر دیا کہ دنیا میں ہر طاقتور چیز خدا نہیں ہو سکتی..... اگر انسان، سانپ، بچھو اور شیر کو طاقتور سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگے تو کیا اسے خدا بنائے.....؟ اور اگر کوئی جانور فائدہ دے تو کیا اسے بھی خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیا جائے..... کس قدر احمقانہ سوچ تھی جس نے اس کے دل میں اضطراب کے ساتھ ساتھ کراہیت بھی پیدا کر دی تھی۔

”خدا تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو دنیا کی ساری طاقتوں کا مالک ہو..... زمین، آسمان، تمام مخلوقات اور کائنات کی ہر شے پر اسے مکمل اختیار اور قدرت ہو.....“ اس کا دل کہتا اور وہ مزید مضطرب ہو کر پہلے سے زیادہ ریسرچ میں مصروف ہونے لگی..... اس نے تمام پرانے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔

کیتھی نے جب ان کے بارے میں پڑھا تو انتہائی کنفیوز ہونے لگی۔ اور اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا وہ خدا کے اس تصور کو مانتی ہے.....؟ اس نے کتاب بند کی اور آنکھیں بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گئی تو اس کے دل نے فوراً جواب دیا۔ ”نہیں جو خدا دنیا بنا کر (برہما) خود سو جائے وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ اپنی ساری مخلوق سے بے خبر ہو کر خود خد کے مزے لے اور کسی کے دکھوں اور تکلیفوں کا احساس نہ کرے وہ کبھی خدا نہیں ہو سکتا..... اور جو خدا (دشنو) مختلف انسانوں اور جانوروں کی صورت میں ظاہر ہوتا تو کیا وہ اس تقدس کے قابل ہے کہ ساری کائنات میں صرف اس کی پوجا کی جائے؟ اور جو خدا (شیو) مختلف ارواح اور شیطانوں کی صورت میں ظاہر ہو تو کیا اس کا مرتبہ اور مقام اس خدا جیسا ہو سکتا ہے۔ جو پوری دنیا کا حاکم اعلیٰ ہو..... نہیں کبھی نہیں..... میرے اندر موجود حق کی آواز ان خداؤں کو قبول نہیں کر رہی۔“ اس نے بڑی سی کتاب واپس لائبریری میں رکھی اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ اس کے دل میں عجیب سی مایوسی چھائی تھی وہ گھر پہنچی تو مسزولسن اپنی بیٹی الزبتھ سے موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ کیتھی نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھا اس کا چہرہ قدرے تھکا ہوا اور اس تھا۔ مسزولسن کو مصروف دکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور جا کر اپنے کمرے میں تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی..... اور چھت کو گھورنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مسزولسن ٹرے میں اس کے لیے کھانا لے کر آئیں اور اس کے پاس ٹیبل پر رکھا۔

”تھینک یو..... مسزولسن آپ نے کیوں تکلیف کی.....؟“ کیتھی نے جلدی سے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”نو پرابلم..... تم میری بیٹی ہی ہو..... میں الزبتھ کو تمہارے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہ تم مجھے اس کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتیں۔“ مسزولسن نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو..... سونائس آف یو.....“ کیتھی نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”اوکے..... مجھے یہ بتاؤ کہ آج تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو؟“ مسزولسن نے اس کے قریب بیٹھ کر نرمی سے پوچھا تو اس نے گہری سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔

”آج میں دنیا کے سب سے پرانے مذہب کے بارے میں پڑھ کر بہت کنفیوز ہوئی۔“

سانس لیتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔
”تم سے اس لیے کہ تم..... مسلم ہو.....“ جوئے نے قدرے خشکی سے کہا۔
کیسی پریشان ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

”کیا میں اس مسلم دشمنی کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔
”کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ اس وقت دنیا کے سب سے بڑے طرز تم ہی لوگ ہو..... تم دنیا کو سکون سے نہیں رہنے دیتے۔“ جوئے نے خشکی سے کہا تو عبدالرحمن اپنی پینٹنگ پکڑ کر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا اور جوئے اس کے لیے برے، برے الفاظ منہ سے نکالنے لگا۔
”جوئے تم اکثر عبدالرحمن کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہو..... کسی کی اتنی تذلیل کرنا اچھی بات نہیں۔“ کیتھی نے پرتاسف انداز میں کہا۔

”یہ لوگ اسی کے حقدار ہیں۔“ جوئے نے کہا اور خشکی سے منہ بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ کیتھی کو بہت افسوس ہونے لگا اسے عبدالرحمن سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ بہت محنت سے پیسے اکٹھے کر کے یہاں آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اور اپنے ملک میں جا کر وہ ایک آرٹ اسکول کھولنا چاہتا تھا۔ اس کے بہت اعلیٰ مقاصد تھے۔ کیتھی کو ڈر تھا کہ وہ جوئے کی وجہ سے اتنا زیادہ ہرٹ نہ ہو کہ سب کچھ چھوڑ کر واپس چلا جائے۔ اسے عبدالرحمن بہت اچھا سلجھا ہوا اور دھیمے مزاج کا نوجوان لگا تھا۔ کیتھی نے آہ سرد بھری اور اپنا بیگ اٹھا وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد عبدالرحمن آرٹ کی کسی کلاس میں نہ آیا تو کیتھی دل ہی دل میں پریشان ہونے لگی۔ آف ٹائم کے بعد اس نے عبدالرحمن کو کئی بار فون کیا..... مگر اس نے اس کی کال نہ لی..... لائبریری میں بھی اور گھر آ کر بھی وہ بہت اپ سیٹ رہی..... اسے جوئے سے محبت تھی..... مگر عبدالرحمن سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ بہت حساس اور نرم دل رکھتی تھی۔ اگلے روز اسے عبدالرحمن کالج میں ملا تو بہت بجھا، بجھا سا تھا۔ کیتھی نے اس سے وجہ پوچھی تو وہ خاموش رہا۔
”پلیز تم جوئے کی وجہ سے ڈسٹرب نہ ہو..... وہ یونہی ہاتھ ہو جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے..... میں اسے سمجھاؤں گی۔“ کیتھی نے عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑ کر اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
”میں یہ کالج چھوڑنے کا سوچ رہا ہوں۔“ عبدالرحمن نے آہ بھر کر کہا۔

”کیتھی جب وہ مجھے برا کہتا ہے تو میں اتنا سنا نہیں کرتا لیکن جب وہ سب مسلز کو برا کہتا ہے اور ان کے بارے میں بری، بری باتیں کرتا ہے تو مجھے بہت برا لگتا ہے تب میرا خون کھولنے لگتا ہے لیکن میں صرف اسی لیے خاموش رہتا ہوں کہ اگر میں نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا تو پھر سب مجھے ہی الزام دیں گے کہ میں نے جھگڑا کیا اور بلا وجہ لڑ پڑا تو پھر مسلز کا ایجن اور زیادہ خراب ہوگا..... اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں.....“ عبدالرحمن نے افسوس سے کہا۔
”اور تمہارے وہ اعلیٰ مقاصد..... اور خواب.....؟“ کیتھی نے پوچھا۔

”میرے لیے میرا religion اور میری مسلم کیونٹی کی عزت زیادہ اہم ہے..... اگر اللہ نے میری قسمت میں تعلیم حاصل کرنا لکھا ہوگا تو میں ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔“ عبدالرحمن نے گہری سانس لے کر کہا تو کیتھی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”انسان جس چیز کے لیے کوشش کرتا ہے اسے وہی ملتی ہے۔ قسمت کا اس میں کیا رول ہے؟“ کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔
”ٹھیک ہے..... لیکن ہم مسلمانوں کا واضح یقین ہے کہ انسان کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی قسمت میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اللہ نے اس کی قسمت میں سب کچھ لکھ دیا ہے لیکن اس راز کو انسان پر ظاہر نہیں کیا اس راز کو پانے کے لیے خود جہد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ خدا پر پختہ یقین رکھتے ہیں وہ اسے اپنی ذاتی محنت کا

کیا پھر اس کے اصرار پر تیار ہونے لگا..... جم اسے لے کر ایک synagogue چلا گیا۔ جوئے نے بھی لاٹک کوٹ پہن رکھا تھا۔ synagogue کے فرنٹ ڈور سے دونوں نے ڈریس میس لے کر اپنے اور اندر چلے گئے۔
synagogue ایک بڑا سا ہال تھا۔ جس کے ساتھ چھوٹے کمرے اسٹڈی کے لیے یا آفسز کے لیے تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرے کی اسٹڈی کے لیے مخصوص تھا۔

”یہ کیا ہے.....؟“ جوئے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

”prayer hall...synagogue“ جم گہری سانس لے کر اسے ہال کے بارے میں بتانے لگا۔
وہاں چند یہودی پینٹ کوٹ اور میس میں ملبوس ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے ان کے ساتھ ادھیڑ عمر ربی کھڑا تھا۔
”یہ کون ہے.....؟“ جوئے نے ربی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ربی..... میرا مطلب..... مائی ماسٹر..... teacher of torah“ جم نے اسے بتایا۔

”اوکے.....“ جوئے نے مسکرا کر کہا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ جم یہودی تھا اور بہت پلاننگ سے جوئے کو یہودی بنانے کے چکر میں تھا۔

☆☆☆

کیتھی اور جوئے کی کلاس میں ایک نئے لڑکے عبدالرحمن نے ایڈمیشن لیا تھا۔ جو پاکستان، حیدرآباد سے آیا تھا۔ اور اسے کیلی گرا ک آرت کے ساتھ ساتھ abstract پینٹنگ میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ بلا پتلا سنجیدہ مزاج نوجوان تھا۔ جو ہر وقت سر پر کیپ پہنے رکھتا۔ پہلے تو جوئے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر جب اسے دوسرے کلاس فیلوز سے پتا چلا کہ وہ مسلم ہے تو اس کے اندر کی نفرت نے اسے مختلف انداز میں عبدالرحمن کو تنگ کرنے پر ابھارا۔ وہ کبھی باتوں، باتوں میں اس پر طنز کرتا اور کبھی اس کی بتائی ہوئی پینٹنگز کا مذاق اڑاتا..... جبکہ عبدالرحمن بہت زیادہ ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹ تھا اور اس کے پیچھے بھی اس کی بہت تعریف کرتے تھے مگر جوئے اس کی ہنک اور توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کیتھی کو جوئے کی یہ حرکتیں دیکھ کر انتہائی غصہ آتا تھا۔ اور وہ اسے منع کرنے کی کئی بار کوشش کرتی..... مگر جوئے اس کی کسی بات کو سننے کو تیار نہیں تھا۔ عبدالرحمن جب بھی جوئے کو اپنی طرف آتے دیکھتا تو راستہ بدل لیتا..... اور جوئے اس بات پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ کیتھی اس کی ذہانت اور ٹیلنٹ سے بہت متاثر ہوئی تھی اور وہ جب بھی کبھی عبدالرحمن کے پاس کھڑی ہو کر کچھ ڈسکس کر رہی ہوتی تو جوئے اسے خشکی سے دیکھتا اور بعد میں اس سے ناراض ہوتا، کیتھی اس سے وجہ جاننے کی کوشش کرتی مگر جوئے اسے جھڑک دیتا۔

عبدالرحمن نے ایک تجربی آرٹ کا شاہکار بنایا تھا۔ جس میں ہر طرف آگ لگی تھی۔ اور اس آگ کے شعلوں میں اس نے بہت خوب صورت انداز میں انسانی آنسو بنائے تھے جو نفرت کی اس آگ کو بجھانے کے لیے بہت کم تھے۔ کیتھی نے پینٹنگ دیکھی تو اس کی بہت تعریف کرنے لگی۔ دونوں بیچ پر بیٹھے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے تو جوئے آہستہ، آہستہ چلتا ہوا ان کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا..... اور پینٹنگ کو بغور دیکھنے لگا۔ اس نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور کیتھی کے ہاتھ سے چھین کر اسے بغور دیکھنے لگا..... دونوں ایک دم ہکا بکا رہ گئے۔

”تم terrorist اینڈ پرتشو لوگ ایسی ہی پینٹنگز بنا سکتے ہو..... کیونکہ تم ساری دنیا کو اپنی نفرت کی آگ میں جلا کر ختم کرنا چاہتے ہو۔“ جوئے نے اس کی پینٹنگ زمین پر پھینکتے ہوئے انتہائی غصے سے عبدالرحمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بھی غصے سے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنی پینٹنگ اٹھائی۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم صرف مجھ سے دشمنی لے رہے ہو یا پھر مسلمانوں سے؟“ عبدالرحمن نے ایک گہری



اسی گنگا

نگہت اعظمی

رمضان کا آخری عشرہ تھا۔ دن کے تین بجے آگ برساتے سورج کے تیروں کا مقابلہ کرنی میں گھر پہنچی..... گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا..... ایک ہفتے پہلے ہی میں نے گھر والوں کی جھنجھلاہٹوں، مخالفتوں اور تنقیدوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنے مشن کو پار کرنے تک پہنچایا تھا۔ یعنی ڈرائنگ روم کو از سر نو سیٹ کیا تھا..... اور اپنے اس کارنامے سے... میں اتنا

نام دیتے ہیں..... اس لیے میرا بھی خدا پر پختہ یقین، ایمان ہے کہ وہ میرے لیے کہیں اور سے راستہ بنائے گا۔“
عبدالرحمن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
”اس ویری اسٹریج..... تم مسلمان لوگ کتنے عجیب ہو..... کیسی عجیب و غریب باتیں کرتے ہو.....“ کیتھی کو اس کی باتوں پر شدید حیرت ہوئی۔

”نہیں، اس میں کچھ بھی عجیب نہیں..... ایک بچی نیلی تمہارا ماسٹڈ ابھی اتنا میچور نہیں ہوا کہ وہ حقائق کو فوراً قبول کر لے..... تم اپنے ذہن سے سوچ رہی ہو..... اور میں اپنے ذہن سے..... تم ایک مختلف ماحول میں چلی بڑھی ہو، تمہارا ذہن مختلف ہے..... ہمارے عقائد بھی مختلف ہیں اور فلاسفی آف لائف بھی..... تمہیں زندگی میں جو تجربات ہوتے ہیں وہ مجھے نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم دونوں کیسے ایک جیسا سوچ سکتے ہیں۔ ہاں، جب ہمارا تعلق ایک عقیدے سے ہوگا تو ہماری سوچ بھی ملنا شروع ہو جائے گی۔“ عبدالرحمن نے بڑی وضاحت سے مگر نہایت آسان الفاظ میں اسے سمجھایا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی مگر بولی کچھ نہیں۔

”میں اب کالج نہیں آؤں گا..... تم بہت اچھی ہو..... ویری ٹاکس پریزن..... اپنا بہت خیال رکھنا..... میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ بائے.....“ عبدالرحمن نے ٹوٹے دل سے ایک زخمی مسکراہٹ سے اسے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ کیتھی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اچانک اس کی آنکھوں سے دو آنسو گرے تو وہ چونکی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اچانک وہ آنسو کیوں گرے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چہرہ صاف کیا اور وہاں سے چلی گئی۔
اگلے روز عبدالرحمن کلاس میں نہیں آیا تھا۔ جوئے نے جان بوجھ کر مذاق میں اس کا ذکر چھیڑا تو کیتھی نے انسو سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس نے کالج چھوڑ دیا ہے..... تمہاری وجہ سے.....“ کیتھی نے آہ بھر کر کہا۔

”میری وجہ سے.....؟ وہاٹ نان سینس..... کیا وہ اتنا بے وقوف ہو سکتا ہے کہ میری وجہ سے اپنی اسٹڈیز چھوڑ کر چلا گیا..... اب مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ مسلمان واقعی بہت نان سینس ہوتے ہیں۔“ وہ منہ بنا کر طنز یہ انداز میں بولا تھا۔
”ہاں..... وہ تمہاری وجہ سے بہت ہرٹ ہو رہا تھا..... جب تم بار بار اسے اور اس کی کیوٹی کو برا کہتے تھے۔“ کیتھی نے حنفی سے کہا۔

”دیکھو تم مجھے الزام مت دو..... اور تم اسے کیوں اتنی فیور کر رہی ہو؟ تم میری فرینڈ ہو..... اور تمہیں مجھے فیور کرنا چاہیے۔“ جوئے نے حنفی سے کہا۔

”میں غلط بات میں تمہیں فیور نہیں کر سکتی..... اور تم نے عبدالرحمن کے ساتھ غلط کیا..... وہ بیچارہ کتنی مشکل سے پیسے جمع کر کے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا اور پتا نہیں اب کہاں ہوگا..... شاید اپنے ملک واپس چلا جائے گا۔“ کیتھی نے نہایت افسردگی سے کہا تو جوئے کو غصہ آنے لگا۔

”تم ایک مسلم کو فیور کر رہی ہو..... تم نہیں جانتی کہ یہ لوگ کتنے برے ہوتے ہیں..... وہ پھر شروع ہو چکا تھا۔“
”عبدالرحمن برا نہیں تھا..... اور تم اتنے اچھے لوگوں کو صرف ان کے religion کے اینگل سے کیوں دیکھتے ہو..... ہر مسلم تمہیں برا لگتا ہے۔“ کیتھی نے غصے سے جواب دیا اور اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی۔

”ہاں، ہاں دنیا کا ہر مسلم برا ہے، وہ بھی ان کا مذہب بھی تمہیں خود پتا چل جائے گا..... تو پھر تم بھی میری طرح انہیں برا کہو گی۔“ جوئے نے غصے سے کہا تو کیتھی نے ایک ٹک حنفی سے اسے دیکھا اور خاموشی سے چلی گئی.....
جوئے غصے میں بڑبڑاتا رہا۔

(جاری ہے)

الغیبت کا

لگے ہوئے تھے۔ ایک بے حد خوب صورت اسٹائلش سیٹی رکھی تھی۔ چھت سفید تھی فانوس اور کلمے صوفوں کے کمر کے تھے۔ پردے بھی صوفوں کے کمر کے تھے جن پر سلور کام بنا ہوا تھا۔ ہر چیز اس طرح جگر، جگر کر رہی تھی جیسے ابھی اور اسی وقت دکان سے خرید کر لائی گئی ہو۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان میں کوئی چیز بھی نئی نہیں تھی۔ پردے سے لے کر صوفے تک ہر چیز کم از کم پانچ سال پرانی تھی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ ان کا صوفہ سیٹ تھا۔ میں نے لیڈر کے بہت سے صوفے دیکھے تھے لیکن اتنا دلکش اور نظروں کو تازگی دینے والے رنگ کا لیڈر ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔

”یہ کون سا لیڈر ہے؟ میں نے لیڈر میں یہ کمر کبھی نہیں دیکھا.....“ کھانا کھانے کے بعد جب ہم خواتین باتوں میں مصروف تھے تو میں نے کرنل ایاز کی سبز صوفوں کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایاز کے دوست کا لیڈر کا کارخانہ ہے۔ ایاز کی فرمائش پر انہوں نے اس کمر کا لیڈر بنایا تھا۔“

”پھر تو یہ بہت مہنگا ہوگا.....“ بے اختیار میری زبان سے یہ جملہ نکلا۔

”ہاں مہنگا تو خاصا ہے..... لیکن اصل لیڈر کے صوفے تو مہنگے ہی ہوتے ہیں۔“ انہوں نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ان سے قیمت پوچھوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ بھی شاید بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ ہم پھر دوسری باتوں میں مصروف ہو گئے۔

پارٹی بہت اچھی رہی ہم سب نے خوب انجوائے کیا..... کرنل ایاز نے سارے آفسرز سے میرا تعارف کرایا۔ جب میں گھر آئی تو میرے دماغ پر ان کا گھر سوار تھا۔ شاید رات بھر میں یہی خواب دیکھتی رہی کہ میرا بھی ایسا ہی گھر ہے اور میں اسے

میں..... ان کی شخصیت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ فوجی ہونے کے باوجود ان میں بے حد عاجزی اور انکساری تھی۔ فوجیوں کے رواج کے مطابق انہوں نے فوراً ہی مجھے بہن کہہ کر مخاطب کیا پھر مجھ سے میرے شوہر اور بچوں کے بارے میں پوچھا۔ میرے مسائل دریافت کیے اور میرے اٹھنے سے پہلے مجھے اور میری فیملی کو اپنی بیٹی کی سالگرہ میں انوائٹ کیا جو دو دن بعد ان کے گھر پر ہونی تھی۔

میں سالگرہ کے دن اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو ان کا گھر دکھ کر حقیقتاً میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بظاہر وہ ایک درویش صفت انسان نظر آتے تھے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا لائف اسٹائل اتنا اعلیٰ اور فیس ہوگا..... میں نے فوجیوں کے بہت بچے سنورے گھر دیکھے تھے لیکن ان کا گھر جس انداز سے سجا ہوا تھا وہ واقعی قابل تعریف تھا۔

کرنل صاحب اور ان کی سز نے بڑے پرتیاک انداز میں ہمارا استقبال کیا اور ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ ڈرائنگ روم میں نہ بے تحاشا ڈیکوریشن کے پیمز کی بھر مار تھی کہ ڈرائنگ روم ڈیکوریشن کی دکان لگے نہ کمرانچر کی دکان کی طرح فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر بہت اعلیٰ قسم کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔

درمیان میں بے حد قیمتی اور اسٹائلش ڈیزائن کا کارپٹ بچھا تھا۔ درمیان میں شیشے کی میز تھی اور چاروں طرف سیون سیزر صوفے رکھے تھے جن پر کاسنی لیڈر چڑھا ہوا تھا۔ صوفوں پر کاسنی کیشن تھے جن پر ڈارک پرنٹ کمر کی کڑھائی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر شیشے کی الماری تھی۔ جس کے اندر کاسنی رنگ کے بلب لگے تھے۔ اس میں سے چمن، چمن کر کاسنی کمر کی روشنی باہر آرہی تھی۔ ایک کونے پر ایک خوب صورت لیمپ تھا جس کا شید کاسنی رنگ کا تھا اور دوسرے کارنر پر مصنوعی درخت رکھا تھا جس میں جا بجا کاسنی پھول

گھماتے رہیں یا پرانی گاڑی بیچ کر نئی گاڑی خرید لی جائے..... یا مہینے میں ایک بار ہوٹل جا کر ڈنر کر لیا جائے۔ انہیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ گھر کا فرنیچر کتنا پرانا ہو گیا ہے۔ صوفے کس زمانے کے ہیں، قالین اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کا اصل رنگ ہی مٹ گیا ہے۔ میری احسن کی ہمیشہ لڑائی اس بات پر ہوتی تھی میں جب بھی گھر کے فرنیچر یا پردے بدلنے کا ذکر کرتی وہ ٹی وی کے پروگرام اتنے غور سے دیکھنے لگتے جیسے میں ان سے نہیں دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں اور جب غصے سے میری آواز تیز ہو جاتی تو انتہائی سکون سے کہتے.....

”کیوں غصہ کر رہی ہو، اس عمر میں غصہ کرنا صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا.....“

یہ سن کر میرا پارہ اور ہائی ہو جاتا اور میں بکٹی جھکتی وہاں سے اٹھ جاتی..... لیکن جب سے میں کرنل ایاز کے گھر سے آئی تھی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب چاہے آندھی آئے پانی جائے میں نے ڈرائنگ روم کو سیٹ کرنا ہی ہے۔

میں فوج میں میجر تھی۔ دو سال پہلے میری پوسٹنگ پنڈی سے کراچی ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ پھر فوج جوائن کر لی..... فوج میں عہدہ تو بڑا ہوتا ہے لیکن اس عہدے کے مقابلے میں پیسہ بہت کم ہوتا ہے، فوجیوں کی زندگیاں بظاہر جتنی پُر شکوہ نظر آتی ہیں اندر سے اتنی ہی محنت و مشقت سے بھر پور ہوتی ہیں۔ ویسے تو میرے میاں بھی میجر تھے مگر اس کے باوجود ہمارے پاس کوئی بینک بیلنس نہیں تھا۔ دو سال پہلے میرے میاں کورس پر کراچی آئے تو میں نے اپنی پوسٹنگ کے لیے درخواست دے دی اور شوکی قسمت کہ دو ماہ کے اندر مجھے بھی کراچی پوسٹ کر دیا..... میں نے سی ایم ایچ میں جا کر رپورٹ کی تو میرا پہلا انٹرویو کرنل ایاز سے ہوا جو اس اسپتال میں سیکنڈ ان کمانڈ (21C)

خوش تھی کہ ہر روز اسپتال سے گھر آ کر ڈرائنگ روم کی زیارت کرتی..... ایک، ایک، ایک چیز کو دیکھ کر خوش ہوتی اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو سراہتی۔

جونہی ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر میں نے لائٹ آن کی تو ایک لمحے کے لیے میری جان کھج کر حلق میں آگئی۔ میرے خون کا درجہ حرارت نقطہ اہمال کو چھونے لگا..... میرا دل چاہا میں دیوار پر سر دے ماروں..... میرے بڑی محنت اور مشقت سے خریدے ہوئے کاسنی کمر کے لیڈر کے صوفوں پر کالے پوائنٹ سے بڑی بڑی لکیریں اور دائرے بنے ہوئے تھے اور یہ اتنے کے تھے جن کو مٹانے کے لیے ابھی تک کوئی ٹیمکل یا پینچ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

میں دل کو تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں بیٹے اور شوہر آفس گئے ہوئے تھے، بیٹی یونیورسٹی میں تھی، گھر میں ساس تھیں، جو اس گھر کے ہر مسئلے سے بے نیاز اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ ملازمہ کام کر کے جا چکی تھی۔ اب میں کہتی تو کس سے کہتی کہ اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

ان صوفوں سے میری جذباتی وابستگی بہت شدید تھی کہ یہ صوفے میرے دو سال کے خوابوں کی تعبیر تھے۔ ان کو خریدنے کے لیے میں نے پورے سال پیسے جمع کیے تھے۔ اپنی بے شمار خواہشات کو مارا تھا۔ کئی ضرورتوں کو پس پشت ڈالا تھا۔ ان کو خریدنے کے لیے کئی دوپہریں بازاروں میں گزاری تھیں۔

اس قسم کے صوفے میں نے سب سے پہلے اپنے ایک سینئر آفیسر کے گھر میں دیکھے تھے۔ خوب صورت اور سجے ہوئے گھر ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں لیکن محدود آمدنی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے میں بھی گھر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈیکوریٹ نہ کر سکی پھر احسن کو بھی گھر کی سجاوٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی دلچسپی یہ تھی کہ نیا LCD آجائے تاکہ وہ آفس سے گھر آ کر مزے سے چھینل

دو حالتوں کا واضح فرق

”مومن چار حالتوں کے درمیان رہتا ہے۔“

☆ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، مومن چار حالتوں کے درمیان رہتا ہے اگر کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے اور اگر کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور اگر بات کرتا ہے تو سچ بولتا ہے اور اگر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو انصاف والا فیصلہ کرتا ہے۔

☆ مومن پانچ قسم کے انوار میں چلتا پھرتا ہے اس کا کلام نور ہے اور اس کا علم نور ہے۔ مومن کے اندر نور ہے اور باہر نور ہے اور قیامت کے دن یہ نور کی طرف لوٹ کر جائے گا جبکہ کافر پانچ قسم کی ظلمتوں (اندھیروں) میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کا کلام ظلمت ہے، اس کا عمل ظلمت ہے، کافر جاتا ہے تو ظلمت میں اور باہر آتا ہے تو ظلمت میں اور قیامت کے دن یہ بے شمار ظلمتوں کی طرف لوٹ جائے گا۔

مرسلہ: رحمانہ حسن، گلستان جوہر، کراچی

کیسے سنا سوار کر رکھتے ہیں۔ یہاں کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ بازار میرے ساتھ چلا جائے۔ میں ہی سارا دن کھتی رہوں۔“

”اب صبح سے تو آپ کے ساتھ پھر رہا ہوں۔ اتنے اچھے اچھے صوفے ہیں آپ کو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔“ وہ بھی سخت جھنجھلا یا ہوا تھا۔ اب اسے کیا بتانی بات صوفے کی نہیں تھی..... اپنے خواب کی تعبیر کی تھی۔ وہ پورا دن سارے بازار کی خاک چھان کر میں ناکام ہو کر گھر آگئی۔ طبیعت سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ پھر میری رات کو ڈیوٹی بھی تھی۔ مجھے اس کا بھی غصہ تھا۔ ایک ہفتے بعد رمضان کی آمد آمد تھی۔ مجھے اس کی بھی تیاری کرنی تھی..... اب ساس بھی ساتھ رہتی تھیں۔ ذرا سی کسی چیز میں کمی بیشی ہو جاتی تو انہیں فوراً بیٹیوں کی تعریف کرنے کا نادر موقع مل جاتا۔

”سارہ تو رمضان سے ہفتہ بھر پہلے ہی ساری چٹنیاں، چاٹ مسالے بنا کر رکھ لیتی ہے۔ اس کے گھر میں پورا رمضان افطاری کے لیے کوئی چیز بازار سے نہیں آتی۔ پھر ماشاء اللہ بھری سسرال میں رہتی ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی افطار پارٹی ہوتی ہے۔“ ساس کے ان جملوں پر میرا خون گھول کر رہ جاتا ہے..... اب ان سے کون کہتا کہ سارہ تو کوری نہیں کرتی، سارا دن گھر میں رہتی ہے۔ میں بھی گھر میں رہوں تو اس سے ڈگنا کام کر سکتی ہوں..... میں یہ سب سوچ سکتی تھی لیکن کہہ نہیں سکتی تھی کہ احسن سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اپنی ماں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ میرا ہر ویک اینڈ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف ہونے لگا۔ انسان واقعی خسارے میں ہے، کیسی کیسی لا حاصل چیزوں کے حصول کے لیے اپنی زندگی کے قیمتی اور انمول نجات کو ضائع کرتا۔ کبھی، کبھی مجھے شدت سے اس بات کا

گھر کی طرح آثار قدیمہ کا شاہکار ہوتا جسے چند سال بعد حکومت میوزیم کا درجہ دے دیتی۔“ ان کے منہ بنانے پر مجھے اور زیادہ غصہ آتا، اور میں ان کو جلانے کے لیے ان کی اماں کو بھی درمیان میں لے آتی۔ میری کراچی میں پوشنگ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ اب میری ساس اپنے بڑے بیٹے کو چھوڑ کر میرے پاس آ کر رہنے لگی تھیں اور اتنے سال خود مختاری کی زندگی گزارنے کے بعد مجھے ساس کا اپنے ساتھ رہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے، تمہارا جو جی چاہے کرو..... جاؤ اور ابھی جا کر ساری تنخواہ سے صوفہ خرید لاؤ۔ پھر سارا مہینہ اسی صوفے کو دیکھ کر گزار لینا۔ اسی کو دیکھ کر پیٹ بھرنا، اسی کو دیکھ کر بچوں کی فینسیں دینا۔ پتا نہیں جب عقل بٹ رہی تھی تو تم کس کونے میں کھڑی تھیں۔ نام کو عقل نہیں ہے۔“ ہمیشہ کی طرح جھگڑے کا اختتام اسی جیلے پر ہوا اور میں غصے سے بڑبڑاتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی اور ٹی وی آن کر کے چینل سرچ کرنے لگی۔

☆☆☆

ان روز، روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر میں نے گھر میں صوفے کا ذکر کرنا بالکل ختم کر دیا۔ لیکن خاموشی سے اپنے مشن کی تکمیل میں لگی رہی۔ میں نے آفس میں ایک لاکھ کی کمیٹی ڈالی تھی اور رمضان سے ایک ہفتے پہلے مجھے کمیٹی مل گئی۔ جس دن کمیٹی ملی میں اپنے بڑے بیٹے کو لے کر پورے شہر کا چکر لگاتی رہی لیکن نہ مجھے اس ڈیزائن کا صوفہ ملا اور نہ وہ کھر..... بیٹا الگ میری اس مشقت سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس کی بیزاری پر مجھے اور بھی غصہ آ رہا تھا۔ میں سارے راستے اسے باتیں سناتی رہی۔

”میں نہ ہوں تو گھر کچرا خانہ بن جائے، کسی کو گھر کی فکر ہی نہیں ہے۔ لوگوں کو دیکھو اپنے گھروں کو

اسی طرح سجا رہی ہوں۔ اسپتال جو آن کرنے کے تین ماہ بعد مجھے بھی ایک فلیٹ مل گیا۔ جو تین بیڈروم، لاؤنج اور ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ فلیٹ پرانا ضرور تھا لیکن روشن اور ہوا دار تھا۔

فلیٹ کے الاٹ ہوتے ہی کرنل ایاز جیسے گھر کا خواب میرے اندر پھیل مچانے لگا اور اس خواب کے آکٹوپس نے میرے پورے ذہن کو جکڑ لیا۔ میری ہر بات کی تان گھر کی سجاوٹ پر ٹوٹنے لگی۔ بچوں کو اس ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور احسن کو تو اس ذکر سے خواہ مخواہ کاہر تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں گھر سجانے کا بہت شوق ہے لیکن اس شوق کو جنون نہ بنا لو۔“

”میں تو جب بھی گھر کے لیے کوئی چیز لانے کو کہتی ہوں آپ اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔“ میرا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ میری عادت تھی کہ جب میں کسی کام کے بارے میں سوچ لیتی تو تن من دھن سے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتی اور اس سلسلے میں مجھے لوگوں کے رائے مشورے بالکل اچھے نہیں لگتے۔

”مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر ان صوفوں میں کیا برائی ہے جو تم انہیں بیچ کر نئے صوفے خریدنے کے لیے باؤلی ہوئی جا رہی ہو جبکہ تم جانتی ہو ابھی ہمارے بجٹ میں اتنے مہنگے صوفوں کی گنجائش نہیں ہے.....“ وہ مجھے سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے۔

”میں آپ سے پیسے نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں نے کمیٹی ڈالی ہے، رمضان میں وہ مجھے ملے گی ان پیسوں سے میں یہ صوفے خریدوں گی۔“ میرے اس طرح کے منہ توڑ جواب سے ان کا منہ بن جاتا اور میرا غصہ کا سورج سوانیزے پر پہنچ جاتا۔

”آپ کا بس چلے تو آپ پرانا ٹونا ہوا فرنیچر بھی نہ پھینکنے دیں..... اگر میں گھر کی چیزوں کے لیے اتنا لڑتی جھگڑتی نہیں تو آج ہمارا گھر بھی آپ کی اماں کی

لے کر آئی۔ شیشے کی میزیں بھی زیادہ مہنگی نہیں ملیں، پردے بھی ہلکے کوالٹی کے خرید لیے۔ ابھی عید میں پورے دو ہفتے باقی تھے اور میرا سارا وقت بازاروں میں گزر رہا تھا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے تم بہت تھکی، جھکی لگ رہی ہو۔“ افطار کے بعد میں ٹڈھال سی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی تو احسن نے بغور مجھے دیکھا..... شاید انہیں مجھ پر ترس آ گیا تھا یا یہ خیال ہوا کہ اگر اس عمر میں، میں ہی راہی عدم ہو گئی تو گھر کو سنبھالنے کے لیے دوسری کہاں سے آئے گی۔

”ظاہر ہے تھکیں گی ہی جب اسپتال سے آ کر سارا دن بازاروں کے چکر لگاتی رہیں گی۔“ میری بیٹی جو اسی سال کالج میں داخل ہوئی تھی اور میری ان سرگرمیوں سے سخت نالاں رہتی تھی منہ بنا کر بولی۔ شاید میں اندر سے بہت کمزور ہو گئی تھی یا بیٹی کی بے حس کا احساس میں کچھ کہے پتا آنسوؤں سے رونے لگی۔

”ارے بھی کیا ہوا.....؟ خیریت..... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے.....“ احسن میرے رونے سے بری طرح گھبرا گئے۔

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا.....“ زہرا الگ پریشان ہو گئی۔

”جاؤ اپنی ماں کے لیے شربت بنا کر لاؤ۔ مجھے لگتا ہے نہیں ڈی ہائیڈریشن ہو گئی ہے۔“

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔“

”تم آرام نہیں کرتی ہو..... ہر بات کو اپنے ذہن پر سوار کر لیتی ہو۔“ احسن نے بڑی نرمی سے مجھے سمجھایا۔

”آپ کو احساس ہی نہیں ہے، عید میں صرف پندرہ دن رہ گئے ہیں، میں پرانا صوفہ بھی بیچ چکی ہوں..... اگر صوفہ نہ آیا تو عید پر جو مہمان آئیں گے

تو کیا فرش پر بیٹھیں گے.....“ احسن کا موڈ اچھا دیکھ کر میں نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کر دی۔

”اوہ تو اس فکر نے آپ کی راتوں کی نیندیں اڑادی تھیں..... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں..... ابھی چلتے ہیں ابھی آپ کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔“ احسن کا موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا۔ شاید باس سے تعلقات بہت اچھے چل رہے تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوراً اٹھ گئی۔ ہم دونوں پہلے طارق روڈ پہنچے..... ٹریفک کا ایسا اثر دھام جیسے کل عید ہو..... وہاں کی ساری فرنیچر کی دکانیں دیکھ ڈالیں کوئی صوفہ اچھا نہیں لگا پھر انجولی کی مارکیٹ پھر 13D اور سب سے آخر میں لالو کھیت کا رخ کیا۔

”یہاں بھی دیکھ لو..... یہاں بھی کبھی اچھی چیزیں مل جاتی ہیں..... یقین کرو یہ بڑی پرانی مارکیٹ ہے یہاں کا فرنیچر بہت اچھا ہوتا ہے۔“ احسن مارکیٹ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے مسلسل سمجھا رہے تھے۔

میں مختلف دکانوں میں فرنیچر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ خواہ مخواہ احسن کے کہنے پر یہاں آگئی۔

”ارے..... اس دکان میں چلیں..... بالکل ویسا ہی صوفہ..... جیسا میں چاہ رہی تھی۔“ میں دکانوں کے اندر رکھے ہوئے فرنیچر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک دکان کے اندر رکھے ہوئے صوفہ سیٹ نے میری دلی مراد پوری کر دی۔ ہم دونوں دکان میں داخل ہو گئے۔

”بالکل ویسا..... وہی ڈیزائن، ویسا ہی لیڈر.....“ میں نے صوفے پر ہاتھ پھیرا۔

”یہ کتنے کا ہے.....؟“ میں نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

”میں ہزار..... دکان دار کے قیمت بتانے پر میں تقریباً اچھلنے کے قریب آگئی۔ میں نے صوفے

کے لیے پچاس ہزار رکھے تھے۔

”حوصلہ رکھو..... زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں.....“ احسن نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔

”یہ اصل لیڈر تو نہیں ہے۔“ احسن نے بھاؤ تاؤ شروع کر دیا۔

”ظاہر ہے..... اصل لیڈر کا صوفہ تو اتنا سستا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اصل لیڈر کا صوفہ لیں تو کم از کم ڈیڑھ لاکھ کا ہوگا۔“ دکاندار نے صفائی سے اصل حقیقت بیان کر دی..... میرا دل بچھ گیا اور دل کی کیفیت چہرے سے آشکار ہونے لگی۔

”اب کیا ہوا ہے؟“ احسن نے میری صورت دیکھی۔

”یہ اصل لیڈر تو نہیں ہے نا.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”تم نے اصل لیڈر کا اچار ڈالنا ہے کیا.....؟ ہمارے گھر میں جو مہمان آتے ہیں ان میں کسی کو بھی اصل لیڈر کی پہچان نہیں ہے..... جیسا ہمارا فلیٹ ہے اس کے لحاظ سے یہ صوفہ بہترین ہے۔“ احسن نے سرگوشی میں یہ جملے کہہ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”ہاں ٹھیک ہے، دیکھنے میں تو ویسا ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے بھی اوکے کر دیا کہ اب میرے پاس اسے قبول کرنے کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ گزشتہ تقریباً ایک ماہ سے بازاروں میں پھر، پھر کر میں ادھ موٹی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اور اب اتنی محنتوں اور مشقتوں سے حاصل کیے ہوئے صوفوں کا یہ حشر دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ کیونکہ چند دن پہلے ہی ملازمہ نے مجھ سے بڑے لجاجت بھرے لہجے میں درخواست کی تھی کہ ”باجی میری چھوٹی بچی بیمار ہے، میں کام پر آجاتی ہوں تو وہ گھر میں روتی رہتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے لے آیا کروں..... وہ بہت نیک بچی ہے میرے ساتھ،

الٹی گتھا

ساتھ رہے گی۔“ اس کے منت بھرے انداز پر مجھے بھی رحم آ گیا۔ ویسے بھی رمضان کا مہینہ تھا نیکی کا جذبہ دودھ کے ابال کی طرح نفس کی آخری حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ میں نے بھی اسی جذبے سے سرشار ہو کر اجازت دے دی۔ یہ ملازمہ بہت سختی اور ایماندار تھی۔ ویسے تو مجھے ملازمہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی میرے ساتھ میرا اردلی تھا۔ احسن کو بھی اردلی مل سکتا تھا لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم صرف ایک اردلی رکھیں گے اور ایک اردلی کی تجواہ لے لیا کریں گے۔ میرا اردلی رحمت میرے ساتھ کافی عرصے سے تھا اور میں نے اسے گھر کے سارے کاموں میں طاق کر دیا تھا۔ لیکن جب ہماری پوسٹنگ کراچی ہوئی اور میری ساس نے میرے ساتھ رہنا شروع کیا تو انہیں سب سے پہلے یہ اعتراض ہوا کہ ایک غیر مرد ہر وقت گھر میں کیوں دندناتا پھرتا ہے جبکہ گھر میں جوان لڑکی بھی ہے۔ احسن بھی اپنی ماں کے ہم نوا تھے۔ اسی لیے مجھے اس ملازمہ کو رکھنا پڑا اب باہر کے سارے کام رحمت کرتا تھا اور گھر کے اندر کے سارے کام..... تسنیم کرتی تھی۔ پہلے تسنیم اپنی بڑی بیٹی کو لایا کرتی تھی..... وہ ایک لمحے کے لیے بھی چلی نہیں بیٹھتی سارے گھر میں گھومتی پھرتی رہتی۔ اور اسے چیزیں اٹھانے کی بھی عادت تھی۔ اس کے آنے کے بعد سے میرے میک اپ کی کئی قیمتی چیزیں گم ہو گئی تھیں۔ جب میں تسنیم سے کہتی تو وہ خدا رسول کی قسمیں کھانے لگتی۔

”نہیں باجی، میری بچی ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ اللہ معاف کرے نہ مجھ میں یہ عادت ہے اور نہ میرے بچوں میں۔ ہم بھوکے سو جائیں گے لیکن چوری نہیں کریں گے۔“ وہ اس طرح کی باتیں کرتی کہ میں سخت شرمندہ ہو جاتی کہ میں نے نیک اور پرہیزگار خاتون کی بیٹی پر چوری کا شبہ ظاہر کیا لیکن جب میری ڈریسنگ ٹیبل سے دو ہزار کا بیئر

(base) اور کئی ہزار کے پرفیوم غائب ہو گئے تو میں نے تسنیم سے صاف، صاف کہہ دیا کہ وہ بچی کو ساتھ نہ لائے۔ تسنیم کو اس لیے جواب نہیں دیا کہ وہ جب سے ہمارے گھر کام کر رہی تھی کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے وہ اماں کی چہیتی بھی بہت تھی۔ اماں کے سارے کام وہی کرتی تھی۔ اس کو نوکری سے ہٹانا اپنے لیے ایک اور مصیبت مول لینا تھا۔ ایک تجربے کے بعد میں دوسرا تجربہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر وہی مجبوری اور نیکی کے جذبے کا اہل..... میں نے دوسری بچی کو دیکھا ہوا تھا..... وہ بہ مشکل تین سال کی ہوگی۔ میں نے سوچا تین سال کی بچی بھلا کیا چرائے گی.....؟ اسی لیے میں نے اجازت دے دی۔ دو دن تک تو وہ بچی خاصی ڈری سہی رہی، تیسرے دن میں اسپتال سے آئی تو دیکھا موصوفہ میری جائے نماز سے تسبیح نکالے اس کے دانے بکھیر رہی ہیں۔ میں نے خود کچھ کہنے کے بجائے ان کی اماں کو بلا کر ان کی لخت جگر کا کارنامہ دیکھایا انہوں نے میرے سامنے ہی بچی کو ایک تھپڑ لگایا اور مجھے شرمندہ کر دیا۔

”باجی کیا کروں، یہ میری بات ہی نہیں سنتی۔“ اس کے اس-سپارگی کے جملے پر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

دوسرے دن گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا وہ ڈریسنگ ٹیبل سے نالکھ پاؤ ڈراٹھائے اپنے آپ کو بھی نہلا رہی ہیں اور ریڈ کارپٹ پر بھی تھوپ رہی ہیں۔ مجھے پھر بے رحم ظالم بیگم صاحبہ بنا پڑا۔ تسنیم کو آواز دی وہ بظاہر لرزتی، کانپتی تشریف لائی مارے صدے کے میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا میں نے رو ہانسی ہو کر بچی اور کارپٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے پھر پرانی پالیسی اختیار کی اور اس دفعہ بچی کے دو تھپڑ لگا دیے۔ بچی نے منہ پھاڑ، پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا اور میری ساس کا جذبہ ترحم

اپنے عروج پر جا پہنچا۔ وہ بھی خوفِ خدا سے لرزتی کانپتی کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”استغفر اللہ..... استغفر اللہ..... تمہیں رحم نہیں آتا..... اتنی معصوم بچی پر ہاتھ اٹھاتی ہو..... خدا کے غضب سے ڈرو، یہ بہت بڑا ظلم ہے، بچوں کو مارنے والا بھی ظالم اور مارنے کی ترغیب دینے والا بھی ظالم.....“ میں سمجھ گئی تھی، اس وقت سب سے بڑی ظالم میں تھی۔ اور آج جب اس صوفے کو آئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا تو اس پر اس قدر بے دردی سے لکیریں اور دائرے بنائے گئے تھے کہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا جس دن یہ صوفہ ہمارے گھر آیا تھا۔ ہمارے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ بڑے بیٹے کو اس کے آنے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی میرے ساتھ بازاروں میں پھرنے کی اذیت سے بچنے کی خوشی تھی۔ بیٹی بھی اس لیے خوش تھی کہ اب اماں گھر میں رہیں گی اور اسے افظاری کے لیے جو ایک آدھ چیز بنانی پڑتی تھی اس سے بھی وہ بچ جائے گی۔ اور احسن اس لیے خوش تھے کہ انہیں ہر وقت اس ذکر کے سننے سے نجات مل گئی تھی۔ رہ گئیں ساس تو وہ اب اپنی تمام خواہشیں پوری کر کے اللہ والی بننے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ ہم جیسے گناہ گاروں کا ہر فعل ان کے نزدیک صرف اس دنیا کا خسارہ تھا۔

”میں کہاں جاؤں.....؟ کس سے کہوں اور..... کیا کہوں.....؟“ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں ایسی رقت تو آج تک کبھی نماز میں طاری نہیں ہوئی جیسی اس وقت طاری ہوئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت تسنیم کو بلاؤں اور اس کے سامنے اس کی بچی کو دل بھر کر ماروں اور اس کو فوراً نوکری سے نکال دوں..... پر رات ہی تو لیلۃ القدر تھی اور ساری رات میں نے توبہ اور استغفار کرتے ہوئے گزاری تھی اور عہد کیا تھا کہ اب

میں بہت نیک اور پرہیزگار بننے کی کوشش کروں گی۔ درگزر کو اپنی عادت بنا لوں گی، لوگوں کو ان کی غلطیوں پر معاف کر دیا کروں گی۔ لوگوں کے دل دکھانے والی باتوں اور رویوں پر صبر کروں گی اور یہ عہد کر کے صبح اسپتال گئی تھی۔ سب سے پہلے نرم اور شفقت لہجے میں گفتگو کرتی رہی۔ جمعہ داروں، ٹیکنٹھوں، آیاؤں، نرسوں کی غلطیوں کو درگزر کرتی رہی۔ کسی کو لیٹ آنے پر بے عزت نہیں کیا..... بلکہ مسکرا کر خوش آمدید کہا کسی کی چھٹی نہیں روکی۔ کسی نے ایک ہفتے کی چھٹی ایلانی کی اسے دو ہفتوں کی چھٹی دے دی۔ کسی نے پچاس روپے مانگے اسے سو دے دیے..... نیکی اور درگزر کے جذبے سے پور، پور ڈوبی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو ایسا سخت امتحان میرا منتظر تھا کہ جس میں درگزر اور صبر کرنا گویا کسی پہاڑ کی چوٹی کو پیر کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ سر کرنا تھا اور میں اس پہاڑ کو سر کرنے کے لیے سارا دن قرآن پاک پڑھتی رہی۔ فیس بک پر بڑے بزرگوں کے اقوال بڑھ کر ڈہرائی رہی۔ اگلے دن اسپتال سے جلدی آگئی تھی کیونکہ شام کو پڑوسیوں کے گھر افظاری بھی بھجوانی تھی۔

”تسنیم.....“ میرے اندر جتنی صبر کی طاقت بھی میں نے اسے جمع کر کیا سے آواز دی۔

”کیا ہوا باجی.....؟“ وہ حسب معمول لرزتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی اور صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے.....؟“

”باجی کیا کروں..... میں باورچی خانے میں اماں کے لیے روٹیاں پکا رہی تھی..... اس نے نہ جانے کہاں سے یہ قلم ڈھونڈ لیا اور لکیریں بنا دیں۔“ اس کے چہرے پر کسی قسم کے شرمندگی کے آثار نہیں تھے۔

”پھر.....“ غصے کی شدت سے الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

”باجی آپ ناراض نہیں ہو..... میں نے بڑی

کوشش کی لیکن یہ صاف نہیں ہوئے..... وہ بہت شریہ ہو گئی ہے اسی لیے میں اسے آج لے کر نہیں آئی۔“ انہوں نے مجھ پر دوسرا احسان کیا۔

”پھر..... اب..... کیا ہوگا.....“ غصہ میری انتہا کو پہنچنے لگا۔

”باجی اس دفعہ معاف کر دیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا.....“ اس نے سو دفعہ کا دہرایا ہوا جملہ پھر سے دہرایا۔

”ظاہر ہے اور کر بھی کیا سکتی ہوں..... نہ تمہیں مار سکتی ہوں اور نہ تمہاری بچی کو..... تمہیں احساس ہے.....؟ تم نے میرا کتنا بڑا نقصان کیا ہے، یہ میرے نئے صوفے ہیں جن کا تمہاری بچی نے یہ حشر کر دیا۔ تمہاری بچی کو میں نے اس لیے گھر میں آنے کی اجازت دی تھی کہ وہ میرے گھر کی چیزوں کو برباد کر دے..... میں نے بہت ضبط کر کے بھی اسے اتنی باتیں سنائیں..... وہ خاموشی سے سر جھکائے میری باتیں سنتی رہی۔

”اب یہاں کیا کھڑی ہو..... میرے سامنے سے فوراً چلی جاؤ.....“ مجھے ڈر لگا کہ کہیں میری زبان سے کچھ اور کڑوے اور کیلے جملے نہ نکل جائیں۔ میں اسے باتیں سنا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ میرا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تو احسن نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا وہ دیکھ لیتے تو ایک لمحے میں اسے نوکری سے فارغ کر دیتے جبکہ میں تو اسے ڈانٹ کر بھی شرمندہ تھی۔ میں نے اسے اس حد تک معاف کر دیا کہ اسے نوکری سے فارغ نہیں کیا..... بلکہ عید کے لیے جو اس کو جوڑا دیتی تھی وہ بھی دیا۔ اس کے بچوں کو عیدی بھی دی..... لیکن عید سے دو دن پہلے وہ غائب ہو گئی۔ دو دن بعد عید گئی۔ ان دنوں کسی ملازمہ کا ملنا پہاڑ سے جوئے شیر نکالنے سے زیادہ مشکل تھا۔ پھر عید کے دن دوپہر میں میری ساس، نندیں، نندوئی اور ان کے بچے، جیٹھ، جیٹھانی

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس پر رنج کر رہا تھا۔ سو ہنسا دلہا ہے کہ بس..... اور اس بس پر اس کی بس
تھا..... خاندان بھر کی عورتیں صدقے داری جاتی رہیں۔ ہونے لگی۔
لڑکیاں، بالیاں اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ ”بڑے نصیبوں والی ہے بھئی.....“ اور اس کا
”ہائے رختی کیسی قسمت والی ہے..... اتنا دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کیسے نصیب.....؟ اور

یہ تیری ہے میسون صرف



چھوٹی سی غلطی پر مجھے ڈانٹا تھا میں نے اسی دن سوچ
لیا تھا کہ میں اس گھر میں کام نہیں کروں گی۔ باجی، ہم
عزت دار لوگ ہیں، ہم نے محنت نیچی ہے عزت نہیں
نیچی..... آپ نے معصوم بچی کی غلطی پر مجھے کتنا بے
عزت کیا تھا۔ آخر بچے تو شرارت کرتے ہی
ہیں..... اس کی باتیں سن کر میرا سر گھوم رہا تھا۔
میں شکر کر رہی تھی کہ میرے پاس کلا شکوف جیسا کوئی
ہتھیار نہیں تھا ورنہ اس وقت میں ساری گولیاں اس
کے پیچھے میں اتا ر دیتی۔

”باجی اس عید پر خرچہ بہت ہو گیا..... آپ
نے ابھی تک تنخواہ بھی نہیں دی عیدی بھی اتنی کم دی
کہ مجھے کسی کو بتاتے بھی شرم آرہی تھی۔ نئی بیگم صاحبہ
نے تو مجھے بھی جوڑا بنا کر دیا اور میرے سارے بچوں
کو بھی اور عیدی بھی آپ سے زیادہ دی ہے۔“ اس
نے شاید میرا صبر آزمانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میرا دل چاہا
کہ میں اس کے ٹوٹے، ٹوٹے کر کے چیل، کوؤں کو
کھلا دوں..... میرے اندر غم و غصے کا طوفان اپنی انتہا
کو پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے مسکراتے
ہوئے چہرے کو دیکھا اور خاموشی سے اٹھی، الماری
کی طرف گئی اس کی تنخواہ کے پیسے نکالے اور پوری
تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے پیسے گنے اور
منہ بنا کر بولی۔

”باجی آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی
ہے، میں نے اتنی خدمت کی اور آپ نے جاتے
وقت مجھے انعام بھی نہیں دیا۔ باجی آپ کو میرے
جیسی ایماندار اور اتنے کم پیسوں میں اتنا کام کرنے
والی عورت نہیں مل سکتی۔“

وہ اور بھی نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی اور
میں لیوں پر خاموشی کا فضل لگائے سوچ رہی تھی۔
”کیا اب بھی میرا شمار صبر کرنے والوں میں
نہیں ہوگا۔“

دیور، دیورانی ان کے بچے کھانے پر مدعو تھے۔
اردنی بھی چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اب گھر میں، میں تھی
اور میری بیٹی۔ چاند رات میں پوری رات جاگتی رہی
روسٹ چکن، دم کے کباب، بریانی کا مسالا، شاہی
مکڑے میں نے رات کو بنائے، صبح تو ویسے ہی
کاموں کا اتنا انبار ہوتا تھا کہ چیزوں کو فاسل بچ دیتے،
دیتے ہی دوپہر ہو جاتی۔ بہر حال سب کے آنے
سے پہلے میں نے سارا کھانا تیار کر لیا تھا..... سب
آئے اور سب نے دل بھر کر کھایا۔ خوب تعریفیں کیں
اور کھانا کھاتے ہی سب روانہ ہو گئے۔ اور میں چکن
میں برتنوں کے ڈھیر کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ پوری شام
برتن دھوتے گزر گئی۔ درمیان میں مہمانوں کی آمد و
رفت بھی جاری رہی۔ رات جب بستر پر لیٹی تو جسم
پکتے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

☆☆☆

عید کے تیسرے دن تسنیم اپنی بچی کو لیے ہوئے
آئی۔ اسے دیکھ کر میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔
”عید پر کیوں نہیں آئیں.....“ میں نے حتی
الامکان لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔
”باجی مجھے ایک اور جگہ کام مل گیا ہے۔ آپ تو
مجھے پانچ ہزار دیتی تھیں۔ وہ مجھے دس ہزار دے رہی
ہیں اور کام بھی کوئی خاص نہیں ہے بس صبح سے چار
بچے تک ان کے بچے کو سنبھالنا ہے۔“ وہ مجھے جلا رہی
تھی یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔

”باجی میں تو آپ کو خدا حافظ کہنے آئی تھی۔“
وہ پھر گویا ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
میں جانتی تھی وہ کیوں آئی ہے۔ اسے اس مہینے کی
تنخواہ لینی تھی۔

”تمہیں جانا تھا تو کم از کم ایک ہفتے پہلے تو مجھے
بتا دیتیں..... تمہیں معلوم نہیں کہ عید پر گھر میں کتنا کام
ہوتا ہے.....“ میرا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

”باجی جس دن آپ نے میری بچی کی ایک

اس نے کہا تھا

کسی دن تم سے ملنے پر
 کہا تھا تم لکھو گے
 تمہارے نرم بالوں پر
 تمہارے شوخ گالوں پر
 تمہاری مست آنکھوں پر
 تمہاری مسکراہٹ پر
 تیرے قدموں کی آہٹ پر
 تیرے ہونٹوں کی نرمی پر
 تیری سانسوں کی گرمی پر
 تیرے ہاتھوں کے گلن پر
 تیری پائل کی چمن، چمن پر
 تیرے سہکتے پہ، چلتے پہ
 کسی دن تم سے ملنے پر
 کہا تھا تم لکھو گے
 تو اب وہ جب بھی ملتی ہے
 یہی کہتی ہے میرے سے
 وہ میری لقم لائے ہو
 یا پھر سے بھول آئے ہو
 مجھے تب یاد آتا ہے
 مجھے ایک لقم لقمی ہے
 اسی کی خوش بیانی پر
 اسی کی مست جوانی پر
 مجھے ایک لقم لقمی تھی
 مجھے ایک لقم لقمی تھی
 مگر اے ہم لقمی میرے
 لکھوں کیا میں تادے یہ
 کہ تیرے ہاتھ میں تو اب
 یہ کس وعدے کی ہندی ہے
 تیرے ماتھے پہ اے ہم دم
 یہ کس کے نام کی بندیا
 چمکتی ہے دکھتی ہے

کاوش، مہوش، جماد، چمک، اعظم، ایسے

اور جب سب خوش تھے تو وہ کیوں نہ ہوتی.....
 اتنا اچھا رشتہ تو نصیبوں والیوں کو ملتا ہے۔ سو وہ خود کو
 نصیب والی گردانے لگی۔
 ”اماں اس کی بہن ابھی تک کیوں نہیں
 آئی.....؟ ایک بھائی ہے اس کا..... اسے کوئی ارمان
 نہیں ہے بھابی کا۔“ ایک روز یونہی برسبیل تذکرہ
 اس کے منہ سے نکل گیا..... اماں تھوڑا چوکیں پھر
 سرسری سا جواب دے ڈالا۔
 ”ہاں، نہیں آئی تو نہیں آئی..... اس میں بھلا کیا
 حرج ہے؟ اور اپنے، اپنے خاندان کے طور طریقے
 ہوتے ہیں..... کنواری لڑکیوں کا یوں شادی بیاہ کے
 معاملات میں بولنا یا دخل دینا پسند نہیں کیا جاتا۔“
 ”پھر بھی اماں.....“
 اماں آگے سے خاموش رہیں تو وہ بھی منہ بھلا
 کر خاموش ہو جاتی پھر عزیز کمال کی اماں کتنی بار ہی
 آئی گئیں..... اماں اور بھائیوں کا بھی آنا جانا
 ہوا..... شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں مگر وہ
 (بہن) نہ تو کبھی آئی اور نہ ہی اس کا تذکرہ ہوا۔
 ”کیسی ہے وہ اماں؟ پیاری سی ہے یا
 یوں ہی..... کس جماعت میں پڑھتی ہے..... دکنے
 میں کیسی ہے؟“ وہ ان گنت سوالات کرتی اور اماں
 کسی ایک کا بھی جواب نہ دیتیں۔ الٹا ڈپٹ دیتیں۔
 ”تجھے اس سے کیا لینا دینا..... اپنے کام سے
 کام رکھ۔“
 ”ارے، مجھے کیوں لینا دینا نہیں..... وہ میری
 ہونے والی اکلوتی تند ہے آخر۔“ وہ کچھ، کچھ منہ بناتی
 اور کچھ، کچھ اٹھلاتی۔
 اور اماں منہ کھولے اسے بکنے لگتیں۔
 ”جیا کر کچھ..... یوں منہ پھاڑ کر کیا ہونے والی
 سرال کا ذکر کرتے ہیں؟“
 ”تو کیا منہ بند کر کے مالا چھتی رہوں سرال
 کی۔“ اور وہ برے، برے منہ بناتی بھائی کے سر ہوئی۔

بھائیوں کی شہ پر وہ اکثر فائدہ اٹھالیتی۔
 ”مت بگاڑو سے..... اگلے گھر جا کر یہی حرکات
 رہیں تو آٹھ، آٹھ آنسو روئے گی۔“ اماں لٹا تیں۔
 ”آٹھ، آٹھ آنسو کیسے اماں..... کوئی اسے
 ایک آنسو بھی رولا نہیں سکتا۔“ رخشی سے بڑا رضوان
 بڑے مان سے کہتا تو اماں سر پکڑ کر رہ جاتیں۔
 ”سدھر جا رخشی..... بچی نہیں رہی تو.....“
 ”ارے اماں بچی ہی ہے ناں.....“ بھائی کی
 شہ پر رخشی اٹھلاتی ہوئی یہ جاوہ جا..... اماں بھائیوں
 کو آنکھیں دکھاتی رہ جاتیں مگر وہاں کسی کو پروا
 نہیں تھی۔ اماں صرف سر ہی پیٹ سکتی تھیں، وہ بھی
 اپنا..... رخشی کا نہیں..... بہترے رشتے آئے مگر کوئی
 بھی انہیں اپنی بہن کے شایان شان نہ لگتا..... وہ ہر
 دوسرے رشتے میں، مین میخ نکالنے۔
 ”شہزادہ نہیں آئے گا اسے بیاہنے۔“ اماں
 کھول کر رہ جاتیں۔
 ”شہزادی ہے ہماری بہن..... سو شہزادہ ہی
 ڈھونڈیں گے۔“ بڑے مان سے جواب آتا اور رخشی
 بیگم ہواؤں میں اڑنے لگتیں۔ دماغ تھا کہ ساتویں
 آسمان سے اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور پھر انہی
 ڈھیر سارے رشتوں میں عزیز کمال کا رشتہ آیا۔ اچھا
 خوبرو نوجوان، پڑھا لکھا، پکی نوکری، اچھی تنخواہ اور
 سب سے بڑھ کر اکلوتا بیٹا..... ساری جائداد کا تنہا
 مالک، ہاں ایک بہن تھی چھوٹی جس کی بھی نہ کبھی تو
 شادی ہوئی جانا تھی..... اسے ہر لحاظ سے موزوں
 لگا۔ اماں الگ خوش تھیں اور بھائی سب کے سب
 مطمئن سو وہ بھی سمجھ بیٹھی کہ بھائیوں نے سچ سچ شہزادہ
 ہی چنا ہے۔
 ”بڑے شریف لوگ ہیں۔“ بڑا بھائی عدنان
 تو یہی کہتا پھرتا تھا اور سب تائید اسے ہلاتے۔
 ”لڑکا ہر لحاظ سے بہترین ہے۔“ چھوٹا عثمان
 بھی خوش تھا۔ سو باقی سب بھی خوش.....

پھر اماں کو زخمی نظروں سے دیکھنے لگی..... کیا خبر میں
 وقت پر انہیں اس کی بھولی صورت پر رحم آجائے اور وہ
 منع کر دیں..... مگر اماں اس کی نظروں، آنسوؤں کو
 شروع دن سے اب تک نظر انداز ہی کرتی آئی تھیں۔
 ”ہائے اماں، کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟
 اب بھی وقت ہے روک لیں مجھے۔“ دل دہائیاں
 دینے لگا۔
 اور اماں تھیں کہ بنی ٹھنی خوش باش سی مہمانوں
 کے درمیان اندر باہر ہوتی رہیں۔
 وقت نکاح جب ایجاب و قبول کا مرحلہ آیا تو
 بھی وہ کن آنکھوں سے اماں کو دیکھتی رہی۔ کیا خبر
 اماں آخری مرحلے پر منع کر دیں..... مگر وہ تھیں کہ
 مطمئن سی کھڑی اس کے جواب کی منتظر تھیں۔
 نکاح نامے پر دستخط کے ساتھ ہی مبارک باد کا
 شور اٹھا..... مامیاں، چاچیاں، خالائیں، پھوپھیاں.....
 کبھی بڑی بوڑھیاں اور لڑکیاں بالیاں لپک، لپک کر
 اسے گلے لگاتیں اور جوم کرا گے بڑھ جاتیں۔
 ”آہ اماں کس جنم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے.....
 ڈائن بھی یہ نہ کرتی ہوگی جو آپ نے اپنی اولاد کے
 ساتھ کیا۔“ وہ چکے، چکے آنسو بہاتی رہی۔ رخصت ہو
 کر جب سرال کی دلہیز پار کی تو گھونگٹ تلے ہی چور
 نکا ہوں سے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگی..... گھر یا ماحول
 دیکھنا مقصود نہ تھا وہ تو اسے دیکھنے کی خواہشمند تھی۔
 ”کہاں ہے وہ؟“ نظروں ہی نظروں
 میں پورا گھر چھان ڈالا مگر بے سود..... اسے نہ ملتا تھا
 سو نہی۔

☆☆☆

رخشدہ جنہیں اپنے چار بھائیوں میں سب سے
 چھوٹی اور اکلوتی تھی۔ بھائیوں نے ہمیشہ سے ہتھیلی کا
 چھالا بنا کر رکھا..... البتہ اماں ہمیشہ کھینچ کر رکھتی تھیں۔
 تربیت کے معاملے میں اماں کسی قسم کے سمجھوتے کی
 قائل نہیں تھیں..... اور وہ بھی تو لڑکی ذات..... مگر

”کیسی ہے میری تند.....؟ دکنے میں کیسی ہے؟ دہلی پتلی خوب صورت سی ہے یا سوئی، بھدی، بد صورت سی؟“

”انسان ہے اور کیسی ہوتا ہے؟“ بھائی بھی اماں کی طرح گول مول جواب دے کر چلتا بنا۔

”آخر کوئی مجھے میری تند کے متعلق بتاتا کیوں نہیں؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔“ وہ دوسرے بھائی کے سر ہوئی۔ وہ اب اونچا، اونچا بول رہی تھی۔ سنا اماں کو مقصود تھا۔

بھائی سب کے سب گونگے بنے اماں کو سکنے لگے اور اماں جیسے بہری بن کر مستقل اپنے کام میں مصروف رہیں۔

”اماں اسے بتادیں۔“ چھوٹا رضوان دبے، دبے لفظوں میں بولا۔

”کیا بتانا ہے مجھے.....؟ اماں کیا چھپا رہی ہیں مجھ سے؟ سچ، سچ بتادیں مجھے..... کہیں وہ کوڑھ کی مریض تو نہیں..... مٹی بی تو نہیں، کھانس، کھانس کر جراثیم پھیلانے والی..... خون تو نہیں تھوکتی؟“ اور اماں نے اشتعال میں آکر ہاتھ میں پکڑا اٹکیہ اسے دے مارا۔

”کوئی شرم حیا ہے یا نہیں..... زبان کیسی قینچی کی طرح چلتی ہے۔“

”قینچی کی طرح چلے یا چھری کی طرح مجھے سب سچ بتائیں۔“ وہ ٹلنے والوں میں سے نہ تھی اور اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتائیں اور کیا چھپائیں۔ سوگلا کھنکھارتے ہوئے تمہید باندھی۔

”دیکھو رخصتی اللہ کا خوف کھانا اس بچی کے معاملے میں..... بڑی بے ضروری ہے وہ۔ بس ذہن صحیح کام نہیں کرتا ہے۔“

”ہائے میں مر جاؤں..... پاگل ہے۔“ وہ اچھل پڑی اور منہ پیٹ لیا۔

”پاگل نہیں ہے وہ..... بس ذہنی کمزوری

ہے۔“ اماں کا دل ہی دہل کر رہ گیا سو فوراً صبح کی۔

”پاگل ہی ہوئی اماں..... آپ نے مجھے پاگلوں کے گھرانے میں دے دیا۔ اُف میرے خدا..... اماں آپ میری سگی ماں ہی ہیں ناں.....؟“ اور اماں دل تھامے اس کی موٹکیاں سنتی رہ گئیں۔ بھائی بھی سب خاموش تھے..... کبھی بات دل کو لگتی، کبھی دل سے اترتی۔

پھر روز، روز ہنگامہ ہونے لگا..... رخصتی چاہتی تھی کہ رشتے سے انکار کر دیا جائے مگر اماں ماننے کو تیار نہ تھیں اور بھائی بھی اماں کے ہم خیال بن چکے تھے اس بار.....

”بیرازکا ہے..... راج کرے گی میری دھی رانی۔“

اماں پیار سے پکارتیں اور وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

”بیرے کے ساتھ جو پتھر ملیں گے ان سے سر ٹکرا، ٹکرا کر جب مر جاؤں گی تو ہی سکون ملے گا۔“ وہ بھال، بھال کر کے رونے لگ جاتی۔

مگر وہ اماں کو نہ مناسکی اور اب بیاہ کر عزیز کمال کے ہمراہ اس کے گھر چلی آئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے بیڈ کی پانسی سے سر ٹکائے لال آنکھیں اور تلکے چلیے میں وہ اسے دیکھ رہی تھی..... سوتی جاگتی سی رخصتی کا خوف کے مارے برا حال تھا سو چیختی ہوئی باہر کی جانب بھاگی۔ اور چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پراٹھا لیا تھا۔

اماں اور دیگر عزیز بڑھی شور مچا کر باہر نکل آئے۔

”وہ..... وہ پاگل میرے کمرے میں ہے، مجھے مارنے آئی ہے۔“ وہ ساس کے پیچھے چھپی ہر اس میں عزیز کو بتانے لگی۔ ثریا بیگم کے دل کو اس کی بات چھید گئی۔ مگر وہ سہہ گئیں۔

”رخصتی وہ پاگل نہیں ہے۔“ عزیز کو برا لگا تھا سو صاف کہہ گیا۔

”میں کچھ نہیں جانتی، اسے میرے کمرے سے

باہر کریں اور مجھے ابھی کے ابھی اماں کے گھر چھوڑ کر آئیں..... میں اس گھر میں ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔“ وہی بچپنا، وہی ضد.....

عزیز کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوا مگر اماں نے بات سنبھال لی۔

”ہاں بیٹا اسے آج اماں کے گھر چھوڑ آؤ..... دو دن وہیں رہ لے، ویسے والے روز واپس لے آنا۔“ معاملہ فہم خاتون تھیں ثریا بیگم سو بیٹے کو طریقت سے سنبھالیا اور ان کے کمرے میں جا کر بیٹی کو باہر نکال لائیں۔

”اماں..... بھابی ہے میری بھابی ہے.....“ وہ رخصتی کی جانب دیکھ کر اشارہ کرتی اماں کو سمجھانے لگی۔ رخصتی اسے باہر نکلتا دیکھ کر عزیز کی اوٹ میں ہو گئی اور کندھے سے جھانک، جھانک کر اسے دیکھنے لگی۔

”بھابی ہے مگر منع کیا تھا ناں کہ بھابی کے کمرے میں نہیں جانا پھر کیوں گئی؟“ اماں کچھ، کچھ روشنی سی نامحاند انداز میں مخاطب تھیں۔

”میری بھابی ہے۔“ وہ ایک ہی گردان لگائے ہوئے تھی۔ جیسے اماں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو اور اماں اتنی سمجھدار ہو کر بھی نا سمجھ بن رہی تھیں۔ اماں اسے تھمیت کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ رخصتی اس روز عزیز کے ہمراہ اپنی اماں کے گھر چلی آئی تھی اور گھر پہنچتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس کی اماں سمجھا، سمجھا کر تھک گئیں مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔

ویسے سے ایک روز قبل ہی ثریا بیگم اس سے ملنے آئی تھیں کرا بند کیا اور اسے سمجھانے لگیں۔

”ہم نے بخت سے متعلق کچھ بھی تمہارے گھر والوں سے نہیں چھپایا بیٹا..... شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ چھپانا بددیانتی ہے اور ہم بددیانت نہیں۔ اس کی حالت کی ذمے دار نہ وہ خود ہے اور نہ

ہم..... اللہ کی طرف سے آزمائش ہے سو کاٹ رہے ہیں۔ وہ قطعاً بے ضرر ہے۔ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں دیا۔ اللہ کی خاطر اسے برداشت کر لو..... اللہ پاک اس کے بدلے تمہاری مشکلات دور فرمادے گا.....“ وہ ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”اور جہاں تک گھر چھوڑ کر بیٹے بیٹھ جانے کا سوال ہے تو بیٹا اچھی بچیاں اپنا گھر اتنی معمولی سی باتوں پر تو کیا بڑی، بڑی باتوں پر نہیں چھوڑا کرتیں..... اس گھر کی اصل مالکن تم ہو..... عزیز کی نہیں تمہاری ماں بن کر سمجھاری ہوں..... ابھی تم نئی تو ملی دہن ہو سو میاں ناز برداریاں اٹھائے گا مگر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ مرد کا دل ایسی حرکات سے اوبے لگتا ہے سو بچی تمہیں خود سے ہی محتاط ہونا پڑے گا۔“

نہ جانے ان کی باتوں میں کیا جادو تھا کہ حرف بہ حرف دل پر ثبت ہوتا گیا اور وہ اس روز ثریا بیگم کے ہمراہ اپنے گھر جانے پر آمادہ ہو گئی۔

”پہلے تو مان کر نہ دے رہی تھیں تم؟“ اماں حیران تھیں۔

”بس تو اب مان گئی ناں..... آپ خوش ہو جائیں۔“ وہ اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔

”ایسا کیا کہا ہے ساس اماں نے؟“ وہ دل ہی دل میں خوش بھی تھیں کہ بیٹی اپنی رضامندی سے واپس گھر جا رہی ہے۔

”بس کچھ کہہ دیا ایسا.....“ وہ مطمئن سی تھی اور اسی لیے اماں بھی مطمئن تھیں۔

☆☆☆

ثریا بیگم کے ہاں عزیز کمال کی پیدائش کے آٹھ سال بعد بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی جس کا نام خوش بخت رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی ثریا بیگم کے میاں کا انتقال ہو گیا اور بھی سے خاندان بھرنے سے بد بخت قرار دیا جو پیدا ہوتے ہی باپ کو

”ہے ہی منحوس..... میرے بھائی کو کھا گئی۔“
پھوٹ نہ بھر، بھر کر اسے کونے دے رہی تھیں..... اس
بچی کو جو ابھی ٹھیک سے ماں کو نہ پہنچاتی تھی جو دودھ
کے علاوہ کچھ کھاتی ہی نہیں تھی۔ وہ سالم باپ کو
کھا گئی۔

”ایسے تو مت کہیں آپا.....“ ثریا نے تڑپ کر
بچی کو سینے سے لگا لیا۔

”ارے پوت کے پاؤں پالنے میں دکھ جاتے
ہیں..... منحوس ماری ہے یہ..... ساری زندگی نکلتی
رہے گی اوروں کی خوشیاں.....“

ثریا بیگم بیوگی کا دکھ بھول کر اپنی بچی کے دکھ
میں گھلنے لگیں جو خاندان بھر میں منحوس اور نابکار ٹھہرائی
جا چکی تھی۔

پھر اس خوش بخت کو سواتین سال کی عمر میں جا
کر ایسا بخار چڑھا کہ دماغی کمزوری کا سبب بن
گیا..... بہتر علاج کرایا مگر فائدہ نہیں ہوا..... جسمانی
نشوونما ہوتی رہی مگر ذہنی نشوونما رک گئی۔ سولہ سال کی
لڑکی ہو کر بھی وہ چھ سال کی بچی ہی رہی۔

جہاں ثریا بیگم بٹھا جاتیں وہیں بیٹھی رہتی.....
منہ سے بچوں کی طرح آوازیں نکالتی، تالیاں مار،
مار کر ہستی اور قہقہوں پہ تہقہے لگاتی جاتی۔ اور ثریا بیگم
اسے دیکھ، دیکھ کر رونی جاتیں جو اپنے حال سے بے
حال تھی۔

سب آتے جاتے یہی کہتے رہتے کہ کیا فائدہ
ہے اس کی زندگی کا..... بے فائدہ نہ ہو تو اور وہ خوش
بخت سے تو بد بخت بنی اور پھر بے فیدی..... وقت
کے ساتھ، ساتھ لوگ بھول ہی گئے کہ اس کا نام خوش
بخت رکھا گیا تھا یا دھما تو صرف بے فیدی.....

ثریا بیگم سوچ، سوچ کر تھک جاتیں کہ کیا.....
بے فائدہ اولاد عطا کر دی ہے اور پھر اللہ سے شکوہ کرنے
لگتیں کہ کیسی آزمائش میں مبتلا کر دیا مجھ بیوہ کو۔

ایک روز اسے اٹھا کر سامنے کھیتوں کی جانب
لے گئیں جہاں ایک زہریلی بوٹی جی ہوئی تھی.....
اسے کھلا کر آزمائش سے نجات چاہتی تھیں مگر
وہاں پہنچ کر دیکھا تو بوٹی سرے سے غائب تھی۔
حالانکہ کل ہی وہ جب بکری باندھنے آئی تھیں تو اس
طرف سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا
اور اسے دیکھتے ہی انہیں یہ خیال آیا تھا۔

”کم بخت کو موت بھی قبول کرنے سے انکاری
ہے۔“ گود میں اٹھائی، رال ٹپکاتی بچی کو لے کر گھر
واپس لوٹ آئیں۔ شام کو بکری کو کھولنے کھیتوں کی
طرف گئیں تو بوٹی وہیں موجود تھی۔ دل کانپ گیا.....
”مولایہ کیا ماجرا تھا؟“ نظر اٹھا کر آسمان کو ہنکا۔

”مولایہ تیرے رنگ..... تو اس کی زندگی چاہتا
ہے، اس بے فیدی کی..... پھر میں کون ہوتی ہوں
اس کی موت کی خواہش کرنے والی۔“ اس دن سے
وہ خوش بخت کا بہت خیال رکھنے لگیں۔

جب وہ پورے گیارہ برس کی ہوئی تو کسی طاق
رات میں صحن میں جا کر کھڑی ہو گئی..... اماں اور
بھائی عبادت میں مشغول اور وہ اکیلی نہ جانے کون
سے اسرار جاننے صحن کے بیچوں بیچ جا کھڑی
ہوئی..... صحن بیچوں سے گونج اٹھا اور وہ غش کھا کر
وہیں گر پڑی۔ اس روز کے بعد سے اسے ایسی چپ
لگی کہ اماں بلا، بلا کر تھک جاتیں مگر وہ نہ اب تہقہے
لگاتی، نہ تالیاں بجاتی..... بس یک ٹک آسمان کو ہنکا
کرتی..... یا آنکھیں موندے بیٹھی رہتی اور نہ جانے
زیر لب کیا، کیا پڑھتی رہتی۔

کہنے والے کہتے کہ اس نے شب قدر پائی
ہے، اللہ کے بہت سے رازوں کو پایا ہے بھی ایسی
حالت ہو گئی۔

پھر عورتیں اس کے پاس آ کر بیٹھتیں اور مدعا
بیان کرتی جاتیں..... دعائیں کروانے آتیں.....
کسی کے گھر والے کی نوکری نہیں تھی تو کسی کی اولاد

نہیں تھی..... کسی کے بچوں کے رشتے کا مسئلہ تو کسی کو
محبت کا.....

وہ سنتی رہتی اور خاموش رہتی، عورتیں ہاتھ جوڑ،
جوڑ کر تھک جاتیں کہ کوئی دعا دے ڈال اور لوٹ
جاتیں، کبھی جو صبح میں ہوتی دھڑا دھڑا دعائیں دیے
جاتی اور قبول کرنے والے نے بھی جیسے عہد کر رکھا تھا
..... اس سے کہ جو مانگے گی ملے گا..... اور مانگنے والی
نے مجال ہے جو خود کے لیے کبھی نمک کا ذرہ بھی مانگا
ہو..... اس کی خودی کوئی چاہت نہ تھی..... وہ تو بس
دوسروں کی چاہتیں پوری کرنے کو ہاتھ اٹھاتی تھی.....
مستجاب الدعوات میں چنا گیا تھا اسے۔

پھر عورتیں..... عقیدت سے ہاتھ چومنے کی
کوشش کرتیں..... وہ انہیں پیچھے ہٹا دیتی..... اسے یہ
حرکت پسند نہیں آتی تھی۔

”میرے میاں کی نوکری لگ گئی تیری دعا سے
خوش بخت.....“

”بخت والی دھی ہے تیری ثریا..... اس کے
ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی جیسے میری بچی کے نصیب کھل
گئے۔ بڑی اچھی جگہ بات پکی ہوئی ہے۔“
اور وہ بے فیدی سے خوش بخت بن گئی تھی۔ ثریا
بیگم اسے دیکھتی رہ جاتیں کہ وہ جو بے فیدی تھی اللہ
اس کی دعاؤں سے کیسے لوگوں کو فیضیاب کر رہا
تھا..... بندہ، بندہ گواہ تھا کہ کبھی اس نے کسی کو نقصان
پہنچانے کی کوشش کی نہ جنگ کیا۔

☆☆☆

رخشی سارا دن گھر کے کام کاج میں جتی رہتی
اور کن آنکھوں سے اسے آتے جاتے دیکھتی جو صحن کی
دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے کچھ بڑبڑانی
رہتی یا پھر زمین پر آڑھی ترچھی نادیدہ لکیریں کھینچتی
رہتی۔ اور نظر اٹھا کر بھی ادھر ادھر نہ دیکھتی۔ آہستہ،
آہستہ رخشی کا خوف جاتا رہا۔

اس دن کے بعد سے نہ وہ اس کے کمرے کی

طرف گئی تھی اور نہ اسے مخاطب کیا۔ بس کبھی کبھار
اسے گھورتی اور پھر سر جھٹک دیتی..... یقیناً ثریا بیگم نے
بہت طریقے سے سمجھایا تھا اور وہ طریقے سے سمجھ بھی گئی
تھی..... نہ اس نے کبھی رخشی کو کسی قسم کی شکایت کا
موضوع دیا اور نہ ہی رخشی کو کبھی اس سے شکایت ہوئی۔

”بے فیدی اب کبھی اس طرف نہیں آئی اور نہ
اس نے مجھے کبھی بلایا ہے۔“ اس روز رات میں وہ
یونہی باتوں، باتوں میں عزیز سے کہہ بیٹھی۔ کافی دنوں
سے دل میں دبا کر بیٹھی تھی اب اظہار کر رہی ڈالا۔

”جانو ر بھی محبت کی زبان سمجھتا ہے، وہ تو پھر
انسان ہے۔“ اس کا لہجہ نرم تھا سو وہ ہنسم کر گئی۔ البتہ
مطلب خوب سمجھ گئی تھی۔

”اور سنو، اسے بے فیدی مت بلایا
کرو..... اس کا نام خوش بخت ہے۔“ عزیز، بہن کے
معالے میں اماں سے زیادہ حساس ثابت ہوا تھا۔

”ساری دنیا اسے بے فیدی ہی کہتی ہے، ایک
میں نے کہہ دیا تو کیا ہوا؟“ اب کی بار اسے اچھا
نہیں لگا تھا سولہ ترش ہو گیا۔

”سب کے منہ میں بند نہیں کر سکتا مگر میرے
گھر میں سے کوئی اسے بخت کے علاوہ کچھ
نہیں بلائے گا۔“ لہجہ دو ٹوک تھا۔ اس نے جو اب بخت
سے پرہیز کیا۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ رخشی خود
سے اسے مخاطب کر لیتی..... کبھی کھانے کے لیے
بلائی تو کبھی کسی چھوٹے موٹے کام کے لیے.....
جو اب اوہ بھی دوڑی، دوڑی چلی آتی اور

”میری بھابی ہے۔“ کہتی ہر کام کر دیتی۔
رخشی کی شادی کو سال سے اوپر ہو گیا تو ایک
روز یونہی وہ خوش بخت کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

”سن بخت تو سب کے لیے دعا کرتی ہے ناں
میرے لیے بھی دعا کر دے کہ اللہ میری گود
بھر دے۔“ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے وہ لجاجت

بھرے انداز سے کہہ رہی تھی اور وہ آنکھیں موندے بیٹھی رہی..... نہ ہوں، نہ ہاں نہ کوئی دعا.....

”سن رے بے فیدی، مجھے کیوں دعا نہیں دیتی؟“ وہ اس کا گھٹنا زور، زور سے ہلانے لگی۔ جواب جو نہ دیتی تھی۔ وہ کوفت کا شکار ہو گئی۔ تبھی اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ پہلی بار اس کی بھابی اس طرح اس کے قریب فرصت سے آکر بیٹھی تھی۔ ذہنی کمزور سہی مگر سب محسوس ہوتا تھا اسے۔ احساسات سے عاری نہیں تھی وہ۔ حقارت، محبت، دکھ، خوشی، پشیمانی، گریز سب سمجھتی تھی۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد وہ امید سے تھی اور شروع دن سے اس کی طبیعت بگڑی ہی رہتی..... دل اتنا گھبراتا تھا کہ کبھی رات میں اٹھ، اٹھ کر کھڑکیاں کھول کر بیٹھ جاتی کہ کہیں سے تازہ ہوا آئے..... عزیز شور کرتا.....

”ٹھنڈا آرہی ہے رختی..... کھڑکی بند کر دو.....“ اور رختی کا دم اور گھٹنے لگتا پھر وہ دروازہ کھول دیتی اور گہری سانس بھرتی..... کہیں سے تازہ ہوا آئے اور اس کے دل سے بوجھ اڑا کر لے جائے۔

”رختی مجھے ٹھنڈا لگ رہی ہے، تم باہر چلی جاؤ۔“ اور وہ اٹھ کر باہر آجاتی۔ ساری رات گھر میں پھراتی پھرتی اور ایسے میں وہ بھی اس کی ہم نشین بن جاتی..... اس کے ساتھ ہی جاگتی رہتی۔ اس لمحے جب اس کا جیون ساتھی بھی ساتھ نہیں بھاڑتا تھا وہ بے فیدی اس کے ساتھ تھی۔

”میری تو حالت ٹھیک نہیں ہے جھلی..... تو کیوں جاگتی ہے پوری رات؟“

اور وہ خاموشی سے بھابی کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی رہتی، یک نیک نظریں انہی پر جمائے رکھتی۔ کبھی رات کو اس کا جی متلانے لگتا تو وہ جھٹ پٹ پانی لے آتی۔ اس کی کمر سہلانے لگتی..... اور ایسا کرتے وہ سمجھ داری سولہ سال خوش بخت لگتی..... کون

کہہ سکتا تھا کہ اس کی ذہنی بالیدگی رک گئی ہے۔ وہ بعض اوقات خود حیران رہ جاتی۔

اور اگلے روز وہ اسے پھر سے وہی بے فیدی لگتی جسے نہ اپنا ہوش ہوتا نہ ارد گرد کا..... عالم فانی اور لافانی کے مدھ میں معلق کسی ثقافت کے مانند.....

☆☆☆

جس روز اسے اسپتال لے کر جایا جا رہا تھا..... اس نے خوش بخت کو نہ جانے کیا پڑھ، پڑھ کر خود پر پھونکتے دیکھا۔

”دعا کرنا میرے لیے.....“ اس نے جاتے، جاتے دروازے کے ساتھ لگی تند سے استدعا کی جس نے سر ہلا دیا گویا سب سمجھ رہی ہو۔ جب وہ واپس آئی تو اس کی گود میں ننھی مٹی سی پری تھی.....

”دیکھ بخت تیری مٹی.....“ ثریا بیگم نے ننھی گڑیا کو اس کی جانب بڑھایا مگر وہ دروازے میں کھڑی اسے دیکھنے کے بجائے بھابی کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلے روز کے بعد سے کبھی اس کے کمرے میں نہ آئی تھی۔

”آ جا بخت..... مٹی کو اٹھائے گی نہیں؟ تو پھپھو ہے اس کی۔“ رختی ذرا سا مسکرائی تو وہ دوڑ کر لپکی اور ثریا کے ہاتھ سے اسے چھٹ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔

”میری مٹی ہے۔“ وہ پیار کرتی جانی اور اماں روتی جاتیں۔

”میں پھپھو..... میں پھپھو اماں۔“ ثریا بیگم نم آنکھوں سے سر اثبات میں ہلاتیں اس کی تصدیق کرتی رہیں۔

”رختی اللہ تجھے اجر دے۔“ اس کے سر پر ہاتھ دھرتے، وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اس دن سے جیسے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب بھابی، نند کو سنبھال لے گی سو وہ ہنستے بعد ہی وہ خاموشی سے مٹی کی چادر اوڑھ کر سونے چل دیں۔

ثریا بیگم کی وفات پر رختی نے پہلی بار خوش بخت

کو دیواروں، درختوں سے لپٹ، لپٹ کر روتے دیکھا تھا..... شادی کے قریب ڈھائی سال بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ رونا بھی جانتی ہے جو، جو خواتین تعزیت کے لیے آتی گئیں، وہ ان میں سے کسی کے گلے نہ لگی نہ ہی روئی..... اس کے ہم نوا اور ہمدرد درخت اور دیوار تھے جن سے سارا سال وہ لپٹی رہتی۔

”ماسی کیا واقعی بخت نے شب قدر پائی ہے؟“ وہ ماسی عظمت سے سرگوشی میں بات کرتے، کرتے اچانک پوچھ بیٹھی۔ ماسی بڑی اللہ لوک بندی تھیں..... گہری سانس بھری اور بخت پر نظریں جمادیں۔

”یہ تو مولا کے رنگ ہیں..... اس کی رمزیں ہیں جو وہ کسی، کسی پر کھولتا ہے، کون اس کا رمز آشنا ہے وہی جانے..... پر ایک بات ہے کہ اللہ نے ایک طرف سے کسی رکھی تو دوسری طرف سے بڑا عطا بھی کیا ہے..... اب ہم جیسے بندے کہاں سمجھ سکتے ہیں ایسی باتیں۔“ ماسی اتنا کچھ سمجھ کر بھی کیسی نا سمجھ عاجز بن گئی۔

رختی سر ہلاتی رہ گئی۔ وہ واقعتاً نہ سمجھتی تھی۔

ثریا بیگم کی وفات کے بعد سے خوش بخت پھر سے بے فیدی بن گئی..... عورتوں کا تانتا بندھا رہتا مگر اب وہ ہاتھ نہ اٹھاتی۔ وہ ہاتھ جوڑ، جوڑ کر تھک جاتیں مگر نہ اس کے ہاتھ اٹھتے نہ لب ہلتے.....

”بخت اب کیوں دعائیں نہیں دیتی؟“ وہ اکثر پوچھتی تھی مگر جواب نہ دار، وہ بلا، بلا کر تھک جاتی مگر وہ جگہ سے انج بھر نہ ہلتی۔

اس نے گڑیا کو اٹھانا بھی چھوڑ دیا تھا..... حتیٰ کہ وہ کمرے میں بڑی روتی رہتی مگر وہ اس کے قریب بھی نہ بھٹکتی۔ رختی اکیلی سارا گھر سنبھال، سنبھال کر ادھ موٹی ہو جاتی..... اس سے پہلے ساس نے سارا گھر سنبھال رکھا تھا تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ گھر کی اتنی ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ پھر گڑیا کی ذمے داری الگ تھی اور بخت ہلنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ گڑیا کی ذمے داری ہی اسے سونپ دے۔

بہ فیدی تھی اس روز کام کر کے اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا اور گڑیا نے رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا..... لہذا سارا غصہ بخت پر نکال دیا۔

”بے فیدی ہی ہے ناں آخر..... نکلی، ناکارہ..... کسی کام کی نہیں ہے۔ اپنا آپ سنبھال نہیں سکتی مجھے کیا مدد دے گی..... لوگ ٹھیک تجھے بے فیدی کہتے ہیں۔“

اس وقت تو بخت خاموشی سے لب سے سستی رہی حتیٰ کہ اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش تک نہیں ہوئی مگر شام میں اس نے بخت کو گڑیا کو گود میں لے کر جھلاتے دیکھا اور منہ سے نہ جانے کون سا آسانی راگ نکل رہا تھا جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا مگر گڑیا اسے سن کر خاموش تھی..... وہ ہولے سے مسکرا دی اور صد شکر ادا کیا۔

اس روز کے بعد سے گڑیا کبھی روتی نہ پائی مٹی تھی..... بخت نے گویا ماں بن کر اسے سنبھال لیا تھا۔

”نہ جانے کون سا طلسم پھونکتی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے پھپھو، بیٹی کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتی..... باتیں کرنے والی تین سالہ دماغ کی حامل خوش بخت اور باتیں سننے والی تین ماہ کی نیٹاں..... بہر حال وہ بیٹی کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنا کام کرتی رہتی۔

☆☆☆

”کبھی، کبھی مجھے بخت کی سمجھ نہیں آتی۔“ وہ نیٹاں کو لٹا کر مالش کر رہی تھی اور جواباً وہ قلقاریاں مار رہی تھی۔

”اب کیا، کیا اس نے؟“ عزیز بیٹی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔

”کبھی کبھار تو ایسی بن جاتی ہے جیسے بہری ہے اور گونگی بھی..... نہ سن رہی ہے اور نہ جواب دے گی.....“ عزیز مسکرا دیا۔ ”اور کبھی ایسی سیانی بن جاتی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ کسی سوسولہ بڑھیا کی روح حلول کر گئی ہے اس میں..... سب سمجھتی ہے جو سمجھاؤ

وہ بھی اور جو نہ سمجھا وہ بھی..... اب دیکھیں گڑیا کو اتنا اچھے سے سنبھال لیتی ہے کہ میں بے فکر ہو جاتی ہوں اس کی طرف سے..... جس لڑکی کو اماں بھی کبھار کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں آج وہ سیانی بن کر گڑیا کو کھلا رہی ہوتی ہے۔ ”عزیز مسکراتا رہا۔

”بس رخصی اس کا بھی دل نہ دکھانا..... اس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا..... وہ بے ضرر ہے یاد رکھنا۔ اماں اسے ہمارے ذمے ڈال کر گئی ہیں سو اس کا بہت خیال رکھنا۔“ وہ نیناں کی مالش کرتے ہوئے سر ہلاتی جا رہی تھی۔ عزیز کی باتوں کو اس وقت پلو سے باندھ لیا تھا..... یہ سوچے بغیر کہ ان باتوں کو تو ہمیشہ ہی پلو سے بندھا رہنا چاہیے۔

☆☆☆

نیناں فطری طور پر بخت سے بے حد مانوس تھی..... بخت اسے کھلاتی پلاتی بھی خود تھی اور سارا دن اس کے ساتھ کھیلتی بھی رہتی۔

”دیکھا کیسے اللہ نے تیری مشکلات اس کے ذریعے حل کیں جس سے تو چڑنی تھی۔“ اماں جب بھی اس سے ملنے آتیں بخت کو دیکھ، دیکھ کر رخصی کو ضرور احساس دلاتیں اور وہ خاموش رہتی مگر دل میں اقرار ضرور کرتی تھی۔

اس روز محلے سے ہی ایک خاتون نیاز کے چاول دینے آئی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ اندر آ کر بیٹھ گئیں۔

”رخصی ہوش کے ناخن لو، تم نے پچی کو اس کے حوالے کر رکھا ہے۔“ رخصی ان کی بات پر ذرا کی ذرا مسکرا دی۔

”نہیں باجی..... جیسا سب سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے، بخت کسی کو نقصان نہیں دیتی اور گڑیا کا تو اتنا خیال کرتی ہے کہ شاید میں بھی نہیں کر سکوں۔“ اس نے محبت پاش نظروں سے تند کی گود میں چڑھی بیٹی کو دیکھا۔

”لاکھ بے ضرر رہی مگر ہے تو یہ پاگل ناں..... حرکات دیکھو اس کی..... تمہاری بچی اب بڑی ہو رہی ہے جو یہ کرے گی، گڑیا بھی اس کی پیروی کرے گی..... جنگلی، گنوار بنانا ہے کیا پچی کو جو اس پاگل کے سپرد کر رکھا ہے۔ خدمت اچھی شے ہے، تم ضرور اس کی کرو..... اجر ملے گا مگر پچی کو اس کے سائے سے بھی دور رکھو..... ایک تو پاگل کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا، کب بگڑ ہی جائیں اور دوسرے پچی کی عادات بگڑ جائیں گی..... خود تو بے فیڈی ہے، پچی پر تو اثر نہ ڈالے۔“

رخصی کے پلو سے بندھی باتیں ایک، ایک کر کے کھلنے لگیں اور نئی گاٹھیں بندھنے لگیں۔ اس نے عزیز کو بتائے بغیر ہی نیناں کو بخت سے دور رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب جب بھی بخت کھیلنے کے لیے اس کے کمرے کی جانب جانے لگتی رخصی ٹوک دیتی..... کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتی۔

”وہ سوری ہے۔“ بخت تھم جاتی۔

”وہ کارٹون دیکھ رہی ہے، تم بعد میں آنا۔“ وہ لوٹ آتی۔

”ابھی اس کے نہانے کا وقت ہے۔“ وہ خاموشی سے وہیں تک جاتی۔

اور چھوٹی سی نیناں نہ جانے کتنے کاموں میں مصروف ہو گئی کہ بخت اس سے مل نہ سکتی۔

ٹریا بیگم کہتی تھیں وہ بڑی سیانی ہے، سب سمجھتی ہے..... اور وہ واقعی سمجھ گئی تھی کہ اب اسے گڑیا کے پاس نہیں جانا، اس سے دور رہنا ہے، بھلے وہ خود سے ہی کیوں نہ اس کی جانب بڑھے، بھلے وہ روٹی رہے،

اب اسے گڑیا کے قریب نہیں جانا۔ اس نے بھابی کی اجازت پر پہلی بار گڑیا کو گود میں بھر کر اپنایا تھا.....

اب وہ بھابی کے کہنے پر ہی اسے گود سے اتار کر برایا کر رہی تھی۔ گڑیا اب اس کی جانب ہمتی تو رخصی روک لیتی، رخصی ادھر ادھر ہوتی تو وہ خود بخود گڑیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر کھسک لیتی۔

وہ جسے سب بے فیڈی کہتے تھے۔ موقع بر محل اس سے فائدہ بھی حاصل کرنا جانتے تھے۔ بھابی نے بھی شاید یہی کیا تھا ہمیشہ سے۔

☆☆☆

ایک روز گھر پر عزیز کے چند دوست مدعو تھے اور رخصی صبح سے باور پچی خانے میں مصروف تھی..... گھر کی صفائی کے لیے کام والی ماسی آنے لگی تھی سو ایک طرف سے فکر کم ہوئی..... جاتے، جاتے ماسی بڑا گیٹ چوپٹ کر گئی اور رخصی بے خبر سی باور پچی خانے میں ہی لگی رہی۔

نیناں کھیلتے، کھیلتے گیٹ کی طرف جانگی اور پلی کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے گیٹ سے باہر..... خوش بخت جو بظاہر اس سے بے خبر رہتی مگر چھپ، چھپ کر اس پر ایک چور نظر ڈال لیتی، میٹرھیوں پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر گھما، گھما کر بھابی کو تلاش اور پھر پھرتی سے باہر کو لگی۔

رخصی کو جب کاموں سے فرصت ملی تو بیٹی کا ہوش آیا اور پھر پورا گھر چھان مارا مگر نہ تو نیناں گھر پر تھی اور نہ بخت.....

”ہائے میرے ربا..... کدھر لے گئی وہ میری بچی کو.....“ دل تھام کر گیٹ کی جانب بھاگی جو کھلا پڑا تھا۔

”بے فیڈی..... کدھر مر گئی، ربا میری بچی۔“

اڑوس بڑوس میں سب سے پوچھ لیا مگر کہیں کسی کو کوئی خیر خبر نہ تھی۔ وہ بھاگتی، بھاگتی بڑے میدان کی طرف جانگی تو سامنے سے ایک شخص گود میں بچی لیے آ رہا تھا۔ نیناں کو دیکھتے ہی بھل، بھل آنسو گرنے لگے۔

”سامنے جو بڑا کٹر سے ناں اس کا ڈھکن ٹوٹا ہوا ہے..... یہ پلی کے پیچھے بھاگتی، بھاگتی وہاں تک جا پہنچی تھی اور گرتے، گرتے بچی ہے۔ وہ دور جو پاگل بیٹھی ہے اس نے اسے بچایا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑی آئی خود وہ بھی آدھی ڈھے ہی گئی تھی..... بس اللہ نے

کرم کیا اس پر کہ وہاں سے ہم گزر رہے تھے تو اسے باہر کھینچ لیا۔“ اس نے دور بیٹھی بخت کی جانب اشارہ کیا جو اپنی کہنی اور گھٹنے سہلا رہی تھی اور منہ سے آوازیں نکال رہی تھی جیسے شدید درد میں مبتلا ہو مگر کوئی اس کے زخم سہلانے والا تھا نہ ہی مرہم لگانے والا۔

”صحیح کہا بھائی صاحب..... اس پر اللہ ہمیشہ ہی کرم کرتا آیا ہے۔“ رخصی، گڑیا کو اٹھائے، اٹھائے اس کی طرف دوڑی..... اس کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل ڈھے گئی۔

بخت اسے اپنے زخم دکھا رہی تھی مگر زخموں کی وجہ چھپا گئی۔ رخصی روٹی جاتی تھی اور اس کے زخمی ہاتھوں کو چومتی جاتی تھی۔

”معاف کر دے مجھے بخت..... اللہ کے لیے مجھے معاف کر دے۔“ بخت حیران پریشان سی روٹی بکتی بھابی کو بکتی رہی اور اپنا درد بھول گئی۔

”اماں آپ ٹھیک کہتی تھیں اللہ اس کے ذریعے سے میری مشکلات نالتا ہے..... اور میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ بے فیڈی نہیں، ہرگز نہیں..... کوئی انسان کیسے بے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کا بتایا کوئی ذرہ بھی اس کائنات میں بے مصرف نہیں..... اس کی بتائی ہر چیز میں تکمیل ہے۔ بصارت اندھی ہو سکتی ہے، بصیرت نہیں۔“

اس نے روتے، روتے نیناں کو اس کی گود میں دے دیا۔

”یہ لے بخت..... یہ تیری ہے، اس کی جان پر اب مجھ سے کہیں زیادہ تیرا حق ہے۔“

اور بخت اسے گود میں اٹھا کر چٹا چٹ پیار کرنے لگی۔

”میری منی..... میں پھپھو.....“ اور رخصی نم آنکھوں سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہاں، ہاں یہ منی تیری ہی ہے۔“



ناولٹ

پاکہرینج

نایاب جیلانی

سپر لگژری ”کیمری“ فل اسپڈ کے ساتھ نیویارک کی کارپنڈ ہائی ویے پر دوڑ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں چھتوں پر پڑ رہی تھیں جہاں برف پڑی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا سنہری کرنوں کی چمک سے کئی ہیرے دمک رہے ہوں۔

مگر یہ چمک اس کی آنکھوں میں ریت بھر رہی تھی۔ اگر خالہ اسے اتنا مجبور نہ کرتیں، اس کے سامنے گریہ نہ کرتیں اور مرنے سے پہلے عہد نہ لیتیں تو شاید

فاطمہ کبھی ان اجنبی راہوں کی طرف نہ پلٹی۔۔۔۔۔ ان کٹھور لوگوں کی بستی میں نہ آتی۔ خالہ کی ہر بات پر سر جھکانا اس کا فریضہ تھا۔ خالہ کی محبت اور فرمانبرداری اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

خالہ کی یاد میں آج بھی فاطمہ کی آنکھیں نمی سی بھر جاتی تھیں۔ اس کا ویزا لگا اور ٹکٹ کنفرم ہوا ادھر خالہ اپنے آخری "فرض" سے فراغت پا کر خالق حقیقی سے جا ملیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فاطمہ کے ویزے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کی زندگی میں در آنے والی طغیانی کے بعد سکون اور شانتی کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی ماموں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ویزا وغیرہ بھیجا۔۔۔۔۔ ٹکٹ کے پیسے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیے۔۔۔۔۔ ادھر خالہ نے مکان بیچ کر سارے اکاؤنٹ کے ڈالرز بنوائے اور فاطمہ کو اپنے آنسوؤں سے زیر کر کے جہاز میں بٹھا دیا۔۔۔۔۔ ابھی وہ سفر میں تھی جب اطلاع ملی کہ خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ شاید وہ فاطمہ کو اپنی زندگی میں محفوظ ٹھکانے پر بھیجنے کا اطمینان کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ یا پھر اپنی بیٹی کا لدا ابو جھ اتار کر اللہ کے حضور حاضر ہوئی تھیں۔

انہیں گمان ہوگا۔۔۔۔۔ یہ عمل ان کی بیٹی کے رستوں میں بکھرے کانٹے سمیٹ دے گا۔ شاید خالہ کا گمان غلط نہ ہو۔۔۔۔۔ مگر ہر کوئی اپنے عمل کا کیا پاتا ضرور ہے۔ چاہے کسی بھی صورت میں ہو۔۔۔۔۔ دل دکھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے اگر کوئی ان کا دل دکھا جائے تو کیا ہو؟ زندگی چھین لینے کی کوشش کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کوئی ان کی زندگی کے ساتھ اس طرح کرے تو کیا ہو۔۔۔۔۔ ہے بے بس کر دینے والے جب خود بے بس ہو جاتے ہیں تو اپنی بے بسی کا حال تک سنا نہیں سکتے۔

نیویارک ہائی وے پر بکھری ایسی دردناک یادیں آج بھی فاطمہ کی روح کو جھنجھوڑتی تھیں۔ جیسے ایک فلم سی تھی جو آنکھوں کے پار چل رہی تھی۔ منظر کے بعد منظر بدل رہا تھا۔ چہرے کے بعد چہرہ بدل رہا تھا۔

آنکھوں کے رنگ بدل رہے تھے۔ لوگ بدل رہے تھے، عکس بدل رہے تھے۔ حتیٰ کہ شہر بدل رہے تھے۔ اچانک چلتی "کیسری" کی خاموش فضا میں مردانہ آواز ابھری تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا بظاہر سنجیدہ نظر آتا بندہ ایک دم بولنا شروع ہوا تو فاطمہ کو خیال آیا۔ وہ گاڑی میں اکیلی نہیں تھی اور سوچوں کے سفر میں بہت دور تک نکلی ہوئی تھی۔ اس کی یادیں نیویارک کی طرح بہت گنجان تھیں۔ پھر بھی وہ لمحہ بھر میں یادوں کے طویل سلسلے کو جھٹک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کا دھیان ارد گرد نہیں، امر کی گفتگو اور باتوں کی طرف تھا۔ وہ شاید خود کلامی کر رہا تھا۔ یقیناً یہ امر ہی تھا۔۔۔۔۔ ماہر کا دوست بلکہ جگہری دوست، بیچ میں چودہ سال آچکے تھے پھر بھی فاطمہ نے رپورٹ پر امر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میں پہچان لیا تھا۔ تب کے اور اب کے امر میں کافی فرق تھا۔ تب وہ ایک لالہ بانی، بے فکر، ہنس مکھ، شوخ مزاج اسٹوڈنٹ تھا۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ لیکن اس وقت وہ پہلے والے امر سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بیچ میں چودہ سال آگئے تھے۔ گوکہ وہ اب بھی ہنڈسم اور بریکٹ تھا مگر اس کی پرسنالٹی سے سنجیدگی بیچ نہیں کر رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ مغرب کا پروردہ ضرور تھا لیکن آج بھی مغرب کے لیے اس کے جذبات منفی ہی تھے۔ فاطمہ کو وہ پہلے والا ہی امر لگا۔۔۔۔۔ جب وہ ماموں کے گھر کی مین روڈ پر اونچی آواز میں گوروں کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو اس وقت بھی وہ پہلے والا امر ہی لگا۔۔۔۔۔ ویسا ہی جوشیلا اور بھڑکیلا۔۔۔۔۔ اور اس کا دوست بھلا کیسا ہوگا؟ پہلے کی طرح ہی سرد، برفیلا، اجنبی۔۔۔۔۔ اس کا خیال بھٹک کر ماہر کی طرف لپکنے لگا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کر کے ذہن امر کی باتوں اور غصے کی طرف لگایا تھا پھر ایک گہری افسردہ سانس اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

"بڑی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ویٹو پاور

کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ پاور بڑی ریاست کی سربراہی سے حاصل ہو۔۔۔۔۔ دولت سے حاصل ہو یا حسن سے۔۔۔۔۔ اپنے مفاد کے لیے بڑی طاقتیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ چھوٹے ملکوں اور چھوٹے لوگوں کو پھل کر رکھ دیتی ہیں۔" فاطمہ کے جواب نے لمحے بھر کے لیے امر کو سن کر کے رکھ دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ ہولے سے کپکپا گیا۔ جیسے وہ سمجھ گیا تھا۔ فاطمہ کا اشارہ کس طرف تھا اور وہ کن بڑی طاقتوں کا ذکر کر رہی تھی۔

"وقت بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔" کافی دیر بعد امر نے جیسے تہمرہ کھپا تھا۔ فاطمہ کے لبوں پر ایک پھکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"وقت نہیں۔۔۔۔۔ بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالیں جو کبھی کبھار الٹ بھی جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور کبھی کبھار مات کرنے والوں کو شہ مات کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ تقدیر کی شہ مات ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ کسی قدر نرم اور افسردہ تھا۔ امر لمحے بھر کے لیے چپ سا ہو گیا۔

"تم بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔" اس کا انداز ذرا بے تکلف قسم کا تھا۔ تاہم وہ اس کی سنجیدگی پر چونک ضرور گیا تھا۔

"بیچ میں چودہ سال آچکے ہیں امر بھائی۔۔۔۔۔" وہ جتنا نہیں چاہتی تھی پھر جانے کیسے زبان سے پھسل گیا۔ امر بھی چپ سا کر گیا۔ اب بھلا کیا بولتا۔ جیسے سارے لفظ بے جان اور بودے ہو چکے ہوں۔

کافی دیر تک کار میں معنی خیزی خاموشی چھائی رہی۔ جسے امر نے خود ہی سمیٹ ڈالا۔

"سفر تو اچھا گزر گیا۔۔۔۔۔؟" اسے کچھ تو کہنا ہی تھا یا شاید وہ فاطمہ کے لفظوں کی کھنکھن کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک ہی گفتگو کو ایک الگ موڑ دے دیا تھا۔ شاید اسے بات بدلنے کے لیے بہترین موضوع مل گیا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔۔۔ ترکی میں جہاز کا اسٹے (وقتی قیام) تھا۔ وہیں پہ خالہ کی وفات کا پتا چلا۔۔۔۔۔ پاکستان سے کال آئی تھی۔" فاطمہ کی آواز پھر سے بھرا گئی۔ امر

کی آنکھوں میں بھی تاسف ابھرنے لگا۔۔۔۔۔ پھر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔

"وہ حور عین کی والدہ تھیں؟"

"ہاں۔۔۔۔۔" فاطمہ کے حلق تک میں ریت بھر گئی تھی۔ دریائے ہڈن کے کناروں پر بکھری سوکھی ریت اڑتی ہوئی اسے غبار آلود کر گئی تھی۔ فاطمہ کا منہ، ناک اور آنکھیں ریت کے نوکیلے ذروں سے بھر گئے تھے۔ اسے لگا حور عین کے نام کے ساتھ ذلتوں کے کئی باب اور کئی اوراق کھلتے چلے گئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتا سر تھام لیا تھا۔ امر نے اس کی بگڑتی طبیعت دیکھی اور پریشان ہو گیا۔ پھر اس نے جلدی سے پانی کی بوتل کھول کر اسے پکڑائی۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ گوکہ وہ ایک ڈاکٹر تھا پھر بھی۔۔۔۔۔

"تم ٹھیک ہو فاطمہ۔۔۔۔۔ پتہ اس نے کافی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئی تب پوچھا تھا۔

"بہتر ہوں۔" اسے یہ مشکل ہی بولنا پڑا تھا۔ پانی کی بوتلیں حلق میں اتریں تو سوکھا گلا کچھ تر ہوا تھا۔ پھر وہ ذرا سنبھل گئی تھی۔ آخر امر پر کچھ کیوں ظاہر ہونے دیتی؟ گوکہ امر اس کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھا۔۔۔۔۔ ہر اس ذلت سے جو اس نے نیویارک سے سیکھی تھی۔۔۔۔۔ ہر وہ ٹھوک اور دھوکا جو اس نے اپنوں سے کھایا تھا۔ امر سب کچھ تو جانتا تھا۔۔۔۔۔ ہر بات، ہر واقعہ، فاطمہ کی زندگی کے ایک، ایک پل سے واقف تھا۔

پھر اس نے امر کا دھیان خود سے ہٹانے کی غرض سے پوچھا۔

"ماموں اور مامی کیسے ہیں؟" اس کی نارمل آواز گاڑی میں گونجی تو امر نے سکون کی سانس لی۔ ورنہ وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پہلے اسے کسی میڈیکل اسٹیشن پر لے جائے مگر فاطمہ اب کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

"انگل اور آئی ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" امر نے نرمی سے بتایا اور پھر بیک ویو میر

سے فاطمہ کے تاثرات دیکھنے چاہے۔ وہ اس کے چہرے سے کچھ کھوجتا چاہتا تھا۔ اس نے کسی اور کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ پلو ماہر کا نہ پوچھتی پھر بھی تم از کم اسے بچوں کے بارے میں تو ضرور استفسار کرنا چاہیے تھا۔ وہ بچے جو اس کے آنے کی خبر پہ سخت دیوانے ہو رہے تھے۔ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ اتنے پرجوش تھے اور بہت دن سے اسے دیکھ بولنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

”بچے تمہارا بہت شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔“ امر نے خود ہی ڈھیوں کی طرح بتا دیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا فاطمہ بالکل بھی بچوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اسے فاطمہ کے سپاٹ تاثرات پہ عجیب سا دکھ ہوا تھا۔ کیونکہ بچوں کا خیال، ان کی خوشی، دیوانگی اور فاطمہ کی آمد کے لیے پرجوش ہونا وہ خود ملاحظہ کر چکا تھا۔

”اگر فاطمہ کے ایسے ہی کٹھور تاثرات رہے تو بچوں کا دل کس قدر ٹوٹ جائے گا۔“ امر کو آنے والے وقت سے خوف سا آیا۔

گوکہ فاطمہ پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ اس کا وہ بچپنا، لاابالیت اور بے وقوفانہ سا تاثر اب کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار اور ٹھہراؤ آچکا تھا۔ اور سب سے بڑی بات فاطمہ کو اپنے تاثرات بھی چھپانے آگئے تھے۔ گویا وقت واقعی بہت آگے تک جا چکا تھا۔ اتنا آگے کہ امر کو بھی فاطمہ سے بات کرنے کے لیے بہت دیر تک سوچنا پڑ رہا تھا۔ وہ کیسے اور کس طرح سے بچوں کا ذکر چھیڑے؟ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا جب فاطمہ نے خود ہی خاموشی کو سمیٹ ڈالا۔ شاید وہ اس معنی خیز چپ پر خود ہی اکتا گئی تھی۔

”کیا ماموں نے گھر بدل لیا.....؟“ فاطمہ نے ششے سے بار در یائے ہڈن کے بل کو دیکھا تھا۔ یہ رستہ ماموں کے گھر کو نہیں جاتا تھا تو پھر یہ لوگ کہاں جا رہے

تھے؟ اس نے بہت نیچے تک جھانک کر دیکھا تھا۔ بہت دور تک ہڈن کا پانی بکھر رہا تھا۔ بہت خوب صورت اپارٹمنٹ نمایاں لہروں پر تیرتی سفید بلطوں کے مانند لگ رہی تھیں۔ ہڈن کے نیلے پانی پر تیرتے بگے اتنے سفید تھے کہ موتیوں سا گمان ہوتا۔ بہت دور سے سفید لگنے معلوم ہوتے تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”دریا کے اس پار.....“ امر نے اپنے تئیں خاصا ہلکا پھلکا جواب دیا تھا جو فاطمہ کو قطعاً نا کافی لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نظر کے گہرے احساس کو دبا کر پوچھا۔

”یہاں کیوں آئے ہیں؟“ وہ بے چین ہو گئی تھی..... یہ امر تو وہی تھا۔ چودہ سال پہلے والا..... بے ڈھنگا، بھیجوبو کہیں، جاتا کہیں تھا..... لینے کسی کو آتا اور لے کسی اور کو جاتا تھا۔

”ہم کہاں آگئے ہیں؟“ ایک جگہ گاڑی رکتے دیکھ کر اس نے پھر پوچھا.....

”ہمیں یہاں لے کر آنا ہے پھر گھر کی طرف نکلنا ہے۔“ امر نے بالآخر لمبا چوڑا پروگرام بتا دیا تھا۔ فاطمہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”تو کیا اب بھی ماما، فاطمہ کے لیے ایک وقت کھانا بنانے کا تردد نہیں کر سکتی تھیں؟“ وہ عجیب انداز میں سوچتی رہ گئی تھی..... گوکہ اسے ماما سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا نرمابٹ کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی دل کو دھکا سا لگا۔ واقعی کچھ لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ ماما بھی ویسی ہی تھیں مغرور، نخربلی اور فاطمہ کو کم تر سمجھنے والی۔ اسے کوئی ایسی خوش فہمی تو نہیں تھی اور نہ ہی یہ امید تھی کہ ماما اس کا پرجوش قسم کا استقبال کریں گی پھر بھی دل عجیب انداز میں بکرا گیا تھا۔ اسے ان سنان، رخ اور اجڑے دنوں کا خیال آیا تھا جو اس نے ماما کی ہمراہی میں گزارے تھے اور جو اس نے ماموں کے عقوبت خانے میں بتائے تھے۔ وہ دن شاید فاطمہ عمر بھر نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ مہینے، وہ سال کیسے جڑا دیتے تھے۔ وہ وقت کتنا درد ناک تھا..... گزرتا ہی نہیں تھا..... رینگ،

ریگ کے چلتا تھا۔

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔ پلکیں پونٹوں سے جڑیں تو دو آنسو خود بخود ٹوٹ کر گالوں پر پھسل گئے تھے۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کو یاد نہ کرنے کا عہد کر کے آئی تھی۔ مگر یادیں تو..... ایسے ہی بد عہد ہوتی ہیں تب اچانک امر نے اسے مخاطب کر لیا تھا۔

”تم نے میرے بارے میں پوچھا نہیں..... میں کیا کرتا ہوں؟ شادی کی یا نہیں؟ یعنی تمہاری نگاہ میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔“ امر کا انداز قدرے خشکی لیے ہوئے تھا۔ فاطمہ کو چونک کر سنبھلنا پڑا تھا۔ پھر وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔

”میں یہی سوچ رہی تھی۔“ اس نے گڑ بڑا کر کہا۔ امر نے بیک ویو مرر سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”جھوٹ تمہیں بولنا نہیں آتا۔“ امر کا انداز جتانے والا تھا۔ فاطمہ چپ سی رہ گئی تھی۔

”تو اب بتا دیں..... کیا کرتے ہیں آپ.....؟“ فاطمہ نے ملائمت سے پوچھا۔ وہ واقعی امر سے یہی سوال کرنا چاہتی تھی..... لیکن ماضی کی تلخ یادوں میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

”کچھ زیادہ نہیں..... بچے پالتا ہوں..... تمہارے بچے۔“ امر کا انداز صاف جتانے والا تھا۔

فاطمہ کو لکھ لگا اور وہ زلزلوں کی زد میں آگئی تھی۔ اس کے دماغ کو چکر پھیریاں لگ گئی تھیں۔ ہر چیز جیسے گول، گول گھومتی جا رہی تھی۔ اس کے دل کو بھی پتکے لگ گئے تھے۔ جیسے صفیہ ہستی پر بھونچال آ گیا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہر طرف ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”تمہارے بچے.....“

فاطمہ کو لگا وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی ٹانگوں پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپانے لگی تھی اور وہ کپکپاتی جا رہی تھی، تھر تھراتی

جا رہی تھی۔ اس پر قیامت آ رہی تھی۔

”ڈیڑھ سال ہو چکا ہے حور عین کو گئے ہوئے۔“ بچے اس سے بہت اٹک تھے۔ وہ ٹوٹ سے گئے۔ ان کو سنبھلنے میں اور کچھ نئی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بہت وقت لگا تھا۔ پھر جب وہ سنبھل گئے تو تمہیں.....“ امر مزید بھی بتا رہا تھا۔ شاید اس کا مائنڈ میک اپ کر رہا تھا۔ نئی حقیقتوں سے مراد شاید بچوں کو فاطمہ کے متعلق بتانا تھا۔ اور جب بچوں کو پتا چل گیا تو پھر کیا ہوا ہوگا؟ ان کا رد عمل کیا تھا؟ اپنے باپ کی طرح ہی ظالمانہ، خود غرضانہ اور کٹھور.....

فاطمہ کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں متزلزل تھیں۔ جیسے کہیں جہلمکہ مچا ہو..... جیسے کہیں قیامت پیا ہو۔ وہ دل جو چودہ سال سے تھپک، تھپک کر صبر کی لوریوں سے بہل رہا تھا اچانک ہی جنونی ہو گیا۔ بے قابو سا ہو گیا..... بے چین و بے قرار سا ہو گیا۔

وہ انہیں دیکھنے کے لیے چل گئی، بلکہ اٹھی..... مضطرب ہو گئی۔ وہ جو لہو کی طرح جسم کے ریشے، ریشے میں رگ، رگ میں دوڑ رہے تھے۔ وہ کہاں تھے؟ وہ کس شہر میں تھے؟ کس نگر میں تھے؟ وہ انہیں کہاں، کہاں تلاشتی؟ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔

فاطمہ کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہے۔ گریہ کرے..... بین کرے..... ماتم کرے..... اسے لگا وہ زمانوں سے نہیں آج ہی جدا ہوئے ہیں بلکہ ابھی جدا ہوئے ہیں۔

امر نے مرر سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ فاطمہ کے رخسار نمکین پانیوں سے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے اندر ماتم کی صف پیا تھی۔ شاید صبر کی طنائیں ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ بلند آواز میں چیخنے لگی۔ وہ اپنے بالوں کو نوپنے لگی۔ رخساروں کو سیننے لگی۔ اس کے سارے اختیارات کی حدیں آج ٹوٹ گئی تھیں۔

امر بے بسی سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

بابا جان ہم ادھورے ہیں بہت

زندگی ایک بے اعتبار شے ہے کسی کو خبر نہیں آنے والا وقت ہمارے لیے خوشیوں کی نوید لا رہا ہے یا غموں کا طوفانی ریلہ..... اپنوں کے بچھڑ جانے کا دکھ صرف چند لمحوں کا رونا نہیں یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ خوشیوں کا موقع ہو یا غموں کے لمحات اپنے بچھڑے ہوئے بہت یاد آتے ہیں۔

12 اپریل ایک قیامت منفری کا منظر، آسمان کیسا کیسا عجیب رنگ دکھاتا ہے یا زمین کیسے دلتی ہے اس دن سمجھ آئی۔ اچانک بالکل اچانک میرے بابا ہم سے بچھڑ گئے۔ جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں مگر اچھے لوگ کبھی بھلائے نہیں جاتے۔ میرے بابا تھے بھی ایسے ناقابل فراموش..... ہر اپنے پرانے کے مددگار اور سہارا، با اخلاق، نڈر، بے باک اور بے خوف، تن تھا اپنے حاسدوں اور دشمنوں کے سامنے سینہ سپر کرنے والے۔ ہمیشہ ہمیں حق بات کہنے کی نصیحت کرنے والے۔ آج ہم بہن بھائی جس مقام پر ہیں وہ والدین کی ہی دعائیں اور رحمت ہیں۔ ہم بیٹیوں کو کبھی بابا نے بیٹوں سے کم نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ فوقیت دی۔ امی سے اکثر باتیں چھپا جاتی تھیں ہم نہیں مگر بابا کو اپنی جگہ صورت حال سے آگاہ کر دیتے تھے ہم بیٹیوں کو جو مان، اعتبار بابا نے دیا میری دعا ہے کہ وہ مان اعتبار محبت ہم سدا قائم رکھ سکیں۔ میگزین میں میرا لکھا ہوا جب بھی پیش ہوتا خوشی و مسرت سے ان کا چہرہ دکھ جاتا تھا میرا نام پڑھ کر..... ہر ماہ باقاعدگی سے میرے خطوط ارسال کرتے۔ مجھے خود میگزین لا کر دیتے۔ ہمارا معاشرہ وہ معاشرہ جہاں ڈائجسٹوں کو پڑھنا حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جہاں بیٹیاں پڑھی لکھی ہونا فضول خیال کیا جاتا ہے ایسے معاشرے کا مقابلہ کرنے والے میرے بابا اپنی ذات میں منفرد ایسے ہی منفرد تھے اپنی تمام فیملی سے یکسر مختلف اور جیسا ہم اولاد کو چاہا امی کی تربیت خاص کی وجہ سے ہم بھی ویسے ہی سامنے آئے میری کتاب اٹالیڈزیت کی اشاعت کے سلسلے میں بابا نے مجھے بہت سپورٹ کیا تھا اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔

ہر اک کو خوشی سے بطور تحفہ دیتے کہ یہ میری بیٹی نے لکھی ہے اور ہر اک حیران کہ ایسے معاشرے میں اتنی کم عمری میں اتنی پختہ شاعری کیسے ممکن.....

بابا جان ہمارے درمیان نہ ہو کر بھی ہمیشہ حیات رہیں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے بابا کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور دعا کریں اللہ پاک ہم اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

طلبکار دعا سہ ماہی ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

بھی ہو جاتا..... مامی اور ان کے بیٹے کی دی گئی ذلت کو اتنی آسانی کے ساتھ بھلا دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ کیسے بھول جاتی، دن رات کی اس اذیت کو ماہر کے تلخ روئے کو، حقارت کو مامی کی بیزارگی کو اور اس آخری رسوائی کو..... کیا وہ سب کچھ بھلا دینا واقعی آسان تھا۔

ماموں سے تڑپ، تڑپ کر روتے دیکھ کر پشیمان اور آزرده ہو رہے تھے۔

”میری بیٹی! مجھے معاف کر دو..... میں تمہارا کوئی حق ادا نہیں کر سکا.....“ وہ اس کا سر تھکتے بہت غم زدہ تھے۔ فاطمہ کو سنبھلانا ہی پڑا۔ آخر اس کی خرابی قسمت میں ماموں کا کیا دوش تھا..... وہ تو اپنا فرض حتی المقدور نبھاتے ہی رہے تھے جہاں تک ممکن ہوا، فاطمہ سے رابطہ رکھا..... تعلق نبھایا..... اسے تسلی دلا سا دیتے رہے..... ماموں بس اتنا ہی تو کر سکتے تھے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا..... میں زندگی میں..... بچاگئی ہوش و حواس کے ساتھ عون اور محمد کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا.....“ وہ اپنے بیٹوں کو خود میں بھینچ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ فاطمہ نے اتنے سال اسی نفرت میں گزارے کہ یہ دونوں اپنے باپ کی طرح ہوں گے۔ ویسے ہی سنگ دل، کٹھور، خود غرض پھر وہ کیوں خود سے اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ کرتی..... ان سے ملتی..... وہ اس گمان میں رہی کہ خود غرض باپ کے بیٹے بھی خود غرض ہوں گے۔

لیکن فاطمہ کا یہ گمان غلط ثابت ہو گیا تھا..... وہ ناک نقشے میں اپنے باپ جیسے ضرور تھے مگر عادتوں، مزاج اور طبیعت میں فاطمہ کا دوسرا عکس..... پھر بہت دیر بعد امر نے ملن کے طویل ہوتے پروگرام کو دیکھ کر فاطمہ سے کہا۔

”فاطمہ! ان سے طویہ حتمہ ہیں..... عون اور محمد کی بہن.....“ امر کے احساس دلانے پر فاطمہ نے گردن موڑ کر کراسنگ ایریا کے انٹرس پر ابھی تک کھڑی اس

اور پھر نیویارک شہر میں اس روز کا چمکتا سورج ڈھل گیا تھا۔ ریچتی ہوئی رات آئی اور ہر چیز پر چھا گئی۔ یہ بچپن دسمبر کی تاریخ تھی کرس کی رات چمکتی روشنیوں نے پورے نیویارک کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ پورا شہر جگمگا رہا تھا۔ پورا شہر گویا جگنوؤں سے بھرا تھا۔ پورا نیویارک دلہن کی طرح سج رہا تھا۔ شاید گوروں کے لیے کرس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہو۔ فاطمہ کے لیے تو عید سے بھی اوپر جہانوں کی خوشیاں بے دریغ آسمانوں سے برس رہی تھیں۔

وہ رات جو شب بارات سے کم نہیں تھی..... وہ رات جو ملن کی رات تھی۔ اس رات فاطمہ کی ہلکتی ممتا کو قرار آ گیا تھا۔ اس رات فاطمہ کی بے سکون زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اس نے ان دو لڑکوں کو دیکھا..... جو اس کے شانوں سے کچھ نیچے تھے۔ پھر بھی اپنی عمر سے بڑے قد..... اونچی اٹھان صحت مند سراپا لیے ذہین آنکھیں۔ فاطمہ کے دل میں ممتا کی ایسی لہریں اٹھیں جو چودہ سال کے ہر دکھ، ہر اذیت ہر جدائی کو بہا کر لے گئیں۔ یاد رہا تو بس اتنا..... ان دو لڑکوں کے وجود میں فاطمہ کے لیے امان ہے سکون ہے، سرور ہے، خوشی ہے، عمر بھر کا قرار ہے۔

وہ عون اور محمد کو آنکھوں میں بسا، بسا کر نہیں تھک رہی تھی۔ وہ بھی ایسے بلک، بلک کر ملے کہ عمر بھر کی ساری وحشتوں کا ازالہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے خوب صورت وجود میں گم ہو کر وہ ماموں، مامی کو یکسر نظر انداز کر چکی تھی۔ امر کے بتانے بلکہ جتلانے پر اسے احساس ہوا تھا سو قدرے سنجیدگی سے ماموں اور مامی کو سلام کیا..... گو کہ اس کا انداز کافی روکھا تھا پھر بھی مامی کا جوش کم نہیں ہوا..... وہ بڑی محبت جتلاتے جوش سے فاطمہ سے بھینچ، بھینچ کر ملی تھیں۔ جیسے مامی کے ساتھ فاطمہ کے بڑے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ اپنے بیٹے کی ہر زیادتی کا اسے فون کر کر کے اور احوال پوچھ پوچھ کے ازالہ کیا تھا۔

فاطمہ کے دل میں انی سی اتر آئی تھی۔ چاہے کچھ

فاطمہ رو، رو کر ٹڈھال ہو گئی۔ چلا چلا کر اس کا حلق خشک ہو گیا۔ چیخ، چیخ کر وہ تھک چکی تھی۔ برسوں سے بہتے آنسوؤں کی ندیاں بھی سوکھنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھیں سوچ کر پھول گئیں۔ کچن کے پھل کی طرح لال ہو گئیں۔ وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ فاطمہ کا دکھا ہوا زخمی دل چیر کر دیکھ پاتا۔

وہاں لہو ہی لہو تھا، زخم ہی زخم تھے۔ ”اور انہیں اتنے سالوں بعد پتا چلا کہ حور عین کون تھی؟ اور تم کون؟ گو کہ بچوں کے معصوم ذہنوں کو الجھانا غیر مناسب تھا پھر بھی ہمیں بتانا تو تھا ہی..... میں نے انہیں سب کچھ بتایا..... اس انداز میں کہ بچوں کی نفسیات کسی بھی موڑ پر نہ الجھے..... ان کے لیے حور عین بھی ڈریم لینڈ کی فیری تھی اور تم بھی..... ڈریم لینڈ کی ایک فیری چلی گئی اور دوسری فیری آگئی..... یعنی تم..... اگر تم واپس پلٹ کر آئی ہو تو یقیناً بہت کچھ درگزر کرو گی..... اپنے لیے نہ سہی، ماہر اور انکل، آنٹی کے لیے سہی..... عون اور محمد کے لیے..... وہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ فلوریڈا کی پرسیز پاکستان سے واپس لوٹ آئی ہے، ہم سب کے لیے..... جو تمہارے اپنے ہیں۔“ امر کی آواز کسی آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ رہی تھی۔ اس بیٹھے لہجے میں آس بول رہی تھی۔ امید چمک رہی تھی۔ وہ یقین تھا جو ٹوٹنے لگتا بھی تو جڑ جاتا۔

اور امر کو واقعی ایسا ہی یقین کامل تھا۔ وہ عون اور محمد کی ماں تھی..... اور مامیں کٹھور دل نہیں ہوتیں۔ مامیں کبھی بچوں سے انتقام نہیں لیتیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو آزماتی ہیں۔

اور وہ فاطمہ احسن..... ماہر ارباب کی بیوی نہیں..... عون و محمد کی ماں بن کر واپس آ رہی تھی کیونکہ فاطمہ احسن صرف عون اور محمد کی ماں تھی..... صرف عون اور محمد کی۔

☆☆☆

ماموں تو پہلے بھی مداخلت نہیں کرتے تھے.....
ہاں ماما اور ماہر تو تھے ناں..... جو اس کے لیے سراپا
جلاد تھے۔ وہی ماہر اسے دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بولنا
ہی بھول گیا۔ شاید اس کے گمان میں تھا۔ فاطمہ مزکر
آئے گی ہی نہیں..... اور شاید فاطمہ کبھی نہ آتی۔ عمر بھر
کے لیے اس پر لعنت بھیج دیتی۔

اگر وہ صرف ماہر کی بیوی ہوتی تو کبھی بھی اس گھر
پر تھوکتی بھی نہیں۔ فاطمہ کو لوٹنا تو اس لیے بڑا تھا کہ وہ
اپنے بیٹوں سے مزید جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے رستوں میں عون اور محمد کھڑے تھے۔ وہ
کس، کس موڑ پر انہیں نظر انداز کرتی؟ وہ کس، کس موڑ
پر انہیں دیکھ کر منہ موڑ لیتی؟ یہ کام ایک سنگ دل باپ تو
کر سکتا ہے مگر ایک مرث جانے والی ماں نہیں کر سکتی۔

اور آج پورے دس سال بعد وہ پھر ماہر کی راج
دہانی میں موجود تھی..... اور پورے اعتماد اور استحقاق
کے ساتھ تھی کیونکہ پہلے اور اب کے وقت میں، سورج
اور چاند جتنا فرق تھا..... دھوپ اور بادلوں جتنا فرق
تھا۔ رات اور دن جتنا فرق تھا۔

حتیٰ کہ ماما بھی اس کے کسی کام میں مداخلت
نہیں کرتی تھیں۔ وہ جو مرضی کرتی جیسی مرضی کو کنگ
کرتی، ناپسندیدگی یا تنقید کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا
اور ماہر بھی خاموش ہی رہتا۔

فاطمہ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب ایک صبح اس نے
ناشتے کی میز سجا کر ماما اور ماہر کو آواز دی تھی۔ وہ
شادی کی پانچویں صبح تھی۔ کو کنگ میں اس کا پہلا تجربہ
تھا۔ وہ بہت محنت و خلوص سے ناشتا بنا رہی تھی۔

گو کہ اسے یہ سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ ماہر کے دل کا
رستہ نہ معدے سے ہو کر آتا ہے اور نہ ہی کسی اور سمت
سے..... وہ بس بڑی لگن سے ناشتا بنا رہی تھی۔ بالکل
اپنی ماں کی طرح..... اس کی ماں بھی پاپا کے لیے اتنی
ہی لگن سے ناشتا بناتی تھیں لیکن پاپا کا رویہ می سے بڑا
ہتک آمیز ہوتا تھا۔ وہ کھانے کی پوری ٹرے کو جب دل
چاہتا الٹ دیتے تھے۔ فلور ٹرے میں اس کی می کے گھر

انسان ہار جانے کی ذلت بھول جاتا ہے مگر ٹھکرائے
جانے کی ذلت بھلا نہیں پاتا۔

پھر فاطمہ کے تو دہرے نقصان ہوئے تھے.....
وہ ڈہری اذیتوں میں مبتلا تھی..... اس کا گھر تو ٹوٹا ہی
تھا، بچے بھی چھوٹ گئے..... اپنا وطن، جگہ اور جائے
پیدائش تک چھوڑنا پڑی۔

وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ وطن سے بے وطن
ہو گئی تھی۔ اس کے سارے رشتے دار اور تعلق ختم ہو گئے
تھے یہاں تک کہ بچے بھی چھڑ گئے تھے۔

تب خالہ تڑپ کر راتوں کو روتی ہوئی فاطمہ کو
ایک چیز سمجھاتی تھیں۔

”یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں
ہوتی..... جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے یا
کھو جائے..... صبر وہاں کام آتا ہے۔“ خالہ جب تک
زندہ رہیں اسے صبر کے سبق ہی پڑھاتی رہی تھیں۔ اور

صبر تھا کہ آتا ہی نہیں تھا..... بہت سال وہ صبر کرنے کی
کوشش میں لگی رہی۔ صبر کی رمزیں سیکھتی، صبر کا
قرینہ سیکھتی..... پھر بھی صبر سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر جب
بہت سا وقت گزر گیا..... ماہ و سال کا شمار کرنا ترک کیا۔

رستے زخموں پر پھا ہے رکھے تو صبر کی پہیلی خود بخود سمجھ
میں آگئی۔ اس نے صبر کو بچھونا بھی بنایا اور اوڑھ بھی
لیا..... سوزندگی کے دن ویران ہی سہی مگر گزرتے چلے
گئے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وقت اتنا آگے نکل گیا۔

زندگی کے اتنے سال چپکے سے نکل گئے..... وہ
پوروں پر حساب رکھتی تو اس کی شادی کو قریب چودہ
سال ہو چکے تھے اور علیحدگی کو دس سال.....

وہ پورے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماموں
کے اسی کالج میں گھوم رہی تھی۔ جس کے چپے، چپے پر
پر اذیت یادیں بکھری تھیں۔ فاطمہ کے آنسو بکھرے
تھے۔ اس کی آہیں بکھری تھیں۔

یہ ماموں کا وہی کالج تھا جو اس کے لیے برزخ کے
سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اسی کالج میں فاطمہ پورے استحقاق
سے گھومتی تھی اور کوئی اسے ٹوکنے والا نہیں ہوتا تھا۔

بعد میں اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

”وکیلیم ان ڈریم لینڈ ماما۔“ اس، عون اور محمد تالی
بجا کر اس کی پزیرائی کرنے کی کوشش میں اسی کے انداز
میں کورٹش بجالائے تھے۔ پھر امر کی بیوی آمنہ نے
اسے گلابوں کا بو کے دیا۔

اگر دیکھا جاتا تو ایسا استقبال بہنوں کا ہی ہوتا
ہے اور فاطمہ کا تو دلہن بن کر بھی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ
فلوریڈا سے دلہن بن کر ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس
وقت کو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ حور عین کی بیٹی حسنہ کو دیکھ کر اس قدر شاکڈ تھی
کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو سہلا بھی نہیں سکی۔
ویسے بھی حسنہ کی طرف اس کا ہاتھ بڑھ ہی نہیں سکا تھا۔

اس کا ظرف اور دل تنگ پڑ گیا..... وہ حسنہ کی پزیرائی
نہیں کر سکی۔ کیونکہ وہ حسنہ کی پزیرائی کرنا ہی نہیں چاہتی
تھی پھر فاطمہ نے پورا رستہ دیکھا ہی نہیں اس ننھی بچی کا
چہرہ بچھ گیا تھا۔ اور اس کی چمکتی آنکھوں میں اندھیرا اتر
آیا تھا۔ پیر لگشری کیمری میں موجود کسی بھی فرد نے

دھیان نہیں دیا تھا۔ حور عین کی بیٹی سب سے نظر بچا کر
چپکے، چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

”اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے
کی ضرورت نہیں..... کیونکہ جو سب کچھ کھودیتا ہے اس
کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔“

خالہ نے ایک مرتبہ فاطمہ کو بڑے جذب کے
ساتھ سمجھایا تھا۔ اس وقت فاطمہ کو خالہ کی یہ بات سمجھ
میں نہیں آئی تھی۔ دراصل وہ وقت انتہائی مایوس کن
تھا..... فاطمہ کو کوئی روزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی
رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خود کو ایک بندگی میں کھڑا پاتی

تھی۔ جہاں پہ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی دروازہ..... نہ
روشنی تھی نہ ہوا..... وہ سب کچھ لٹا کر آئی تھی..... وہ اپنا
قیمتی سرمایہ ہار کر آئی تھی۔ اس کا صدمہ، اس کا غم کوئی
معمولی نہیں تھا۔ زندگی میں ہار جانا اتنا اذیت ناک

نہیں ہوتا، جس قدر ٹھکرایا جانا درد ناک ہوتا ہے۔

دس سالہ بچی کی طرف دیکھا تھا جو ہنوز پر شوق نگاہوں
سے فاطمہ کی طرف دیکھتی سرخ گلابوں کی ٹوکری
اٹھائے کھڑی تھی۔

اس نے سرخ فراک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں
سرخ ربن لگا رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سرخ گلاب پکڑ
رکھے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں آس چمک رہی
تھی۔ جیسے فاطمہ خود چل کر اس کے پاس آئے گی۔

جیسے فاطمہ عون اور محمد کی طرح اسے خود سے لپٹالے
گی..... اسے بہت پیار کرے گی۔
وہ آنکھوں میں ستاروں کی چمک لیے اسے ہی
دیکھ رہی تھی..... وہ چھوٹی سی بچی نہیں..... ”حور عین“

کھڑی تھی۔ اتنی ہی حسین، مہکتی، خوب صورت کہ نگاہ
ٹھہرتی اور جم جاتی..... پھر ہنسی ہی نہیں..... فاطمہ کو جیسے
سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے قدم ہڈن پارک کے اس
تین منزلہ ریسٹورنٹ کے فرش نے پکڑ لیے تھے۔ وہ

اپنی جگہ پر جیسے جم گئی تھی۔ اس کی سانس تک رک گئی
تھی۔ رگوں میں گردش کرنا لہو جیسے جم گیا تھا۔
پھر یوں لگا جیسے درود یوار گھوم رہے ہیں۔ جیسے
زمان و مکان بھول رہے ہیں۔ فاطمہ کی آنکھوں کے

سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چکر اکر
گر پڑتی۔ معاوہ بچی چلتی ہوئی فاطمہ کے قریب آئی۔
اس کی چال میں شہزادیوں کی سی نزاکت تھی، اس کی
آنکھوں میں معصومیت تھی، دل کشی تھی، وہ حور عین کی

حسنہ تھی..... حور عین جیسی نازک، حسین، دل فریب، ویسی
ہی نزاکتوں والی..... فاطمہ کو دوسرا جھٹکا تب لگا تھا جب
بچی نے پھولوں کی ٹوکری اس کے پیروں میں رکھی تھی۔
پھر دوسرے ہی لمحے وہ فاطمہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

ایسا دلہانہ انداز تھا کہ فاطمہ کا دل بیٹھ گیا۔
حور عین کی بیٹی کا یہ دلہانہ انداز اس کے دماغ
کی چولیس ہلا گیا تھا۔ اس کے سر پر ریسٹورنٹ کی چھت
آن گری..... وہ ننھی بچی نہیں کسی ماہر رقاصہ کی طرح

گول، گول گھوم کر گیت بنا رہی تھی۔
پھر وہ گیت کے اختتام پر کورٹش بجالائی..... اور

جیسا کوئی گھر نہیں ہوگا۔ اور اس کی می جیسی بھی کوئی می نہیں ہوں گی۔ فاطمہ کی می نے کبھی شوہر کی مار پیٹ اور بد تیزی پر مشتعل ہو کر پولیس نہیں بلوائی تھی۔ کم از کم فاطمہ نے اپنے ہوش میں کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔

اس طرح پاپا کے جیسا کوئی بد تیز شوہر فاطمہ نے پورے فلوریڈا میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی پوری دنیا میں صرف پاپا جیسا ایک ہی مرد ہے..... انتہائی ال میزڈ..... اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے پاپا سے بڑھ کر بھی ایک مرد موجود ہے، جو ان سے بد تہذیبی میں چار ہاتھ آگے تھا۔ پاپا غصے میں پوری ٹرے الٹ دیتے تھے اور ماہر غصے میں پوری میز الٹ دیا کرتا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ فاطمہ کو شادی کے پانچویں روز ہوا تھا۔ جب ماہر کو ناشتا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک، ایک چیز کو سونگھا اور میز الٹ دی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ فاطمہ ہم کر چیخ پڑی تھی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ پھر بھی ماہر کو رحم نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے بیس منٹ تک چلا رہا تھا۔ پھر اپنے میڈیکل اسکول چلا گیا۔

ماہی آرام سے تماشا دیکھتی رہی تھی۔ انہوں نے ماہر کو ٹوکا ہی نہیں تھا۔ الٹا ماہر کے جاتے ہی پرس پڑیں۔

”کیا اتنا بد ذائقہ کھانا پکاتی ہو؟ کبھی ماہر نے میز الٹ دی۔ تمہاری وجہ سے اتنا نقصان ہوا ہے۔ میز کا شیشہ بھی ٹوٹا اور برتن بھی..... تمہاری سزا ہے تم گھر کا سارا کام کروگی، ڈرائیو دے سے برف بھی ہٹاؤ گی۔“ یہ ماہی نے محض ٹریڈ دکھایا تھا۔ پھر پوری فلم تو ہی مون سے پہلے ہی چل پڑی تھی۔ ماہی کے خرابے ماہر کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ وہ پٹیس، گلاس، چمچے اٹھا، اٹھا کر نیچے پھینکتا تھا۔ غصے میں چلاتا، گالیاں دیتا اور دہاڑتا رہتا تھا۔

پھر فاطمہ کو کچھ ہی عرصے بعد پتا چلا کہ ماہر کو اس کے ہاتھ کا کچھ بھی پسند نہیں تھا بلکہ سرے سے فاطمہ ہی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے بھوتی، کالی، بھدی اور نہ جانے کیا، کیا کہتا تھا۔

سوچوں کا طویل سلسلہ اسے پھر سے بھنکا رہا تھا۔ معادہ عون کی آواز پر حال کی دنیا میں لوٹی تھی۔

اس وقت سب فاطمہ کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ پہلے جیسا ہی تھا۔ شاید ان سب کے ٹیسٹ بدل گئے تھے۔ اس کے بچے تو بہت رغبت سے کھانا کھا ہی رہے تھے ماہی اور ماہر بھی خاموشی سے کھاتے رہے..... بغیر ناک چڑھائے..... ماتھے پر شکن لائے بغیر.....

”شاید حور عین نے ماہر اور ماہی کی عادتیں بدل دی تھیں۔“ اس نے می کے ساتھ سوچا پھر خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

اسے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماہر کی سلطنت میں آئے ہوئے آج آنکھوں دن تھا۔ وہ بہت جلدی اپنے بچوں کی پسندنا پسند کو جان گئی تھی۔ وہ کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے؟ فاطمہ کو چند دنوں میں ازبر ہو چکا تھا۔ وہ بڑی لگن، محنت اور چاہت سے کوکنگ کرتی رہی تھی۔ خالہ نے اسے پاکستانی کھانوں میں بھی طاق کر دیا تھا۔ گوکہ وہ اب بھی بہت لذیذ کھانا نہیں بناتی تھی پھر بھی اس کے بچے بے انتہا تعریف کرتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی سہ پہر تھی۔

وہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی..... اس نے کرلیوں کے ساتھ سبزی کا رائس بنا لیا تھا۔ اور سویتھ میں اپیل پائی..... عون اور محمد پاکستانی نوڈ کے زیادہ شوقین تھے۔

جب اس نے رات تک کھانا بنا لیا..... تب میز بھی سجادی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا تھا، بچے ماہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ خاص طور پر حور عین کی حمنہ..... وہ تو پانی تک نہیں پیتی تھی۔ فاطمہ کو حیرانی ہوتی..... اپنی ماں والے سارے گرا سے ازبر تھے۔ ساری اداؤں اور چالاکیوں سے واقف تھی۔ باپ کو کس، کس طرح خود تک محدود رکھنا ہے اپنی طرف متوجہ یا مصروف رکھنا ہے۔ وہ اتنی سی باشت بھر کی لڑکی کو دیکھ، دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔

جب اس نے ڈنر سروس کیا..... تب کرلیوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ماہر کے چہرے پر استعجاب اترتا تھا اسی طرح حمنہ کے تاثرات میں بھی ناپسندیدگی نظر آتی۔

جبکہ عون اور محمد کے ساتھ ماہی بھی بے نیازی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ گویا انہیں کھانے پر اعتراض نہیں تھا۔ پھر ماہر اور حمنہ کے تاثرات ایسے کیوں تھے؟ فاطمہ کو اندر ہی اندر کھد بدی ہوئی..... لیکن وہ ماہر کے سامنے اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بنی کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ کر ماہر سے رہا نہیں گیا..... اور شاید اس کی آمد کے پچیسویں دن ماہر نے خود فاطمہ کو مخاطب کیا تھا وہ بھی اپنی نخر کی بنی کے لیے..... فاطمہ کے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔

”اس کو چیز آلیٹ بنا دو.....“ ماہر نے حمنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... وہ مخاطب فاطمہ سے تھا مگر دیکھ حمنہ کی طرف رہا تھا۔ حمنہ بھوکی رہے..... یہ اسے گوارا کہاں تھا..... کیونکہ وہ جانتا تھا حمنہ نان و بیجیرین ہے۔ اسے سبزیاں پسند نہیں تھیں جبکہ ماہر دیکھتا تھا لیچ یا ڈنر میں سبزی ضرور ہوتی تھی..... اور اس کے ساتھ ہی کوئی اضافی آئٹم نہیں ہوتا تھا۔ حمنہ بنا ناپسندیدگی دکھائے چپ چاپ کھانا کھا لیتی تھی..... یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ وہ کوئی نخرہ یا اعتراض نہیں کرتی تھی لیکن حمنہ خود پر جبر کرے؟ یہ ماہر کی برداشت سے باہر تھا۔

اسنے دن ہو چکے تھے..... وہ خود سب دیکھ رہا تھا فاطمہ، عون اور محمد سے میز پوچھتی تھی۔ ان کی پسند کا کھانا بناتی تھی مگر حمنہ سے کچھ بھی پوچھنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی حمنہ نے حنکی دکھائی تھی۔ نہ باپ سے شکایت کی..... وہ ایسی ہی فرمانبردار بیٹی تھی۔ وہ بہت امن پسند بیٹی تھی۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتی..... اسے پتا تھا وہ باپ سے شکایت کرے گی تو گھر میں لڑائی ہوگی۔

جب ماہی، عون اور محمد اٹھ کر چلے گئے تب ایک مرتبہ ماہر نے فاطمہ سے کہا۔

”حمنہ کو کچھ بنا دو..... وہ بھوکی رہے گی..... کھانا نہیں کھا رہی..... اسے سبزی پسند نہیں آتی۔“ ماہر کی

آواز سن کر ایک مرتبہ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ حمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ فاطمہ کو پوری ایکٹرنگ رہی تھی۔

وہ غائب دماغی سے ماہر کو دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہ رہی ہو..... ماہر اندر ہی اندر رنج سا ہونے لگا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

”حور عین نان و بیجیرین ہے، مجھے پتا نہیں تھا..... نہ اس نے کبھی بتایا۔“ فاطمہ نے خاصی سنجیدگی دکھائی۔ ماہر پانی پیتے، پیتے چونک گیا۔

”حور عین؟“ اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا تھا۔ پھر اس نے حمنہ کی طرف دیکھ کر جتلیا۔

”حور عین نہیں، حمنہ..... اس کا نام حمنہ ہے۔“

”اچھا..... میرے ذہن سے نکل گیا.....“ فاطمہ نے غائب دماغی سے سر جھٹک دیا تھا۔ ماہر کے ہونٹوں پر طنز پھسل پڑا۔

”تمہارے حواسوں پر حور عین ہی سوار ہے۔ اور ہمیشہ سے سوار ہے۔“

”اور آپ کے؟“ اس کا سوال بڑا کرار قسم کا تھا کچن کی طرف بڑھتا ماہر لمبے بھر کے لیے رک گیا۔

”ظاہر ہے میرے بھی۔“ وہ کچھ اور جواب دینا چاہتا تھا مگر بات بدل گیا۔ اچھا تھا کھلتی رہتی۔ اتنا نخرہ دکھا رہی تھی حد نہیں..... ایک آلیٹ بنانا تھا یا ہڈن میں تیرنا تھا..... حد تھی اور واقعی حد تھی..... وہ غصے میں فراننگ پین میں آئل ڈالنے لگا۔

اور فاطمہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ تو وہ آج تک اور ابھی تک حور عین کا ہی اسیر تھا۔

اسی کا عاشق، اسی کے عشق میں گرفتار..... فاطمہ کے اندر الاڈ بھڑکنے لگا تھا، شعلے پھیلنے لگے تھے اور حور عین آج بھی ان کے درمیان تن کے کھڑی تھی۔ کسی پہاڑ کے مانند جسے عبور کرنا کم از کم فاطمہ کے بس کا کمال نہیں تھا۔ اس کے پورے وجود پہ تھکن اتر آئی۔

افسردگی اتر آئی۔ رنجیدگی اتر آئی۔ دل چاہ رہا تھا۔ واپس کسی اندھے رستے کی طرف مڑے اور کھائی میں

191 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY.COM

PAKSOCIETY1

جاگرے یا کسی دریا میں کود جائے۔ جہاں نہ ماہر ہو اور نہ ماہر کی حور عین.....
یہ دونوں فاطمہ کی زندگی کے ناسور تھے۔ عذاب تھے، زخم تھے، نا آسودگی کا برزخ تھے۔ وہ جانے کب تک برف کے مانند جمی رہتی۔ معائنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”ماما! ڈیڈی کو چیز آلیٹ نہیں بنانا آتا..... وہ کنفیوزڈ ہیں۔“ حمنہ نے بھیگی نمناک آواز میں کہا تھا۔ جسے باپ کی مشکل پر وہ سخت بے چین تھی۔ فاطمہ اچھی بھلی ششدر رہ گئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کا انداز انتہائی شائستہ تھا وہ اتنی سی بچی کی حیات پر سخت متعجب تھی۔

فاطمہ نے چونک کر اوپن بکن میں دیکھا..... فرانگ بین جل، جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ماہر جانے کون سا مسئلہ حل کرنے کے لیے سوچوں میں مستغرق تھا۔

فاطمہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر حمنہ کو بری طرح سے جھڑک دیا۔

”اتنا باپ کا خیال ہے تو خود کر لو..... میری جان چھوڑو..... میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں.....“ اس کی آواز نہ جاتے ہوئے بھی بلند ہو گئی تھی۔ یوں کہ ماہر تک ٹھنک کر مڑا تھا اور حمنہ بھی ڈر کر سہم گئی تھی۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔

ماہر کی چھستی نگاہوں کی تپش پا کر وہ اٹنے قدموں اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ جاتے، جاتے، جاتے اس نے حمنہ کے چکنے گلابی گالوں پر آنسو بکھرتے دیکھے تھے۔ لمحے بھر کے لیے فاطمہ کو اپنے روڑ رویتے پر انسوس ہوا پھر وہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی کیونکہ ماہر کی نظروں میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ جس نے فاطمہ کے دل کو اٹکا دیا۔ جیسے اسے امید نہیں تھی کہ فاطمہ، حمنہ کے ساتھ اتنا روڈ بی ہو بیڑ رکھے گی۔

پھر اس ساری رات فاطمہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی، سوچتی رہی..... جیسے ضمیر کی چیخیں کا شکار ہو جیسے ساری رات حمنہ کے آنسو اسے بے چین

کرتے رہے ہوں۔ پھر بھی وہ حور عین کی طرح خود کو کھنور ہونے کا درس دے کر مضبوط کرتی رہی تھی۔ آخر حور عین نے گیارہ سال لکھا کے شوہر پر قبضہ جما کر اسے چلا وطن کیے رکھا تھا۔ اگر حور عین بے حس بھی تو فاطمہ بھی اس کی بیٹی کے لیے اتنی ہی بے حس ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے وہ فلوریڈا سے نیویارک آئی تھی۔ پھر چار سال سے بھی کم مدت کے بعد ذلت اور رسوائیوں کے داغ لے کر پاکستان چلی گئی۔

اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ وہ فلوریڈا واپس کیوں نہیں گئی؟ فاطمہ آج بھی اسی سوال کے گرد گھومتی تھی۔

ماہر کی بے وفائی کا صدمہ لے کر اسے فلوریڈا جانے سے امر نے روکا تھا۔ وہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے فاطمہ کا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ پاکستان کا ویزا لگوایا تھا۔

یہ امر کی خواہش تھی کہ فاطمہ پاکستان چلی جائے..... وہاں جا کر حور عین کی ماں یعنی اپنی خالہ کو اس کے کروتوت بتائے..... کیا خبر اس کی ویران اور اجڑی زندگی کی کہانی سن کر خالہ کو جلال آجائے..... وہ امریکا پہنچ کر ماہر اور حور عین کی طلاق کروادیں۔

تب فاطمہ کو بھی یہی مناسب لگا تھا..... پھر فلوریڈا میں اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا اپنے بے حس باپ کے پاس وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تعلیم اس کے پاس نہیں تھی۔ ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔ نہ کوئی جاب تھی، نہ فنانشلی اسٹراٹجی پوزیشن تھی..... اسے پتا تھا کہ پاکستان میں اس کی خالہ بہت امیر ہیں..... کم از کم فاطمہ کو رہنے کے لیے چھت اور عزت کی روٹی تو ضرور ملے گی۔ اس سے زیادہ کی اسے چاہ نہیں تھی۔

وہ پاکستان تو چلی آئی..... خالہ کو اپنی دردناک کہانی بھی سنائی۔ خالہ نے اس غم کو سر پر سوار بھی بہت کیا..... اسپتال جا پڑیں۔ حور عین سے قطع تعلقی کر لی..... اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس سے کلام

نہیں کریں گی..... حالانکہ فاطمہ نے بہت زور دیا تھا۔ بہت کوشش کی..... خالہ امریکا جائیں..... بیٹی سے پوچھیں..... اسے غیرت دلوائیں..... ماہر کو مجبور کریں، وہ اسے طلاق دے..... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خالہ نے حور عین سے بات ضرور کی تھی مگر اس کے بعد وہ چپ سی ہو گئی تھیں۔

انہوں نے پھر حور عین کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ بلکہ ایک چپ کی بیکل میں گم ہو گئیں۔ فاطمہ نے لاکھ سر چینا مگر جواب نداد تھا۔ وہ اسے صبر کرنے کا بس مشورہ دیا کرتی تھیں۔

حالانکہ امر بھائی کے کہنے پر فاطمہ نے رو، رو کر سارا واقعہ بار بار خالہ کو سنایا تھا۔

”صرف اپنے عشق کی آگ بجھانے کی خاطر ماہر نے مجھے بدکردار کہا..... عیاش کہا..... کال گرل کہا..... اور بچے چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا..... مجھے ہر رشتے سے بے دخل کر دیا..... صرف اس حور عین کی وجہ سے..... آپ کی بیٹی نے میرا گھر اجاڑ دیا.....“ وہ ساری، ساری رات روٹی اور تڑپتی تھی..... اسے غم کے لہے، لہے دورے پڑتے..... بہت سال وہ دنیا سے کٹی رہی..... یہ خالہ کی کوششیں اور بدعاتیں تھیں جو رنگ لائی تھیں اور فاطمہ بہت سال کے بعد کچھ سنبھل گئی تھی۔

اس وقت وہ کانج کی سیرھیوں پر کھڑی تھی۔ یہاں سے امریکی ہائی وے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کا بہترین ٹریفک نظام امریکا میں دکھائی دیتا۔ جگہ، جگہ سائن بورڈوں پر شہروں، قصبوں اور ریاستوں کے میں بارے میں لکھا ہے۔ کوئی بھی اجنبی شخص نقشے کی مدد سے پورے امریکا کی سیر کر سکتا ہے۔ کسی سے رستہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

لیکن فاطمہ ایک ایسی امریکی لڑکی تھی جو نقشے کو پکڑ کر بھی اجنبیوں سے اپنے ہی گھر کا رستہ پوچھتی پھرتی..... چاہے کوئی ٹھیک بتاتا یا غلط..... فاطمہ کو اندھا دھند دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت تھی..... ایک بات تو سچ تھی..... اس نے کبھی اپنی عقل کا استعمال

روئے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر ولیم فیوری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غدودوں سے خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیوری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیائی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض میں بالخصوص السر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیوری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو، پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیساوی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیوری نے سوا افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: ماریہ عقیل، لاہور

نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ماہر اپنی ماں پر چلا تار بتاتا تھا۔ ”کس احمق اور بدھو کو میرے ساتھ باندھ دیا..... اس میں عقل نام کی نہیں..... اتنی احمق اور گاؤدی ہے..... کسی بات کا پتا نہیں چلتا..... فلوریڈین گائے ہے۔“ ماہر کی بازگشت آج بھی فاطمہ کو سالوں پیچھے لے جاتی تھی۔ تب بھی وہ احساس توہین پر رو پڑتی..... چیخ اٹھتی اور پاگل ہو جاتی تھی۔ اور جب وہ صدمے کی انتہا پر بھلا، بھلا کر کے روتی تب بھی ماہر کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا..... ”اس کو رونے کا بھی سلیقہ نہیں..... کوئی ایسے

روتا ہے؟ آخر حور عین بھی تو ہے ناں..... وہ تو ایسی نہیں..... وہ تو بالکل ایسی نہیں..... آپ کو یہ لوکی دم ملی تھی میرے لیے..... کیا حور عین دکھائی نہیں دی.....؟“ ماہر جب بولنے پر آتا تو ذرا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے، ایسے فضول الفاظ کا استعمال کرتا تھا کہ بندہ مٹی تلے مٹس جانے کی خواہش کرنے لگتا۔

پھر ماہر کو اس کی عمر پر بھی اعتراض تھا۔ اسے میچور ڈلڑکیاں پسند تھیں۔ حور عین جیسی..... فاطمہ کم عمر تھی..... اسے ڈریسنگ کرنے کا، کوکنگ کا، گھر سنوارنے اور شوہر کا دل جیت لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جانے وہ کون عورتیں ہوتی ہیں جنہوں نے اتنے، اتنے دیوہیکل شوہروں کو بھی دام میں کر رکھا ہوتا ہے۔ ایک فاطمہ بھی اسے شوہر کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کا بھی طریقہ نہیں آتا تھا۔

اوپر سے مامی اس کی انسلٹ یہ بہت خوش ہوتی تھیں۔ اصل میں حور عین انہیں بھی پسند تھی اور فاطمہ کی پوری قبیلی کو وہ سخت ناپسند کرتی تھیں۔ شاید اس کے پاپا کی وجہ سے ورنہ اس کی مٹی تو آئیڈیل ماں بلکہ آئیڈیل عورت تھیں۔ صوم و صلوة کی پابند، شرمیلی، نیک اور دیوہیکل..... انہوں نے فاطمہ کی تربیت بھی ایسی ہی کی تھی یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے بھتیجے کو ایسی لڑکیوں سے انتہائی چڑ اور نفرت تھی۔

وہ با اعتماد اور باوقار لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ جو سو برہوں، دھیمبا بولیں، کسی بھی پرابلم کو سولو کرنے کے پہلو سوچیں ناں کہ چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیں۔ اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط، پاور فل اور اسٹرائٹ خواتین اچھی لگتی تھیں جبکہ فاطمہ میں ایسی کوئی بھی خوبی نہیں تھی۔

وہ خود سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اگر کوئی اسے مشورہ دیتا، اچھا یا برا تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لیتی..... دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کرتی..... خود سے اس کے اچھے، برے پہلو پر غور نہیں کرتی تھی۔

اس کی مٹی نے بہت حد تک اسے محتاج بنا ڈالا تھا۔ وہ کبھی اکیلی گھر سے اسکول تک نہیں گئی تھی۔ مٹی نے اسے سہیلیاں بھی بنانے نہیں دیں۔ اسے اسٹور تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے تئیں مٹی سے ارد گرد کے بے باک ماحول کی پرچھائیوں سے دور رکھتی تھیں۔ یہ خبر نہیں تھی کہ بیٹی میں اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ماہر جیسے بندے کے ساتھ کس طرح سے رہے گی؟ کیسے گزارہ کرے گی؟ نیویارک کی کھلی سڑکوں کو دیکھتی وہ فلوریڈا میں مٹی کے پہلو سے جا چکی.....

”آگ یادیں اور رولادینے والی یادیں.....“ مٹی کی یاد نے اسے نمناک کر دیا تھا۔ جیسے ہی اس نے گردن گھمائی پیچھے ماہر کو کھڑا دیکھ کر حواس باختہ ہونے کے بجائے اکڑ گئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ماہر اس کی تلخ کلامی پر باز پرس کرنے آیا ہے۔ مگر وہ ہوتا ہے کون تھا باز پرس کرنے والا؟ دس سال پہلے اس کی ناک تلے عشق کا کھیل رچا کر، اپنی محبوبہ سے ایک بیٹی پیدا کر کے آج بھی اتاتن کے کھڑا تھا۔ جیسے اسے اپنے کسی بھی عمل پر پشیمانی نہیں تھی۔

جیسے اسے اپنی پہلی بیوی کو گھر سے دھتکارنے اور بچے چھین لینے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئی گئی تھی تو کم از کم ماہر کا فرض تو بنتا تھا۔ فقط ایک لفظ معذرت اور شرمندگی کا اس کی سماعتوں میں اتار دیتا لیکن فاطمہ کو لگتا وہ اس کے لوٹ آنے پر کچھ اور اکڑو خان بن گیا تھا..... اندر ہی اندر جانے کتنا مسرور ہے..... ایک بیوی کو دھتکار کر، دوسری شادی بھی رچالی..... بیٹی بھی ہو گئی..... اور محبوبہ کے مر جانے کے بعد پہلی بیوی نے گھر بھی آ کے سنبھال لیا..... کتنے مزے تھے ان مردوں کے جو یورپی ہوتے ہیں یا پاکستانی..... ویسے بھی پاکستانی مغرب کے ماحول میں پیدا ہو کر بھی ذہنی طور پر رہتے پاکستانی ہی ہیں، وہی بیویوں کو نیچا دکھانے والی پرانی اور گھنیا برصغیرانہ غلام قسم

کی سوچ.....

اس وقت فاطمہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے ماہر کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد ماہر کو خود ہی بولنا پڑا..... شاید وہ فاطمہ کی پہل کا انتظار کر رہا تھا۔

”حنہ کے ساتھ اتارو ڈلی بی ہو، کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بہت کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ فاطمہ کے اعصاب بھی تن گئے تھے۔ حنہ کے لیے اس کی چاہت یہ وہ شدید جلن محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ ایک بیٹی سے کیا حسد کرنا؟ لیکن وہ اپنی کیفیات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”میں ایسی ہی ہوں۔“ اس نے اپنے تئیں بڑا تنگ کر کہا تھا..... ماہر کو شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم میں کچھ تبدیلی آ چکی ہے لیکن تم تو وہی ہو..... میں نے ہی تمہیں دوبارہ بلوا کر غلطی کی.....“ اس کے انداز میں تاسف بھر گیا تھا۔ اور فاطمہ کے تو سر پر جا لگی تھی..... اس کی آنکھیں احساس توہین سے لال ہوئیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ فاطمہ نے غصے سے کہا۔

”بہت خوب، مطلب بھی میں ہی سمجھاؤں تمہیں..... اپنا کیا دھرا بھول چکی ہو..... جو کچھ تم نے کیا..... وہ ایسا شرمناک تھا کہ تمہیں تو میرے سامنے اتنا اکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی سو مرتبہ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر تم اپنے انگریز بے مذہب اور بے دین باپ کی طرح ڈھیٹ اور بے غیرت ہو۔“ ماہر کے الفاظ نے فاطمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں آگ برسانے لگیں۔

”جسٹ شٹ اپ.....“ وہ چلا اٹھی تھی۔

”چلاؤ مت فاطمہ..... میں خود بھی ماضی کو ڈھرانے نہیں چاہتا..... اور ایسا قابل فخر ماضی ہے بھی نہیں.....“

جسے اچھے دنوں کی طرح یاد کیا جائے..... اگر میں سب کچھ بھلا چکا ہوں تو تم بھی کچھلی باتیں بھول جاؤ۔

کبھی

بہتری اسی میں ہے..... اور باقی یہ ہے کہ حنہ کے ساتھ برتاؤ میں تبدیلی لاؤ..... وہ اتنی سمجھدار نہیں جو تمہاری مٹی کو برداشت کر سکے۔“ ماہر کا لہجہ اب بھی روکھا اور کھر در اٹھا۔

”میں نے حنہ کو کیا کہہ دیا؟“ وہ اب کی دفعہ کچھ پست آواز میں بولی۔

”جو کہا ہے اب ایسا مت کہنا..... میری بیٹی بہت ہی حساس ہے۔“ ماہر نے جیسے دارنگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ پھر نے تلے قدم اٹھا تا پلٹ گیا۔ جبکہ فاطمہ ہونٹ کاٹتی غصے میں بڑبڑاتی رہ گئی۔

☆☆☆

ماہر سے اس دن کی تلخ کلامی کے بعد دوبارہ بات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ حنہ کے حوالے سے ماہر کی شکایات دور ہو چکی تھیں۔ فاطمہ خاص طور پر ماہر کی موجودگی میں جتا، جتا کر حنہ سے پوچھتی تھی۔

”آج لٹچ میں کیا ہوا؟ یا ڈنر میں کیا بناؤں؟“ وہ واضح طور پر ماہر کو سنا کر حنہ کو مخاطب کرتی تھی جو اب حنہ اپنا فراموشی پروگرام بے تکلفی سے نشر کر دیتی۔ فاطمہ نے ایک بات شدت سے نوٹ کی تھی۔ حنہ بہت زیادہ فاطمہ کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ وہ بہانے، بہانے سے فاطمہ کو متوجہ کرتی..... اس سے پیار لینے کی کوشش کرتی اور پھر بہت لاڈ سے گلے میں بانٹیں ڈال کر جاتی۔

”ماما.....! آپ میری پرنس ہیں۔“ اکثر لاڈ کے یہ مظاہرے ماہر کے سامنے ہونے لگے تھے۔ اور وہ ٹی وی دیکھتا اچانک چونک جاتا تھا۔

”ایسا قاتلانہ جھوٹ.....“ اس کی بڑبڑاہٹ پہ آسانی فاطمہ کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی تھی گو کہ وہ جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی ظاہر کرتی تھی کہ اس نے ماہر کی بڑبڑاہٹ سن لی ہے تاہم وہ جانتا ضرور تھا کہ اندر ہی اندر وہ سکتی ہے۔ حنہ اکثر اپنے ایکسٹرا لاڈوں کی وجہ سے اسے شرمندہ کرواتی تھی۔

ایک دن بڑے جوش میں کہنے لگی۔

”میری ماما سے اچھی کوکنگ کوئی نہیں کرتا.....“

آپ میرے لیے نوڈلز بنائیے گا۔ چکن نوڈلز.....“ حنہ

195

جتلا تا پڑا تھا۔ فاطمہ چپکی سی رہ گئی۔

”اس نے میرا گھرا جاڑا تھا۔“

”اس نے تمہارا گھر نہیں اجاڑا تھا..... یہ کام تم نے خود کیا.....؟“ ماہر اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا..... فاطمہ ہکا بکا رہ گئی۔

”میں نے خود؟“ اس کی آواز لڑکھڑا گئی..... ”مگر کیسے.....؟“ اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ماہر لمبے بھر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے کسی سوچ میں گم ہو..... اس کے چہرے پر فکر کا جال تھا اور ان سارے ماہ و سال کی کہانی درج تھی جس کا وقت اور ایک، ایک لمحہ بھاری تھا۔ اتنا ہی بھاری جس قدر فاطمہ پر بھاری تھا۔

وہ جانے کیا، کیا سوچتا رہا کس، کس انداز میں سوچتا رہا۔

پھر جب بولا تو اس کی آواز پہلے کی طرح روکھی اور کھردری تھی۔

”اپنے باپ پر بھروسا کر کے.....“ ماہر کے جواب نے فاطمہ کو سرتاپا فریز کر دیا تھا۔

☆☆☆

”خدا اور ہٹ دھرمی سچ رائے کو بھی دور کر دیتی ہے۔“ یہ بات بہت پہلے فاطمہ کی مٹی نے اس کے لیے کہی تھی اور وہ حیران ہوتی تھی کہ اس میں خدا اور ہٹ دھرمی کہاں ہے؟ اپنے تئیں وہ بڑی فرمانبردار تھی، مٹی کی ہر بات مانتی تھی۔ ان کی ہر بات کو سمجھتی تھی..... لیکن مٹی نے کہا تھا۔

”فاطمہ خاموش ضدی اور خاموش ہٹ دھرم ہے۔“ اس بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ فاطمہ سمجھی نہ سمجھ پائی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس میں کچھ عادتیں اپنے باپ والی ضرور موجود تھیں..... اس کا باپ بھی ہٹ دھرم تھا..... اپنی بات پر ڈٹا رہتا اور منواتا چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی فاطمہ بھی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔ گو کہ وہ اپنے باپ کی طرح شور نہیں مچاتی تھی مگر اندر ہی اندر وہ اپنی سوچی ہوئی رائے پر قائم رہتی..... چاہے وہ رائے

میرے ہی نصیب میں تھی..... اس امتحان کا جو دس سال پر محیط ہو گیا تھا..... کون میرے دس سالوں کے عذابوں کا حساب دے گا؟ کون میرے ماہ و سال کا حساب دے گا؟ میرے بچوں نے جو میرے بغیر وقت گزارا..... میں نے اپنے بچوں کی جدائی کس طرح برداشت کی کوئی میری تکلیف کو سمجھ ہی نہیں سکتا..... فاطمہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ شاید ماہر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا..... وہ خاموش ہو گیا تھا۔

”لوگ خوش نصیب ہیں جو چاہتے ہیں پالیتے ہیں۔“ اس کا اشارہ حور عین کی طرف تھا۔ وہ بڑے درد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے مری ہوئی حور عین پہ بھی رشک آرہا تھا۔

ماہر اسے دیکھتا رہا..... وہ آج بھی ایسی تھی جلد باز، جذباتی، بات بے بات آنسو بہانے والی..... جلدی بدگمان ہونے والی..... ہر تاثر کو ظاہر کرنے دینے والی۔

”تم حور عین کی بات کر رہی ہو؟“ ماہر نے عجیب انداز میں پوچھا تھا۔

”ظاہر ہے..... حور عین کے بجائے کوئی اور اتنا قابل رشک ہو سکتا تھا؟“ وہ چپچپے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

”اچھا..... بھلا وہ کیسے خوش نصیب تھی؟“ ماہر نے اگلا سوال داغا..... فاطمہ بغیر ر کے شروع ہو چکی تھی۔

”اس کے پاس اتنی قابلیت تھی، وہ اتنی کامیاب تھی پھر اسے من چاہی محبت ملی.....“ اس کا لہجہ حسرت آمیز ہو چکا تھا۔ ماہر اسے تاسف سے دیکھتا رہا۔

”مجھے آج پتا چلا ہے حور عین کو تمہارے حسد کی نظر لگ گئی تھی۔“ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا..... جس پر وہ چلا اٹھی تھی۔

”میں کیوں اسے نظر لگاتی؟ وہ میری خالہ زاد بہن تھی۔“

”لیکن تم نے ہمیشہ اس سے نفرت کی۔“ ماہر کو

تعلقات ویسے بھی خاصے کشیدہ تھے۔ مزید کشیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔

”آہ..... عقل مند عورت تو ملی تھی..... بس نصیب ہی خراب تھے۔ حور عین ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتی۔“ اس نے بڑی تلخ اور کاٹ دار بات کی تھی۔ ماہر لمبے بھر کے لیے چپ ہوا جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”حور عین ہوتی بھی تو تم یہیں ہوتیں حور عین کا مرجانا کوئی بہانہ نہیں بنا تھا۔ اس کی زندگی میں ہی اگر مجھے کچھ حقیقتوں کا پتا چل جاتا تو تب بھی تم یہیں ہوتیں۔“ اس نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا تھا۔ اب چپ ہونے کی باری فاطمہ کی تھی۔

”تو تم کو یا دس سال کا کٹ کاٹنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ تب کچھ غلط ضرور ہوا تھا؟“ وہ جیسے شدت عم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

”غلط ہوا نہیں تھا فاطمہ.....! تم نے غلط کیا تھا؟ مان جاؤ کہ تم انتہائی احمق ہو..... جو بھی ہوا تمہاری بے خبری میں ہوا..... جس کا بھگتان ہم سب نے بھگتا..... سزا تم نے بھی کافی اور میں نے بھی.....“ ماہر لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

”سزا کس نے کافی؟ ماہر ارباب نے..... ہرگز نہیں تم نے تو حور عین کے ساتھ اچھا وقت گزارا..... امتحان تو سارے میرے لیے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کی جدائی سہی..... ملک بدر ہوئی..... ایک ٹھٹھن زدہ زندگی تک محدود رہ گئی تھی اگر خالہ نہ ہوتیں تو میں مرجاتی۔“ فاطمہ کے جانے کون، کون سے نائکے ادھر گئے تھے۔

”اور مجھے میرے باپ کا آخری منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔“

”اس کا تو نام ہی مت لو.....“ ماہر کا انداز ہر خند تھا..... مامی اور ان کا خنت جگر فاطمہ کے پاپا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ شاید وہ انگریز تھے یا پھر کوئی اور وجہ.....؟

”تو پھر کس کا نام لوں.....؟ اس آزمائش کا جو

اس کے روئے میں روکھا پن پا کر بھی بڑے دعوے سے فرمائش کرتی تھیں۔ تب ماہر بھی اخبار دیکھتا متوجہ ہوا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا اٹھا تھا۔

”اللہ میرے بچوں کے معدوں پر رحم کرے۔“ بچن کی طرف جاتی فاطمہ لمبے بھر کے لیے رک گئی تھی پھر اس نے جیکھے ابرو اٹھا کر کہا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی..... میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر لوگ اب میزیں کیوں نہیں اٹھتے..... ایک بات یہ سارا کریڈٹ حسد کی ماں کو ضرور جاتا ہے..... اس نے ناک میں نکیل ڈال کر پالنے کے بجزوں کو سدھا دیا..... یہ کمال حور عین کے ہی پاس تھا۔“ اس کا انداز بھرپور سراہتا ہوا تھا..... ماہر باہر جاتا، جاتا رک گیا۔

”چلو، تم نے کسی بات پر حور عین کو کریڈٹ تو دیا۔“ حور عین تو آسکر کی حقدار تھی..... دوسروں کے..... گھوں پہ شب خون مارنا عام بندے کا کام نہیں ہوتا۔“ اس کے طنز کی کاٹ کو جانے کیسے وہ ضبط سے پی گیا تھا۔ شاید حسد کا احساس کر کے..... ورنہ فاطمہ تو جانتی تھی منہ توڑ جواب دیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔

”ذرا اپنے الفاظ میں ترمیم کر لو..... شب خون حور عین نے نہیں مارا بلکہ تم نے ہماری زندگیوں میں کسی ناگہانی بلا کی طرح انٹری دی تھی، مجھے کچھ ڈھرانے کی ضرورت نہیں..... تم ایک، ایک حقیقت سے آشنا ہو۔“ اس نے جس بات کی طرف اشارہ دیا تھا وہ فاطمہ اچھی طرح جانتی تھی..... یہ ایک ویک پوائنٹ تھا..... سو وہ چپ کر گئی۔

”میں نے کسی کے ساتھ لو میرج نہیں کی تھی..... نہ میں کورٹ میرج کے ذریعے آئی..... مجھے مامی اور ماموں شادی کر کے لائے تھے۔“ فاطمہ نے بڑے..... دو ٹوک انداز میں جتایا تھا۔

”اور ابھی تک میں اسی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اللہ کرے کسی کا بھی کسی بے عقل عورت سے واسطہ سمجھی نہ پڑے۔“ ماہر کا انداز ہلکا پھلکا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھ کر اور رخ اختیار کر لے۔

غلط ہوتی یا ٹھیک ہوتی..... وہ اپنے ذہن میں آئی سوچ پر عمل کر گزرتی تھی..... لیکن اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی ضرور کرتا تھا۔ ماموں کے گھر دس سال بعد آکر بھی وہ ان نکتوں کو آج تک سوچ نہیں پائی تھی جو ماہر اور اس کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے تھے۔

اس کی اپنی سوچ اور خیال حور عین تک ہی محدود تھے..... وہ حور عین جو اس کی زندگی میں بھونچال لائی تھی۔ وہ حور عین جو اس کی زندگی میں تہلکہ مچا گئی تھی۔ لیکن اس کے پیچھے کوئی ایک وجہ بھی ضرور تھی..... یہی ناں کہ ماہر ارباب کو حور عین سے محبت تھی..... اس سے بڑی وجہ علیحدگی کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

چھٹی کے روز ماہی نے ایسے ہی حور عین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

”بعض لوگ بڑے ہی بد قسمت ہوتے ہیں۔ نہ قابلیت ان کے کام آتی ہے نہ حسن اور نہ ہی محبت.....“

ماہی کے لہجے میں آج بھی حور عین کے لیے ہمدردی محسوس کی جا سکتی تھی..... آہ، حور عین جا کر بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں موجود تھی۔ پھر بھی یہ لوگ سمجھتے تھے حور عین بد قسمت ہے۔

”آپ کے بیٹے نے اس سے عشق فرمایا تھا۔ پھر بھی وہ بد قسمت تھی؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی فاطمہ کے لہجے میں جلن در آئی تھی۔

”حور عین کو تو نظر ہی کھا گئی۔ عشق، محبت کسی کے کام کیا آتے ہیں؟ جب قسمت ہی ساتھ نہ دے۔“

ماہی کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

”اسے ماہر مل گیا تھا تب بھی وہ بد نصیب تھی؟“

اس نے کڑھتے ہوئے کہا۔

”ماہر تو تمہیں بھی مل گیا تھا..... ماہر کامل جانا کیا خوش قسمتی کی علامت ہوتا ہے؟“ ماہی کے اگلے الفاظ اسے ہکا بکا کر گئے..... کچھ میل کے لیے فاطمہ کچھ بول نہیں پائی..... ایک دم گم سم ہو گئی تھی۔

”ماہر کو مجھ سے محبت تو نہیں تھی ناں.....“ اسے بات کرنے کے لیے ایک پوائنٹ مل ہی گیا تھا۔

”اچھا.....“ ماہی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا..... ”اگر محبت نہیں تھی تو دس سال بعد تم یہاں نہ ہوتیں۔“ ان کا انداز بھر پور جتنا نے والا تھا۔

”میرا یہاں دوبارہ آنا ماہر کی مجبوری نہیں..... اسے بچوں کی خاطر مجھے بلوانا پڑا.....“ وہ سبزی کا تٹی بہت آزرده ہو گئی تھی۔ جانے کیا، کیا باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ عمو ماہر گزری باتیں بھلائی ہی نہیں تھی۔

”تم جو بھی سمجھ لو.....“ ماہی نے گہری سانس کھینچی۔

”محبت اسے بس حور عین سے تھی۔“ اس نے جملے دل کا پھوپھو پھوڑ ہی دیا۔

”اس کا جواب ماہر سے لینا۔“ انہوں نے صاف دامن بچالیا۔

”ماہر بھلا کیا جواب دے گا۔ اس کی نشانی کو سینے سے لگا تو رکھا ہے.....“ فاطمہ نے کلس کر کہا۔

اشارہ حسد کی طرف تھا کیونکہ حسد میں ماہر کی جان بند تھی۔ وہ حسد کے معاملے میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”کمال ہے۔“ ماہی کو پھر سے طنز سوجھا تھا۔

”تمہاری بھی دو نشانوں کو اس نے سینے سے ہی لگا رکھا تھا۔“ ان کا اشارہ اس کے بیٹوں عون اور محمد کی طرف تھا۔

”لیکن میرے ساتھ زیادتی تو کی تھی ناں.....“

اسے اپنے خسارے رہ، رہ کر یاد آنے لگے۔ ”مجھے گھر سے نکالا تھا.....“

”یہ تمہاری اپنی غلطیوں کا خمیازہ تھا..... ٹھیک ہے تب ماہر غصے میں تھا..... لیکن اس نے تمہیں بعد میں بلوایا بھی تھا۔“ ماہی نے جتلاتے ہوئے کہا تھا..... فاطمہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

”کب بلوایا تھا..... کب؟“ اسے تو پچھلے دس سالوں میں ایک بھی ماہر کی فون کال موصول نہیں ہوئی تھی۔

اور ماہی کی سافک جھوٹ بھول رہی تھیں۔

”کیا تمہارے ماموں نے ایک ہزار ایک فون

نہیں کیے تھے؟ کیا وہ تمہیں لینے پاکستان نہیں گئے..... کیا میں نے فون نہیں کیے.....؟ کیا حور عین نے تمہاری متیں نہیں کی تھیں؟ گو کہ شروع کے چند سالوں میں ماہر کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔ وہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن بعد میں ماہر نے تم سے رابطہ کرنے کے لیے ہمیں مجبور کیا..... شاید اس کا غصہ اتر گیا تھا یا پھر بچوں کی وجہ سے..... اور اب بھی تمہیں ماہر ہی نے بلوایا ہے.....“ ماہی ایک ہی سانس میں اس کی آنکھیں کھولتی چلی گئی تھیں۔

”اور تم تب بھی نہیں آئیں..... تم خود نہیں آئیں..... کیونکہ تم ہٹ دھرم ہو.....“

”ماہر لینے آتا تو آ جاتی..... میں خود سے کیوں آتی؟ ماہر نے حور عین کی وجہ سے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نکلتی تو اس کی خواہش پوری ہوتی.....“ فاطمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ ماہی اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”تم اپنی غلطی بلکہ گناہ کبھی تسلیم نہیں کرو گی۔“

ماہی زیر لب بڑبڑا کر رہ گئیں..... ان کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ فاطمہ پہ آسانی سن سکتی۔ اسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ آخرا اب بھی ماہی کی نظر میں فاطمہ ہی بری تھی۔

”میں نے کیا گناہ کیا تھا.....؟ بتائیں مجھے..... جو بھی ہوا، میرا اس میں کیا قصور تھا؟“ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”پتا نہیں..... لیکن ہم سب نے بہت ٹھٹ مائم گزارا تھا تب..... ماہر تو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ تمہیں طلاق دینا چاہتا تھا۔ یہ تو ہم سب نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا تھا۔“ ماہی شاید اب کریڈٹ لینے کے چکروں میں تھیں..... فاطمہ نے کم از کم یہی سمجھا تھا۔

”پھر تم اپنی غلطی ماننے کے بجائے اکڑ بھی گئیں۔ فلورڈا جانے کے بجائے پاکستان چلی گئیں۔“

امر کو تم نے فورس کیا..... تمہیں پاکستان بھجوائے..... پھر حور عین کی ماں کو ہمارے خلاف کر دیا۔“ ماہی بھی تاک، تاک کے حملے کر رہی تھیں۔ اگر چہ ساری باتیں ہی ٹھیک تھیں پھر بھی اسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔

”مجھے بھی امر نے ہی کہا تھا..... تم پاکستان ریلیکس ہونے چلی جاؤ.....“ فاطمہ کی آواز دہلی ہوئی تھی۔

”اس نے تمہیں ریلیکس ہونے کو کہا تھا کیونکہ ان دنوں تم بھی ڈپریسڈ تھیں، تنہا تھیں، ماہر کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر تمہارے لیے اسے یہی بہتر لگا۔“ ماہی نے برہمی سے جتلیا۔

”امر نے ہی مجھے بتایا..... حور عین کی شادی کا..... حور عین کو بھی مجبور کیا..... وہ طلاق لے..... لیکن وہ طلاق کیوں لیتی، اس کے تو ارمان پورے ہو رہے تھے۔ اچھا ہوا مر کھپ گئی۔“ آخری الفاظ انتہائی صدے کی کیفیت میں اس نے منہ ہی منہ کہے تھے۔

گو کہ حور عین اس کی رقیب تھی پھر اس کی وفات کا سن کر فاطمہ کو دکھ ضرور ہوا تھا لیکن اس وقت وہ جذباتی کیفیت میں تھی۔

”حور عین کو گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ فاطمہ کو اچانک ایک اور شکوہ یاد آیا تھا۔ ماہی کو چونکنا ہی پڑا۔ ان کی آنکھوں میں تحریر پھیل گیا تھا۔

”ڈیڑھ سال؟ تمہیں کس نے کہا؟“ ماہی کی حیرانی پہ فاطمہ بھی چونکا ہو گئی۔

”مجھے امر بھائی نے بتایا تھا۔“

”اوہو..... امر نے، اچھا، اچھا.....“ ماہی جیسے سمجھ گئی تھیں..... ”اور دیکھو..... یہ لڑکا دوبارہ آیا ہی نہیں..... بچی کی خبر گیری نہیں لی۔ برنس بھی تو اس کا ملکوں، ملکوں پھیلا ہوا ہے..... بیچارے کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا..... یہ تو تمہاری وجہ سے نیو انگلینڈ کی مصروفیات ترک کر کے اتر پورٹ پہنچا تھا۔ پھر اسے نکٹ بھی کنفرم کروانا پڑا..... پاکستان کے لیے

آئندہ افطاری کے چند

رہنما اصول یاد رکھیں

- 1- دسترخوان پر اس جگہ بیٹھیں جہاں آپ کا ہاتھ ہر چیز تک جا سکے۔
- 2- شربت کا جگ اپنے سامنے مگر تھوڑا سا دور رکھیں ورنہ سب آپ سے شربت مانگتے رہیں گے۔
- 3- دوسروں پر نظر رکھیں اور چیزوں پر بھی دیکھیں کون سی چیز جلد ختم ہو رہی ہے۔
- 4- ہر پانچ منٹ بعد تھوڑا سا شربت پی لیں تاکہ ٹھنسی ہوئی چیزیں نیچے ہو جائیں اور نعمتوں کی جگہ بن جائے۔
- 5- کھجور کی گٹھلیاں اپنے ساتھ والے کی پلیٹ میں ڈالتے جائیں تاکہ آپ کا دامن صاف رہے۔

نوٹ:

دسترخوان سے اٹھنے سے پہلے کھل اطمینان کر لیں کہ کوئی چیز خراب تو نہیں گئی۔
خصوصی نوٹ..... اس سال ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ بھی ہوں۔

از: مدوش، سمرن راجپوت، سیالکوٹ

اظہارِ ہمدردی

ایک خاتون اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔

”اتنی دیر ہو گئی، منے کے ابا واپس نہیں آئے، ہو سکتا ہے کہ آج وہ پھر شراب خانے چلے گئے ہوں۔“

”اے ہے.....! تم ہر بات کا برا پہلو ہی کیوں سوچتی ہو؟ پڑوسن نے کہا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بس کے نیچے آ گئے ہوں۔“

شاعرہ: جمیر انوسین، منڈی بہاؤ الدین

ملزوم تھی۔

فاطمہ پچھلے سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسے ہر موڑ پر امر کی یادیں اس گھر میں بھری نظر آتیں۔ وہ اپنے گھر میں کم، کم قیام کرتا تھا..... اس کا ہر وقت کا پڑاؤ اسی گھر میں تھا.....

لیکن اب امر کو آئے ہوئے مہینہ بھر سے ادھر پر ہو گیا تھا۔ مایہر وقت امر پر غصہ کرتیں۔ ان کی ہر بات کا اختتام اس فخرے پر ہوتا۔

”بچی کی ذرا بھی پروا نہیں..... دونوں مصروف، دونوں آؤٹ آف اسٹیشن، ان کا غصہ ناک کی نوک پر رہتا تھا اور حسد بھی پورے دن میں کئی مرتبہ پوچھتی.....“
”ڈیڈی! وہ لوگ کب آئیں گے؟“ کبھی کبھی جب وہ زیادہ اپ سیٹ ہوتی تو ماہر حسد کو لیے کمرے میں چلا جاتا..... جانے کون لوگ تھے جنہیں حسد مس کر رہی تھی اور کبھی، کبھی شدت سے کرنے لگتی..... تب ماہر آؤٹنگ کا لازمی پروگرام بنا لیتا تھا۔

ڈزنی لینڈ میں گزرا وہ دن بھی ایسا ہی بیکار سا تھا۔ فاطمہ کو بالکل ہی بیکار لگا..... ایسا دن جس میں ماہر بس حور عین کی بیٹی کے خڑے اٹھاتا رہا تھا۔ گوکہ عون اور محمد بھی بہت خوش تھے اور پورا دن ڈزنی لینڈ میں انجوائے کرتے رہے۔

”ڈیڈی کے ساتھ کبھی، کبھی اتنا انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے۔“ عون بہت خوش تھا..... ڈزنی لینڈ میں آ کر کبھی خوش ہوتے ہیں ڈزنی لینڈ ایک جادوگری ہے۔

فاطمہ نے اپنی پوری زندگی میں ڈزنی لینڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ بہت غریب تھا اور می بس اتنا کماتی تھیں جس سے پیٹ کا سلسلہ چل سکتا۔ باقی عیاشیاں تو بس خواب اور خیال تھیں۔

ان کے مقابلے میں می کے رشتے دار بہت امیر تھے۔ ماموں کا اپنا بزنس اور گھر تھا۔ اور پاکستان والی خالہ بھی بہت امیر تھیں۔ بس انہی کے حالات بہت خراب تھے۔

کیونکہ بیچ میں حور عین کھڑی تھی..... خالہ جتنی عظیم تھیں حور عین اتنی ہی پست..... ”وہ کھٹی، کھٹی آواز میں بول رہی تھی۔“

”اور اس نے بہت دفعہ مجھ سے کہا..... میں اس کی زندگی سے چلی جاؤں۔“

”وہ تمہارے ماموں کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا..... انہوں نے زبردستی تم سے ماہر کی شادی کروائی تھی۔“ مایہ کو بھی نہ جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔

”جانتی ہوں سب.....“ فاطمہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا..... ”اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔ ماہر خوش رہتا اپنی حور عین کے ساتھ..... اب بھی حور عین جاتی نہیں تو ماہر مجھے کبھی نہیں بلواتا..... نیچے سنبھالنے مشکل جو ہو رہے تھے۔“ وہ زہر خندی بولتی چلی گئی۔

”تم عقل سے خالی ہو.....“ مایہ نے ہمیشہ کی طرح بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

”آپ جو بھی کہہ لیں اتنا تو تسلیم کریں گی تاں کہ حور عین نے آپ کے بگڑے ہوئے لخت جگر کو سدھا کر دیا ہے۔ کہاں وہ چلانے والا..... میزیں اٹھنے والا ماہر ارباب..... اور کہاں ایسی تہذیب کے گھر میں موجودگی کا بھی گمان نہیں ہو.....“ وہ سبزی کاٹ چکی تو زپر لب بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی..... معا اس کی نگاہ سنگ روم کے ڈور فریم پر پڑی..... وہ ہکا بکارہ گئی تھی۔ سبز یوں کا پورا باؤل اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا..... وہ آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھتی رہی تھی۔ اور فرش پر کئی ہوئی گا جروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا..... سدا کا چننا چلاتا ماہر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا نہ جانے کب سنگ روم کے ڈور فریم میں کھڑا ہوا تھا..... اور جانے کب سے وہ ان کی باتیں سن رہا تھا؟ اور اس نے کیا کچھ نہیں سن لیا ہوگا؟ فاطمہ کا دماغ جیسے گول، گول گھومنے لگا..... مارے شرمندگی کے اس سے سر اٹھانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

امر کا اس گھر میں قیام اور آمد و رفت لازم و

”اے“ بھجوانا جو تھا..... ”مایہ بھی غیر رواں لہجے میں بولتی اسے کچھ عجیب سی لگیں۔ ان کی کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ جانے کے ارجنٹ پاکستان بھجوانے کے لیے امر کو تردد کرنا پڑا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ پھر امر تو میڈیکل اسکول میں پڑھتا تھا۔ بزنس میں کیسے لگ گیا۔ خیر، بزنس تو اس کے باپ کا تھا۔ اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا..... باپ کے بعد بزنس کو اسی نے سنبھالنا تھا..... کیونکہ امر امریکا کے کروڑ پتیوں میں شمار ہوتا تھا۔

”حور عین کو امر نے بھی بہت فورس کیا تھا..... وہ ماہر سے طلاق لے..... مگر وہ ایسی کھو رہی کہ میرا گھر اجاڑ ڈالا..... میں دس سال اپنے بچوں سے دور..... رہی..... اے پھر سے وہی روٹا یاد آ گیا۔

مایہ اسے تاسف سے دیکھتی رہی تھیں جیسا کہ فاطمہ کا راگ انہیں کچھ بھانپیں رہا تھا۔ خاص کر گھر اجاڑنے والی بات.....

”اپنا کیا دھرا تمہیں بھول چکا ہے..... خیر یاد بھی نہیں کروانا چاہتی.....“ مایہ کو بلا کا غصہ آ گیا۔

”آپ بھی ہمیشہ مجھے الزام دیتی ہیں..... میں نے کیا گناہ کر دیا تھا؟“ وہ روہا سی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

”تم نے حور عین اور ماہر کے نکاح کی خبر پولیس کو نہیں دی تھی؟“ انہوں نے انتہائی کڑھکی سے فاطمہ کو حواس باختہ کر دیا..... یہ خاصا کر پہلے ہی تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا..... وہ قدرے شرمندہ ہو گئی لیکن وہ اپنے عمل میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی کہ اسے تب یہی کرنا چاہیے تھا اور اس نے ٹھیک کیا تھا۔

”تو میں اور کیا کرتی؟ مجھے اپنا گھر بچانا تھا۔“ اس نے پست آواز میں کہا۔

”گھر بیچ گیا تھا کیا.....؟ بلکہ تمہارا یہ عمل ماہر کو اور بھی تم سے متنفر کر گیا.....“ مایہ کو بھی بھگو بھگو کر مارنی آتی تھیں..... وہ پہلے بھی فاطمہ کو ہر وقت احساس دلانی رہتی تھیں کہ وہ ماہر کی من چاہی بیوی نہیں ہے۔

”ماہر شروع سے ہی مجھے پسند نہیں کرتا تھا.....“

اور اس وقت فاطمہ اپنی سابقہ زندگی کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندگی جو کیزوں مکوڑوں سے بھی بدتر تھی، وہ بڑے عرصے بعد فلوریڈا آئی تھی۔ قریب چودہ سال بعد..... یہ فلوریڈا تھا..... اس کا آبائی شہر..... جائے پیدائش..... لیکن فلوریڈا میں ابتدائی سولہ سال گزار کر بھی اس نے کبھی ڈزنی لینڈ کی سیر نہیں کی تھی۔ اسے ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی بہت حسرت تھی۔ بہت شوق تھا ایسا ہی شوق جیسے پاکستان میں کسی بچے کو سفاری پارک دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر فاطمہ کو تو جنونی شوق تھا۔ کیونکہ ڈزنی لینڈ ایک جادوگری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسی جادوگری جس میں انسان کھو جائے، گم ہو جائے اور کبھی خود سے بھی نکل سکے۔ ڈزنی ورلڈ کو چھ حصوں میں اچھی طرح منظم بنایا گیا تھا۔ اس کا ماسٹر مائنڈ والٹ ڈزنی تھا..... جس کی ذہانت نے یہ منفرد اور اچھوتا جادوگر بنایا تھا۔

کوئی بھی انسان اس کو دیکھ کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا..... جہاں جا کر تمام غم دنیا سے نجات مل جاتی..... وہ مین اسٹریٹ امریکا پر چلتی ہوئی بہت دور جا رہی تھی۔

بچے پرانے فیشن کی اسٹیم انجن والی ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جو پوری جادوگری کے ارد گرد چکراتی تھی۔ اس کے قریب سے ہاؤس کبھی گزر رہی تھی۔ کبھی کے آگے دو گھوڑے بندھے تھے۔ گھوڑے بہت خوب صورت تھے۔ جن کے بڑے، بڑے پاؤں ہوتے ہیں۔

مین اسٹریٹ کے آخری کارنر پر خوب صورت سنڈریلا کالہ جنہیں پریوں کا محل کہتے تھے۔ اس کی اٹھارہ منزلیں تھیں۔

اور بہت بچپن میں وہ سنڈریلا کاسل دیکھنے کی خواہش میں مٹی کا سر کھاتی تھی۔ اس پر ضد اور ہٹ دھرمی سوار ہو جاتی۔ وہ روتی، چیختی اور پھر کونے میں مٹس کر لائق ہو جاتی..... منظر سے غائب

ہو جاتی۔ اس کی۔ بچپن سے یہی عادت تھی۔ وہ مقابل کی مجبوری کا سبب نہیں کھوجتی تھی۔ بس بدگمان ہو کر غائب ہو جاتی۔ منظر سے دور ہو جاتی اور تب تک اسی طرح رہتی جب تک اپنا دل واپسی کو نہ چاہتا۔

فاطمہ کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اس کی ماہر سے شادی ہوئی..... تب اس نے پہلی فرمائش میں ماہر سے کہا۔

”مجھے ڈزنی لینڈ دیکھنا ہے، مجھے سنڈریلا کاسل جانا ہے۔“ یہ فاطمہ کی بچپن سے دل میں دبی معصوم خواہش تھی اور اسے لگا یہ خواہش پوری کرنا ماہر کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ پیسہ بھی تھا اور وقت بھی..... لیکن ماہر اس کی فرمائش پر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔

”تم نے فلوریڈا میں رہ کر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا؟“ اس کی چیخ ایسی بھیانک نہیں تھی جس قدر اس کا رویہ ہنک آمیز تھا۔ ایک تو ماہر نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا تھا..... وہ تو فاطمہ کو دیکھتا تک نہیں تھا۔ اوپر سے ایسی بے تکلفانہ فرمائش..... جیسے وہ دونوں بڑی محبت کرنے والے میاں بیوی ہوں۔ وہ تو اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ پھر اپنی مغرور ماں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑاتا رہا..... ماما بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہیں بھی فاطمہ پر طنز کے تیر برس آنے کا موقع مل گیا تھا۔

”اس کا باپ اسے ثانی تک لاکر نہیں دیتا تھا کجا کہ سیریں کراتا..... ملائکہ کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔“ ماما کو اس کی مٹی پر بھی کچھ اچھالنے کا موقع مل گیا تھا۔ تب اس کا دل ماما سے کھٹا ہوا ہی تھا۔ ماہر سے بھی کھٹا ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی اس کی مٹی پر الزام لگانے لگا۔

”یہ سب ملائکہ پھپھو کے اعمال کی سزا ہے۔ انسان کو اتنا بھی اپنے مقام سے گرنے نہیں جانا چاہیے کہ اسے اچھے، برے کی پہچان ہی نہیں رہے۔“ ماہر کی اس

بات پر فاطمہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ غصے میں پھٹ پڑی تھی۔ اور اس نے ماہر کو بے نقط سنا ڈالی تھی۔ اس بات کو قطعاً نظر انداز کر کے کہ وہ چار دن کی تو بیابا ہتا دلہن ہے۔ اس کی بکواس سن کر ماہر چیخ اٹھا تھا۔

”یہ ترس کے قابل نہیں تھی..... دیکھا آپ نے..... اس کی لمبی زبان کو..... میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کرتا آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا مٹی..... کتنی اجڈ اور جاہل ہے۔ اس میں بالکل تمیز نہیں.....“ ماہر کا یہ غصہ پھر کم نہیں ہوا..... بلکہ وقت کے ساتھ، ساتھ بڑھتا رہا۔ اس دن کے بعد سے ماہر کو فاطمہ میں بس کیزے ہی کیزے دکھائی دینے لگے۔

وہ اس کی نظر میں جاہل تھی، ان پڑھ تھی، اجڈ تھی، کم عقل تھی۔ اس نے فلوریڈا میں پیدا ہو کر بھی گنوا دیا تھا..... اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بات میں سلیقہ، نہ وقار، نہ ٹھہراؤ..... اسے تو بس مٹی نے چوزوں کے ڈبے میں قید کر رکھا تھا تاکہ اسے امریکی معاشرے کی ہوانہ لگے۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ فاطمہ کے بنیادی حقوق، تعلیم اور اعتماد کو نظر انداز کرتی رہی تھیں۔

مین اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے فلوریڈا کی یادوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا پھر اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس نے ماہر کے ساتھ گزاری تھی۔

عون اور محمد کے بعد بھی وہ فیبر لینڈ میں پرانی اسٹیم ٹرین جیسی زندگی گزارتی رہی تھی۔ جس میں بیٹھ کر انتہائی خوفناک سین دکھائی دیتے تھے۔ بظاہر اس کی زندگی ڈزنی لینڈ سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر آ کر پتا چلتا کہ وہ کتنا خوفناک وقت گزار رہی تھی۔

بچے ابھی تک قلعہ جات، ریچھ، جمبودی ڈائننڈ، ہارس شو اور شوٹنگ کرنے کا شوق پورا کر رہے تھے۔ ماہر اسے مین اسٹریٹ پر اندھا دھند چلتے دیکھ کر لیرنی اسکوائر کی طرف لے آیا تھا۔ وہ جو..... اپنے دھیان میں مگن اور گم تھی۔ ماہر کے بازو کھینچنے پر بھی چونکی نہیں تھی

ماں کے نام

اپنی پلکوں پر میرے اٹک پونے والی مجھ سے بھی پہلے میرے درد پر رونے والی میری ہر سانس ہے مقروض محبت تیری بوڑھے ہاتھوں سے میرے کپڑوں کو دھونے والی مجھ کو احساسِ شبی سے بچائے رکھا پھول ہی پھول میری راہوں میں بونے والی مجھ کو جرموں کی تلافی کا بھی موقع نہ دیا بے خیالی میں میرے ہاتھ سے کھونے والی صبر اور شکر تیری عمر کا حاصل ٹھہرے قلزمِ فخر میں تن من کو ڈوبنے والی روز روتی ہے میری تلخ حجازی تھک کو مٹھنی باتوں سے میرے دل کو بھگونے والی کون راتوں کو میرے واسطے اب جاگے گا تختِ فردوس پہ آرام سے سونے والی ماں کو کھویا ہے تو یہ راز کھلا ہے دائم ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے ہو کھلونے والی

شاعر: دائم بٹ
مرسلہ: یاسمین کنول، پرورد

نظم

کبھی مہندی سے سجالو تم اپنے ہاتھوں کو اس سجاوٹ کے کسی کونے میں ہمارا بھی نام لکھ دو یہ نام صرف ہم دونوں کو ہی نظر آئے کچھ اس طرح سے ہم دونوں کا نام لکھ دو تیری مہندی سے سجے ہاتھوں کو میں اپنے ہاتھوں میں لوں گا تیری مہندی کی خوشبو کو اپنے دل میں قید کر لوں گا ڈھونڈ لوں گا میں تیرے ہاتھوں میں چھپے ہم دونوں کے نام

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلا نوالی



بخیل

امم طینور

”میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر مسئلہ کیا ہے پروفیسر صاحب کا؟“ زیاد نے غصے سے دودھ سے بھرا گلاس پرے کھسکایا۔ جس میں سے کچھ دودھ چھلک گیا اور باقی بچے دودھ کو امی نے اس کے آگے سے اٹھالیا۔ مبادا بیٹا اس کو بھی گرا کر ضائع کرتا۔ رزق ضائع کرنا اس گھر میں سب سے بڑا جرم تھا۔

”زیاد بس کرداب..... عقل، تمیز سب بھول بیٹھے ہو ایک چھوٹی سی بات کے پیچھے۔ اب جلدی

ناں.....؟ لیکن یہ بکے تو بچوں کی انجوائے منٹ کے لیے ہے..... تم ہنی مون کے لیے بس گاڑوں کا انتخاب کرتیں۔ ویسے وقت اب بھی نہیں گزرا..... اگر تم چاہو تو ہنی مون کا ایک سویٹ تیار ہو سکتا ہے۔“ ماہر جان بوجھ کر اسے تپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ وہ غصے میں کچھ تو بول اٹھے۔ لیکن فاطمہ فی الوقت ضبط سے کام لے رہی تھی۔

”تم کیا سوچ رہی ہو فاطمہ؟“ ماہر کو ذرا سنجیدہ ہونا ہی پڑا تھا۔ فاطمہ نے بھی ناپ تول کر اس کی ساری طراری نکالنے کا سوچا..... اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

”میں حور عین کو سوچ رہی ہوں۔“

”تم کبھی اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو..... کبھی اپنی غلطیوں پر بھی نظر ثانی کر لیا کرو.....“ اس کی توقع کے عین مطابق ماہر چڑ گیا تھا۔ شاید وہ اس وقت حور عین کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیسا بے وقاف تھا، ماہر..... اتنی جلدی حور عین کو بھول بھی گیا۔ مرد ایسے ہی ہر جائی ہوتے ہیں۔ اس کے پاپا بھی می کو جلدی بھول گئے تھے۔ وہ می جنہوں نے پاپا کی خاطر ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائی تھیں، مشکلات جھیلی تھیں۔

”ہر کوئی مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ میں نے کون سا گناہ کر دیا تھا؟“ فاطمہ چیخ پڑی تھی۔ ماہر لمبے بھر کے لیے چپ کر گیا۔ اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ وہ غیظ و غضب سے بھر گیا تھا۔ پھر وہ بڑے ہی ضبط کے ساتھ بولا۔

”تم اپنی یادداشت کھو چکی ہو..... یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود بھی اس شرمناک قصے کو دہرانے نہیں چاہتا..... بہتر ہے ہم کوئی اور بات کر لیں۔“ ماہر کا دو ٹوک انداز اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گیا تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا..... اس کی یادداشت سلامت تھی..... اور اسے وہ شرمناک قصہ بھی یاد تھا..... مگر اس سب میں اس کا تصور کہاں نکلتا تھا۔

(جاری ہے)

بلکہ اس کے ساتھ ہی کھینچی چلی آئی۔ پھر ایک راؤنڈ نیبل کے راؤنڈ اسٹول کو کھینچ کر ماہر نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ اور پھر خود کو لمبیا ہار ہار ہاؤس سے سمندری خوراک یعنی مچھلیوں کی ڈشز اٹھالایا۔ پھر اس نے بچوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ بھوک سے ابھی کوسوں دور تھے۔ سو وہ گم صم سی فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”تمہاری برسوں کی خواہش پوری ہو گئی.....؟“ اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا۔ پھر بھی فاطمہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید ماہر کی بات کو سمجھنا چاہتی تھی۔

”برسوں کی خواہش؟“ اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... ناں..... ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی خواہش.....“ ماہر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔ فاطمہ جان نہیں پاتی تھی کیا یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی؟ اور اس نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا۔ قریب چودہ سال پہلے فاطمہ کی وہ خواہش جو ماہر کے مذاق میں دب کر دم توڑ گئی تھی۔

”تم سنڈریلا کا سل نہیں دیکھو گی؟“ اس نے شرارتا ہونٹ کا کونا دبا کر کہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فاطمہ پھٹ پڑتی مگر اس وقت وہ فضول بحث میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں.....“ اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔ ماہر ہنوز مسکراتا رہا..... جیسے اس کے نہیں کو انجوائے کر رہا ہو۔

”اگر کسی نے پوچھا تو بتا دینا..... سنڈریلا کا سل میں بہترین ریسٹوران، اسٹیک بار، کیفے، بیکریز، خوب صورت اسٹال، ہاؤس آف میچک جیولرز، بینک، فرسٹ ایڈ سینٹر موجود ہیں۔“ وہ کسی ٹورسٹ گائڈ کی طرح اسے بتا رہا تھا۔ فاطمہ کو بلا کا غصہ آیا مگر وہ پی گئی۔ اس وقت وہ کوئی تماشائے نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ویسے تم ڈزنی لینڈ میں ہنی مون منانا چاہتی تھیں

سے دودھ ختم کرو اور اپنی دادی کی دوائیں لے کر آؤ میڈیکل اسٹور سے..... رات سے ختم ہیں۔“ امی نے آدھا باقی رہ جانے والا دودھ کا گگ دوبارہ پورا بھر کے زیادہ کے سامنے دھرا اور خود بھی ایک کرسی تھیت کر ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ گھر کے تمام افراد اسی چھوٹے سے کچن ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔

”مجھے نہیں پینا دودھ، امی! خدا کا واسطہ ہے، اب آپ کی اولاد بڑی ہوگئی ہے۔ ناشتے میں تھوڑی سی تربیم کر دیں۔ چائے بنا کر دیں مجھے.....“

”زیادہ بیٹا ہر بات کو اتنا کا مسئلہ مت بنا لیا کرو۔ گھر میں اس طرح فساد پیدا ہوتا ہے، چلو شاباش ختم کرو اب اسے۔“ امی نے رمان سے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔ وہ اس کے غصے کو قابو کرنا جانتی تھیں۔

”امی! پروفیسر صاحب سے کہیں اپنے حکم میں تھوڑی تبدیلی لائیں۔ دودھ ناشتے کے بجائے رات سونے سے پہلے دے دیا کریں۔ کسی کو پتا چلتا ہے تو ہنستا ہے ہم پر کہ کالج، یونیورسٹی میں آکر بھی ہم ناشتے میں بچوں کی طرح دودھ لازمی پیتے ہیں۔“ زیادہ سخت اب سیٹ تھا اور امی اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ دودھ تو محض غصہ نکالنے کا بہانہ تھا۔ امی نے صبر کا گھونٹ بھر اور محل سے گویا ہوئیں۔

”سب سے پہلی بات کہ میں نہیں سمجھتی کہ دودھ صرف بچوں کے پینے کی چیز ہے۔ تمہارے ابو کیا بچے ہیں؟ میں نے ساری عمر پروفیسر صاحب کو ناشتے میں دودھ پیتے دیکھا ہے۔“ امی نے لفظ پروفیسر صاحب پر زور دے کر کہا۔ ”اور دوسری بات..... پروفیسر صاحب تمہارے باپ ہیں اور باپ کو اس کے پیشے کے حساب سے نہیں، رشتے کے حساب سے بلایا جاتا ہے۔ سبھی.....“ امی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تیبیہ کی تھی۔ جبکہ زیادہ کے چہرے کے تاثرات میں بیزارگی مزید نمایاں ہوگئی۔

”زیادہ.....“ امی کو اس کے تاثرات سے دکھ پہنچا تھا۔

”ہوں.....“ وہ گگ کے کنکے پر انگلی پھیرتا کسی سوچ میں گم تھا۔

”بیٹا! ماں، باپ اولاد کا کبھی دانستہ برا نہیں کرتے..... نہ سوچتے ہیں..... ہاں یہ بات انہیں سمجھا نہیں سکتے۔ شعور کی طنائیں، وقت کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، جو خود بخود عمر کے کسی حصے میں ان کے دماغ میں اتر جاتا ہے۔ تم سے صرف یہی کہوں گی کہ باپ کے لیے بدگمان ہونے کے بجائے انہیں سمجھو..... جس طرح بائیس سال انہوں نے تمہیں سمجھا ہے۔“ زیادہ نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہو گیا۔ کچن سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک نظر وہاں سے نظر آنے والے ”پروفیسر صاحب“ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور کچن کے رخ کھلنے والے کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ امی نے دکھ اور تاسف سے دودھ سے بھرے گگ کو دیکھا جو جوں کا توں پڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”ٹھک، ٹھک، ٹھک.....“ آدھا گھنٹا ہو گیا تھا زیادہ کو اپنی بائیک کے ساتھ ”ٹھک، ٹھک“ اور خود سے ”بک بک“ کرتے ہوئے۔ قریب ہی کرسی پر براجمان دادی تیج کے دانے گراتی بغور پوتے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی پنڈلیوں کا تیل سے مساج کرتی گھریلو ملازمہ زیادہ کی چڑچڑاہٹ کا لطف اٹھاتی وقفے، وقفے سے کبھی کبھی کرنے میں مصروف تھی۔ زیادہ کی برداشت جواب دے گئی۔

”اپنی کبھی، کبھی کنٹرول میں رکھو بیہ.....! نہیں تو تمہارے سر میں بھی دو پیچ ٹھونک دوں گا کبھی.....؟“ زیادہ نے اوزار کے ساتھ ملازمہ کو گھر کا۔

”اونہوں! زیادہ لحاظ رکھو..... اور ٹوبہ تم بھی

اٹھو اب..... دیکھو جا کر تمہاری آپا کو کسی کام میں تمہاری ضرورت نہ ہو۔“ دادی اماں نے ملازمہ کو بہو کے پاس اندر روانہ کیا انہیں گھر کے مردوں کا ملازماؤں کے منہ لگنا قطعاً پسند نہیں تھا۔

”اور زیادہ! تمہیں کاہے کا اتنا غصہ ہے جو اپنی بائیک کو آدھے گھنٹے سے مارے جا رہے ہو۔ بس مارے جا رہے ہو۔“ دادی اماں کا اشارہ زیادہ کی بائیک کی طرف تھا جس پر اپنا نہ جانے کون سا غصہ وہ نکال رہا تھا۔

”یہ اسی قابل ہے کہ اسے روز مارا جائے، سائیکل سے بدتر ہو چکی ہے، روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوا رہتا ہے اس کے ساتھ۔“ وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔

”مسئلہ تمہارے دماغ کے ساتھ ہے، جو تمہیں یہ اچھی بھلی بائیک، سائیکل سے بدتر دکھ رہی ہے۔ ابھی ہفتہ پہلے تمہارا باپ تفصیلاً مکنیک کو دکھا کر لایا ہے اور مکنیک کے بقول تمہاری بائیک بالکل فنٹ ہے۔ ہاں..... اگر تم یونہی اوزار لے کر اس کو ٹھوکتے رہے تو یقیناً ان فنٹ ہو جائے گی۔ جیسا کہ تم چاہتے ہو۔“ دادی اماں نے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ بتایا تھا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بڑی مدلل ہوتی تھی۔ اپنے وقت کی آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں، پروفیسر کی ماں تھیں اور بزرگوں کی باتوں میں علم کے سمندر سے زیادہ تجربہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ زیادہ ہمیشہ کی طرح جڑ بڑ ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اوزار فرش پر رکھتا دادی اماں کے پاس چلا آیا۔ ان کے گھنٹوں پر ہاتھ دھر کر خود بھی وہیں تک گیا۔

”دادی اماں! پلیز آپ میری سفارش کر دیں ناں..... دیکھیں آپ کے سامنے ہی تو ہے میری بائیک کی حالت.....“ دادی اماں نے خشکیوں نظروں سے گھورا تھا۔

”اچھا، اچھا..... اچھی بھلی ہے میری بائیک.....“ زیادہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیار ڈالے تھے۔

بخیل

”بس میرا شوق ہے ہیوی بائیک..... میرے دو دوستوں کے والد نے انہیں لے کر دی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حسن کے والد تو آسانی سے انورڈ بھی نہیں کر سکتے پھر بھی محض بیٹے کے شوق کی خاطر انہوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا اور ایک پروفیسر.....“ زیادہ نے زبان فوراً دانتوں تلے دبا کی تھی۔ دادی اماں کے سامنے وہ باپ کو پروفیسر صاحب کہتا تو انہوں نے ایک زور کا دھردینا تھا۔ ایسی زبان وہ صرف ماں کے سامنے ہی استعمال کرتا تھا۔

”میرا مطلب ہے آپ ابو سے کہیں ناں کہ مجھے بھی ہیوی بائیک لے دیں۔ وہ تو انورڈ بھی کر سکتے ہیں..... پلیز.....! آپ کہیں ناں ان سے..... پتا نہیں ابو اپنے بچوں کی خواہشات کو ترجیح کیوں نہیں دیتے.....؟ اوروں کے باپ بھی تو ہیں، اولاد کے منہ سے نکالنے سے پہلے چیز سامنے لا دھرتے ہیں لیکن ہمیں محض میانہ روی کا چورن چٹا دیتے ہیں۔ آخر ہماری بھی آرزوئیں ہیں، مانگیں ہیں۔“ اپنے تئیں زیادہ نے دادی اماں کو جذباتی حوالے سے گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر دادی اماں کے انداز و اطوار میں تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے پوتے کا چہرہ بغور جانچنے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

”زیادہ میرے بچے.....! تمہارے پیدا ہونے سے لے کر تمہارے جوان ہونے تک کوئی ایسا لمحہ مجھے یاد نہیں جب تمہارے باپ نے تمہاری بنیادی ضروریات سے نظر چرائی ہو۔ تمہاری بھوک میں تمہیں خوراک مہیا کی، تمہاری بیماری میں تمہارا علاج کرایا، تمہیں بہترین اوڑھایا، پہنایا..... نرم گرم بستر پر سلا یا، سردی گرمی سے بچایا، جس کالج اور یونیورسٹی کا نام تم نے لیا، وہیں تمہیں پڑھایا، تمہاری ہی خواہش پر صرف ڈیڑھ سال پہلے تمہیں نئی بائیک لے کر دی تھی حالانکہ گھر میں گاڑی کی سہولت پہلے سے ہی موجود تھی۔“ زیادہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نمایاں تھی مگر دادی اماں نے بات

بڑا کیا وہ آج انہی کے لیے بچہ کیسے بن سکتے ہیں؟

☆☆☆

زیادہ، پروفیسر محمود کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا اکلوتا چھوٹا بھائی..... زیادہ کے خیال میں وہ لاڈلا، اکلوتا، کبھی نہیں رہا۔ اور اس کی وجہ زیادہ کے خیال میں خود اس کے والد محترم تھے۔ پروفیسر محمود اصول پرست اور سادہ طرز زندگی کے عادی ایک ایسی شخصیت، جن کے مداحوں میں ان کے اسٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ اہل محلہ بھی شامل تھے۔ معلم کے طور پر قابل تحسین زندگی گزاری تھی۔ حلال کھایا تھا اور حلال کمایا تھا۔ بقول بیٹے کے بہت زیادہ کمایا تھا مگر کہاں ٹھکانے لگایا تھا یہ اس کی نظر میں باپ کی زندگی کا سربستہ راز تھا۔ اس کی اپنی نظر میں وہ خاصی مظلوم زندگی گزار رہا تھا جس میں اس کی ڈھیروں آرزوؤں کا خون ہو رہا تھا۔ بہت سی خواہشات مارتا پڑ رہی تھیں۔ زندگی کی ہر سانس پروفیسر صاحب کے حکم کے تابع تھی۔

”دودھ زندگی کا لازمی جزو، نہار منہ بادام ضرور کھانے ہیں، سونے سے پہلے چائے، کافی نہیں پینی؟ سردیوں میں ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ دودھ چلبلی لازمی کھانی ہے، رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر رہنا ممنوع ہے، گھر میں چاہے ستر دوست بلوالو مگر ہوٹلوں، کلبوں میں دوستوں کے ساتھ غل غپاڑا کرنا حرام، کمرے کا دروازہ بلاوجہ لاک نہیں کرنا اور باتھ روم میں نہانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہونے چاہئیں۔“ ان تمام احکامات کو مانتے زیادہ، بچے سے جوان ہوا تھا پر اب وہ آزادی چاہتا تھا۔ وہ ناشتے میں دودھ کے بجائے ڈھیر ساری کافی حلق سے اتارنے کا خواہش مند تھا۔ باداموں سے آسے چڑھ گئی تھی۔ وہ کھلی پاکٹ منی کا خواہش مند تھا۔ زندگی ایک ڈھب پر گزارتے، عاجز آچکا تھا۔ وہ پروفیسر صاحب کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ

جاری رکھی تھی۔ ”اور میرا خیال ہے کہ صرف چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ناں تمہیں لپ ٹاپ لے کر دیے ہوئے۔ تمہاری تین بہنوں کی تعلیم و تربیت اور پھر مناسب جہیز کے ساتھ بیاہ، میرا خیال ہے تمہارے باپ نے ہی کیے ہیں۔ پروفیسر درویش منٹس ضرور ہے مگر دنیا داری نبھانا جانتا ہے۔ اب اگر تمہاری بیوی بائی کو فضول خرچ مان کر وہ دلانے سے انکار کر رہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کچھ نہیں..... نہیں ہوں گے اس کے پاس اس قدر پیسے..... اپنے باپ کو سمجھو زیادہ..... اسے آزماؤ مت.....“ آخر میں دادی کا لہجہ بلاشبہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”یہی تو..... یہی تو دادی اماں.....“ آخر کہاں جاتے ہیں پیسے.....؟ میں نہیں مانتا کہ ابو کے پاس پیسے نہیں..... وہ میٹھس، اسٹیشن کے جانے مانے استاد ہیں، اکیڈمی بھی رن کر رہے ہیں پھر بھی آپ کہتی ہیں، پیسے نہیں..... چھوڑیں بھئی.....“ زیادہ نے تنفر سے سر جھٹکا اور دادی اماں کے دل کو جھٹکا لگا تھا۔ ان کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بت بنی زیادہ کو پلٹ کر واپس جاتے اور بائیک کے پاس پڑے اوزار سیٹھے دیکھتی رہی۔

2015 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015

اب بچہ نہیں رہا بلکہ ایم بی اے کے فائل سمسٹر میں آچکا ہے۔ اس کا حلقہ احباب ہے..... وہ شہر کی ایک بہترین یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے (جو بقول اس کے پروفیسر صاحب نے محض دھاک بٹھانے کے لیے اس کا شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا کر، اتنا خرچا کیا ہے) اب اگر وہ ایسی اونچی جگہ پر پڑھے گا تو رکھ رکھاؤ تو رکھنا پڑے گا ناں.....

اور اس نے کوئی ایسی بیوی ڈیمانڈ تو نہیں کی محض ”بیوی بائیک“ ہی تو مانگی ہے مگر پروفیسر صاحب کا میانہ روی کا اصول ان کے آڑے آ رہا تھا جبکہ زیادہ کے خیال میں اصل رکاوٹ ”بجل“ ہے، پروفیسر صاحب اپنی اولاد کے معاملے میں کنجوس ہیں، ٹھیک ہے اگر کچھ عرصہ پہلے ہی انہوں نے نئی بائیک دلانی تھی تو کیا ہوا.....؟ کیا باپ ایک کے بعد دوسری چیز نہیں دلاتے.....؟ اس کا اصل رونا ہی یہی تھا کہ پروفیسر صاحب پیسے کا کیا کرتے ہیں؟ ان کے ”سوشل اسٹیشن“ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پھوں پھاں کی عادت نہ ان میں تھی نہ امی میں..... گھر بھی سادگی اور سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا تو پھر اس کا ”حق.....“ پروفیسر صاحب کے دیتے رہے ہیں جو اس کے لیے ان کے پاس محض ایک بیوی بائیک کے لیے رقم نہیں..... کہاں جاتا ہے میرا حق.....؟ اور زیادہ... کو زیادہ دن تک یہ کھوج نہیں لگانی پڑی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما عروج پر تھا۔ رات بھی شدید بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ٹھنڈ میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ مگر صبح سورج نکلنے کی وجہ سے گھروں کے صحن پر رونق ہو گئے تھے۔ اتوار کا دن تھا، اس لیے ہر گھر سے بچوں کی چپکار کی آواز آتی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب بھی طبیعت میں گرانی کے کارن آج گھر میں موجود تھے۔ حالانکہ چھٹی کے دن وہ کبھی گھر

میں نہیں نکلتے تھے۔ ضرور کسی نہ کسی کے بلاوے پر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ اس وقت وہ دھوپ کا لطف اٹھاتے تازہ اخبار کی سطر، سطر پڑھنے میں مصروف تھے۔ امی کچن میں ابوی کی پسند کے پکوان بنانے میں لگی تھیں کہ کوئی تو دن ہوتا تھا جب شوہر سارا دن گھر میں موجود ہوتے تھے جبکہ دادی اماں حسب معمول ملازمہ سے پنڈلیوں کی مالش کروانے کے بعد وہ صحن میں کرسی ڈالے معمول کی تسبیحات پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زیادہ تک سک سے تیار کمرے سے باہر آیا تھا۔ آج اس کا پروگرام اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی بیوی بائیکس کو لانگ روٹ پر انجوائے کرنے کا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب کو صحن میں موجود پا کر ٹھنک گیا تھا کیونکہ وہ یقیناً اس کی تیاری دیکھ کر ٹھنک جاتے۔ دل میں ہزار بہانے تیار کرتا وہ بے قدموں باہر آیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا چہرہ پوری طرح سے اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا لہذا پنا چاہ کے وہ صحن سے ملحق چھوٹی ٹی ٹی میں کھڑی بائیک کو احتیاط سے گھسیٹ کر گلی کے آخری سرے پر بنے چھوٹے گیٹ سے باہر نکال لینا چاہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی پوچھ پڑتال سے بچ کر نکلنے کا یہ طریقہ خاصا احتیاط تھا۔ روزانہ سیکڑوں طالب علموں کی چال سے ان کی شخصیت جانچ لینے والا معلم اپنی اولاد کے قدموں کی چاہ کیسے نہیں پرکھ سکتا.....؟ زیادہ نے پنا آواز کیے بائیک کو اسٹینڈ سے اتارا تھا اور چند قدموں کے فاصلے تک بائیک کو ابھی گھسیٹ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔

”برخوردار.....! سانسے کہتے ہیں کہ بائیک کو کک لگائی جائے تو وہ چلتی ہے، تم بھی ایسی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ زیادہ کا دل چاہا بائیک کو ایک زور دار دھکا دے اور صحن کی دیوار پر دے مارے مگر وہ ہمیشہ کی طرح بے بس تھا۔ اس نے پلٹ کر پروفیسر



صاحب کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر آواز اخبار کے پیچھے سے آئی تھی۔ زیادہ غور سے اخبار میں وہ سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں سے انہوں نے زیادہ کوٹاڑا تھا۔ دادی اماں جو بیٹھے، بیٹھے اونگھنے لگی تھیں، الرٹ ہو کر پوتے کی طرف متوجہ تھیں۔ اب جواب دینے کے بغیر چارہ نہیں تھا بھی بولا۔

”وہ اصل میں ابو..... یونیورسٹی میں فائنل سسٹریکل رہا ہے اس لیے اسائنمنٹ بنانے کے لیے سب دوست اکٹھے ہو رہے ہیں اور بائیک تو ویسے بھی دس منٹ لے ہی لیتی ہے، اشارت ہونے میں۔ بہت تنگ کرنے لگی ہے۔“ زیادہ بوکھلا ضرور گیا تھا مگر بائیک کا خود ساختہ نقص بتانا نہیں بھولا تھا۔

”اچھا! لاؤ میں بھی تو دیکھوں ذرا.....“ پروفیسر صاحب نے مصنوعی فکر مندی سے اخبار لپیٹا۔ ”نہیں، نہیں ابو..... اتنی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں.....“ زیادہ نے قفاٹ بائیک پر بیٹھ کر اسے کلک لگائی تھی۔ پروفیسر صاحب کے بقول..... بےوقوفانہ طرز عمل اس پر ختم تھا۔ اب بھی اپنے عمل سے اپنے بیان کی نفی کر بیٹھا تھا۔

”ہوں..... اچھا ہوا اشارت ہوگئی۔“ پروفیسر صاحب نے دوبارہ کرسی سے ٹیک لگائی اور بولے۔ ”نہیں تو مکینک کی خیر نہیں تھی برخوردار.....! آخر پوری تسلی دی تھی اس نے بائیک کی حالت کے بارے میں۔“

دادی اماں نے باپ، بیٹے کی نوک جھوک پر۔ بمشکل ہنسی دہائی تھی۔ زیادہ جان چھڑاتا اشارت بائیک کو لے کر گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی..... اس نے بائیک پر بیٹھے، بیٹھے دروازہ کھولا، قدوسی صاحب تھے، پروفیسر صاحب کے قریبی دوست..... اس نے سلام کر کے انہیں اندر آنے کو کہا اور خود ان کے ذرا پہلو سے بائیک باہر لے جانے لگا تھا کہ قدوسی صاحب نے اسے روک لیا۔

”بیٹا! یہ رسید پروفیسر صاحب کو دے دو۔ ان سے کہتا کہ جن کو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے بھجوائے تھے، یہ ان کی طرف سے ہے۔ ابھی میں جلدی میں ہوں پھر کسی وقت آ کر تفصیلاً بات کروں گا..... ابھی چلتا ہوں.....“ قدوسی صاحب ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر چلے گئے۔ یہ جانے بغیر کہ زیادہ کے دل میں لگی چنگاری کو ہوا دکھا گئے ہیں۔ ایک بیٹے کو باپ کے مقابل کھڑا کرنے کا سامان فراہم کر گئے ہیں۔ لمحوں میں زیادہ کا دماغ سلگنے لگا تھا۔ اندرونی خلفشار اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس لیے کہ ابھی کل بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا جب ایک دور پرے کی رشتے دار آ کر پروفیسر صاحب کی دریا دلی کے گن گارہی تھیں اور اپنے کمرے میں موجود زیادہ سب بن رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بائیک کو مسلسل ریس دینے لگا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے پروفیسر صاحب کا دل سکڑ کر پھیلا تھا، زبان جیسے خشک ہو کر تالو کو جا لگی تھی جو بھی تھا زیادہ میں ان کی جان تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ساری عمر نہ ڈرے تھے، نہ جھکے تھے۔

دادی اماں ساری صورت حال کی سنگینی جانچ کر زیادہ کو آواز دے بیٹھیں۔ وہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ اس وقت زیادہ بائیک پر کہیں جائے..... جذباتی اور غصہ ورتو وہ شروع سے تھا۔ دادی اماں کی آواز سن کر زیادہ نے لال بوٹی ہوتی آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا تو نظر قریب کھڑے باپ کے مطمئن چہرے پر جا لگی۔ اور اگلے ہی لمحے رسید کی پرچی باپ کے پیروں میں پھینکتا وہ طوفان کی طرح بائیک نکال کر لے گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ پروفیسر صاحب نے وہ رسید یوں جھپٹ کر اٹھائی تھی جیسے وہ رسید نہیں کوئی قیمتی خزانہ ہو.....

☆☆☆
شام ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی اذانیں بلند ہونا

شروع ہوگئی تھیں۔ مگر اس گھر کا ایک بوڑھا، کمزور اور بیمار وجود جبکہ دو بڑے چاہے کی دلیر پرکھڑے نیم تو اتنا نفوس سچ سے خالی پیٹ، صحن میں بیٹھے صرف جوان بیٹے کی راہ تک رہے تھے۔ امی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کو تنکا جہاں پرندے گھروں کو اڑان بھر رہے تھے۔

”زیادہ تو بھی گھر لوٹ آ..... میرے بچے.....“ ماں کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ دادی اماں کا سردی کی شدت سے چنخٹا بوڑھا چہرہ، جوان پوتے کے لیے فکر مند تھا تو نڈھال پروفیسر صاحب کا مضبوط دل بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے ماں کو بہت دفعہ اندر کمرے میں بھیجنے کی اور کچھ کھلانے کی کوشش کی مگر بے سود..... لاکھ باشعور سہمی..... مدلل طرز گفتگو رکھنے والی عورت سہمی..... اندر سے وہ روایتی دادی اماں ہی تھیں..... ”اصل“ سے زیادہ انہیں بھی ”سوڈ“ پیارا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کتنے لمحے سر کے تھے کہ زیادہ کی مخصوص ڈپلیکٹ جاپی کی کھٹک نے ان..... تینوں کو زندہ کر دیا تھا۔ گیٹ کھلا اور زیادہ خاموشی سے بائیک کھینچا اندر چلا آیا۔ ان تینوں نے بائیک کی بدتر حالت کو دیکھا مگر کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا..... جو چی، چی کر کسی شدید ایکسیڈنٹ کا پتا دے رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ جس جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر زیادہ گھر سے نکلا تھا اس میں، اس کا بھیریت گھر واپس آ جانا غنیمت تھا۔ پروفیسر صاحب کے لبوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا تھا، بائیک کی حالت دیکھ کر خود کھلامی کی۔

”غبیٹ! سچ میں بائیک ٹھوک آیا ہے، ناقابل استعمال بنانے کی ہر ممکن کوشش.....“ بیٹے کو خیریت سے سامنے دیکھ کر دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دو چار تھپڑ بھی جڑ دیں۔ امی اور دادی اماں دونوں زیادہ سے لپٹ، لپٹ جا رہی تھیں۔ دونوں ٹٹول، ٹٹول کر اس کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مبادا کہیں خود کو بھی چوٹ لگو الایا ہو۔

سنو لڑکی!.....
زمانے کی طرح تم نے کسی کے خواب دیکھے ہیں
اگر خوابوں کی تعبیریں کبھی زندہ بھی رکھی ہیں
تو اپنے پیار کی خاطر
زمانے کو بھی بھی درمیاں اپنے نہیں لاتا
زمانہ تو کسی کیدو سے ہرگز کم نہیں جاتا
سنو لڑکی.....

شاعرہ: فریدہ فری..... لاہور

اصل جواب
ٹھنچر: ”دو میں سے دو نکلے تو کیا بچا.....؟“

اسٹوڈنٹ ”ہم کو سوال سمجھ نہیں آیا؟“
ٹھنچر: ”تمہارے پاس دو روٹیاں تھیں تم نے ان کو کھا لیا اب تمہارے پاس کیا بچا؟“
اسٹوڈنٹ: ”سالن!“

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

ہنستے رہو
☆ چوٹی رکشے میں بیٹھی اور پاؤں باہر رکھا۔
ڈرائیور: ”میم! پاؤں اندر کر لیجئے۔“
چوٹی: ”نہیں راستے میں ہاتھی ملا تو لات مارتی ہے، کل منہ چڑا کر گیا تھا.....“

☆☆☆

☆ لڑکی: ”آپ میری مستغنی پر کیا تحفہ دیں گے؟“
سکھ: ”جو آپ کہو گی۔“
لڑکی: ”رنگ دے دیتا۔“
سکھ: ”ٹھیک ہے پر اسٹیڈنٹ کرنا بیلنس کٹ جاتا ہے۔“

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

”اب بس بھی کریں آپ دونوں..... آپ کا بیٹا دلگ جیت کر نہیں آ رہا بلکہ پورے شہر میں پھرتے آوارہ کتوں کی کنٹی کر کے آرہے ہیں برخوردار..... دیکھ نہیں رہیں خود کی حالت کیسی ہو رہی ہے؟ اور رہ گئی باینک تو اس کا تیا پانچا آج نہیں تو کل لازمی تھا۔“ پروفیسر صاحب سارے دن کی کھولن اتارنا لازمی سمجھ رہے تھے جبکہ دادی اماں اور امی مسلسل انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر رہی تھیں۔ مگر پروفیسر صاحب مکمل فارم میں تھے۔

”کہاں تھے تم سارا دن.....؟ گھر والوں کی فکر یا پروانچ کھائی ہے..... اور باینک پر کیا ظلم ڈھایا ہے، ذرا یہ بھی بتا دو.....“ پروفیسر صاحب کو خاموش کھڑے زیاد کی خاموشی سے جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

وہ شعوری طور پر اسے بلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ رسید والے واقعے کے حوالے سے زیاد کار عمل جان لینا چاہتے تھے مگر وہ پروفیسر صاحب کے سوالات کے باوجود خاموش کھڑا کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف تھا۔ بھی پروفیسر صاحب دھیرے دھیرے چلتے باینک کے پاس آئے اور جا سختی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد بولے۔

”چلو تمہاری مرضی تو پوری ہوئی اب..... نئی باینک کا سبب بنا ہی لیا آخر.....“ پروفیسر صاحب کی زبان سے الفاظ کیا ادا ہوئے، زیاد کے تھکے ہوئے اعصاب پہ گویا بٹر برس گیا، وہ یک دم پھٹ پڑا تھا۔

”مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی..... پاس رکھیے آپ..... اپنے پیسے..... آپ کے خزانے میں کی آجائے گی ورنہ..... آپ غیروں کو لاکھ دیکھیے یا دو لاکھ..... مجھے پروا نہیں مگر اب مجھے آپ کے خزانے میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جوڑ کر رکھیے، سنبھالیے اپنے خزانے کو سدا.....“

”یکو اس بند کرو زیاد.....“ دادی اماں سے برداشت نہیں ہو سکا۔ بھی تڑپ کر بولیں۔ ”کیا

خزانہ، خزانہ لگا رکھی ہے؟ کون سی ایسی چیز ہے جو تم بچوں سے چھپا کر رکھی گئی ہے؟ کہاں گڑا دیکھ لیا تم نے ان دیکھا خزانہ.....؟“ زیاد اس قدر متنفر ہوگا، کسی کو گمان تک نہیں تھا۔

”یہ تو پروفیسر صاحب کو پتا ہوگا نا..... میں کیا جانوں.....؟ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ اوروں کے لیے ان کے پاس دینے کو لاکھ، لاکھ، ڈیڑھ، ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے، جو یہ خدا ترسی کرتے ہوئے دیے جا رہے ہیں مگر اپنے سگے بیٹے کے لیے..... اپنے خزانے میں سے محض ایک بیوی باینک کے لیے بھی پیسے نہیں دے سکتے تو پھر مجھے بھی کوئی پروا نہیں..... ان کا خزانہ، انہی کو مبارک.....! مگر مجھے ساری عمر یہ دکھ ضرور رہے گا کہ تمام عالم کو علم کی روشنی بانٹنے والا میرا باپ ”بخیل“ ہے۔“

”زیاد.....“ امی اس درجہ گستاخی پہ ششدر رہ گئی تھیں اور ان کا ہاتھ پھڑ مارنے کے لیے اوپر اٹھا تھا جسے نرمی سے پروفیسر صاحب نے تمام کر نیچے کر دیا تھا۔

”مار لیں..... مار لیں کیا فرق پڑ جائے گا.....؟ کم از کم مارنے کے معاملے میں تو بخل سے کام نہ لیں۔“ زیاد استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا کمرے کا رخ کرنے لگا، جب اسے اپنے پیچھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

”زیاد! ذرا میرے کمرے میں چلو..... آج میں تمہیں اپنا پوشیدہ خزانہ دکھا دینا چاہتا ہوں.....۔ چلو.....“ پروفیسر صاحب نے قدم بڑھائے تھے۔ زیاد نے حیرت اور بے یقینی سے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور پھر بولا۔

”سچ میں.....؟ دیکھیں ابو مجھے آپ کی دولت جائداد کی ہوس نہیں..... مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سا ”خفیہ خزانہ“ ہے جو میں آپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا، جہاں سے دنیا بھر کی

اعداد کے لیے بڑی بڑی رقمیں نکل آتی ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی زیاد کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور کہیں دل میں شرمندگی کا احساس بھی جگہ بنا رہا تھا۔

”ہے..... واقعی ہے، ایسا خفیہ خزانہ ہے جو تمام کائنات کے خزانوں پر بھاری ہے مگر میں زندگی میں اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔“ پروفیسر صاحب کے ٹھنڈے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا جس نے زیاد کے احساسات کو پل بھر کے لیے منجمد کر دیا تھا۔

”اور میں.....؟“ زیاد نے سینے پر انگلی رکھ کر باپ سے سوال کیا۔

”کیا میرے نفع کے لیے ہے وہ خزانہ.....؟“ ”نہیں، تم بھی اس سے زندگی میں نفع نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی موت آجائے.....“

امی اور دادی اماں نے کیجے تھامے تھے جبکہ زیاد کی آنکھیں شدت حیرت سے پھینکنے کے قریب تھیں۔

”اور یاد رکھو تم نے وہ خزانہ اگر اپنی اولاد کو منتقل کیا تو وہ بھی اس سے قبل از مرگ نفع نہیں اٹھا سکتی..... اب چلو میرے ساتھ کمرے میں، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ آپ دونوں خواتین یہیں رکھیے.....“ پروفیسر صاحب نے ماں اور بیوی کو مخاطب کیا۔ ”اور ایک باپ کے اپنی اولاد کے سامنے سرخرو ہونے کی دعا کیجیے گا۔“ آخری فقرہ کہتے، پروفیسر صاحب کا لہجہ بھرا گیا۔ زیاد، باپ کے قدم پہ قدم رکھتا ان کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

پروفیسر صاحب نے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا اور خود دھیرے سے پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

”میری الماری کا دایاں پٹ کھولو.....“

پروفیسر صاحب نے دروازے پر جھکے کھڑے زیاد کو کہا۔ ”اب چلی دراز کو کھولو اور اس کے پچھلے خانے میں چھوٹا سا ڈبا رکھا ہے۔ اسے نکال لاؤ۔“ زیاد کسی معمول کی طرح پروفیسر صاحب کے کہنے کے مطابق

عمل کرتا ہوا دراز کھولنے لگا۔ دراز کے پچھلے خانے میں واقعی ایک چھوٹا سا سختہ حال لکڑی کا ڈبا بڑا تھا۔ زیاد نے اسے نکال کر ہاتھوں میں لیا اور پہلی سوچ اس کے دماغ میں جو آئی وہ یہ تھی۔

”اتنے چھوٹے ڈبے میں..... بڑا خزانہ.....؟ شاید سونے کے لٹکٹ.....؟“ ایک میٹھی، میٹھی سی لہر زیاد کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے زیاد کی شخصیت پر جو لگ ہمیشہ نصب کیے رکھا تھا۔

”احتمقانہ خیالات.....! احتمالانہ حرکات..... زیاد.....“ وہ واقعتاً اس پرفٹ بیٹھتا تھا۔

”اسے میرے پاس لے آؤ۔“ نامعلوم ابھی کتنی دیر زیاد کا وجود میٹھی، میٹھی لہروں کے سپرد رہتا جیسی اسے پروفیسر صاحب نے پکار لیا۔ اس نے خاموشی سے پلٹ کر باکس باپ کے حوالے کیا اور خود قریب بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پروفیسر صاحب چند لمحے گہری سوچتی نگاہوں سے اس باکس کو دیکھتے رہے۔ زیاد کو اس لمحے باپ کی آنکھوں میں واضح نمی دکھائی دی تھی پھر انہوں نے باکس کا چھوٹا سا سختہ پک ہٹا کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔ زیاد نے خوشی اور تجسس کے تحت کچھ اچک کر اس باکس میں جھانکا اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

اس میں ڈھیروں کاغذ اور بوسیدہ رسیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف تو پرانی رسیدوں کا چھوٹا سا بنڈل پڑا تھا جو سارا کا سارا پیلا پڑ چکا تھا۔ پتا نہیں کس صدی کے کاغذ تھے۔ ان ان گنت چھوٹے کاغذوں اور رسیدوں میں زیاد کو کام کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ اسے پروفیسر صاحب پر شدید غصہ آ رہا تھا جو اسے بے وقوف بنا رہے تھے مگر ضبط کیے بیٹھا رہا اور پھر پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

”تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ان رسیدوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے تمہارا کوفت بھرا جیس ختم

کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل میں جاؤں گا۔“ زیاد نے فوراً چہرے کے تاثرات نارمل کیے پروفیسر صاحب باپ تھے، جان گئے تھے بیٹے کے جذبات.....

”تمہارے دادا رحمت اللہ ٹھیٹھ کاروباری آدمی تھے۔ صرف اپنے گھر والوں کی نظر میں اور انتہائی خدا ترس اور ہمدرد تھے دنیا کی نظر میں..... تمہاری طرح ہمیں بھی ان سے شکایتیں تھیں۔ پیسے کی کمی کی..... مائیں پوری نہ کرنے کی..... عیش و عشرت کا سامان مہیا نہ کرنے کی..... ان کا کام محض گھر میں راشن ڈالنا اور بھول جانا تھا۔ اماں کو لگا بندھا پکڑاتے تھے اور پھر اماں ہوتیں اور ان کے رونے..... وہ کیسے ہم بہن بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرتیں، کیسے فیسیں دیتیں۔ اباجی کو کبھی سروکار نہیں تھا ان باتوں سے۔ بہت سے گلے شکوے دل میں لیے ہم بہن بھائی اپنے، اپنے ٹھکانے لگے اور اباجی اپنے آخری ٹھکانے..... اور پھر جس دن وہ مرے اس دن ہم پر کھلا کہ اباجی محض ہمیں یتیم نہیں کر گئے بلکہ ایک دنیا کو بے آسرا چھوڑ گئے۔ ان کی میت پر ان کی اولاد سے زیادہ رونے والے انجان لوگ تھے۔ جو روتے جاتے اور ہمیں بتاتے جاتے تھے کہ کس کے گھر کا چولہا اباجی کے دم سے جلتا تھا۔ کس کی بیٹی اباجی کی وجہ سے بیاہی گئی..... کس کو روزگار اباجی نے دلایا۔ کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ اور بہت سے لوگوں کا بہت کچھ اباجی اپنے سنگ سمیٹ کر لے گئے۔ بہت دن بعد جب میں نے اباجی کی دکان کھولی تو وہاں کسی کو نہ کھدے سے مجھے یہ ڈبلا ملا..... بالکل ایسا ہی جس میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا تمہارے دل میں ابھرا تھا۔ میں نے بھی یہی گمان کیا کہ میرے ہاتھ نہ جانے کیا خزانہ لگنے والا ہے..... شکر تھا اباجی کو ہمارا خیال تو آیا..... ساری عمر دوسروں کو بھرتے رہے اب مرنے کے بعد ہمیں بھی کچھ نواز ہی گئے۔

مگر جیسے ہی میں نے ڈبے کا ہک ہٹایا..... ڈھیر سارے چھوٹے، چھوٹے کاغذ کے ٹرے میرا منہ چڑا رہے تھے..... بالکل ویسا ہی تاثر اور غصہ میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا اباجی میں نے تمہارے چہرے پر دیکھا تھا..... میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور ان کاغذ کے ٹرے کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی بات تھی..... ہر دوسرے ٹرے پر تقریباً ایک جیسی عبارت لکھی تھی۔

”لالہ رحمت اللہ..... دس روپے کی روٹی“

”لالہ رحمت اللہ..... پانچ روپے کی روٹی“

”لالہ رحمت اللہ..... سات روپے کی روٹی“

میں نے باقی کاغذوں کو بھی پھروں کے دیکھا جن میں سے کافی ساری تو رسیدیں تھیں اور کسی میں چھوٹی، چھوٹی سی لکھائی میں پیسوں کا حساب کتاب لکھا تھا۔ اباجی میں اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں پڑی چوکی پہ محمد دین چاچا آ کر بیٹھ گئے۔ چاچا محمد دین اباجی کے بہت قریبی یار دوستوں میں سے تھے۔ بالکل سامنے ہی ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اباجی کی دکان کھلی دیکھی اور مجھے اس میں موجود پا کر اٹھ کر میرے پاس چلے آئے..... میں ان سے ملنے کے لیے اٹھنے لگا تو مجھے کندھے سے تھپک کر بٹھا دیا۔ ان کی آنکھیں بھرا آئی تھیں..... شاید اباجی کی یاد نے چٹکی لی تھی۔ دونوں کی بیٹھک بھی بڑی تھی ایک دوسرے کے ساتھ..... میرے ہاتھوں میں موجود ڈبے اور اس میں موجود کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ میں مجھ سے پوچھنے لگے۔

”کیا دیکھ رہا ہے محمد پتر..... کیا ڈھونڈنا چاہ رہا ہے؟“ ان کی نظروں میں ناقابل فہم سا تاثر تھا۔ مجھے عجیب طرح کی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں چاچا جی..... وہ میں بس..... یونہی..... آج ویسے ہی دکان کھولنے کو جی کیا تو چلا آیا..... سوچا کہ.....“ میں نے جواب دیا۔

”کیا سوچا.....؟“ چاچا نے میری بات اچک لی۔

”یہی کہ تیرا باپ اس دکان میں تم لوگوں کے لیے کون سا خزانہ چھپا کر گیا ہے؟“ چاچا سر جھٹک کر دھیما سا ہنسے جبکہ میں شرم سے سینے، سینے ہو گیا۔

”شرم نہ کھا پتر..... آخر جو ہے تم سب کا ہی ہے۔ وارثت کے لیے شرم کیوں کھائی..... پر پتر ترک تو، تو ہاتھ میں تھام کر بیٹھا ہے۔“ چاچا نے میرا دھیان ڈبے کی طرف کرایا۔

”کیا..... یہ ڈبہ..... ہمارا ترکہ.....؟“

مجھے لگا چاچا دین محمد بگلا گیا ہے..... کیسی عجیب بات کر رہا تھا نا.....؟ بھلا کبھی کسی باپ نے اولاد کے لیے وراثت میں پرچیاں بھی چھوڑی ہوں گی.....؟ مگر میں اپنے مرے باپ کے لیے کچھ بھی نہیں کہتا چاہتا تھا۔ مجھ میں برداشت اور تحمل بہت زیادہ تھا کہ ایک یہ واحد چیز تھی جو ہمارے باپ کی طرف سے ہم بچوں کو وافر ملنے والی سہولت تھی کیونکہ کسی بھی دکھ، درد، تنگی، ترشی میں اس خصوصیت کا موجود ہونا ہی کسی سہولت سے کم نہیں ہوتا.....

”کیوں تاؤ کھا رہا ہے پتر.....؟“ چاچا محمد دین کی آواز نے میرے خیالات کی ڈور کھینچی..... مجھے چاچا کے درست قیاس پہ حیرت بھی ہوئی۔ یہ پرانے وقتوں کے بابے، بابیاں (بوڑھے، بوڑھیاں) آپ کے کچھ نہ بھی لگتے ہوں تو پھر بھی آپ کی سوچیں گئے ماں، باپ کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔“ باپ یہ غصہ نہ کر..... تیرا باپ بڑا درویش آدمی تھا۔ تم لوگ جو بھی سمجھو..... پر دنیا جانتی ہے کہ وہ نکلے کو پترا اور بھوکے کو نوالہ دینے والوں میں سے تھا۔ یہ جو ڈبہ تیرے ہاتھوں میں ہے نا..... اگر تیری عقل سے پا جائے تو یہ سچ میں خزانہ ہے۔ اس ڈبے میں تیرے باپ کا کردار بند ہے۔ اس کی خدا ترسی، ہمدردی اور غریبوں کی دعائیں جمع ہوئی رکھی ہیں۔ سچ پوچھ تو اس میں لوگوں کی وہ گواہیاں

بند ہیں جنہیں تیرے میرے جیسے فقیر روز قیامت اپنے نیک اعمال کا وزن زیادہ کرنے کو، حلق سے باہر زبانیں لٹکانے ڈھونڈتے پھریں گے۔ یہ جو تو پرچی دیکھ رہا ہے نا.....“ چاچا نے ہاتھ بڑھا کر وہی پرچی تھامی جس پر لکھا تھا۔

”لالہ رحمت اللہ، دس روپے کی روٹی.....“

”یہ تیرے باپ کا روز کا کام تھا..... سامنے جو یونس ہوٹل ہے نا..... اُدھر تیرے باپ نے کہہ رکھا تھا کہ دن بھر میں جو فقیر، غریب خواہ ضرورت مند یا ڈھونگی، لالہ رحمت اللہ کا نام لے کر روٹی مانگے تو اسے کبھی نہ مت کہنا۔ جتنا مرضی کھالے، کھانے دینا اور رات میں ایک ہی دفعہ حساب کی پرچی میری دکان پر پہنچا دینا..... یہ پرچیاں اسی کھاتے کی ہیں۔ روزانہ نہ جانے کتنے چھوٹے تو کتنے سچے آ کر کھانا کھاتے اور تیرا باپ مل چکا تا۔ اصل میں جو بھی رحمت اللہ کی ہٹی یہ مانگنے آتا وہ اسے سامنے ہوٹل روانہ کر دیتا۔ دیکھا، دیکھی وہ لوگ بھی جانے لگے جنہیں تیرے باپ نے نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ مگر پھر رحمت اللہ کو ساری دیہاڑی (دن) کی چاہے دس روپے کی روٹی پڑتی یا پندرہ کی..... اس کے ہتھے کبھی وٹ نہیں پڑا (اس زمانے میں دس روپے کی بھی اہمیت بہت زیادہ تھی) حاجی کرم دین کے پتر کو دکان تیرے پیو (باپ) نے ہی ڈال کر دی تھی۔ جس سے اس غریب کے بچے پلنے شروع ہوئے، کہہ ہاروں کا منڈا وہی کیسے پہنچ گیا.....؟ تیرے باپ کے دیے ادھار سے، جو کبھی واپس نہیں ہوا۔ رحمت اللہ روز رات کو اپنا دیا ہوا معاف کر کے سوانے ولوں میں سے تھا۔

یہ جو ادھار لیس ہے، پچھلی گلی میں جھکی ڈال رکھی ہے جس نے..... وہ جب عیسائی سے مسلمان ہوا تو اسے کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ مسلمان اب بھی اس سے کھج (کراہیت) کھاتے اور عیسائی پوچھتا نہ تھا۔ تو تیرا باپ ہی تھا جس کی دکان سے

یہ مرد بھی ناں.....

تجلی نفس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا کہ یونین الرجنی نے شدید حملہ کر دیا تھا..... اور رات کے اس پہر میں بے بسی میں یوں سانس کیا لے رہی تھی لگتا تھا ابھی دم گھٹ جائے گا۔ شوہر نامہ دار اپنی اسٹڈی روم میں کانوں پر ہیڈ فون لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مطالعہ اور موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ گرتی پڑتی ان کے کمرے میں اشاروں سے اپنی حالت زار بتائی۔ میری طرف متوجہ ہوئے، ہیڈ فون اتار کر احوال پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں! (یہ جملہ ان کا دل جلا یا کرتا تھا) اگر ایمر جنسی میں جلدی نہ لے جایا گیا تو حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔ بڑ بڑاتے ہوئے اٹھے، گاڑی نکالی اور مجھے ایمر جنسی سیکشن میں اسپتال لے گئے۔ راستہ بھر..... بولتے رہے، یہ بے وقت کیوں بیمار ہوئیں، یہ کون سا وقت ہے بے آرام کرنے کا..... میں ان کی عادت سے واقف تھی سنتی رہی..... خیر اسپتال میں آلہ بحالی تنفس میرا مطلب ہے آکسیجن سے میری بے ربط سانس بحال ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد میں پُرسکون سی ہو کر گھر آ کر سو گئی۔

شب و روز گزرتے رہے۔ ایک رات ٹھیک ایک بجے مجھے نیند سے جگا یا اور کہا کہ میری

اسے راشن پانی جاتا تھا۔ کون، کون سے بندے گنواؤں تجھے.....؟ میں مانتا ہوں پتر کہ تم بچوں کے لیے تمہارا باپ کوئی لمبی چوڑی جائیداد چھوڑ کر نہیں مرا..... مگر پتر اس غریب پرورد کی مدد نے اس طرح کی کہ آج اس کی ساری اولاد کسی نہ کسی لائق ہو چکی ہے تو بھی بہت سا پڑھ گیا..... بہنیں تیری بیانی لگیں۔ بھائی تیرا کمائی سے لگ گیا.....

پتر محمود.....! تیرے باپ نے یہ ڈبا دنیا دکھاوے کو نہیں بھرا..... وہ تو تاریکیوں میں گھروں کو راشن ڈھوتا تھا۔ یہ ڈبا وہ تم لوگوں کے لیے اس لیے چھوڑ گیا کہ شاید اس کی کسی اولاد کے ہاتھوں اس کے خزانے میں واد (زیادتی) ہوتا رہے۔ اس نے ان اعمال کے اجر کے لیے دنیا میں آس نہیں لگائی تھی۔ وہ تو کہتا ہی اس کو "وڈے دن کا خزانہ....." (روزِ حشر کا خزانہ) تھا جو پتر ہر کوئی اکٹھا نہیں کر پاتا..... تیرے میرے جیسے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

بڑی، بڑی باتیں کرنے والوں کے کام بھی بڑے ہوں، یہ ضروری نہیں ہوتا کبھی بکھار بازی وہ لوگ مار لیتے ہیں جو کم فہم سمجھے جاتے ہیں۔ اب یہ تجھ پہ ہے کہ پتر کہ اپنے باپ کے لیے صدقہ چارہ بن جا اور ڈالتا رہ اس خزانے میں اعمال کے موئی اگر نہیں تو اٹھ اور سامنے والے نالے میں روڑ (بہا) آ..... تیرے باپ کی روح یقیناً سمجھ جائے گی کہ اس کی اولاد اس کا ترکہ سنبھال نہ سکی۔ اس کی چھوڑی جائیداد نالے کے نذر ہو گئی....." چاچا محمد دین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کندھے پر بڑا صاف اتار کر اپنی آنکھیں صاف کیں پھر کھڑے ہو کر میرا کندھا تھپک کر دکان پار کر گئے جبکہ میں وہیں پہ بیٹھا سو دو زیاں کا حساب کرتا رہ گیا۔ کیا پایا تھا میں نے.....؟

چوبیس سالہ زندگی میں..... کون سا دن ایسا تھا جو میں نے اباجی کے ڈھب پر گزارا ہو؟ کس کی طرف

طبیعت خراب ہے اسپتال جانا ہے۔ ہمارا ڈرائیور شام کو واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا..... سو میں نے اپنے بیک میں کچھ رقم ڈالی اور انتہائی تیزی سے انہیں اسپتال لے آئی۔ ایمر جنسی میں بیٹھے ڈاکٹر اور عملے نے انہیں فوری امداد دی۔ لائف سیونگ انجکشن لگایا اور ایڈمٹ کر لیا کہ اب مریض آرام سے ہوگا۔ اگلے چند روز وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے۔ اور ڈاکٹر مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اور میں کمرے کے باہر بیٹھی ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں میں مصروف تھی۔ بارہا یہی خیال آتا کہ انسان پہ یہ افتاد کسی بھی وقت آسکتی ہے اب ان سے کیا کہتی کہ دن کی روشنی میں آپ کیوں بیمار نہ پڑے..... یہ کون سا وقت تھا مجھے بے آرام کرنے کا؟

بعد میں میں سوچتی رہی کہ اس روز وہ سارا دن کیوں بے چین سے لان میں چہل قدمی کرتے رہے تھے کہ شاید انہی باتوں کی بازگشت پر غور کر رہے تھے.....؟ ویسے عام حالات میں بے حد خیال اور محبت کرنے والے انسان تھے اور میں ان کو یہ بات یاد دلا کر خوب چھیڑ خانی کرتی صرف مسکرائیں ہوتیں چہرے پر.....

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

سے مجھے کبھی کوئی رسید یا پرچی موصول ہوتی تھی؟ بس! وہ وقت مجھ پر ٹھہر گیا پھر میں نے ماضی دیکھا نہ مستقبل..... میں نے حال میں رہتے ہوئے آخرت کی فکر شروع کی..... رسیدیں اور پرچیاں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ اباجی کی طرح لوگوں کے گھروں میں راشن ڈالنے شروع کیے۔ بیروزگاروں کو کسی کام دھندے سے لگوا دیا..... کسی کی بیٹی کی شادی کا فریج پتر تو کسی کی بیٹی کی بارات کا کھانا، کسی غریب کی چھتی چھت کو مرمت کروایا تو کسی کو علاج کی غرض سے رقم فراہم کی..... اور ان تمام کاموں کی رسیدیں وصول کیں..... اس لیے نہیں کہ کل کو میں مردوں تو دنیا میرے لیے واہ، واہ کرے بلکہ اس لیے کہ جیسے میں نے اباجی کے شروع کیے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، ویسے ہی میری اولاد اس خزانے میں اپنا حصہ ڈال سکے لیکن....." پروفیسر صاحب نے جو بڑی دیر سے اپنی دُھن میں ماضی کی کھرچن، کھرچ

رہے تھے لمحے بھر کور کے اور بے جان بت کے مانند بیٹھے اپنے واحد اور جان سے عزیز بیٹے کو دیکھا۔ "لیکن ہم ایسے (خزانے) پائیں..... مرنے کے بعد..... یہاں تک کہ ہم حشر میں اٹھائیں جائیں گے۔ تب ہم اس خزانے کو پائیں گے اجر کی صورت، جزا کی صورت..... جنت کی صورت..... میں بخیل نہیں ہوں زیاد..... میں قطعاً بخیل نہیں ہوں، اللہ جانتا ہے میں نے اپنی اولاد کی خوراک، رہائش، پڑھائی، تربیت و پرورش میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اس قدر گلے ہیں..... میں تمہیں اب بھی چھوٹے سے بچے کے مانند دیکھتا ہوں، اولاد کبھی ماں، باپ کے لیے بڑی نہیں ہوتی، میں تمہیں دو دو پلو اتا ہوں کیونکہ میں اپنے بچے کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں..... با دام کھلاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے پڑھائی میں جتے بیٹے کے دماغ کو با دام تقویت دیں گے.....

وائے
۲۶۶
فسر ح طاہر



میں اللہ کی رسی کو تھام نہ پاتا تو.....؟ "زیادہ کا پسینے، پسینے ہوا جسم زوردار جھٹکا کھا گیا اور اس جھٹکے کے پیچھے میں وہ پروفیسر صاحب کے قدموں میں پڑا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں ابو.....! میں بد بخت ہوں، کم ظرف ہوں، میں باپ کو آزمانے چلا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری خود کی زندگی آزمائش بن جانی تو.....؟ میں آپ سے بد تمیزی کرتا رہا۔ آپ کو نچیل اور کنجوس سمجھتا رہا..... میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کے اعمال روزِ حشر مجھے بھی خاک سے لاکھ کا کر دیں گے..... جو میں آپ کے قدم پہ قدم رکھ لوں..... مجھے معاف کر دیں ابو..... پلیز....." زیادہ رو رہا تھا اور زیادہ کے رونے سے پروفیسر صاحب کا دل رو رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر پیروں پہ گرے بیٹے کو اٹھایا، اس کی پیشانی چومی..... پھر بولے۔

"میں نے تمہیں معاف کیا..... ہمارا رب بھی ہمیں معاف کرے..... آج میں بہت آسودہ حال ہو گیا ہوں۔ میرا بیٹا، میرے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ تم نے مجھے خوشیوں سے بھر دیا ہے اور باپ کو خوش کر کے اپنے خزانے کو نیکیوں سے....." آخری جملہ کہتے ہوئے پروفیسر صاحب کا لہجہ ہلکا سا شرارتی ہوا تھا۔

"اب میں باہر جاتا ہوں ابو.....! دادی اماں اور امی سخت پریشان ہوں گی....." زیادہ تیزی سے اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے قدم دروازے کی سمت بڑھا دیے۔

"زیادہ.....؟" عین اسی وقت پروفیسر صاحب نے پیچھے سے پکارا۔

"جی ابو....." وہ پلانا۔

"مجھے اچھا لگتا ہے، جب تم مجھے وہ کہتے ہو۔"

"وہ کیا ابو.....؟"

"پروفیسر صاحب....." اور پروفیسر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ان کے خوب صورت قمقمے میں زیادہ کی چہکار بھی شامل تھی۔

میں تمہیں دس بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں جانے دیتا ہوں کہ دل سوکھے پتے کے مانند تھر تھراتا ہے جب میرا بچہ رات گئے تک باہر رہتا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ میرا لائق بچہ شہر کے بہترین کالج اور یونیورسٹی کے قابل سے سو میں نے اس کا ایڈمیشن وہیں کرایا اور..... اور مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا ہیوی بائی کے قابل نہیں ہے وہ اس پر بیٹھ کر ہوا سے باتیں کرے گا، وہ اس پر سوار ہو کر بے پروا ہو سکتا ہے، وہ بھول سکتا ہے کہ اس کی ریش رائڈنگ خدا نخواستہ اسے کسی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے بس..... اتنا سا قصہ ہے میرے بیٹے....."

پروفیسر صاحب بات مکمل کر کے آنکھیں موندے گہری، گہری سانس لینے لگے..... تھکن جیسے رگ، رگ میں سرایت کر گئی تھی۔

"میں کنجوس نہیں ہوں، میں اپنی آخرت کے لیے ڈر چکا ہوں، تمہارے تو آگے لمبی زندگی پڑی ہے انشاء اللہ..... مگر میرے بچے..... میرا تو شہ خالی ہے..... مجھے اپنی خالی جھولی کو اس خزانے سے بھرنے دو..... خدا کا واسطہ ہے تمہیں..... میں اور کتنا جیوں گا..... سب تمہارا ہی ہے مگر زیادہ..... میرے بچے..... مجھے خالی ہاتھ مت جانے دو، مجھے اکٹھا کر لینے دو....."

اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب بچوں کے مانند رو دیے۔ انہوں نے بیٹے کے سامنے اپنی پیشینگی کی تھی۔ وہ دکھ کی اتھا گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں خبر تک نہیں تھی کہ زیادہ یہ کیا بیت گئی۔ وہ شدید سردی میں پسینے میں ڈوبا گہری، گہری سانس سنبھال رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آف.....! پیشانی سی پیشانی تھی..... کیا سمجھتا رہا وہ اپنے باپ کو اور وہ کیا نکلے..... کیا وہ ایسے دادا کا پوتا یا ایسے باپ کا بیٹا کہلانے کا مستحق تھا؟ میں اپنے دھندوں میں الجھا رہا اور میرا باپ اپنے اور میرے لیے آخرت کا سامان کرنے میں لگا رہا اور اگر اب بھی

مگر آج ایسا کچھ بھی نہیں تھا..... نہ کوئی سامنے موجود تھا اور نہ ہی کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا وہ حیران و پریشان سی آگے بڑھی۔ لیکن میں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے

وہ کالج سے لوٹی تو نظر کے سامنے کوئی بھی نہیں تھا اسے کافی زیادہ حیرت ہوئی یہ وقت تو دو ہیبر کے کھانے کا تھا ہر طرف چہل پہل ملا کرتی ہمیشہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جی کی آواز سنائی دیا کرتی



کمرے میں بیگ اور فائل رکھی اور افراد خانہ کی تلاش میں باہر نکل آئی۔ سب کمرے میں دیکھنے کے بعد جیسے ہی وہ دادا جان کے کمرے قریب سے گزرنے لگی تو اسے امی جی آواز سنائی دی۔

”یہ سب یہاں اس وقت کیا کر رہے ہیں.....؟“ خود سے سوال کرتی ادھ کھلے دروازے کو مزید کھولتی اندر داخل ہوئی..... اس کی متلاشی نگاہوں نے وہاں سب کو موجود پایا۔ وہ کچھ آگے بڑھی تو سب کی یہاں موجودگی کا جو سوال اس کے ذہن میں اٹھا تھا اس کا جواب آپوں آپ ہی مل گیا۔

اس کے سامنے دادا جان بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے، وہ تیزی سے ان کے بیڈ کے قریب آئی تھی۔ ”کیا ہوا دادا جان کو.....؟“ اس نے بتا کسی کو دیکھے سوال کیا تھا جس کا جواب امی جی نے دیا۔

”ابھی ڈاکٹر چیک کر کے گئے ہیں، ان کا کہنا ہے بڑھتی عمر کے ساتھ کمزوری زیادہ ہوگئی ہے۔ اسی لیے ان کی حالت ایسی ہو رہی ہے۔“

”ان کو کھانے میں کیا دیا تھا؟“ دادا جان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس نے بخار چیک کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ناشتا ہی تو دینے آئے تھے تب ہی ان کی اس حالت کا پتا لگا..... جب سے بس اسی طرح لیٹے ہیں نہ تو کچھ بول رہے ہیں نہ آنکھیں کھول رہے ہیں۔“ زرین نے لب کشائی کی۔ دادا جان کو بخار نہیں تھا وہ برف کے مانند ٹھنڈے پڑے تھے اس نے تیزی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر نبض چیک کرنی چاہی..... رک، رک کر چلتی نبض نے اسی کی پریشانی میں مزید اضافہ کیا۔

”ابو جی دادا جان ٹھیک نہیں ہیں۔“ اس نے پریشانی بھری نگاہوں سے دادا جان کو دیکھ کر ابو کی طرف دیکھا تھا۔ یہ بات وہ سب پہلے سے جانتے تھے ابو جی کی آنکھوں میں تیرتی نمی واضح دکھائی دے رہی تھی

اس نے لب بھینچ کر سر جھٹکا۔ ”دادا جان کو کچھ نہیں ہو سکتا.....“ وہ خود رو دینے کو تھی مگر دل و دماغ میں ابھرتی سوچوں کو پرے جھٹک دیا۔

”شرمین بیٹا ڈاکٹر ان کو انجیکشن لگا گئے ہیں ان کا کہنا ہے یہ کچھ دیر بعد خود ہی ہوش میں آ جائیں گے۔ تم پریشان مت ہو بیٹا.....“ امی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا مچلتا دل کچھ حالت سلون میں آ گیا۔

”چلیں پھر ان کو آرام کرنے دیں، ہم سب باہر چلتے ہیں.....“ دادا جان کو کبل اوڑھاتے ہوئے وہ ان کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی..... تو سب اس کے ساتھ دادا جان کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے بند کر کے باہر چلے آئے۔

دادا جان کے کمرے سے باہر آ کر زندگی روز کی طرح معمول پر آ گئی۔ امی جی بچن میں چلی آئیں جبکہ ابو جی اور بھیا خبریں سننے کے لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ زرین امی جی کی مدد کرانے ان کے ساتھ بچن میں موجود تھی اور وہ خود یونیفارم بدلنے کمرے میں چلی آئی۔

آج کا دن خاصا محنت طلب اور تھکا دینے والا تھا۔ سارا دن پریکٹیکل کرتے لیب میں گزر گیا پھر گھر واپسی پر روٹ ویر سے چلا اور گھر لوٹی تو دادا جان کی حالت نے پریشانی میں مبتلا کر دیا..... عصر کی اذان ہو رہی تھی اس نے کپڑے بدل کر نماز ادا کی اور باہر آ گئی۔ بھوک سے برا حال تھا مگر کھانے کو من نہیں تھا۔ امی جی نے کھانا کھانے کو کہا تو وہ انہیں منع کرتی خاموشی سے دادا جان کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے سدھ پڑے تھے۔

ان کے برابر میں بیٹھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا..... اس نے ایک بار پھر ان کی نبض چیک کی جو اب نارمل محسوس ہو رہی تھی اس نے

دادا جان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ تیزی سے ان پر جھکی۔

”دادا جان آپ جاگ گئے؟“ انہوں نے اس کی بات کا جواب تو نہیں دیا تھا البتہ آنکھیں کھول کر اس کی سمت دیکھا ضرور تھا۔

”دادا جان.....“ اس نے بے تابی سے پکارا تھا۔ ”کیوں رو رہی ہو شیری.....؟“ ان کے انداز میں کتنا پیار بھرا تھا۔ شرمین نے ہاتھ اٹھا کر اپنا چہرہ چھوا جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اسے حیرت ہوئی وہ رو رہی تھی۔

”دادا جان مجھے پتا ہی نہیں لگا کہ آنسو کب نکلے.....“ اب وہ بھی مسکرائی تھی۔

”روتے نہیں ہیں بیٹا.....“ دادا جان کی آواز میں شگفتگی تھی اسے شدید حیرت نے آگھیرا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ ان کی طبیعت دیکھ کر پریشان تھی اور اب دادا جان کیسے تروتازہ دکھائی دے رہے تھے۔ شاید یہ معجزہ تھا کہ خدا نے ان کو پھر سے بولنے کی ہمت بخشی تھی۔

”دادا جان آپ کے بغیر سب اتنا بیکار لگ رہا تھا..... میں بہت ادا اس تھی.....“ اس نے منہ بسواؤ وہ ایک بار پھر مسکرا دیے اس پل ان کے چہرے پر کتنا نور تھا۔ چہرہ روشن، روشن دکھائی دے رہا تھا۔

”شرمین ذرا مجھے پانی پلا دو.....“ وہ ان کے برابر سے اٹھی اور سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر ان کے پاس چلی آئی..... اپنے بازو پر ان کی گردن ذرا سا اٹھائے اس نے انہیں پانی پلایا اور پھر سے آرام دہ حالت میں بیٹھے پر لٹا دیا۔

دادا جان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ ”نہ جانے کیسی پیاس ہے پانی پی کر اور پانی کی طلب محسوس ہونے لگی ہے۔“

”دادا جان میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ

لاتی ہوں۔“

ان کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے بچن میں آئی تھی سب کو ان کے ہوش میں آنے کی خبر کی اور پلیٹ میں دادا جان کے لیے بنائی گئی کھجڑی لیے ان کے کمرے میں آ گئی۔

”بیچے، امی جی نے خاص طور پر آپ کی پسندی کھجڑی بنائی ہے..... اسے دیکھ کر تو خود میری بھوک بھی چمک اٹھی ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا اور دادا جان کی طرف نظر کی تو وہ گھبرا گئی۔

وہ لمبی، لمبی سانسیں بھر رہے تھے..... اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سائڈ ٹیبل پر رکھی اور ان کے برابر بیٹھ کر ان کے چہرے کو تھامے انہیں پکارنے لگی۔

”دادا جان، دادا جان!“ مگر جواب نہ دار..... اسے باہر جا کر کسی کو بلانے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ دادا جان دوپہر کی طرح برف کی سل کے مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے اسی نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر ان کا ہاتھ تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی سارے وقت میں اس کی نظریں دادا جان کے چہرے پر جمی تھیں وہ اب رک، رک کر سانسیں بھر رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں سانس لینے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔

”دادا جان.....!“ دادا جان نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آخری لمبی سانس بھری اور اس کے ہاتھوں میں بے جان ہو گئے۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جن کا کچھ دیر پہلے سانس لیتا وجود اب حالت سکون میں آ گیا تھا۔ دادا جان اسے چھوڑ کر جا چکے تھے اس نے شدید غم کی حالت میں انہیں پکارا تھا۔

”دادا جان.....“ غم کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آواز جیسے پھٹ سی گئی تھی۔ اب وہ ان کا چہرہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور دہاڑیں مار، مار کر رونے لگی۔

اس کی چیخ و پکار سن کر گھر کے سارے دیگر افراد جیزی سے دوڑے چلے آئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ سب یہیں موجود تھے۔ دوپہر سے لے کر عصر تک کے وقت میں کوئی نہ کوئی ضرور ان کے ساتھ تھا مگر ان کا دم نکلنے وقت صرف شرمین تھی۔

دادا جان کو ان سے پچھڑے مہینہ ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک یقین نہیں کر پائے تھے۔ سردیاں اپنے عروج پر تھیں آج فراغت کے بعد وہ سب امی، ابو کے کمرے میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ان کی باتوں میں دادا جان کا ذکر چل رہا تھا۔ شرمین گم صم بیٹھی ان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ امی جی کچھ بول رہی تھیں وہ ان پر نظر سے جمائے بیٹھی تھی جب اچانک ہی امی کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور وہ ایک طرف کولڑھک گئیں۔ سب سے پہلے وہی ان کی طرف بڑھی تھی۔ ابھی تو اس کی امی جی نہا کر نکلی تھیں اور کبل میں دیک کر بیٹھ گئی تھیں پھر اس نے انہیں گرم، گرم چائے دی تھی۔

”امی جی آپ کو کیا ہوا.....“ وہ ان کی طرف بڑھی۔

”امی جی اور بھیا امی جی کے گرد بیٹھے ان کے ہاتھ پاؤں سہلارے تھے جبکہ وہ خود ان کا سینہ مسل رہی تھی..... ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا..... امی جی پہلی پڑتی جا رہی تھیں۔ شرمین نے رونما شروع کر دیا جبکہ وہ خود خوف کے زیر اثر دم سادھے کھڑی تھی۔

ابو جی اور بھیا امی جی کو لے کر امیر جنسی بھاگے..... تو اس کا سکتہ ٹوٹا.....

”اللہ جی..... میری امی جی کو کچھ نہ ہو مجھے میری امی جی لوٹادیں۔“

ایک ہی بات کو ڈہرائی وہ بری طرح رونے جا رہی تھی جب زمین نے اسے اٹھا کر پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”امی جی کو کچھ نہیں ہوگا شرمین آپی، آپ پانی پی لیں.....“ وہ خود بھی پریشان تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے موبائل اٹھایا اور بھیا کا نمبر بریس کیا دوسری طرف سے اس کی کال پک نہیں کی گئی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ ”کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو گیا.....“ اس نے دیوانہ وار دوبارہ بھیا کا نمبر ملا یا اب کی بار دوسری تیل پر کال پک کر لی گئی تو اس نے چھوٹے ہی بھیا سے سوال کیا تھا۔

”بھیا امی جی سے میری بات کروادیں۔“ انہوں نے سیل فون امی جی کو پکڑا دیا۔

”شرمین بیٹا میں ٹھیک ہوں.....“ امی جی کی کمزوری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ آواز اس قدر ہلکی تھی اسے لگا بھیا نے امی جی کی آواز کی نقل کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بھیا کی کال ڈراپ کر کے ابو جی کو کال کی۔

”ابو جی، امی جی سے بات کروادیں پلیز.....“ اس کا انداز التجائیہ تھا۔

”شرمین بیٹا..... تمہاری امی اب بالکل ٹھیک ہیں۔“ انہوں نے اس کو یقین دلانا چاہا مگر اس نے پھر التجا کی۔

”امی جی ٹھیک ہیں.....“ وہ ایک بار پھر شکرانے کے طور پر سجدہ ریز ہو گئی۔ بے خودی کے عالم میں اس کا سر بڑی زور سے زمین سے ٹکرایا تھا مگر اسے تو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اسے لگا تھا کہ زندگی ختم ہو گئی ہو..... اس کی اپنی سانسیں اٹکنے لگی تھیں اس کی ماں کو خدا نے دوسری زندگی سے نوازا تھا۔ وہ شکر ایہ ادا نہ کرتی تو کیا کرتی۔

سجدے سے اٹھی تو اس کی پیشانی پر بڑا سا گومڑ نمودار ہو چکا تھا۔

شرمین اس کے پاس بیٹھی تھی وہ اب تک اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت اس کو دہلائے دے رہی تھی..... شرمین کے گلے لگ کر وہ ایک بار پھر رو دی۔

کچھ دیر بعد امی جی، بھیا اور ابو جی کے ساتھ گھر واپس آ گئی تھیں۔ ذرا سی دیر میں یہ سب ہو جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ سب سے پہلے وہ ان کے گلے لگی تو کچھ سکون نصیب ہوا..... ساری رات وہ امی جی کے پاس سے ہلی تک نہیں۔ پوری رات ان کے پاس بیٹھی جا گئی رہی۔

پہلے دادا جان کی اچانک موت اور اب ایسے امی جی کی اچانک بگڑتی طبیعت نے نہ جانے کیوں اس کے اندر بہت سارا خوف بھردیا تھا۔ اس کے اپنے اسے چھوڑ جائیں گے تو وہ کیا کرے گی.....؟ آنکھیں بند کرتی تو دادا جان کا اس کے ہاتھوں میں دم توڑتا چہرہ سامنے آجاتا۔ آنکھیں کھولتی تو امی جی کی بند ہوتی سانسیں اس کو مزید خوف زدہ کر دیتیں۔

وہ ایک بہادر لڑکی تھی مگر ان سانحوں کی وجہ سے جو خوف اس کے اندر بیٹھا اس نے اس کی شخصیت کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں جیسے اڑ گئی تھیں۔ رات میں اگر وہ سو بھی جاتی تو نہ جانے کتنی بار اس کی آنکھ کھل جاتی، وہ سوتے سے اٹھ

جی تھی اور گھر کے سوائے افراد کو جا کر ان کے کمروں میں دیکھتی۔ امی جی اور ابو جی کے کمروں میں وہ چپ چاپ کھڑی ان کے زندہ ہونے کا یقین کرنے کے لیے بار بار ان کی آتی جاتی سانسوں کی ضمانت لیتی کچھ تسلی نصیب ہوتی تو اپنے کمرے میں آ جاتی.....

اس کی صحت پہلے کی نسبت بری طرح گر رہی تھی۔ ہر کام پر سے اس کی توجہ ہٹنے لگی۔ غضب تو جب ہوا جب اس نے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑی اور گھر بیٹھ گئی۔ حالانکہ یہ وہی شرمین تھی جسے ڈاکٹر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا..... اور اب اس نے اپنا کیریئر تک داؤ پر لگا دیا تھا۔ گھر کے ہر فرد نے اسے سمجھا کر دیکھ لیا مگر اس کی نہ ہاں میں نہ بدلی..... آج بھی اسی سلسلے میں ابو جی اس کے پاس آئے تھے۔

”شرمین بیٹا..... میں چاہتا ہوں آپ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔“

”مگر ابو جی میں ایسا نہیں چاہتی..... میں گھر میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے انکار کر دیا تھا۔

”مگر بیٹا آپ کی تعلیم کا کیا ہوگا؟ آپ نے تو ہائر اسٹیڈیز کے لیے باہر جا کر پڑھنے کا پلان کیا تھا۔ وہ سب کیوں ادھورا چھوڑ دینا چاہتی ہو؟“ وہ کسی بھی صورت اسے راضی کر لینا چاہتے تھے مگر اس کے جواب نے تو جیسے ان کی بوتلی بند کر دی۔

”میں غلط ہی ابو جی..... میں نے اتنا آگے تک کا پلان کر لیا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، نہ جانے کب موت آجائے..... پھر فائدہ لیتے آگے تک کی پلاننگ کرنے کا.....؟“

”یہ موت اور زندگی کا ذکر درمیان میں کہاں سے آگیا۔“ ابو جی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا..... وہ اسے کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے۔

”اگر تمہاری طرح ہر شخص موت کے ڈر سے کچھ بھی کرنا چھوڑ دے تو دنیا تو اپنی جگہ رک ہی جائے گی..... کیسے چلے گا نظام زندگی؟ چلو یہ تو اچھی بات

222 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015ء

223 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015ء

مانگا..... اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا۔
ابو جی مسکرا دیے ایسے جیسے انہیں اس سے اسی
جواب کی توقع تھی۔
”پھر اتنی دیر تک اتنا کمن ہو کر کیا مانگ رہی تھیں؟“
”آپ سب کی سلامتی کی دعا.....“ وہ نظریں
جھکائے ناخنوں سے کھینٹنے لگی تھی۔ ابو جی اس کی بات
سن کر دنگ رہ گئے۔

اتنی دیر سے وہ صرف یہ دعا مانگ رہی
تھی.....؟ انہیں اس کی ذہنی کیفیت پر ذرا سا شک
گزر رہا تھا جب ہی آج وہ اس کے پاس چلے آئے
تھے مگر اب اس کی باتیں سن کر ان کا شک جیسے یقین
میں بدل گیا تھا۔

”شرمین بیٹا آپ سے ایک بات پوچھوں؟“
سچ بتائیے گا۔“ انہوں نے گہری نظر سے اس کے
جھکے سر کو دیکھا تھا۔
”پوچھیں ابو جی.....؟“ اس نے جھک کر سر اٹھا کر
انہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں کیا بات ڈراتی ہے؟“
”مجھے.....؟“ اس نے کہا پھر کچھ توقف کے
بعد جھجکتی ہوئی مزید گویا ہوئی۔ ”بہت سے ڈر مجھے
ڈراتے ہیں ابو جی..... جیسے میں گھر سے باہر ہوئی
اور مجھے کچھ ہو گیا تو..... اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں،
میں لاوارث بڑی رہ گئی تو.....؟ مجھے بہت ڈر لگتا
ہے ابو جی کہ اگر آپ میں سے کسی کو کچھ ہو گیا
تو.....؟“ اس کا خوف اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

جب تک وہ اپنے خوف کا سامنا نہیں کرے گی
وہ اسی طرح اس کے اندر نیچے گاڑے بیٹھا اسے
دہلائے رہے گا..... انہوں نے اسی سے کھل کر بات
کرنے کا فیصلہ کیا۔

”اچھا اگر ہم سے کسی کو کچھ ہو گیا تو آپ کیا
کر سکتی ہو.....؟ اس طرح ہمارا خیال رکھ کر کیا
ہمارے قریب آتی موت کو ہمارے قریب آنے سے

ہوں، تم میری ماں نہیں ہو۔“ تو وہ بڑبڑاتی ہوئی ان
کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس دن کے بعد سے اس
نے کچن کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ وہ پہلے
سے زیادہ مصروف ہو گئی مگر اس قدر مصروفیات کے
باوجود بھی وہ اپنوں کی طرف سے ذرا سا بھی غافل
نہیں ہوئی تھی ان کی ہر چیز ہر ضرورت کا خیال وہ اسی
طرح رکھتی تھی۔ ان کے منہ سے نکلنے والی ہر بات
گویا اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا
تھا..... وہ سب کی فکر میں رہتی مگر اس کی فکر کرنے والا
اسے سمجھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بہت اکیلی ہوتی
جا رہی تھی۔ خدا کے حضور جھک کر وہ جب دعا کے
لیے ہاتھ اٹھاتی تو بس اپنوں کی سلامتی کے لیے دعا
کرتی..... اٹھتے بیٹھتے یہ دعا تو جیسے ورد کی طرح اس
کی زبان پر جاری رہا کرتی۔ ابھی نماز عشا کی ادائیگی
کے بعد ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے آنسو بہاتی
اپنوں کے لیے دعا گو تھی جب ابو جی اس کے کمرے
میں داخل ہوئے..... اسے دعا میں مشغول دیکھ کر
وہیں فرش پر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کافی دیر دعا
مانگ چکنے کے بعد جب اس نے پھیلے ہوئے ہاتھ
چہرے پر پھیر کر آنکھیں کھولیں تو نظر کے سامنے ابو
جی کو بیٹھے پایا۔

”ابو جی آپ اس وقت میرے کمرے
میں..... کوئی کام تھا کیا.....؟“ وہ ایک دم ہی
کونشش ہوئی تھی۔
”کیا میں کام کے علاوہ اپنی بیٹی سے بات
کرنے نہیں آسکتا.....؟“ انہوں نے اس کا انداز
دیکھ کر ہلکے سے مسکرا کر کہا تھا۔
”بالکل آسکتے ہیں.....“ وہ سر جھکا گئی۔
”خدا سے اپنے لیے کیا مانگا.....؟“ ابو جی نے
سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔
”اپنے لیے.....؟ اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں

ہو۔“

وقت کی توجہ اور نصیحتوں سے سب بیزار دکھائی دینے
لگے تھے۔ انہیں اس پر سخت غصہ آنے لگا تھا۔ جب وہ
چھوٹے بچوں کی طرح ان کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں
کا خیال رکھتی..... جب تک وہ سونہ جاتے ان کے سر
پر سوار رہتی..... ہر وقت کی توجہ بھی انسان کو جھنجھلا ہٹ
میں مبتلا کر دیتی ہے ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہو رہا
تھا..... وہ اب اس سے چڑنے لگے تھے۔

مگر وہ ان کا غصہ، ان کی ناراضی کو مکمل نظر
انداز کیے اسی طرح اپنے خوف و وہم کے درمیان
گھن چکر بنی ہوئی تھی۔

امی جی کی طبیعت کئی دن سے خراب چلی آرہی
تھی۔ زرین کے پیر ز شروع ہو جانے کی وجہ سے وہ
گھر کے کاموں کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو گئی
تھی۔ ایسے میں کچن کی ساری ذمہ داری اس کے
کندھوں پر تھی۔ اسی لیے امی خرابی طبیعت کے
باوجود اس کی مدد کرواتی رہیں لیکن اس نے کئی بار ان
سے کہا وہ کچن کے کام نہ کریں وہ سب خود کر لے گی
مگر امی جی پھر بھی کوئی نہ کوئی کام کرتی دکھائی
دیتیں۔ آج بھی کچن میں کھڑی سالن بنا رہی تھیں
جب اچانک آجانے والے چکر کی وجہ سے وہ گرنے
کو تھیں کہ انہوں نے جلدی سے کاؤنٹر تھا ما جھبی
شرمین کچن میں آئی اور آگے بڑھ کر انہیں گرنے سے
بچایا تھا اور انہیں سہارا دے کر وہاں سے انہیں
کمرے میں لا بیٹھایا تھا۔ انہیں پانی پلانے کے بعد
وہ ان پر خفا ہونے لگی۔

”کہا تھا ناں مت کام کیا کریں مگر آپ نے
پہلے کبھی میری بات سنی ہے جو آج سنتی..... سوچیں
ذرا اگر میں فوری وہاں نہ آجاتی تو آپ گر جاتیں۔
ماربل کا فرش تھا کہیں چوٹ و وٹ لگ جاتی تو کیا
ہوتا.....؟“ اس کے لفظوں میں پروا کا ہر رنگ موجود
تھا مگر امی جی چڑکیں۔

”شرمین تمیز سے بات کرو، میں تمہاری ماں

ہے انسان موت کے ڈر سے ایسا سوچے..... کوئی بھی عمل
کرے تو پہلے سوچے تاکہ اسلام کے مطابق زندگی کو
سنوارے اور موت بھی سنور جائے مگر یہ تو سراسر بے
وقوفی ہے کہ اپنا ہر کام چھوڑ کر موت سے پہلے موت کا
انتظار شروع کر کے زندگی کو مشکل ترین بنا دے.....“
شرمین نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا
وہ مایوس ہی لوٹ گئے تھے۔ نہ جانے اس نے کیا سوچ
لیا تھا جو اس حد تک مایوسی اس کے اندر رچ بس گئی تھی۔
اپنوں کی فکر میں گھلتی وہ انہی سے دور ہونے لگی تھی۔

اس کی فکر کا انداز ہی الگ تھا۔ ایک طرف ان
کے لیے پریشانی ہوتی تو دوسری طرف ان سے سخت
ہوتی جا رہی تھی جیسے اس دن بھی معمولی سے کچھ لیٹ
ہو گئے تو اس نے ایک گھنٹے میں چار بار انہیں کال کی
ساتھ میں سختی سے انہیں گھر پہنچنے کو کہا جب بھی گھر پہنچے
تو وہ ان پر کوئی بھی لحاظ کیے بغیر برس پڑی۔ بیٹھے
بڑے محل سے اس کی ڈانٹ کو سنا تھا۔ پھر جب وہ سب
کہہ چکی تو بیٹھے کہنا شروع کیا۔

”شرمین تم بھول رہی ہو کہ میں تم سے بڑا ہوں
اور دوسری بات یہ کہ میں گھر سے بتا کر گیا تھا کہ آج
میں کسی ضروری کام کی وجہ سے لیٹ آؤں گا..... اس
کے باوجود بھی تم نے جتنی بار مجھے کال کی ہے میں نے
ہر بار تمہاری کال پک کی اور ہر بار تمہیں اپنے کام کی
نوعیت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی تم اس طرح ری ایکٹ
کر رہی ہو، مجھے تو شدید حیرت ہو رہی ہے..... تم اتنی
نا سمجھ تو بھی نہ تھیں شرمین.....“ قدرے ناراضی سے
اسے کہتے وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے مگر اسے ان
کا انداز بہت بری طرح کھلاتا تھا۔

”ایک تو میں ان کی فکر میں اس قدر پریشان
رہی اوپر سے مجھے ہی چار باتیں سنا گئے.....“ گنتی
ہی دیر وہ وہاں بیٹھی روٹی رہی تھی۔
وہ شاید وہی ہو گئی تھی..... اس قدر وہی کہ
اپنوں سے اپنوں ہی کے لیے الجھ پڑتی تھی۔ اس کی ہر

میر نصیب کی سعدیہ حیدر

اذان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔
دسمبر کی سب سے صبح تھی۔ پنکھوں کا شور نہ ہونے کی وجہ
سے موذن کی آواز کانوں میں واضح طور پر رس گھول
رہی تھی۔ اس نے رضائی سے سر باہر نکالا اور پھر کلمہ
پڑھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

اماں بھی اپنے پتنگ پر جاگ ہی رہی تھیں۔
طوبی نے انہیں سلام کیا اور سیدھا باورچی خانے کا
رخ کیا تھا۔ پانی کا دیکھا گرم ہونے کے لیے



چاہو گی۔ اگر تم اس کے حضور جھکی اس سے دعا بھی مانگو
اور ساتھ میں خوف میں مبتلا بھی رہو تو کیا فائدہ اس دعا
کا..... جس میں آپ خود نہ یقین رکھتی ہوں، پھر خدا
کیسے آپ کی دعا سنے گا..... خدا سے حسن ظن رکھو.....
آپ اپنے گمان میں ایسی باتیں سوچو گی تو آپ کی دعا
تو بے اثر ٹھہرائی جائے گی نا.....؟ وہ خدا ہے سب
سے بڑا ہے، اسی پر یقین مضبوط رکھو..... وقت سے
پہلے کبھی کچھ نہیں ہو سکتا..... اور جو ہونا ہوتا ہے جس
چیز کا وقت آچکا ہوتا ہے پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت
اسے ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس اللہ کو محبوب رکھو
وہ تمہیں محبوب رکھے گا۔ سب کچھ اس پر چھوڑ دو، اس
کی رضا میں راضی ہو جاؤ پھر وہ ہو گا جو آپ چاہو گی،
جو کچھ بھی آپ کے دل میں خدشات ہیں، ڈر ہیں اس
سے کہہ ڈالو وہ آپ کو سنے گا..... اپنوں کو اس کی امان
میں دے کر مطمئن ہو جاؤ وہ آپ کی امانت کی حفاظت
کرے گا اس سے بڑھ کر کوئی امانت دار ہی
نہیں ہو سکتا..... ایسا کر کے دیکھو بیٹا پھر دیکھنا آپ کا
ہر ڈر، ہر خوف نکل بھاگے گا۔“ ابو جی کے ہر لفظ
میں اثر تھا ایک یقین تھا اس کا ڈر تمام خوف دل سے
نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

”ہاں وہ خدا ہی تو ہے، وہی سب کا مالک و
مختار ہے۔“ اس کا دل ٹھہرنے لگا۔ دل و دماغ
میں مچی رہنے والی ہر وقت کی بے چینی کو سکون
آ گیا..... ”وہ ذات ہی تو ہے جو سب کرنے والی
ہے..... پھر وہ کیوں اس کے کاموں کو اپنے سر پر
لے کر خود کو پریشان کرے.....“ اس نے سر جھکا کر
مکمل یقین کے ساتھ اپنا ہر خوف خدا کے حضور پیش
کر دیا..... اور خود ہلکی پھلکی ہو گئی۔ ابو جی نے پیار و
شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا..... تو اس کا دل
مزید اطمینان سے بھر گیا۔ وہ واقعی غلط تھی اور اب
اس کا ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹ آنا ممکن تھا۔

روک لوگی؟“

وہ خاموش رہی تھی۔

”جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا بیٹا۔“ وہ
اسے سمجھانا چاہ رہے تھے۔ ”کیوں اس طرح کی
فکروں میں الجھ کر خود کو بلکان کیے رکھتی ہو۔“ وہ ذرا
دیر چپ ہو کر اس کے تاثرات جانچتے رہے پھر مزید
کہنے لگے۔

”ہم گھر سے باہر ہوں تو آپ دس بار کال کر
کے ہماری خیریت معلوم کرتی ہو، کیا آپ کی کال
کرنے سے ہم پر آئی مصیبت ٹل جائے گی؟ اپنی امی
جی سے ہر کام چھڑوا کر ان کو بیڈ ریٹ پر بٹھا دیا اگر
انہیں کچھ ہونا ہوا تو کیا یوں آرام کی حالت میں
نہیں ہو سکتا..... آپ ہمارے لیے دعا کرتی ہو یہ
اچھی بات ہے مگر اس طرح فکر مند ہونا..... یہ تو غلط
ہے ناں بیٹا یہ تو مکمل اِنارمل رویہ کہلاتا ہے..... آپ
نے محسوس کیا آپ کی اپنی ہی وجہ سے آپ کے اپنے
بہن، بھائی آپ سے دور ہوتے جاتے رہے
ہیں۔“ وہ اب رونے لگی تھی ابو جی نے اسے رونے
دیا تھا تا کہ اس کا خوف آنسوؤں میں بہ جائے.....
وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”جی ابو جی میں ان سب کی اتنی فکر کرتی ہوں
مگر وہ مجھے سمجھتے ہی نہیں۔“

”فکر کرنا اچھی بات ہے بیٹا مگر جس طرح
آپ کرتی ہیں وہ غلط ہے، کبھی خود کو دیکھا ہے آپ
نے؟ کسی قدر کمزور ہو گئی ہیں آپ؟ اس سب
سوچوں میں پڑ کر اپنی تعلیم تک کو ادھورا چھوڑ
دیا..... آپ خدا سے دعا کرتی ہیں اس پر یقین ہے
ناں آپ کو..... تو پھر.....؟“ انہوں نے استفہامیہ
انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے اقرار
میں سر ہلا دیا۔

”تو بیٹا جب اس سے دعا مانگتی ہو تو اس پر یقین
بھی رکھو، وہ تمہیں ضرور سنے گا..... ویسا ہی جیسا تم

دوسری..... "وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔"

"دوسری کیا تانیہ.....؟"

"ماتا کہ میں نے کسی شہزادے کے خواب نہیں دیکھے تھے مگر کلرک....." وہ ذرا خاموش ہوئی پھر بولی۔
"میں نے یہ بھی تو نہ چاہا تھا۔" اس کی آواز سے ملال عیاں تھا۔

"دیکھو تانیہ ہو سکتا ہے کہ میری بات تمہیں کڑوی لگے مگر..... بحیثیت دوست تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے۔ تمہاری پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ تمہاری شادی سے تمہاری اماں اکیلی نہیں پرسکون ہو جائیں گی۔ اب رہا لڑکے کے کلرک ہونے کا سوال.....؟ تو میرے خیال سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے یا حرام..... آج کے دور میں چمکتی دکتی دولت اور آسائشات تو بہت جلد نکالوں کو خیرہ کر دیتی ہیں لیکن اس چمک دمک میں ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ چمک دمک ایمان کی روشنی کو کم کرنے کا سبب تو نہیں بن رہی۔"

"اچھا اگر یہ رشتہ تمہارے لیے آتا تو.....؟"

تانیہ نے سوال کیا۔

"نہیں بھئی تمہیں ہی مبارک ہو..... اگر کبھی ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں حلال کمائی کو ترجیح دوں گی۔ ابھی تو تم مجھے اچھی سی چائے پلا دو۔" وہ گھر واپس آئی تو بھیا آفس سے آچکے تھے جو ان پہن پوڑھے ماں، باپ اور تین بچوں کی ذمے داریوں سے ان کے کندھے ڈھلکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بھیا اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"سوچ لیجئے ابا..... وقت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔" وہ الجھی ہوئی نظروں سے بھیا کا چہرہ تکتے لگی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ طوبی نے سوالیہ نظروں سے اماں کی جانب دیکھا مگر اماں جیسے انجان بن گئیں پھر عقدہ کھل ہی گیا۔

کاموں سے فارغ ہو کر چلی جانا....." اماں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی وقت ثنا بھاگتی ہوئی آئی اور پھوپھو کا نعرہ لگا کر اس کی گود میں سر چھپا لیا۔
دروازے پر بھابی کھڑی تھیں۔

"ثنا چلو دیر ہو جائے گی۔" انہوں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"بھابی میں اسے ہاتھ روم لے جاتی ہوں۔"

وہ نرمی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
بھابی قدرے مطمئن انداز میں واپس پلٹ گئیں۔ اماں نے پیار بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی نرم مزاج، صلح جو، بدلتے ہوئے حالات بھی اس کا مزاج بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

دو پہر میں وہ تانیہ کی طرف چلی آئی جو پچھلی گلی میں ہی رہتی تھی۔

"بھئی طوبی تم تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔" اس کی اماں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

"نہیں خالہ جان بس پچھلے دنوں اماں کے جوڑوں کا درد کچھ زیادہ ہی تھا بس انہیں چھوڑ کر نکلنے کا دل ہی نہیں ہوا۔"

"اچھا چلو اب تو آئیں، آؤ اندر کمرے میں چلتے ہیں۔"

تانیہ بھی اس طرح بڑی سادہ مزاج لڑکی تھی۔ اس لیے طوبی اور وہ دونوں آپس میں بڑی گہری سہیلیاں تھیں۔ تانیہ نے اسے بڑی رازداری سے بتایا کہ اس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ لڑکا سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ بڑی بہن شادی شدہ اور گھر میں صرف ابا.....

"لیکن طوبی میں سخت پریشان ہوں۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"کیوں.....؟" طوبی نے سوال کیا۔

"بھئی پہلی بات تو یہ کہ میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد اماں اکیلی ہو جائیں گی اور

گھر بھر..... جس میں ابا، اماں اور بھیا اور سب سے چھوٹی وہ خود سب کی آنکھوں کا تارا۔ مگر ابا کی ریٹائرمنٹ اور بھیا کی شادی کے بعد افراد تو بھابی کے اضافے کے بعد وہی تھے لیکن ان کے مقامات تبدیل ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا کہ کمائی ہوئی رقم کس طرح لوگوں کی وقعت میں اضافہ کرتی ہے۔ گھر کے بڑے تو ابا اور اماں ہی تھے لیکن کماد پوت بھیا..... چنانچہ اب سربراہ کا تاج بھی انہوں نے ہی پہننا تھا اور اس تاجپوشی کے بعد ملکہ کا درجہ تو بھابی کو ہی ملنا تھا چنانچہ اماں اور ابا نے چپ چاپ اس معزولی کو دل سے قبول کر لیا تھا اور وہ.....؟

اس سارے معاملے میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ شطرنج کی بساط پر ایک معمولی پیادے کی کیا وقعت..... شروع، شروع میں تو بھابی بہت کھل کھل کر رہیں لیکن بچوں کی آمد کے ساتھ ہی وہ ان میں زیادہ مصروف ہوئی گئیں۔ یوں گھر کی ساری ذمے داری رفتہ، رفتہ اس کے کندھوں پر منتقل ہوتی گئی اس کی سادہ طبیعت نے بغیر کچھ محسوس کیے ساری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے اٹھالیں لیکن..... اس لیکن کے آگے وہ سوال تھے جن کے جواب اس کے یا اماں، ابا کے پاس نہیں تھے۔ بڑھتی عمر..... اس کی قبول صورت اور سفید پوشی کا بھرم ایسے میں اچھے رشتے کی امید دیوانے کا خواب ہی لگتی..... مگر نہیں..... اماں، ابا کے طویل سجدے اور دعائیں..... وہ خدا سے مایوس نہیں تھے۔ مایوسی کفر ہے..... وہ تو صبر اور شکر کی راہ کے مسافر تھے..... اس نے اپنا سر جھک کر اماں سے کہا۔

"اماں.....! میں سوچ رہی ہوں کہ آج تانیہ کی طرف چکر لگالوں..... کئی دفعہ آچکی ہے اب تو لگتا ہے کہ ناراض ہے وہ۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ دو پہر میں سارے

چڑھایا۔ ابا کے کمرے سے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے انہیں جا کر سلام کیا پھر روزمرہ کے معمول میں مصروف ہو گئی۔ یعنی گرم پانی سے اماں اور ابا کو وضو کرانا پھر خود بھی نماز کی ادائیگی اور بعد میں چائے کی تیاری..... پورے گھر میں سکوت طاری تھا۔ خاموشی ٹوٹنے میں تقریباً آدھا گھنٹا تھا جب تک بھابی اور بچوں کی اپنے کمرے سے آمد نہ ہوئی۔ چوبیس گھنٹوں میں یہی چند سکون بخش لمحات ہوتے جب وہ اماں کے گھنٹوں سے لگ کر باتیں کیے جاتی..... پھر تو..... اور اس تو کے بعد کاموں کی وہ طویل فہرست ہوتی جو اسے انجام دینے ہوتے اماں نے اس کے ہاتھوں سے گرم چائے کی پیالی لیتے ہی دعا دی۔

"جیتی رہو خوش رہو اللہ نصیب اچھا کرے۔"

"نصیب.....؟" اس کے دل کو جیسے دھکا سا لگا۔ "کب اچھا ہوگا یہ نصیب؟ عمر کی اٹھائیس بہاریں تو دیکھ لیں۔" ڈھلتی عمر کے مہیب سائے جیسے ہر وقت ڈرانے کے لیے تیار رہتے۔ وہ اندر کی گھن کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپاتی ہوئی اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اماں نے لرزتی انگلیوں سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ان کی تھیلی اس کے گال پر آکر ٹھہر گئی۔

"تو اتنی کیوں چپ رہتی ہے؟" اماں کے متا کے چنڈیات جب عروج پر ہوتے تو وہ تم سے تو پر آجاتی تھیں۔

"کچھ نہیں اماں..... آپ محسوس زیادہ کرتی ہیں۔" وہ مسکرا دی۔

"کیا میری اداکاری زیادہ جاندار نہیں....."

اسے اپنی سوچ پر بہت زور سے ہنسی آئی۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی خاموش طبع تھی۔ نین اتج میں تو اس کی ہنسی کی جھنکار گھر بھر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی۔

چاہتوں کا مکان

ایک مدت سے تعمیر کر رہی ہوں میں

چاہتوں کا مکان

جس میں کڑی سزائیں

بے اتفاقی

نفرتوں کی ہر ایک گٹھری کو

دفن کر کے

میں نے خشتِ الفت سے

بنیاد رکھی ہے اس مکان کی

سو جس کی بنیاد میں ہوشاں

مپر خلوص جذبے، ہزار چاہتیں

بھلا وہ کیس اس کے اثر سے

کب تک رہ سکتے ہیں دور اس سے

میں بھی اسی یقیں کے سہارے

گزار رہی ہوں یہ لمحے سارے

کبھی تو تمہیں نہیں پڑیں گی دل پر

نفرتوں کے موسم چھٹیں گے دل سے

تمہارے قلب تک میری رسائی ہوگی

تمہاری بے رحم طبیعت کو

میری محبتوں سے آشنائی ہوگی

زندہ ہوں میں اسی یقیں کے سہارے

گزار رہی ہوں یہ لمحے سارے

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

اس کے اپنے جملے گونجنے لگے جو اس نے تانیہ سے کہے تھے۔

”بھئی ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں حلال کماٹی کو ترجیح دوں گی“ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گرتی جا رہی ہے۔ ایک طرف ابا، اماں اور ان کی دی ہوئی تربیت..... دوسری جانب بھیا بھابی..... اسے بھابی سے زیادہ بھیا کی فکر تھی..... مٹھیوں سے نکلتی ریت کے مانند اس کی عمر..... بھیا کی ذمے داریاں..... معاشی مسائل..... مگر معاملہ ساری زندگی کا تھا..... رزقِ حلال اور رزقِ حرام اور ان دونوں کے درمیان ہچکولے لیتی اس کی زندگی اسے وہ حدیثِ رسول یاد آتی جس میں ایسے شخص کا ذکر ہے جو بالوں میں گرد اور تھکے جسم کے ساتھ اللہ کے حضور اس کے گھر میں فریاد کرے گا مگر رزقِ حرام کے باعث اس کی دعا شرفِ قبولیت نہ پائے گی۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ گئی۔

گٹھری کی سوئی تین بج رہی تھی۔

رات کا پچھلا پہر..... وہ پہر جب خدا آسمان دنیا پر اپنے بندوں کی فریاد سننے کے لیے در رحمت وا کرتا ہے وہ وضو کر کے جائے نماز پر تہجد کی غرض سے کھڑی ہو گئی۔

نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنا آنچل دعا کی غرض سے پھیلا یا مگر جیسے تڑپ کر بجدے میں گر گئی۔ جائے نماز سے جائے قرار محسوس ہو رہی تھی۔

”یا اللہ.....! میں عاجز و کمزور..... تیرے حضور التجا کر رہی ہوں۔ میرے مالک اپنے حبیب پاکٹ کے صدقے مجھے بچالے۔ مجھے غلط فیصلے سے بچا..... اے میرے مالک مجھے لوگوں کے غلبے سے بچا۔ میری زندگی میں آسانیاں عطا کر اے اللہ..... میری ذات سے دوسروں کی زندگی آسان ہو جائے۔“ اس کا پورا وجود ہچکچوں کی زد میں تھا۔

ہے۔“ اماں کا اطمینان جیسے طوبی کو ڈھارس دے گیا۔

”ٹھیک ہے ابا آپ کی مرضی..... ویسے رشتہ اچھا تھا۔“ بھیا ٹکست خوردہ لہجے میں بولے۔

بھابی کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ رات کے کھانے پر بھی ماحول نارمل نہ ہوسکا۔ سب چپ تھے اور جلد ہی سب سونے اپنے، اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رات چپ تھی۔ طوبی نے کھڑکی سے آسمان پر نظر کی۔ ستارے ٹھنڈے تھے۔ ”کیا میرے مقدر کا ستارہ کبھی نہیں چمکے گا۔“ اس کے ذہن میں بھابی کے جملے گونجنے لگے۔ جب وہ رات کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی تو بھابی چپکے سے اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

”آپ نے تو ذرا ہی دیا بھابی۔“ وہ چونک گئی۔

”وہ میں.....“ بھابی خاموش تھیں۔

”کیا بھابی کوئی کام ہے؟“ بھابی اسے کسی سوچ میں گم لگیں۔

”نہیں، وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھیا چاہتے ہیں کہ تم اپنے حق کا استعمال کرو۔“

”حق..... کیا مطلب..... کون سا حق میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”بھئی یہی کہ اس رشتے کے لیے اماں کے سامنے اپنی رضامندی کا اظہار کر دو۔“

بھابی نے تیزی سے جملہ ایک سانس میں مکمل کیا اور پھر ہانپنے لگیں۔

اب سانس لینا طوبی کے لیے دو بھر ہو رہا تھا۔

”بھابی آپ.....؟“ باقی الفاظ جیسے اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ بھابی تیزی سے کچن سے باہر تھیں۔ اور اب آسمان پر دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”یا اللہ.....! میں کیا کروں..... کس دورا ہے پر آ کھڑی ہوں۔ میری مدد کرو۔“ بازگشت میں جیسے

اس نے اماں اور بھابی کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن لیا۔

اس کے لیے رشتہ آیا ہوا تھا۔ بھابی کے کوئی دور پار کے رشتے دار تھے سب کچھ صحیح تھا۔ بس ایک بات غلط تھی اور وہ غلط بات کیا تھی..... رشتہ باضابطہ طور پر نہیں آیا تھا صرف بھابی کے ذریعے زبانی بات ہی ہوئی تھی کہ ابا اور بھیا سے لڑکے کے ابا کی ملاقات کہیں باہر ہوگئی۔ بھیا دونوں کو ہونٹ لے گئے کہ چلیں میں آپ دونوں کو چائے پلاتا ہوں۔

وہیں گفتگو کا رخ بینک اور پھر بینک سے حاصل ہونے والے منافع (سود) کی جانب ہو گیا۔

رضا (لڑکے کے ابا) نے بڑے جوش سے فرمایا۔

”بھئی ہم تو اسے غلط نہیں مانتے، بھئی حکومت نے اجازت دی ہوئی ہے۔“ ابا مارے صدے کے کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

اب بھیا انہیں گھر بلانا چاہ رہے تھے مگر ابا انکاری تھے۔ بھیا کا اصرار تھا۔ ”ابا لڑکا تو اپنا کام کرتا ہے ہمیں ان کے ابا کے خیالات سے کیا لینا دینا۔“ پھر یہ سرد جنگ بالآخر ایک طویل بحث پر ختم ہو گئی۔

شام کی چائے پر بحث کا آغاز ہوا۔ ابا اپنی جگہ حق بجانب تھے۔

”بیٹا، ماں، باپ کی دی ہوئی تربیت بہر حال ساری زندگی اپنا اثر دکھاتی ہے جو چیز باپ کے لیے آج حلال ہے مستقبل میں بیٹا بھی اسے اپنے لیے جائز سمجھے گا۔“

”پر ابا طوبی کی بڑھتی ہوئی عمر کا تو خیال کیجیے.....“

طوبی کو سامنے سے آتا دیکھ کر بھیا گڑبڑا گئے۔

”بیٹا..... مجھ سے زیادہ میرے رب کو خیال ہے۔“ ابا کا لہجہ ہر سکون تھا۔

”اماں..... آپ ہی کچھ سمجھائیں.....“ بھیا نے اماں کی جانب التجائیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میرے خیال سے سمجھانے کی تمہیں ضرورت



صحیح نشانی

شمیم فضل حنا

چھوٹے بازار میں میر تقاسم کی کافی بڑی دکان تھی..... ان کی دکان کو دو بستوں والی دکان کہتے تھے اور سارے بازار میں ان کی واحد دو بستوں والی دکان تھی ورنہ باقی سارے دکان ایک، ایک بستے کی تھی..... میر تقاسم بڑے سوشل بندے تھے، یاروں کے یار تھے۔ شطرنج کھیلنے کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا تھا کہ دکان کا ایک حصہ انہوں نے حجرہ سا بنالیا تھا..... سرخ رنگ کا پرانا افغانی قالین بچھا کر انہوں

بند کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دے۔ اسی وقت دروازے کی کھنٹی بجی۔ سکیئہ خالہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ دروازے پر تھیں۔

سکیئہ خالہ، اماں کی خالہ زاد بہن تھیں انتہائی سادہ طبیعت اور ملتسار..... اماں انہیں دیکھ کر مسکرائیں۔

”ارے سکیئہ بڑے دن بعد آئیں، آؤ بیٹھو.....“ ان کا بیٹا باہر ہی ابا اور بھیا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بہو نے پیار سے طوٹی کو گلے لگا لیا۔

آج پیار کے انداز ہی اور تھے۔ طوٹی نے فرق واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

”بھئی آج تو طوٹی کے ہاتھ کی چائے پینی ہے۔“ سکیئہ خالہ نے فرمائش کی۔

وہ ان کے انداز پر الجھتی باورچی خانے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو سکیئہ خالہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ”بھئی بڑے نصیبوں والی بچی ہے۔“

”ہاں اماں میرے بھائی کو دین دار لڑکی ہی چاہیے تھی۔“ سکیئہ خالہ کی بہو نگہت مسکرائی۔

طوٹی کے ہونق چہرے کو دیکھ کر اسے بڑا مزہ آرہا تھا۔

اور طوٹی سوچ رہی تھی۔

”نگہت بھابی کا بھائی ایک دین دار انسان..... اور دنیاوی اعتبار سے ڈاکٹری کے مقدس پیشے سے وابستہ.... اے میرے اللہ واقعی تو ہی مسبب الاسباب ہے۔ بے شک پاکیزہ مردوں کے لیے پاکیزہ بیبیاں.....“

اماں کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی اس کے نصیب کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔

۞

اسے صرف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس پوری کائنات میں بس وہ ہے اور اس کا رب درمیان کے فاصلے مٹ گئے ہیں۔ میں اور تو کی کیا حقیقت ہے؟ کیا بندگی ہے؟

ان تمام فلسفوں سے بے نیاز وہ سیدھی سادی لڑکی صرف رب کائنات کے حضور سجدے میں تھی۔ اس کا پورا وجود مجسم دعا تھا۔ جسم لرزہ بر اندام..... آنکھیں اشک بار..... یکا یک اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔

اس نے سر اٹھایا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا.....

”بھیا.....“ بھیا دوڑا تو ہو کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر رونے لگے۔

”مجھے معاف کر دو طوٹی، میں نے ابا کی تربیت فراموش کر دی۔ میں نے رب کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ میں نے تم پر بھی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن یقین کرو رات سے میں بھی بے چین تھا۔

کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہے، مجھے معاف کر دو بہنا..... خدا کا شکر ہے کہ میں اس وقت پانی پینے کی غرض سے

باہر آ گیا۔ انشاء اللہ وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔“

”میں نہیں بھیا..... اللہ تعالیٰ!“ طوٹی نے تصحیح کی۔

اور دونوں مسکرا دیے۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ برآمدے میں بھیا اور ابا کی سیاسی معاملات پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اماں تلاوت میں مصروف اور بھابی حسب معمول بچوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اور وہ.....

ابھی نہا کر نکلی تھی۔ صاف ستھرا، چہرہ..... اس کا

چہرہ قبول صورت تھا لیکن پاکیزہ خیالات... ایک روشنی بن کر چہرے سے جھلکتے تھے۔ اس کا چہرہ

پرسکون تھا۔

اماں نے مسکرا کر ایک نظر اس پر ڈالی اور قرآن

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیلے

رسالے حاصل کیجئے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

یا قاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

بیاہ ہو گیا تھا۔ میر قاسم کو اب اس لیے بھی فکر ہو گئی تھی
کہ خالہ نینب آئے روز بیمار رہنے لگی تھیں۔ میر
قاسم سوچ رہے تھے کہ اگر خدا نخواستہ خالہ نینب کو
کچھ ہو گیا تو پھر وہ راحیلہ کے لیے کون سا سہارا تلاش
کریں گے، اس سے اچھا ہے کہ اسے اپنے گھر کا
کردیں اور بے فکر ہو جائیں۔ اس دن ان کا کوئی
دوست شطرنج کھیلنے نہیں آیا تھا، وہ اکیلے ہی اپنی
دکان والے حجرے میں بیٹھے شطرنج کے مہروں کو
آگے پیچھے کر رہے تھے۔ فواد کسی گاہک کے ساتھ
الجھا ہوا تھا وہ سودا قرض مانگ رہا تھا جبکہ فواد مسلسل
انکار کر رہا تھا اور اسے دکان میں لٹکے ہوئے گتے
کے بورڈ پر لکھے اس جملے کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ
ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں۔ لیکن گاہک اپنی
بولی بول رہا تھا کہ آج پیسے نہیں ہیں سودا دے دو۔۔۔۔۔
چند دن بعد پیسے دے دوں گا۔۔۔۔۔ میر قاسم ایسے
معاملات میں چپ ہی رہتے تھے۔ فواد خود ہی
معاملہ سلجھا لیتا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی دونوں کی تکرار سن
رہے تھے لیکن بیچ میں دخل نہیں دے رہے تھے۔ فواد
اور گاہک کی تکرار اب جھگڑے میں تبدیل ہو چکی
تھی۔۔۔۔۔ میر قاسم کو فواد کا یہ رویہ اچھا لگ رہا تھا کہ وہ
ان کی طرف داری کر رہا تھا بلکہ ان کے ایک اصول کو
فالو کر رہا تھا کہ جو انہوں ہمیشہ روارکھا تھا وہ ادھار
کے سخت خلاف تھے۔۔۔۔۔ دونوں کے جھگڑے کے بیچ
ہی انہوں نے سوچا کہ اگر ان کی محنت سے حاصل کی
ہوئی دکان فواد کے حصے میں آئی تو وہ ان کے اس
واحد ورثے کا بیج حقدار ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنے
اس خیال پر دل ہی دل میں ہنسے کہ بھلا فواد کس
اینگل سے ان کی جائداد کا حقدار ہوگا۔۔۔۔۔ کہ وہ تو
صرف ان کا نوکر ہے۔۔۔۔۔ اچانک۔۔۔۔۔ ایک سرسرا تا
ہوا خیال ان کے ذہن میں آیا۔۔۔۔۔ کہ اگر فواد ان کا
داماد بن جائے تو نہ صرف ان کی دکان پر اس کا حق
ہوگا بلکہ وہ ان کا دایاں بازو بن جائے گا اور ان کے
بیٹے کی خالی جگہ بھی پُر ہو جائے گی اور راحیلہ کو بھی کسی

لڑکا بالا تھا۔۔۔۔۔ بیٹھ، بیٹھ کر بیٹھ ہو جاتا تو تھوڑی بہت
آؤٹنگ اس کا حق بنتا تھا۔۔۔۔۔ بیچ وہ میر قاسم کے
ساتھ ہی کرتا تھا۔۔۔۔۔ میر قاسم نے اس کی دیانت
داری کے عوض اسے بہت سی مراعات دی تھیں جن
میں ایک اسے اپنے ساتھ بیچ کرانا تھا۔۔۔۔۔ بیچ گھر
سے ہی آتا تھا۔ سارے دکانداروں نے مل کر ایک
چھوٹے سے لڑکے کو تھوڑے سے پیسوں کے عوض
اپنے، اپنے گھروں سے بیچ لانے کے لیے رکھا
تھا۔۔۔۔۔ سارے دکانداروں کے گھر آس پاس ہی
تھے۔ لڑکا سائیکل پر جاتا اور تمام گھروں سے بیچ
یا کسز سائیکل کی ٹوکری میں ڈال کر لے آتا۔۔۔۔۔ اگر
بکھی وہ لڑکا نہ ہوتا تو میر قاسم، فواد کو بیچ لانے گھر بھیج
دیتے۔۔۔۔۔ میر قاسم کی بیوی کچھ عرصہ پہلے فوت ہو چکی
تھی۔۔۔۔۔ ایک بیٹی تھی۔۔۔۔۔ راحیلہ نام تھا اس کا۔۔۔۔۔
بیوی کی وفات کے بعد یار دوستوں نے میر قاسم کو
دوسری شادی کے لیے بہت مجبور کیا لیکن میر قاسم نہ
مانے۔۔۔۔۔ وہ دوستوں میں خوش رہنے والے مرد تھے۔
دوبارہ بیروں میں بیڑی ڈالنے کو تیار نہ تھے۔
راحیلہ ایک جوان لڑکی تھی۔۔۔۔۔ گھر میں اس کے اکیلے
رہنے کا مسئلہ تھا۔۔۔۔۔ شہر میں میر قاسم کی ایک بیوہ خالہ
تھیں جو بے اولاد تھیں اور تیرے میرے گھروں میں
لڑھکتی پھر رہی تھیں۔۔۔۔۔ میر قاسم خود ان کے پاس
گئے اور بڑی عزت سے خالہ نینب کو لے آئے تب
سے نینب خالہ، راحیلہ کے پاس تھیں اور میر قاسم اب
راحیلہ سے بالکل بے فکر ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ راحیلہ نے
میٹرک کر لیا تھا اب وہ کالج جانے لگی تھی۔۔۔۔۔ وہ
بڑوں کی لڑکیوں کے ساتھ آیا جا کر رہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ
تھیکھے نقوش کی سانولے رنگت کی دہلی پتلی لڑکی تھی، وہ
بہت زیادہ حسین تو نہ تھی لیکن دیکھنے میں اچھی لگتی
تھی۔۔۔۔۔ لیکن کچھ دنوں سے میر قاسم کی نیندیں اڑ گئی
تھیں۔۔۔۔۔ جب سے راحیلہ کی سہیلی نازش کی شادی
ہوئی تھی۔۔۔۔۔ میر قاسم کو بھی راحیلہ کی فکر ہو گئی تھی۔
نازش، راحیلہ کی عمر کی تھی اور اس کا جھٹ مٹکنی پٹ

نے اس کے ارد گرد گھاؤ بکھے رکھ دیے تھے۔ جہاں ان
جیسے شطرنج کے شوقین یاد آجاتے اور تب بازیاں
جتیں گپ شپ ہوتی۔۔۔۔۔ ہنسی مذاق ہوتا۔۔۔۔۔ قریب
کی دکان سے چائے کے، قبوے کے رنگ آلود
چائیک آتے۔۔۔۔۔ دکان کا دوسرا حصہ انہوں نے
جنرل اسٹور بنا رکھا تھا جس میں کوالٹی کا سامان
ہوتا۔۔۔۔۔ جنرل اسٹور پر انہوں نے فواد نامی لڑکے کو
رکھا تھا۔۔۔۔۔ شطرنج کھیلتے، کھیلتے اور گپ شپ لگاتے
ہوئے بھی وہ فواد کو نظروں کے حصار میں لیے رکھتے۔
فواد ایک گڈ لنگ نوجوان تھا۔۔۔۔۔ اس نے ایف
اے کیا تھا اور آج کل بی اے کی تیاری پرائیویٹ
طور پر کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کا ایک چچا کے سوا اور کوئی
نہیں تھا۔ والدین اس کے فوت ہو چکے تھے۔ اپنا
خرچہ اٹھانے کے لیے وہ میر قاسم کی دکان میں ملازم
ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ میر قاسم نے اسے ملازم رکھتے ہوئے ہر
طرح کی تحقیق کی تھی اور بعد میں نت نئے طریقوں
سے اسے آزمایا بھی تھا۔۔۔۔۔ کبھی وہ اپنے جنرل اسٹور
میں پانچ سو یا ہزار کا نوٹ گرا دیتے لیکن ہر بار فواد
ان کو نوٹ پکڑواتے ہوئے کہتا۔

”حاجی صاحب۔۔۔۔۔ یہ لیس اپنے
پیسے۔۔۔۔۔ چینی کی بوری کے پیچھے پڑے تھے۔۔۔۔۔ وہ
شکر اکر نوٹ اپنی جیب میں آؤں لیتے۔۔۔۔۔ وہ دکان
سے ناغہ کبھی نہ کرتے اور جتنے بھی گاہک آتے انہیں
دل ہی دل میں گنتے اور شطرنج کھیلتے، کھیلتے بھی
نظروں میں تولتے کہ گاہک نے کیا خریدا اور کتنا
خریدا۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں انہیں کبھی فواد پر شک نہیں
ہوا۔۔۔۔۔ دراصل اس نے کبھی انہیں شک کا موقع
نہیں دیا۔۔۔۔۔ شام کو دکان بند ہونے سے پہلے وہ سارا
حساب کتاب میر قاسم کو دے کر جاتا اور یہ حساب
کتاب میر قاسم کو بالکل صحیح لگتا۔۔۔۔۔ فواد دو پہر میں ایک
گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دکان چھوڑ کر باہر جاتا۔۔۔۔۔ میر
قاسم اس کو یہ سہولت خوشی سے دے دیتے اور اس
دوران خود دکان پر بیٹھ جاتے۔ ان کے خیال میں وہ

اور بولے۔

”دراصل مجھے راجی کے بارے میں بات کرنی ہے..... وہ..... اس کی شادی کے بارے میں..... اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔“ آہٹ پر وہ خاموش ہو گئے..... راحیلہ چائے کا کپ لے کر آئی تھی..... کپ تپائی پر رکھ کر وہ بولی۔

”ابا..... میں سیمہ کے پاس جاتی ہوں..... کچھ سہیلیاں آئی ہیں اس کے گھر..... اس نے چائے پر سب کو بلایا ہے۔“

”ہاں؟ جاؤ بیٹا.....“ میر قاسم نے خوشی سے اسے اجازت دی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ خالہ زینب سے آزادی کے ساتھ اس کے متعلق بات کر سکیں گے..... سیمہ کا گھر قریب ہی محلے میں تھا اور راحیلہ کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی..... راحیلہ کے جانے کے بعد میر قاسم نے پھر سے اپنی بات شروع کی، ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پھنساتے ہوئے وہ بولے۔

”راجی بڑی ہوگئی ہے خالہ..... اب ہمیں اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔“

”شکر ہے بیٹا..... تجھے اس کا خیال تو آیا..... ورنہ تو، تو شطرنج میں ایسا محو تھا کہ اکلوتی بیٹی کا خیال تک تجھے نہیں آتا تھا۔“ خالہ زینب نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

”نہیں اب ایسی بات بھی نہیں ہے..... لیکن اتنی بڑی بھی نہیں ہوئی تھی وہ..... اب بڑی ہوگئی ہے تو.....“ میر قاسم شرمندہ سا ہو کر بولا۔

”دیکھ بیٹا..... چھوٹی بڑی کو چھوڑ..... تیرے حالات ایسے ہیں کہ تجھے راجی کے بارے میں چند سال پہلے سوچنا چاہیے تھا..... دوسری شادی تو کرتا نہیں ہے..... میں چراغ سحری ہوں..... اور ویسے بھی میں کہاں اس کی جوانی کی حفاظت کر سکتی ہوں اور یہی بات میں تجھ سے کہنا چاہ رہی تھی بر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی..... کتنے دن سے کشمکش

فروٹ کا لٹافہ لینے لگی..... خالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر میر قاسم نے اس سے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”دوائی تو دے دی ہے۔“

”اچھا..... میں ان سے مل لیتا ہوں..... تم میری چائے وہیں لے آنا۔“ راحیلہ نے قدرے حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔ ابا اتنی زیادہ دیر تو خالہ کے کمرے میں نہیں رکھتے..... خیر وہ دل میں سوچنے لگی اور چائے بنانے کے لیے کچن میں کھس گئی۔

”کیا حال ہے خالہ..... طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ میر قاسم سلام کر کے ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بس بیٹا..... ٹانگوں میں شدید درد ہو رہا ہے..... پاگل بنا کر رکھ دیا ہے ان دردوں نے مجھے.....“ خالہ کو خود بھی ان کے بیٹھنے پر حیرت ہوئی۔ اکثر وہ کھڑے، کھڑے اس کا حال پوچھتے یا سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے..... خالہ زینب گاؤں تکے کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔

”ڈاکٹر کی دوائی تو نام پر لے رہی ہیں نا.....؟“

”ہاں بیٹا..... راجی وقت پر دوائیاں دے دیتی ہے۔“ وہ بولیں تو میر قاسم ہمدردی سے کہنے لگے۔

”ایک دو دن دیکھ لیتے ہیں خالہ..... اگر آرام نہ آیا تو دوسرے ڈاکٹر سے چیک اپ کرا لوں گا۔“

”اچھا بیٹا..... خدا تمہاری عمر دراز کرے.....“ خالہ زینب انہیں دعائیں دینے لگیں..... میر قاسم کچھ دیر بیٹھے سوچتے رہے پھر بولے۔

”خالہ..... آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ خالہ زینب کی ہائے وائے ٹھم گئی.....

”ہاں بیٹا..... سو باتیں کہو..... مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی تھی..... خیر پہلے تم کہو.....“ وہ بولیں۔

میر قاسم نے ان کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی

حال میں فواد کو داماد بنا سکیں گے چاہے اس کے لیے انہیں کچھ زیادہ کیوں نہ کرنا پڑے..... شاید اس کے لیے خالہ زینب بھی نہ مانیں، ایک نئی سوچ ان کے ذہن پر حملہ آور ہوئی..... لیکن بہر حال وہ ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کریں گے..... فواد کے بارے میں تو انہیں یقین تھا کہ وہ یہ خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا..... اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن وہ بیٹھے بٹھائے نہ صرف اپنے مالک کی بیٹی کی قسمت کا مالک بن جائے گا بلکہ ایک عدد گھر اور جمہایا کاروبار بھی اسے مل جائے گا..... آج گھر جاتے ہوئے میر قاسم کے ذہن کو سوچوں نے شل کر رکھا تھا..... کبھی کبھی انہیں ڈر بھی لگنے لگتا.....

”لوگ کہتے ہیں کہ پیر کی جوتی کو سر پر کبھی نہیں رکھنا چاہیے کیا خبر..... وہ مجھے میرے ہی کاروبار سے بے دخل کر دے..... مجھے آنکھیں نہ دکھانے لگ جائے..... خیر.....“ میر قاسم نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے خود کو تسلی دی..... ”میں کیوں اپنی ساری کشتیاں جلاؤں گا..... سب کچھ راحیلہ کے نام کروں گا فواد اس کا شوہر ضرور ہوگا لیکن جائداد تو راحیلہ کے نام ہوگی اور فی الحال تو راحیلہ کے نام بھی نہیں ہے..... گھر، دکان سب میرے نام ہے..... جائداد کی فکر چھوڑ کر مجھے راحیلہ کا گھر بسانے کی فکر کرنی چاہیے۔“ مثبت اور منفی خیالات کے گولے ان کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

شام کو وہ دکان بند کر کے گھر آئے تو کمرے سے خالہ زینب کی ہائے وائے کی آوازیں آرہی تھیں..... یہ روز کا معمول تھا خالہ زینب بیمار تو تھیں لیکن ان کی عادت داویلا مچانے کی بھی تھی۔ چھوٹی سی تکلیف ہوتی تو بھی بہت زیادہ شور مچاتیں..... اکثر تو میر قاسم ان کی ہائے وائے نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں چلے جاتے لیکن آج وہ ایسا نہ کر سکے..... راحیلہ نے باپ کو دیکھا تو لپک کر کچن سے باہر آگئی اور باپ کو سلام کر کے ان سے پھل

اور گھر میں نہیں جانا پڑے گا..... ان کا دل اس خیال پر زور، زور سے دھڑکنے لگا جیسے دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجائے گا..... ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے..... یہ خیال ہی بے حد انوکھا اور عجیب تھا..... شاید ان کے دوستوں اور بازار کے لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئے کہ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کا نکاح ایک تنخواہ دار ملازم سے کرنے کا سوچا ہے اور ہو سکتا ہے یہ لوگ اس شادی میں رکاوٹیں بھی ڈالنے کی کوشش کریں.....

”لیکن..... مجھے ادھر ادھر کے لوگوں سے اور ان کے خیالات کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے، میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا اور جسے میں اپنے لیے مناسب سمجھوں گا.....“ میر قاسم جتنا، جتنا ان خیالات کو اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرتے اتنا ہی وہ ذہن پر قابض ہوتے جا رہے تھے وہ سوچ رہے تھے کہ آخر فواد میں خرابی کیا ہے وہ گڈ لکنگ ہے..... پڑھا لکھا ہے اور مزید پڑھ رہا ہے..... جب بھی دکان پر گا بک نہ ہوتے تو وہ اپنی کتابیں کھول کر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا..... نہ اس کے آگے کوئی ہے نہ پیچھے کوئی ہے، ایک بیٹی کے باپ کے لیے یہ بھی اس کی خوبی میں شمار ہوتا ہے، بس اس کی ایک خامی ہے کہ وہ غریب ہے اور ان کا نوکر ہے تو غربت کوئی خامی نہیں اور نہ ہی محنت کرنا کوئی گالی ہے۔ وہ محنت کرتا ہے اس دکان کے لیے جان مارتا ہے اور بدلے میں، میں اسے تنخواہ دیتا ہوں..... اور ویسے بھی اس نے کئی بار کہا ہے کہ یہ جب اس کی عارضی جاب ہے وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا چاہتا ہے.....“ میر قاسم کا سوچ، سوچ کر برا حال ہو گیا..... ان کی نسیں درد سے پھٹنے لگیں..... فواد اور گا بک کا جھگڑا کب کا ختم ہو چکا تھا..... گا بک دکان سے جا چکا تھا اور فواد اپنی کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا..... میر قاسم کو مختلف قسم کی سوچوں نے ادھ موا کر رکھا تھا لیکن انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ ہر

جب تک وہ میرے دل میں رہتا تھا
تب تک وہ میرے یقین میں رہتا تھا
بھرم ٹوٹا اس یقین کا کہ وہ میرا ہے
اس یقین اس بھرم کے ٹوٹنے کی صدا
بہت دور تک سنائی دی

مرسلہ: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ

لاہور

دعا

ماگنی ہے دعا
تیری خوشیوں کی
مکرا

اپنے ساتھ
اگر ہے گوارا تجھے بھی
تو تم بھی
آمین کہہ دو

شاعرہ: ندیہ نورین مہک، برٹانی

گول مول ہو کر اس کے حلق میں چبھنے لگے تھے۔ وہ
کچھ کہنے کے۔۔۔ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔
میر قاسم نے اس کی پیٹھ تھکتے ہوئے کہا۔

”راحیلہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔۔۔ اگر وہ
میرے گھر سے چلی گئی تو میرے پاس کچھ نہیں رہے
گا۔۔۔ اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اسے میں ایسے
لڑکے سے بیاہوں گا جو میرا داماد نہ ہو۔۔۔ بلکہ بیٹا بن
کر میرے ساتھ رہے۔۔۔ اور اس کے لیے میں نے
تمہارا انتخاب کیا۔۔۔ کیونکہ تم کافی وقت سے میرے
ساتھ رہ رہے ہو۔۔۔ تمہاری ساری خوبیاں مجھ پر
آشکار ہو چکی ہیں۔“

”دل۔۔۔ لیکن حاجی صاحب۔۔۔“ وہ کھکھیا
کر بولا۔ ”میں تو آپ کا نوکر ہوں۔۔۔ نہ گھر ہے نہ
روپیہ، پیسہ ہے۔۔۔ آپ آسمان ہو تو میں زمین۔۔۔ یہ
کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ میری اور آپ کی رشتے داری

آگئے۔۔۔ وہ کم صم اپنے حجرے میں بیٹھے تھے آج
زوروں کی بارش برس رہی تھی۔ کڑا کے کی سردی تھی
۔۔۔ فواد دکان کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا اس نے ایک
دو بار میر قاسم کو بکارا لیکن میر قاسم کا دھیان اس۔۔۔
طرف نہ تھا۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہے تھے ان کے
چہرے پر ایسی مردنی چھائی تھی کہ فواد کا دل سہم سا
گیا۔۔۔ وہ بے اختیار ان کے قریب گیا۔

”حاجی صاحب۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک
ہے ناں۔۔۔؟“

وہ خالی، خالی نظروں سے فواد کی طرف دیکھتے
ہوئے۔۔۔ بالکل اچانک بولے۔

”فواد۔۔۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔۔۔
بہت اہم بات۔۔۔“ فواد نے فوراً کہا۔

”کیسے ناں حاجی صاحب۔۔۔“ میر قاسم نے
کچھ بے بسی سی ابھی، ابھی نظروں سے اسے دیکھا
اور جس بات پر ابھی انہوں نے مزید سوچنا تھا اور پھر
فیصلہ کرنا تھا۔۔۔ وہ فیصلہ تو اچانک ہو گیا۔۔۔ وہ
نظریں جھکا کر بولے۔

”فواد۔۔۔ فواد بیٹے۔۔۔ تم جانتے ہوناں کہ
میں تم سے ایک بیٹی جیسی محبت کرتا ہوں۔۔۔ جانتے
ہوناں تم۔۔۔؟“

”جی حاجی صاحب۔۔۔“ فواد سعادت مندی
سے اپنا سر جھکاتے ہوئے بولا۔

”میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنے باپ کی طرح سمجھا
ہے۔“ میر قاسم دبے دبے جوش کے ساتھ بولے۔

”اگر ایسا ہے تو کیوں ناں ہم سچ سچ کے باپ،
بیٹا بن جائیں۔“

”جی۔۔۔“

”وہ اس طرح کہ تم میرے داماد بن جاؤ۔۔۔“ میر
قاسم نے اب کے صاف، صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

”سچ۔۔۔ جی۔۔۔“ مارے حیرت کے فواد سے
بات نہیں ہو پارہی تھی۔۔۔ وہ پھٹی، پھٹی نظروں سے میر
قاسم کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔۔۔ الفاظ

”آپ نے بھی مجھے نہیں بتایا۔۔۔ اب بتا رہی ہیں۔“

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خالہ زینب بولی۔

”ایک باپ کو ایسی خبر سنائی آسان کب ہوتی
ہے بیٹا اور مجھے تو خود چند دن پہلے معلوم ہوا ہے۔۔۔

میں تو دو پہر کو کھانا کھا کر سو جایا کرتی تھی، وہ تو چند دن
قبل مجھے نیند میں پیاس نے ستایا تو میں پانی پینے

آئی۔۔۔ دیکھا تو راجی کسی لڑکے ساتھ کچن میں بیٹھی
تھی۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکا تو بھاگ گیا اور راجی

میری منت سماجت کرنے لگی کہ میں تمہیں نہ بتاؤں۔“

”وہ لڑکا کون تھا؟“ میر قاسم ہاری ہوئی آواز
میں کہنے لگا۔

”میں نے لاکھ پوچھا پر اس نے بتا کر نہ
دیا۔۔۔ ہوگا اس کی کسی سہیلی کا بھائی وائی۔۔۔“ خالہ

زینب نے جواب دیا۔

میر قاسم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے مر
چکے ہوں۔۔۔ وہ عجیب سی کیفیت سے گزر رہے
تھے۔۔۔ کبھی ان کا دل چاہتا کہ خود کو مار لیں کبھی

راحیلہ کی جان لینے کو دل کر رہا تھا۔ خالہ زینب انہیں
دھیرے، دھیرے سمجھا رہی تھیں۔

”دیکھ بیٹے۔۔۔ اپنے غصے پر قابو پا۔۔۔ راجی کو
کچھ نہ کہہ۔۔۔ بلکہ ایسا ظاہر کر چسے تجھے کچھ معلوم ہی

نہیں۔۔۔ دیکھ میر قاسم یہ جوانی بڑی دیوانی ہوتی
ہے۔۔۔ نہ اپنا نقصان دیکھتی ہے نہ دوسروں کا۔۔۔

بس جھٹ پٹ اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔۔۔ اگر تو
نے اس کے لیے کوئی لڑکا ڈھونڈا ہے تو ویر نہ

کر۔۔۔“ اس کے علاوہ بھی خالہ زینب نے انہیں
بہت نصیحتیں کیں اور انہیں کسی بھی انتہائی قدم سے

روکے رکھا۔۔۔ میر قاسم، خالہ زینب کے کمرے سے
اپنے کمرے تک آئے تو انہیں قدم اٹھانا مشکل لگ

رہا تھا ایک، ایک پیر من، من بھر کا ہور ہا تھا۔۔۔ ان کا
جی زندہ رہنے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔۔۔ وہ لائٹ آن

کے بغیر اپنے بستر پر گرے اس رات انہوں نے کھانا
بھی نہیں کھایا۔۔۔ سچ بھی بغیر ناشتا کے دکان پر

میں ہوں کہ تجھے بتاؤں تو کیسے بتاؤں۔۔۔“ خالہ
نے رسائیت سے کہا۔

میر قاسم کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔۔۔ ابھن
بھری نظروں سے خالہ زینب کو دیکھتے ہوئے وہ بولے۔

”کیا بات ہے خالہ۔۔۔ کیا کوئی بات ہوئی
ہے؟“ خالہ زینب تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔

”ہاں بیٹا۔۔۔ بہت بڑی بات ہے۔۔۔ دراصل
راحیلہ نے اپنے لیے چور دروازہ ڈھونڈ لیا ہے۔“

”کک۔۔۔ کیا۔۔۔؟“ میر قاسم کا دل دھک
سے رہ گیا۔۔۔ ان کا دل ڈوبنے لگا۔۔۔ وہ ہراساں

لہجے میں بولے۔

”خالہ۔۔۔ آپ پہیلیاں کیوں بھجوا رہی
ہیں۔۔۔ صاف، صاف بات کریں ناں۔۔۔“

”صاف، صاف بات یہ ہے میر قاسم۔۔۔ کہ
راجی نے اپنے لیے بر خود چن لیا ہے۔۔۔ ایک لڑکا

اس سے ملنے آتا ہے۔۔۔“ میر قاسم کو ایسے لگا جیسے کسی
نے کس کر ٹھانچا ان کے منہ پر مار دیا ہو۔۔۔ وہ لڑکھڑا

کر رہ گئے۔۔۔ کافی دیر تک تو ان سے بات نہیں ہو سکی
لیکن جب بولے تو ان کی آواز غیظ و غضب سے۔۔۔

بھر پورگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور غصے
سے کانپتی آواز میں بولے۔

”کہاں ہے وہ منحوس۔۔۔ میں اس کا خون پی
جاؤں گا۔۔۔ زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا اسے۔۔۔

ذلیل! خالہ زینب نے چار پائی سے اٹھ کر ان کے
کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور انہیں دوبارہ کرسی پر

بٹھاتے ہوئے دھیسے لہجے میں بولیں۔

”میر قاسم۔۔۔ جوان، بیٹی کا باپ اس طرح
سچ کر نہیں بولتا۔۔۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے

ہیں بچے۔۔۔ اپنی عزت کو خود سنبھالنا پڑتا ہے۔“

میر قاسم بھرائی آواز میں بولے۔

”بیٹی نے تو عزت کا جنازہ نکال دیا اب میں
کیا اپنی عزت سنبھالوں گا۔۔۔ لیکن خالہ۔۔۔!“ اور
ایک شکایت بھری نظر ان پر ڈالی۔

اللہ مالک

ثوبیہ رفعت ذوالفقار



آنے سے گریزاں رہتی تھی..... اسے شک ہو گیا تھا کہ خالہ نے شاید میر قاسم کو اس کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوگا..... میر قاسم بھی راحیلہ کو چائے کھانے کا نہیں کہتے تھے..... دونوں کے بیچ چھین، چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا۔ میر قاسم وہاں نہ جاتے جہاں راحیلہ ہوتی اور راحیلہ باپ کو دیکھ کر کونے کھدروں میں چھپ جاتی.....

شادی کا دن آ گیا..... میر قاسم نے سارے محلے داروں اور بازار کے دکانداروں اور اپنے یار دوستوں کو بڑا پر تکلف کھانا کھلایا..... اور راحیلہ اور فواد ایک ہو گئے..... فواد اپنا مختصر سا سامان لے کر میر قاسم کے گھر آ گیا..... میر قاسم کے دل سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا..... وہ بالکل ریلیکس ہو گئے..... اب ان کی شطرنج کی بازیاں کچھ زیادہ ہی لگنے لگیں..... خالہ زینب بھی مطمئن ہو گئیں کہ جو ان لڑکی کی چوکیداری آسان بات تو نہیں تھی ہاں ایک بات ضرور تھی کہ وہ فواد کو دیکھ کر سوچتیں کہ انہوں نے فواد کو کہاں دیکھا ہے..... انہیں فواد کی شکل جانی پہچانی سی لگتی تھی..... اکثر وہ اس شک کا اظہار راحیلہ سے کر دیتیں تو راحیلہ ہنس کر کہتی۔

”اب مجھے کیا پتا خالہ..... کہ آپ نے فواد کو کہاں دیکھا ہے۔“ لیکن رات کو وہ ہنس کر جب یہی بات فواد سے کرتی تو فواد مسکرا کر کہتا۔

”بھئی راجی..... بڑی تیز میں تمہاری خالہ..... یعنی اس دن کچن میں مجھے ایک نظر دیکھ کر ہی انہوں نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے..... حالانکہ میں تو اس دن چھٹا وا بن گیا تھا..... اتنا تیز تو میں زندگی میں نہیں بھاگا ہوں جتنا اس دن بھاگا تھا۔“

دونوں کی مشترکہ ہنسی جب باہر تک آتی تو میر قاسم کے ہونٹ خود بخود مسکرانے لگتے۔ گویا ان کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ راحیلہ اس لڑکے کو بھول گئی تھی جس سے وہ ملا کرتی تھی۔

کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ حیران اور پریشان تھا۔

”ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے فواد بیٹا.....“

میر قاسم نے ہنکارا بھرتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا..... ”تم پڑھے لکھے ہو..... شریف ہو، تابعدار ہو، تمہاری شکل صورت اچھی ہے، کیا خامی ہے تم میں..... غریب ہونا کوئی جرم نہیں..... اور سنو..... جو چیزیں تمہارے پاس نہیں وہ میں تمہیں دوں گا..... مثلاً گھر، کاروبار اور ایک عدد بیوی..... اور ہاں ایک عدد باپ بھی.....“ اچانک فواد پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میر قاسم کی پیروں پر رکھ دیے۔

”حاجی صاحب..... آپ مجھے اتنی عزت اور محبت دے رہے ہیں جس کا میں اہل بھی نہیں..... میں انکار کر کے کیوں گناہ گار ہوں..... آپ دیکھیں گے کہ میں ہمیشہ آپ کا نوکر بن کر ہی رہوں گا۔“

کل سے لے کر اب تک پہلی بار میر قاسم نے اطمینان کی سانس لی..... انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے کل سے ان کے سینے میں سانس گھٹ رہی تھی..... جیسے وہ پہلی بار کھل کر سانس لے پائے ہوں..... انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں آج ہی تمہارے چچا سے بات کرتا ہوں۔“ فواد کے چچا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا..... وہ بھی فواد کی طرح حیران تھا اسے اپنے بھتیجے کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ معاملات اتنی جلدی، جلدی طے پا گئے کہ خود میر قاسم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا..... گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ خالہ زینب کی ساری بیماریاں گھر میں ہلا گلا ہونے ہی بھاگ گئی تھیں..... پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور فی الحال اپنی ساری بیماریاں وہ بھول بیٹھی تھیں..... میر قاسم کے دل میں راحیلہ کی طرف سے دھڑکا سا لگا تھا سو وہ شادی جلدی کرنے کے حق میں تھے۔ راحیلہ ان کے سامنے

ان کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے اثرات واضح تھے۔ جدید طرز پر مبنی اس خوب صورت بلڈنگ سے اپنے پی اے کے ہمراہ باہر نکل کر انہوں نے اپنی بلیک مرسیڈیز کی طرف قدم بڑھا دیے تھے جو سڑک کے کنارے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی لوگوں کی توجہ اور واہ، واہ اپنی طرف سمیٹ رہی تھی۔

سرمنی ڈریس میں ملبوس ہاتھ میں قیمتی بریف کیس تھا اسے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے، اپنی شاندار پرسنالٹی کے ساتھ خود آفندی صاحب نے بھی وہاں سے گزرتے ہوئے بہت سے لوگوں کو مرعوب کیا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں تیز قدم چلتے ہوئے وہ بار، بار اپنے ماتھے اور چہرے پر آیا پسینہ صاف کر رہے

”کیا ہوا... آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....“
شرمین کو فکر ہوئی تھی اپنے لوگ، سینڈ کی۔
”ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟“ وہ بس اتنا ہی بول
سکے تھے۔

”بہت خوش.....“ ساتھ ہی وہ مسکرائی تھی۔
”آپ کے ہوتے ہوئے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
”کچھ کر رہی ہو؟“ آفندی صاحب اصل
موضوع پر آنا چاہتے تھے۔

”ہاں، اپنی فرینڈ کی میرج اپنی ورسری کے
لیے گفٹ لینے نکلی تھی۔ میری بہت ہی خاص فرینڈ
ہے..... ہاں آپ کا کارڈ ہی استعمال کیا ہے یہی
بتانے کو فون کیا ہے، آپ کے اکاؤنٹ میں اب
تھوڑی ہی رقم ہے۔“ آفندی نے گہری سانس لی،
سات لاکھ کی رقم اسے تھوڑی رقم لگ رہی تھی۔ جو
بات انہیں گلے میں پھنسی ہڈی محسوس ہو رہی تھی ان
کی لاڈلی بیگم نے اسے چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔

”دیے انوائٹ تو انہوں نے ہم دونوں کو کیا
تھا لیکن آپ کے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہوتا میرے
لیے..... نہ گھر میں بیٹھ کر آرام سے چند باتیں کرنے
کا نہ کسی جگہ باہر جا کر فرصت سے انجوائے کرنے
کا..... مجھے اکیلے ہی ہر جگہ خوار ہونا پڑتا ہے۔“ اسی
نے الٹا شکوہ کر کے فون رکھ دیا تھا۔ آفندی صاحب
بس اپنے موبائل کو دیکھتے رہ گئے۔ جہاں سے کچھ درپچھل

ان کی عزیز از جان بیگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
گاڑی اب موٹروے کی سڑکوں پر فرار لے بھر رہی تھی
انہیں سفر کرتے ہوئے تقریباً ڈھائی گھنٹے ہو گئے
تھے۔ جب گاڑی کے ٹائر چرچر چائے تھے اور پھر اس
نے مزید حرکت سے انکار کر دیا تھا۔

”اب کیا ہو گیا ہے؟“ انہوں نے بیزار
سے ڈرائیور سے دریافت کیا تھا۔

”سر معلوم نہیں شاید گاڑی میں کچھ مسئلہ ہو گیا
ہے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ اس نے بوٹ کھول کر

حقیر معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے گھر کا بے تحاشا خرچ،
کمپنی کے اخراجات، ملازمین کی تنخواہیں، والدہ کا
علاج، علی کی گاڑی، مونا کی فرمائشیں، بیگم کی شاپنگ
اور سب سے بڑھ کر نئی فرم لانچ کرنا جس کے لیے وہ
پچھلے تین سالوں سے جتن کر رہے تھے۔ ان تمام
مسائل سے نپٹنے کے لیے انہیں بے تحاشا پیسے کی
ضرورت تھی۔ انہی پراہلہز کی وجہ سے ڈیپریژن اور
انسونیا کے مریض بن گئے تھے۔

☆☆☆

”پاپا مجھے اس سال ورلڈ ٹور پر لازمی جانا
ہے۔ آپ مجھے جانے دیں گے ناں..... آپ کو تو پتا
ہے میرے بچپن کا خواب ہے۔“ مونا نے پیار سے
پلپتے ہوئے ان سے کہا تھا ان کے ذہن میں بیٹی کی
معصوم خواہش ابھری۔

”پاپا آپ نے مجھ سے اسپورٹس کار دلانے کا
وعدہ کیا تھا میں نے آپ کا پوزیشن لانے کا خواب پورا
کیا اور اب آپ میرا ارمان پورا کریں۔ مجھے میرا انعام
اسی مہینے چاہیے۔“ علی نے پرجوش ہوتے ہوئے انہی
کا وعدہ یاد دلایا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اپنے
بچوں کے ہنستے مسکراتے ڈیمانڈز کرتے چہرے گھوم
رہے تھے۔ آفندی صاحب نے آنکھیں کھول دیں وہ
اپنی سوچوں میں غلطاں تھے جب ان کے موبائل پر پیج
آیا۔ وہ پیج بینک کی طرف سے تھا۔

”ایک اور نئی مصیبت!“ پیج پڑھتے ہی ان
کے منہ سے نکلا تھا۔ ان کے کریڈٹ کارڈ پر اچھی
خاصی رقم کی شاپنگ کی گئی تھی اور وہ جانتے تھے ان کا
کارڈ استعمال کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ وہ
نمبر ملانے ہی والے تھے جب ان سے پہلے ان کی
بیگم کی کال آگئی۔

”ہیلو ہنی.....“ شرمین نے کھلکھلاتے ہوئے
کہا تھا۔

”ہیلو!“ جواباً انہوں نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

جلی کیفیات ان کے اعصاب پر سوار تھیں۔ کچھ دیر
پہلے ہونے والے نیلامی کے تمام سین کسی فلم کی طرح
باری، باری ان کے ذہن میں چکر کھا رہے تھے اور
ساتھ ہی ساتھ ان کا غصہ اور ملال سوا ہوتا جا رہا تھا۔
”ذلیل، خبیث..... چھوڑو گا نہیں میں اسے۔“
نہایت نامعقول الفاظ ان کے منہ سے یقیناً مخالف پارٹی
کے لیے نکلے تھے۔ آج تک شیراز آفندی کو کسی نے
برنس کے میدان میں شکست نہیں دی تھی اور آج ضیغم
صدیقی آج کی نیلامی جیت گیا تھا۔

”میرا دل کرتا ہے، میں ختم کر دوں اس
کو.....“ انہوں نے غصہ نکالنے کے لیے پوری قوت
سے ہاتھ کا مکا بنا کر گاڑی کی کھڑکی پر مارا تھا جس
سے ایک زوردار ٹھک کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ جس کا
شیراز آفندی نے نوٹس نہیں لیا..... اپنا غصہ نکالنے
کے لیے انہیں ایک پچنگ بیگ کی ضرورت تھی جس
پر متواتر گھونسوں کی بوچھاڑ کر کے وہ دل کی بھڑاس
نکال سکتے۔

”گاڑی تیز چلاؤ.....“ وہ ڈرائیور پر دباڑے
تھے۔ جس نے فوراً سے گاڑی کی اسپید بڑھادی تھی مگر
اگلے ہی لمحے اسے گاڑی کو روکنا پڑا تھا۔

”گاڑی کیوں روک دی۔“ وہ ڈرائیور پر
چلانے ہی والے تھے جب ونڈ اسکرین کے پار نظر آتی
ٹریفک سگنل کی ریڈ لائٹ کو اپنا منہ چراتے دیکھا۔

”ڈیم اسٹ.....“ انہوں نے سیٹ کی پشت
کے ساتھ ٹیک لگالی اور کرب سے آنکھیں موند لیں۔
ان کی زندگی میں اتنی مشکلیں کیوں ہیں، وہ آئے دن
آفتوں کے گرداب میں پھنستے جا رہے تھے۔ ان کا
سکون برباد ہوتا جا رہا تھا۔ کتنی کوشش کی تھی انہوں
نے، یہ نیلامی جیتنے کو خود کو کتنے سال مشقت کی چکی
میں پیسا تھا مگر فائدہ کیا ہوا چار کروڑ..... صرف چار
کروڑ کا منافع..... ان کے مسائل ہی اتنے ہی زیادہ
تھے کہ یہ لمبی چوڑی رقم ان کی ضروریات کے سامنے

تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پی اے کو ہدایات بھی
جاری کر رہے تھے۔
”تم مزید دو دن یہاں رکو گے۔“ انہوں نے
آرڈر کیا تھا۔

”جی سر۔“ پی اے کی طرف سے نہایت
مستعدی سے جواب آیا تھا۔
”تمہیں اپنا سارا کام نہایت احتیاط اور
ہوشیاری سے کرنا ہوگا..... مجھے ہر حال میں ان کے
سکریٹس چاہئیں۔“ انہوں نے مزید کہا تھا۔

”ایسا ہی ہوگا سر، ڈونٹ یووری.....“ پی اے
کو جیسے رٹا گیا تھا ان کی ہر بات کا مثبت جواب
دینے کے لیے..... چلتے، چلتے وہ لوگ گاڑی تک پہنچ
گئے تھے۔ جہاں ڈرائیور نے دروازہ پہلے سے کھول
دیا تھا۔ اور اب دروازہ تھا سے مؤدب کھڑا تھا۔
”یاد رکھنا..... اگر یہ خیر لیک ہوئی یا کسی قسم کی
کو تاہی ہوئی تو اس کے ذمے دار صرف تم ہو گے۔“
وارننگ دے کر وہ دھب سے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے
جبکہ پی اے کی زبان گنگ ہو گئی تھی اس انوکھی لیکن
خوف ناک تہمت کو سن کر.....

”جلدی گھر چلو.....“ بریف کیس برابر کی
سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی
ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کو
بارعب لہجے میں آرڈر کیا..... لنچ ٹائم تھا اور آفندی
صاحب ابھی ابھی ٹینڈر آکشن سے فارغ ہوئے تھے
اور اب انہیں اسلام آباد سے لاہور اپنے گھر جانا تھا
کیونکہ وہ کھانا ہر ممکن کوشش میں اپنی فیملی کے ساتھ ہی
کھاتے تھے چاہے ٹائم سے بے ٹائم ہو جاتے۔ جو
انہیں بے حد عزیز تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی موٹروے
پر ڈال دی تھی۔ پی اے کے سامنے کے عالم میں کھڑا ان کی
گاڑی کو وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رنج، کرب، حسد، ملال، غصہ اور ٹینشن کی ملی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو پی
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریل کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

انہوں نے سرعت سے منہ موڑا تھا۔
”واٹ ڈائریبل از دس.....“ وہ دوبارہ شیشہ بند کرنے والے تھے۔ جب ڈرائیور بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا۔

”سر مجھے پاس ہی ایک ورک شاپ مل گئی ہے۔ گھبرا میں نہیں، گاڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتا رہا تھا۔ ”بس ہم ابھی گاڑی دھکیل کر وہاں تک لے کر جائیں گے اور.....“

”کیا بکواس ہے یہ.....“ آفندی صاحب نے درمیان میں ہی اسے ٹوک دیا تھا۔ ”تمہارا مطلب ہے میں گاڑی کو دھکا لگاؤں گا۔“ انہوں نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

”نوسر میں اور وہ شخص دھکا لگا کر گاڑی کو وہاں تک لے جائیں گے آپ بس..... پیدل چل کر ہمارے ساتھ آئیں۔“ ڈرائیور نے تھوک ننگتے ہوئے انہیں آگاہ کیا تھا۔ جو آفندی صاحب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ ایک معمولی شخص کی بے وقعت جھونپڑی تک شیراز آفندی کا چل کر جانا ان کی شان کے خلاف تھا مگر اس وقت مجبوری تھی۔ موٹر وے کی ہیلپ سروس آج ناپید تھی۔

☆☆☆

وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے سامنے ملکیت کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ٹائر میں ہوا بھرنے کے بعد وہ اب انجن اور اس کی تاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔

شاید کسی وائر کا انجن سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسپارک انجن تک نہیں پہنچ رہا تھا اور انجن نے اشارت بند کر دیا تھا۔ وہ شخص غیر معمولی انداز میں آفندی صاحب کو اپنی طرف اٹریکٹ کر رہا تھا۔ اس کے فن میں اس کی مہارت کمال کی تھی۔ وہ اسی قدر آرام اور مستعدی سے اپنا کام انجام دے رہا تھا گویا یہ سب اس

لیور کھینچا اور نیچے اتر کر انجن چیک کرنے لگا۔ ایک ٹائر کی ہوا بھی کم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے آفندی صاحب کو ایک اور منحوس خبر سنا کر ان کی ٹینشن میں مزید اضافہ کیا تھا اور شاید ویسے بھی بیٹری یا انجن میں کہیں کوئی ٹیکنیکل پرابلم آ گیا تھا۔

”میں قریب ہی کوئی ورک شاپ ڈھونڈتا ہوں۔“ اس نے ان کی طرف کی کھڑکی کے پاس آ کر کہا۔ تھوڑے فاصلے پر آبادی کے آثار تھے۔

درد اور بے چینی کے آثار اس کے چہرے پر بسرا کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دنیا جہاں کا کرب سمنا تھا۔ وہ چل کر اپنی چھپر نما دکان سے باہر آیا اور اضطراب کے عالم میں نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ مگر نظریں مایوس ہو کر واپس پلٹ آئیں پھر اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا..... اور

شاید کسی سے کوئی فریاد کرنے لگا تھا..... اس کی آنکھوں کی سطح نم ہو گئی مگر اس کی امید میں ذرا آنچ آئی تھی نہ رتی بھر کی..... کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا اور پھر نگاہیں جھکا لیں اس کی تکلیف میں افاقہ ہوا تھا۔

شاید اوپر سے کسی نے اسے نسلی دی تھی یا ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ واپس اپنی جھونپڑی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ جب اسے دور سے کوئی بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا اور اسے ہاتھ کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں چمک اٹھیں..... یہ صبح سے لے کر سہ پہر تک اس کا پہلا لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

آفندی صاحب سے گاڑی میں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ گاڑی بند ہو جانے کی وجہ سے اسے سنی نے مزید حتمی پھیلا تا بند کر دیا تھا اور گاڑی کے اندر جس بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا شیشہ کھول دیا جب اچانک گرم ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا اور ان کے منہ سے نکل آیا آفندی صاحب کو وہ ہوا جہنم کی آگ سے بھی زیادہ پُر تپش محسوس ہوئی تھی۔



دل کے دروازے

کائنات غزل



جسکے سے اس نے گاڑی اشارت کی تھی۔
 ”گاڑی ٹھیک ہوگئی صاحب.....“ اس شخص نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی۔ آفندی صاحب نے ایک خواب کی سی کیفیت میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے تھے اور چند نوٹ اس کی جانب بڑھائے تھے۔ اس شخص نے حیرت سے ان نوٹوں کی جانب دیکھا وہ رقم اس کی محنت سے زیادہ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر صرف ایک پانچ سو کا نوٹ پکڑا تھا۔

”میری محنت بس اتنی ہی تھی، مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہیے۔“ آفندی صاحب کو حد درجہ حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے آج تک اپنی ایک پائی بھی کسی پر فضول خرچ نہیں کی تھی۔ اس شخص کو انہوں نے اجرت سے زیادہ رقم دی تھی اور وہ اس سے انکار کر رہا تھا۔

”میرے لیے اتنی رقم کافی ہے، اتنے میں میرے بچوں کی آج کی روٹی پوری ہو جائے گی۔ آج رات میرے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے۔ آج گھر میں امن ہوگا۔ ہاں میرے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے۔“ وہ شخص دیوانہ وار کہتے ہوئے اپنی دکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”سنو.....“ آفندی صاحب اسے پکارا اٹھے تھے۔ یہ ”بس آج کی روٹی کے پیسے ہیں، تم کل کیا کرو گے؟“ وہ شخص ان کی پکار سن کر رکا تھا۔
 ”کل..... کل کا اللہ مالک ہے.....“ کہہ کر وہ شخص اپنی جھونپڑی کی جانب بڑھ گیا۔ آفندی صاحب کے قدم وہیں رک گئے۔

”کل کا اللہ مالک ہے.....“ ان کے اندر سکون کی ایک لہر اٹھی تھی۔ بلیک مرسیڈیز سڑک پر رواں تھی۔ ”کل کا اللہ مالک ہے“ شیراز آفندی جیسے، جیسے یہ بات سوچ رہے تھے ویسے، ویسے ان کے دل میں اطمینان بھرتا جا رہا تھا۔ یہ جگہ ان کی پسندیدہ ترین جگہ بن گئی تھی۔

کے لیے کوئی کھیل ہو۔ آفندی صاحب اسے بغور دیکھنے میں مصروف تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو انہیں اس جگہ سے متلی محسوس ہو رہی تھی، وہ ایک چھوٹا سا ڈربانما ایک کمرہ تھا جسے اس شخص نے اس ویرانے میں اپنی ورکشاپ بنایا ہوا تھا۔ گارے اور اینٹوں کو ملا کر دیواریں تعمیر کی گئی تھیں اور اس کے اوپر بانس اور گھاس پھوس کا چھپر ڈالا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے پر ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی بچھی تھی۔ جس پر کسی قسم کا کپڑا یا دری نہیں بچھائی تھی۔ بس پالکی پر ایک کھیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ میز پر ایک واٹر کولر اور اس کے اوپر ایک اسٹیل کا گلاس الٹا کر کے رکھا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر زنگ لگا ہوا تھا اور کولر کے ساتھ ہی ایک ٹرے میں کھانا کے برتن لپٹے ہوئے اور دوسرے کونے پر اس کا مرمت کا سامان تھا۔ آفندی نے نخوت سے سر جھٹکا تھا اسی شخص نے انہیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا تھا مگر جواباً انہوں نے گھور کر دیکھا تھا۔ اور اب..... وہ مبہوت ہو کر اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا ایک ڈور نے انہیں اس شخص کے وجود کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور وہ شخص اس ڈور کے ذریعے انہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کا بارونق، تروتازہ چہرہ اور اسی پر جی ہوئی داڑھی، چہرے کی معصومیت اور ہاتھ کی پھرتی، کام میں مہارت، عمدگی اور دلجمعی اس کی شخصیت کو ایک انوکھا وقار بخش رہی تھی۔ وہ ہنوز اس کی طرف متوجہ تھے۔ کچھ دیر پہلے والی بے گلی... فی الوقت کہیں منہ چھپا کر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

نہ جانے وہ شخص کب ان کی آنکھوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور پُر امید لہجے میں بولا تھا۔
 ”کام ہو گیا صاحب.....“ آفندی صاحب چونکے تھے وہ ان کے سامنے کھڑا چہرے پر ہلکی سی آس لیے ہوئے تھا۔ وہ کپڑے کے ساتھ اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ شاید وہ ان سے اجرت کا تقاضا کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے ان کا ڈرائیور گاڑی کو تسلی سے چیک کر رہا تھا اور پھر

اندرواٹل ہوتے ہی وہاں پڑے ٹوٹے گلداں کو جوتے کی نوک سے کونے میں کر کے وہ آگے بڑھا۔ صوفی پر آصفہ ماتھے پر پٹی باندھے آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ نیچے کارپٹ پر دونوں بچے گندے سندے چلیے میں سو رہے تھے۔ کارپٹ پر برگر کی تھیلی اور برگر میں سے نکلا ہوا کباب انڈا اگر ہوا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی درندہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔“
 ”نہیں کروں گی..... بالکل نہیں کروں گی“
 میرے باپ کے پیسے پر نظر رکھتے ہو اور میں بولوں
 ”بھی نہ.....“
 دہاڑ دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ رات تقریباً ڈیڑھ بجے اپنی چابی سے دروازے کا لاک کھول کر

ٹونٹ ٹونٹ کی آواز پر آصفہ موبائل دور پھینک کر روتے روتے سو گئی۔

”اوہ.....!“ مومنہ کا سارا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔ آتے ہی اچھا خاصا لوڈ کروایا تھا لیکن سسرال میں ادھر ادھر کال کر کے سب ختم۔ ”آصفہ بتائیں کیا سوچے گی۔“ مومنہ کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ جلدی، جلدی سارا کام نمٹا کر کل ہی آصفہ کے گھر جانے کا پروگرام ترتیب دینے لگی۔

☆☆☆

بیل کی آواز نے آصفہ کو سوچوں کے گرداب سے نکالا۔ یہ مشکل انھی آہستہ، آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دروازے تک آئی۔ سامنے مومنہ کھڑی تھی۔ مومنہ کو دیکھتے ہی پیمانہ صبر لہر نہ ہو گیا اور گلے لگ کر رونے لگی۔

”آصفہ، آصفہ کیا ہو گیا ہے پار اندر تو آنے دو۔“ آصفہ نے دوپٹے سے منہ پونچھا مومنہ اسے صوفے پر بٹھا کر کچن سے پانی لا کر پلانے لگی۔

”اب بولو کیا بات ہو گئی؟“ اندر آنے کے بعد وہ بولی۔ گھر کا حال تو ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا۔

”ہو گئی نہیں ہو چکی، میں برباد ہو چکی۔“ آصفہ اتنا کہہ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

”آصفہ کچھ بتاؤ تو.....! مومنہ نے انتہائی افسوس سے اپنی بچپن کی دوست کو دیکھا۔

”یاور کا کہیں چکر چل رہا ہے، سارا پیسہ اسی پر لٹا رہا ہے۔ گھر میں خرچ دینا کم کر دیا ہے اور تو اور پاپا جو پاکٹ منی مجھے دیتے ہیں، اس میں سے بھی مجھ سے پیسے مانگتا ہے۔ اگر نہیں دوں تو مارنے بھی لگا ہے۔ یہ دیکھو کل اس نے چابی کا گچھا کھینچ مارا تھا۔“ مومنہ کو پہلے تو گھر کا حشر اور اب آصفہ کی بات سن کر سکتہ ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یاور ایسا کر سکتا ہے؟

مغیث کے رونے کی آواز پر آصفہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔۔۔ مومنہ گہری سانس لیتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

”ہیلو السلام علیکم!“

”سچا پانا؟“

”آپ بتادیں۔“ انتہائی تھکی ہوئی آواز میں آصفہ نے کہا۔

”میں مومنہ ہوں آصفہ۔ تم ٹھیک ہو سو تو نہیں رہی تھیں؟“

”نہیں بس یونہی سر میں درد تھا۔ تم سناؤ کیسی ہو کب آرہی ہو پیرس سے؟“

”لگتا ہے آصفہ تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے..... میں نے تمہیں کراچی کے نمبر سے کال کی ہے تم نے دیکھا ہی نہیں۔“

”نہیں یاد بتایا ناں سہیں درر ہے۔ تم کراچی کے نمبر سے کیسے کال کر رہی ہو؟“

”ارے بابا کراچی میں ہوں جیسی تو کراچی کے نمبر سے کال کر رہی ہوں۔“

”تم..... تم کب آئیں کراچی؟ مجھ سے ملنے نہیں آئیں اور کال بھی نہیں کی۔“ آصفہ کا دل بھر آیا۔

”آصفہ میری جان، تم رو کیوں رہی ہو آتے ہی اتنی مصروف ہو گئی۔ گھر کی سیٹنگ، جمال نے سارا بزنس وائنڈاپ کیا پھر یہاں سیٹ کیا۔ سبج کا ایڈمیشن بس سب کچھ میں اتنا ٹائم لگا لیکن یاد مجھے تم برابر تھیں۔ تم سناؤ بیٹے، یاور بھائی کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں سب۔“ آصفہ نے گہری سانس لی۔

”سنو مجھے کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ مومنہ کو کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ جو آصفہ بات کرنے سے پہلے مسکراتی تھی بات کرتے، کرتے بھی آواز اتنی کھنکھاتی تھی کہ سامنے بگڑے موڈ والا بھی مسکرا دیتا اور اس وقت.....

”مومنہ تم کیا سننا چاہتی ہو میری بربادی کی داستان تو سنو۔“ آصفہ کا لہجہ سچ گیا۔ مومنہ کا ہاتھ دل پر گیا۔

”خدا خیر کرے۔“

دروازے کی دھاڑ سے آصفہ حواس کھو بیٹھی پوری قوت سے ساتھ رکھی ٹیبل پر رکھا گلدان کھینچ مارا تھا اور پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر روتی رہی بھوک نے ستایا تو اٹھ کر فریج میں دیکھا کل کا آلیٹ تھا۔ ایک تھیلی میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ فریج بند کر کے واپس آئی مغیث کو فیڈ کروایا چکر آنے لگے۔ سردرد سے پھٹنے لگا۔ زخم پر پٹی باندھی۔ خالی پیٹ ہی پین کلر لی۔ معیز کی چھٹی کا وقت ہونے والا تھا۔ مغیث کو پڑوس میں چھوڑ کر عیابا پہنا معیز کو اسکول سے لا کر کھینچ کر وایا وہی کل والا آلیٹ گرم کر کے روٹی اور دودھ کے ساتھ رکھ دیا۔

کارپٹ پر معیز کے ساتھ ہی بیٹھ کر صوفے پر سر نکالیا۔ آنکھیں موندتے ہی کئی آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ گئے۔

”مما، ممما.....“ آصفہ نے آنکھیں کھولیں۔

”مما آپ کیوں رورہی ہیں؟ میں ٹرے پکن میں رکھ کر آ گیا۔ آپ کے سر میں درد ہے سرد بادوں۔“

”نہیں میری جان۔“ آصفہ، معیز کے ننھے، ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی۔ معیز کو سینے میں بھینچ کر وہ پھر رونے لگی۔

”مما۔“

”جی، بیٹے۔“

”مما آپ کا موبائل بج رہا ہے۔“ آصفہ کی نظر گھڑی پر گئی کتنی دیر ہو گئی تھی ایک ہی طرح بیٹھے، بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ اسے پتا بھی نہ چلا معیز کب اٹھ کر پاس سے چلا گیا تھا۔ موبائل بج، بج کر بند ہو گیا تھا۔ مغیث کو دودھ پلا کر پڑوس کے بچے کو پیسے دے کر برگر منگوا یا۔ برابر کی مسز جمیل نے برگر کے ساتھ بریانی بھی بھیج دی تھی۔ معیز نے آدھا برگر کھایا اور وہیں سو گیا۔ مغیث وہیں پڑی بال سے کھیلنے لگا موبائل ایک بار پھر بجا۔ آصفہ موبائل لے کر صوفے پر آ کے لیٹ گئی۔

وہ سیدھا کچن میں گیا جا کر ایک گلاس پانی پیا اور فریج میں جھانکا۔ جو خالی پڑا تھا صرف ایک بریانی سے بھری پلیٹ رکھی تھی۔ یقیناً پڑوس سے آئی تھی۔ اس نے وہیں اسٹول پر بیٹھ کر ٹھنڈی بریانی کھائی ادھائی پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کی طلب تھی لیکن کچن کی حالت دیکھ کر طلب وہیں دبائی۔ دونوں بچوں کی فیڈر بنائی۔ ایک، ایک کر کے دونوں کو بیڈ پر لا کر لٹا آیا۔ آصفہ پر نظر گئی تو دل تاسف سے بھر گیا۔

دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ اسے دیکھے گیا۔ ماتھے پر گومڑا محسوس ہو رہا تھا سفید پٹی پر سرخ خون..... جو سوکھ کر براؤن ہو چکا تھا۔ چہرے پر بکھرے بالوں کی لٹیں..... آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، تلکبجے سے حلیے میں بھی وہ اپنی، اپنی لگی۔ وہ آہستگی سے گھٹنوں کے بل بیٹھا چہرے سے بال ہٹائے۔ آصفہ ذرا سا کسماسی، نظر پھر چوٹ پر گئی تو صبح والا واقعہ یاد آیا..... خون کھولنے لگا تیزی سے اٹھا اور بیڈروم میں چلا گیا۔

☆☆☆

آصفہ کی آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ دونوں بچے کارپٹ سے غائب تھے۔ بیڈروم میں آئی، چھوٹا مغیث جھولے میں فیڈر لیے سو رہا تھا جبکہ یاور اور معیز کے کپڑے بیڈ پر پڑے تھے یعنی یاور، معیز کو اسکول لے کر چلا گیا تھا۔ ایک دم سر چکرایا تو اسے یاد آیا کہ کل سے بھوک ہے اور اس کے ساتھ ہی کل کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ یاد آنے لگا۔

کل جب یاور نے معیز کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد اس سے پیٹروں کے پیسے مانگے تھے۔ اس نے یاور کو کتنی باتیں سنائی تھیں پھر کیا ہوا تھا۔ اچانک سر میں اٹھتی ٹیس نے یاد دلایا۔ یاور نے چابی کا گچھا کھینچ مارا تھا۔ پہلے تو وہ سن بیٹھی رہ گئی۔ آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔ جب آنکھ سے کچھ اوپر ایک گیلی لائن محسوس ہوئی ہاتھ لگایا تو انگلیاں سرخ ہو کر واپس آئیں۔

ہیں مہینوں آ کر رہے لیکن شوہر سے لڑکر آؤ گی تو ایک گھنٹا بھی نہیں رکنے دوں گی....“ آصفہ نے بیزار سے کہتے ہوئے عبا یا پہن کر مغیث کو گود میں اٹھایا اور گھر لاک کر کے مومنہ کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ معیز کو لے کر وہ ماما کے ہاں اتر گئی۔

”ارے میرے بچے آ گئے۔“ ماما لان میں پودوں کو پانی دیتی ہوئی مل گئیں۔ پاپ چھوڑ کر آصفہ کو گلے لگایا۔ باری، باری دونوں کو پیار کیا۔ مغیث کو گود میں لیتے ہوئے اندر کی طرف بڑھیں۔ ساتھ ہی ملازمہ کو آواز لگا کر مل بند کرنے کا کہا۔

”مالی بابا کہاں ہیں؟“ آصفہ نے بیگ رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”بیمار ہیں بیچارے اور تم سناؤ یاد بیٹے نے چھوڑا ہے؟“ ماما ملازمہ کا لایا ہوا اسکوائش گلاس میں نکالتے ہوئے بولیں۔

”نہیں ماما، مومنہ پیرس سے آ گئی ہے، گھر آئی ہوئی تھی وہی ڈراپ کر کے گئی ہے۔ اسے اپنے بچوں کو لینا تھا اسی لیے اندر نہیں آئی اور یہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں کام کے سلسلے میں۔“ آصفہ نے تفصیلاً جواب دینے کے ساتھ آخر میں بہانہ گھڑا کہ ماما کی زیرک نگاہوں سے بچنا آسان نہیں تھا۔

”یہ تمہارے ماتھے پر گوڑہ کیسا ہے؟“ ماما کو پریشانی لاحق ہوئی۔

”اُف یہ مائیں بھی ناں۔“

”ایسے ہی بس کچن میں چکر آ گیا تھا کینٹ سے سر ٹکرا گیا۔“ آصفہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹا خیال رکھا کرو اپنی صحت کا، رنگت بھی دیکھو کیسی زرد ہو رہی ہے۔ لگ ہی نہیں رہیں وہی گلابی، گلابی سی آصفہ۔ صدیوں کی بیمار دکھ رہی ہو۔“

”مما بھوک لگ رہی ہے۔“ معیز کی آواز پر ماما چونک کر اٹھیں۔

کچن میں جا کر کچھ چیزیں ٹھکانے لگائیں۔ گھر سے لایا ہوا کھانا ہاٹ پائٹ میں سے نکالا۔ ٹرے لے کر بیڈروم میں چلی آئی۔

”آؤ آصفہ کچھ کھا لو۔“ مومنہ بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ آصفہ نے مغیث کو تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

”آصفہ میں نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا جیسی جلدی پہنچی ہوں، پلیز جلدی آ جاؤ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔“ آصفہ کو مجبوراً آنا پڑا۔ کھانا کھا کر کچھ کمزوری کم ہوئی اور حواس بھی بحال ہوئے۔

”آصفہ تمہاری کام والی ملازمہ کتنے بچے آتی ہے؟“

”نہیں آتی، وہ بھی نہیں آتی اب..... گاڑی بھی بچ دی.....“ مومنہ کو ایک بار پھر آصفہ کو چپ کروانا مشکل ہو گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے یار، ہم مل کر اس مسئلے کا کچھ حل نکالتے ہیں۔ تم ابھی نہا کر فریش ہو جاؤ دو بچے بچوں کی چھٹی ہو جانی ہے پھر مجھے تو جانا ہوگا۔ پلیز جلدی کرو۔“ مومنہ کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

آصفہ کو ناچار اٹھنا پڑا۔ مومنہ نے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور جتنا ممکن تھا کراسیٹا پھر ایک خیال کے تحت برابر والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کچھ ہی دیر میں مسز جنیل کی ملازمہ کے ساتھ پورا گھر چکا دیا۔

آصفہ بیٹھی خلاؤں میں تکتی رہی۔ اسے یاد آیا کہ معیز کی چھٹی کا بھی ٹائم ہو گیا۔ کل اقبال ڈے ہونا تھا اور پھر ویک اینڈ آصفہ نے جلدی سے بیگ میں بچوں اور اپنے چند جوڑنے ڈالے اور مومنہ سے کہا۔

”پلیز تم مجھے امی کی طرف ڈراپ کر دینا۔“ مومنہ حیران نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

”تم کیا کر رہی ہو یہ.....؟“ مومنہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں کر رہی ہوں یار اور جو تم سمجھ رہی ہو وہ تو بالکل نہیں۔ تمہیں معلوم ہے ناں میری ماما کہتی

”ارے، میں اپنے بابا کو ابھی اچھا سا کھانا کھلاتی ہوں۔“ ماما کی توجہ اپنے سے ہٹ کر معیز کی طرف لگنے پر تشکر بھری سانس لی۔

☆☆☆

بستر پر لیٹتے ہی مومنہ کو پھر سے آصفہ کی پریشانی نے آگھیرا۔

”جمال!“

”ہوں۔“

”ادھر میری بات تو سنیں۔“ مومنہ نے جمال کا بازو ہلایا۔

”ہاں بولو۔“ جمال نے کروٹ بدلی۔

”جمال میں آج آصفہ کے گھر گئی تھی۔“

”اچھا، کیسی ہے وہ؟“

”جمال، یاد رکھی لڑکی سے چکر چل رہا ہے اور.....“ آہستہ آہستہ وہ تمام احوال جمال کے گوش گزار کرنے لگی۔

”ادہ تو یہ بات ہے۔“ جمال پریشانی سے اٹھ بیٹھا۔

”پھر بھی تم آصفہ کو سمجھاؤ اس سے کہو کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ میں بھی یاد سے بات کروں گا۔“ جمال دوبارہ لیٹ گیا۔

☆☆☆

کل آصفہ نیازی کی برتھ ڈے تھی کالج میں سب فرینڈز اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔

مشہور تھا۔ تمام استاد انہیں پسند کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھیں۔ ان کی اچھی رپوٹیشن کی وجہ سے سرز وہیب جو ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے انہوں نے بھی اجازت دے دی تھی کہ کچھ خالی کلاسوں میں سے ایک کلاس انہیں چند گھنٹے کے لیے دے دی جائے گی۔ جہاں یہ لوگ آصفہ کی برتھ ڈے کھل کر انجوائے کر سکیں چونکہ آصفہ کالج میں بھی نقاب نہیں اتارتی تھی آج الگ کلاس کی وجہ سے آصفہ نے عبا یا بھی اتارا اور خوب تیار بھی ہوئی۔

آصفہ ہاتھ میں کولڈرنک لیے سر کو دائیں بائیں ہلا کر مومنہ سے مسکرا کر بات کر رہی تھی کہ کلاس کے آگے سے گزرتے ہوئے یاور زمان کی نظر آصفہ پر پڑی جو پلٹ نہ سکی۔ سرخ رنگ کا خوب صورت اسکارف لیے سرخ ہی اسے لائن فراک، چوڑی دار پانچامہ اور چہرے پر بلا کی مصومیت۔ بات کرتے ہوئے بائیں گال میں پڑتا ڈمپل۔ لائٹ سے میک اپ میں وہ ادھ کھلا گلاب لگ رہی تھی۔

آصفہ کو اپنے چہرے پر کسی کی نظر کا ارتکاز محسوس ہوا تو ہیزل براؤن آنکھوں میں ناگواری سی آ گئی۔ اپنی ہی کلاس کا یاور زمان چاروں طرف سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ آصفہ نے رخ موڑ لیا۔ پیچھے اس کے سنہرے بال آبتار کے مانند محسوس ہو رہے تھے۔ یاور کے کندھے پر جمال نے ہاتھ رکھا تو وہ گہری سانس لیتے ہوئے پلٹ گیا۔

پھر آہستہ آہستہ یاور نے آصفہ کے دل میں جگہ بنا ہی لی اب وہ جب بھی اسے دیکھتا تو آصفہ نیازی بھی بس نیچے دیکھ کر مسکراتی۔ کبھی آصفہ کی نظریں یاور کو دیکھ کر لوڈینے لگتیں تو کبھی اسے نہ پا کر بے چین سی ہو جاتیں۔ بس انہی نظروں کا رابطہ تھا آپس میں۔ اس سے زیادہ نہ کبھی یاور نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور نہ آصفہ نے۔ فائنل ایئر ختم ہوتے ہی جمال نے مومنہ کے لیے اور یاور نے

”ہم نے سرز وہیب سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے پریشن بھی دے دی۔ آصفہ اب تو وعدہ کر وکل اچھا سا ڈریس اپ ہو کر آؤ گی۔“

”اور عبا یا بھی اتارو گی۔“ ندا کی بات میں سمیرا نے ٹکرا لگایا۔

”ہاں بابا لیکن پردے کا خیال بھی تم لوگوں نے رکھنا ہے۔“ آصفہ نے ہامی بھری۔

”اوکے باس۔“ ارومہ نے سر جھکا کر اسٹائل سے کہا سب ہنسنے لگیں۔ ان کا گروپ پورے کالج میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا کروں؟

جو کر رہا ہے زمانہ مری سرشت نہیں کسی کے خواب چرانا مری سرشت نہیں کروں گی رقص میں شب بھر تمہاری یاد کے ساتھ اکیلے ہجر منانا مری سرشت نہیں مرے لیے جو دعاؤں کے پھول چننا ہو اسی پہ انگلی اٹھانا مری سرشت نہیں میں گھر بلا کے اسے سوئپ دوں گی اپنا آپ پر اس کے دام میں آنا مری سرشت نہیں کسی کے زخم پر مرہم بھلے نہ رکھ پاؤں کسی کو زخم لگانا مری سرشت نہیں میں جس کی یاد میں رو، رو کے صبح کرتی تھی اسی کو دل سے بھلانا مری سرشت نہیں از: سیدہ جیاب عباس، مرالی تلہ گنگ

”ناشتادے دو۔“ وہ مخاطب کیے بنا بولا۔
 ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟ باہر بارش ہو رہی ہے بہت تیز۔“ آصف کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔
 ”میں نے تمہیں کہا ہے ناں میرے معمولات میں مت بولو۔ میں کہاں جاؤں، کہاں آؤں، کیسے موسم میں آؤں کیسے موسم میں جاؤں۔ ناشتادینا ہے تو دوور نہ رہنے دو۔“ اس کی آواز ہلکی لیکن لہجہ تکی لیے ہوئے تھا۔ آصف آنسو پتی چکن میں آگئی۔ چائے اچلتے ہی اسے ابا کی آئی واش روم بھاگی۔ باہر یاور کھڑا تھا۔
 ”طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو رہنے دو میں ناشتا باہر کر لوں گا۔“
 ”نہیں، میں لے کر آ رہی ہوں تیار سے۔“

نکل آئی اب باہر ہلکی، ہلکی بوند اماندی شروع ہو چکی تھی۔ اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ وہ قریبی ریسٹورنٹ آگئی۔ برگر اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے کر وہ نڈھال سی چیئر پر بیٹھ گئی۔ ویٹر برگر سرور کر کے گیا وہ چھوٹے، چھوٹے ہائٹ لینے لگی۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر بھی نظر دوڑا لیتی۔ ایک دم اسے لگا کہ برگر کا گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا۔ دور نیبل برگولڈن شوڈر کٹ بالوں والی عورت کے ساتھ مسکراتا ہوا یاور۔ عورت کی پشت اس کی جانب تھی۔ آنسوؤں کو باہر آنے کا موقع مل گیا۔ برگر ادھورا چھوڑ کر بچے کو گود میں اٹھایا بل ادا کر کے وہ گھر لوٹ آئی۔
 گھر آ کر بھی عجیب بے چینی میں گھری تھی۔ یاور آج بھی دیر سے آیا کسی بھی قسم کی بات کیے بنا کھانا کھایا اور سونے لیٹ گیا۔ آصف معمول کے مطابق چائے لے کر آئی تو وہ سوچکا تھا یا معلوم نہیں سوتا بن رہا تھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آصف کی آنکھ ناگوار بو سے کھلی۔ سامنے یاور راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ آصف سگریٹ دیکھ کر دہل گئی۔ اٹھ کر یاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے پکارا۔
 ”یاور کیا ہوا خیند نہیں آ رہی؟“ یاور نے انتہائی سرخ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں؟“
 ”تم سوئی کیوں نہیں ہو، دماغ مت کھاؤ ہٹ جاؤ میرے سر پر سے۔“ یاور کی آواز کسی دہاڑے سے کم نہ تھی۔ آصف کا ہاتھ دل پر گیا اور وہ ٹیٹھی چلتی گئی۔ وہ کرسی کو ٹھوک لگا کر باہر چلا گیا اور آصف کی یہ رات بھی بھیکتی چلی گئی۔
 صبح اس کی آنکھ کھلی تو باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی بھی بند نہیں تھی۔ سارا جسم درد کر رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ باہر آئی وہ صوفے پر بیٹھا موزے پہن رہا تھا۔

”لیکن وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔“
 ”کیا..... کیا کہہ رہی تھی؟“
 ”پہلے تم بتاؤ، سچ بتاؤ گے ناں؟“ جمال اب اس سے وعدہ لے رہا تھا۔ یاور نے گہری سانس لیتے ہوئے ہاں میں گردن ہلائی۔
 ”آصف نے مومنہ کو بتایا ہے کہ تمہارا کوئی چکر وغیرہ چل رہا ہے اور تم سارا پیسہ اسی پر لٹا رہے ہو اور اس کے والد جو پاکٹ منی دیتے ہیں وہ بھی تم لے لیتے ہو اور اگر وہ نہ دے تو ہاتھ بھی اٹھاتے ہو؟“ جمال کہہ رہا تھا اور یاور شا کڈ رہ گیا۔ آصف کی سوچ اس حد تک چلی گئی ہے۔
 ”آف۔“ یاور دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گیا۔
 ☆☆☆
 ”یاور آپ آج کل کچھ لیٹ آرہے ہیں۔“
 ”ہاں..... بس۔“
 ”میں نے آپ کو کال کی تھی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے ڈاکٹر کی طرف جانا ہے۔“
 ”بھول گیا تھا سوری۔ چلو اب سونے دو۔“ یاور کے لہجے میں بیزاری تھی۔
 ”تو سو جائیں۔“ آصف نے غصے میں کروٹ بدل لی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ آصف کو انتظار ہی رہا کہ یاور ابھی منائے گا لیکن کچھ دیر بعد ہی یاور کے خراٹوں کی آواز آنے لگی اور آصف کا تکیہ بھگنے لگا۔
 موسم میں آج کل جس سا محسوس ہو رہا تھا۔ معزز کو لے کر وہ گھر سے نکلی تو دھوپ کی تیزی سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ گانا کا لوجسٹ کے ہاں پہنچتے ہی اندیشے کی تصدیق بھی ہو گئی۔
 ”مبارک ہو آپ امید سے ہیں لیکن آپ کا یہ بچہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور آپ کمزور بھی بہت ہیں آپ کو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔“ ڈاکٹر نے پیشہ درانہ انداز میں کہہ کر میڈیسن لکھ دیں۔ وہ دھیرے، دھیرے مایوس کن انداز میں قدم اٹھاتی کلینک سے

آصف کے لیے رشتہ بھیجا۔ عبدالبجار نیازی آصف کے والد اپنے نام کی طرح ایک شخصیت رکھتے تھے حتیٰ کہ یاور زمان جو جدی پشتی رئیس اور کئی ایکٹرز میں کا وارث تھا وہ بھی کنفیوز ہو گیا۔ عبدالبجار نیازی صاحب نے یاور زمان کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کروائی۔ یاور کے باپ کے انتقال کے بعد اس کے چچا زاد بھائیوں نے ان کے کاروبار اور گھر پر قبضہ کر کے اسے بے دخل کر دیا۔ یاور نے اپنا حصہ مانگا تو تھوڑا بہت دے کر اسے ڈرا دھمکا دیا۔ یاور نے اس پیسے سے ایک چھوٹا سا فلیٹ خریدا اور باقی سے اپنا بزنس اشارت کیا اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ آصف شادی ہو کر اسی فلیٹ میں آگئی تھی۔ یاور، آصف کو دیوانوں کی طرح چاہتا تھا تو وہ بھی یاور پر فدا تھی پھر ان کی خوشیوں اور مسرتوں کو بڑھانے کے لیے معزز چلا آیا۔ ان کی زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی پھر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔
 ☆☆☆
 ”یاور جو پوچھوں گا سچ، سچ بتاؤ گے؟“ جمال دوسرے دن یاور کے آفس میں موجود تھا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد جمال اصل مدعا پر آیا۔ ”ایسا کیا ہوا ہے یاور جو تم دونوں بکھر گئے ہو؟“
 ”کچھ نہیں یار، وہ عورت نفسیاتی ہو گئی ہے۔“ یاور نے بیزاری سے جواب دیا۔
 ”نہیں، وہ اتنی بڑی بات ایسے نہیں کہہ سکتی جو تمہیں دیوانوں کی طرح چاہتی تھی۔ آج خود دیوانی بنی بیٹھی ہے۔“ جمال نے دھی لہجے میں کہا۔
 ”تم نہیں سمجھتے ہو۔ صبح، صبح اٹھ کر چیخنے لگ جاتی ہے گھر میں توڑ پھوڑ کرتی رہتی ہے۔ خرچ دو مہینے کا ختم دس دن میں کر دیتی ہے۔ بیزار آ گیا ہوں گھر جاؤ تو اتنا پھیلاوا کہ گھر میں قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔“ یاور کہتا جا رہا تھا اور جمال اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میرا پیچھا چھڑائیں، میں تھک گئی ہوں اس شخص کی مار کھا کھا کر۔“ یاور کے گھر سے نکلے ہی مومنہ کی کال آگئی تھی۔

”او کے..... او کے آپ فینس نہ ہوں، میں سمجھتا ہوں اسے۔“

☆☆☆

”یاور تو آصف کو طلاق دے دے۔“

”کیا..... کیا کہہ رہا ہے بھائی؟“ یاور پریشان ہو گیا۔ جمال نے یاور کے آفس آتے ہی سلام دعا کے بعد پہلی بات یہی کی۔ ”تجھ سے آصف نے کہا ہے کچھ؟“ اس نے جمال کو دیکھا۔

”ہاں، وہ اب تیرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، اب تم خود سوچ لو کہ کرنا کیا ہے۔“ جمال نے سے کھوجی نظروں سے دیکھا۔

”یار میں نے تمہیں نہیں بتایا بلکہ کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میرا بزنس بالکل ڈاؤن ہو چکا ہے۔ میری پارٹیوں پر حریفوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے نئے سرے سے اشارت لینے میں بال، بال قرض میں جکڑ چکا ہوں اب گھر سے بھی بندے کو میٹن ملے تو بندہ کہاں جائے۔“ یاور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”تم نے یہ بات آصف سے بھی شیئر نہیں کی؟“

”نہیں۔“ یاور نے نظر اٹھائی۔

”پہلی بات تو یہ کہ وہ تمہاری شریک حیات ہے دکھ درد کی ساتھی اگر اسے اپنے مسائل سے آگاہ نہیں کرو گے تو وہ خود بخود تمہارے روتیوں سے تمہارے بارے میں غلط سوچ رکھے گی۔ اگر شروع ہی میں تم نے شیئر کیا ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔“ بات کے دوران ہی جمال کی کال آئی وہ یاور کو سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

”پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ تم اتنے خراب حلے میں کیوں رہتی ہو مانا کہ تمہارے حالات اب پہلے جیسے

ہو سکتا ہے۔ شاباش جلدی سے پیکنگ کرو۔“ مومنہ بہت رمان سے اسے سمجھا رہی تھی۔ آصف کے آنسو اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ مومنہ نے اسے گلے لگا لیا۔

☆☆☆

معزز کو اسکول چھوڑ کر یاور گھر آیا تو آصف آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔

”آصف..... آصف میری بات سنو۔“ اس نے آصف کا بازو ہلایا۔

”نہیں سنی مجھے تمہاری کوئی بات۔“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔ میری براؤن ٹائی کہاں ہے بس اتنا بتا دو۔“ یاور نے بات بدلی۔

”مجھے نہیں پتا میں نے ٹھیک نہیں لیا ہوا تمہاری چیزوں کا۔ جس کے لیے رج سنور کر جا رہے ہو اسی سے پوچھو۔“ آصف اسی پوز میں بولی۔

”فالتو بکواس مت کرو۔ فضول میں بار بار میرے منہ نہ لگا کرو۔“ یاور چیخا۔

”فالتو بکواس میں نہیں کر رہی اور میں منہ نہیں لگی تم.....“ یاور نے پاس رکھے فلاور اسٹینڈ کو ٹھوک ماری اور باہر نکل گیا۔ فلاور اسٹینڈ آصف کے پاؤں پر گرا۔ بھل بھل کر کے خون بہنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”مومنہ دعا کرو میں مر جاؤں، اپنے بچوں سمیت تمہارے کہنے سے اس جہنم میں دوبارہ آگئی۔ کیا صلہ ملا۔ اس نے پھر مار دھاڑ شروع کر دی۔“ وہ فون پر مومنہ کو بتا رہی تھی۔

”لاؤ میری بات کرواؤ۔“ پیچھے سے جمال کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو آصف، کیسی ہو سسٹر؟“

”جمال بھائی اپنے ایب نارٹل دوست سے

ابھی گھر سے باہر کر دیں گی کہ کیوں لڑ کر آئی ہو۔“

”ابھی کیا کہہ کر رکھی ہو؟“ مومنہ نے استفسار کیا۔

”یہی کہ یاور اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“ آصف نے سر کے پچھلے حصے کو دباتے ہوئے کہا۔

”پھر تم نے کیا سوچا ہے یاور سے الگ ہونا چاہتی ہو؟“

”نہیں، نہیں۔“ وہ یک دم گھبرا گئی اس نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

”پھر.....؟“ مومنہ، آصف کے دل کا حال جانتی تھی۔ اب اسے جانچ رہی تھی۔

”مومنہ، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

”سمجھ تو مجھے بھی کچھ نہیں آرہا کہ تم دونوں کو ہوا کیا ہے۔ تم نماز حاجت بڑھ کر اللہ سے دعا مانگو۔“ مومنہ نے مشورہ دیا۔

”لیکن..... میں تو نماز ہی نہیں پڑھ رہی اب۔“ آصف نے شرمندگی سے بتایا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم..... تم تو تہجد بھی پڑھتی تھیں، کیا ایک بھی نماز نہیں پڑھتی ہو؟“

”نہیں۔“ آصف نے نظریں چرائیں۔

”تمہیں تو سب معلوم ہے نا کہ ناپاکی کی حالت میں شیطان حاوی ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہی ہے تمہارے اور یاور کے درمیان جھگڑوں اور بے برکتی کی۔“ مومنہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”اچھا اب کوشش کروں گی۔ چھوٹے مغیث کی وجہ سے اکثر کپڑے خراب رہتے ہیں۔“

”نہ صرف نماز پڑھو بلکہ اپنے گھر واپس چلی جاؤ اگر تمہاری بات یعنی یاور کے چکر والی درست بھی ہے تو تم خود ہی اپنی جگہ خالی کر آئی ہو۔ خالی جگہ دیکھ کر تو نہ آنے والا بھی آجاتا ہے بلکہ اٹھو میرے ساتھ ہی چلو اگر تم آج بھی آنٹی کے گھر رکیں تو انہیں شک

ناشتا۔“ وہ دوپٹے سے منہ تھپتھپاتی کچن میں آگئی۔ یاور وہیں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ آصف نے اس کے آگے ناشتا لگایا اور معزز کی فیڈر بنا کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

”یہ کیا؟“ یاور نے جب مہینہ آنے پر خرچ دیا تو آصف نے سوال کیا۔

”پیسے ہیں اور کیا؟“

”یاور اتنے کم پیسوں میں گزارہ کیسے ہوگا۔ دوائیں وغیرہ کتنے خرچے بڑھ چکے ہیں اور آپ.....“

”دماغ مت خراب کرو، اپنے فالٹو خرچے بند کرو، لوگ اس سے بھی کم میں گزارہ کرتے ہیں۔“ یاور کے انداز پر آصف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یہی یاور، آصف کے لاکھ منع کرنے پر بھی کہتا تھا۔

”لے جاؤ کیسے جاؤ شاپنگ جو پسند ہو خرید لو جیب کی فکر نہ کرو خالی ہو جائے گی تو کریڈٹ کارڈ موجود ہے نا۔“

ہر مہینے رقم کم ہوتی چلی گئی۔

”یاور اتنے کم پیسے، میں ملازم کو کیسے دوں گی؟“

”ہٹا دو ملازمہ، ساری دنیا خود کام کرتی ہے تم کوئی انوکھا بچہ پیدا نہیں کر رہی۔“ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا ڈیوری کے وقت کمزوری کی وجہ سے ایسا مسئلہ ہوا کہ آپریشن کے پناہ گزارہ نہ تھا۔ یاور نے گاڑی بیچ کر اسپتال کا بل ادا کیا۔ ہاتھ تنگ ہوتا چلا گیا۔ آصف گھر اور بچوں میں الجھ کر رہ گئی۔ عبدالببار صاحب جو پہلے پاکٹ منی دیتے تھے وہ بینک میں جمع ہوتی تھی اب وہ بھی خرچ ہونے لگی۔ معزز کا ایڈمیشن بھی انہی پیسوں سے ہوا۔

”خرچہ اب بھی وہ مجھے ہی دیتا ہے جو دس دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ تو پاپا والے پیسے خرچ ہونے لگتے ہیں۔“ مومنہ، آصف کے پاس بیٹھی تھی۔

”اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ ماما کو خبر ہوگی تو

نہیں رہے لیکن وارڈ روم تہاری اب بھی بہترین جوڑوں سے بھری ہے۔" مومنہ اور جمال نے آج کل دونوں میاں بیوی کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔
 "دل نہیں کرتا یار۔" آصف نے کسندی سے کہا۔ "اتنی پریشانیوں میں مار کھا، کھا کر کون اچھے کپڑے پہنے۔"
 "بالکل غلط کر رہی ہوتی۔ تمہیں تو اور تیار ہو کر رہنا چاہیے تاکہ یار گھر آئے تو صاف ستھری بیوی ملے اور باہر کی عورت کی طرف سے دھیان خود بخود ہٹ جائے۔" مومنہ نے سمجھایا۔
 "تمہیں معلوم ہے یار جو رقم دیتا ہے میں اس میں کیسے خرچ چلا رہی ہوں؟" آصف نے کہتے ہوئے روتے مغیث کو گود میں اٹھایا۔

"اس کا بھی حل ہے تم سب سے پہلے اپنے پورے مہینے کا خرچ ایک کاپی پر لکھو۔ اس میں سے انتہائی ضرورت کی چیزیں مثلاً کھانے کا خرچ، پیٹرول کا خرچ، مغیث کے ڈائریز کے خرچ الگ کرو پھر جب یار تمہیں رقم دے تو تم سب چیزوں کے پیسے الگ کر لو۔ کم پڑیں تو انکل کی دی ہوئی پاکٹ منی میں سے ڈال لو۔ ویسے بھی تم انکل والے سارے پیسے خرچ کر رہی ہو۔ ہر چیز لکھ کر منگواؤ، ہر خرچ کا حساب رکھو۔ پھر دیکھو کچھ بچتا ہے تو اوپر کے کام کے لیے کام والی لگا لو۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ کالج کی اتنی ذہین لڑکی استادوں کی ہر دلچیز شاگرد ڈیوٹیٹر کا یہ حال ہو جائے گا۔" مومنہ نے انتہائی افسوس سے کہا۔ آصف کو لگا جیسے اسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھائی دی ہو۔

☆☆☆

الارم کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی، پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ اندھیرے میں الارم کیوں بج رہا ہے۔ دور سے اذان کی آواز آئی تو یاد آیا فجر کی نماز کا وقت ہے۔ تیزی سے بستر چھوڑا۔ برابر میں دیکھا یار بستر

سے غائب تھا وہ دھک سے رہ گئی پورا گھر دیکھ لیا وہ کہیں نہ تھا۔ نماز کا وقت تنگ پڑنے لگا۔ وضو کیا نماز پڑھ کر خوب رو، رو کر دعائیں مانگیں۔ جائے نماز لپیٹ کر پٹی تو یار پیچھے کھڑا تھا۔

کہاں چلے گئے تھے کا سوال کرتے، کرتے زبان دانتوں میں دبالی۔ یار کے چلنے سے لگ رہا تھا کہ مسجد سے آ رہا ہے۔ سر پر ٹوپی تھی اور صاف ستھرے کپڑے۔ کچھ دیر وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ بلیک اور پنک کاٹن کے برینڈ سوٹ اور سفید نماز کے دوپٹے میں وہ روئی، روئی بہت ہی معصوم اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔ یار نے پہلے کی طرح اپنی ہانہیں وا کر دیں۔ وہ پہلے تو ذرا جھنجھکی پھر اس کی ہانہوں میں سٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ یار نے بھی چپ نہ کروایا بس اس کے بالوں پر ٹھوڑی ٹکائے اس کی کمر تھپتھپاتا رہا۔ خوب رونے کے بعد الگ ہو کر وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ وہ بھی اسی سائڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ آصف کو اپنی بے اختیاری پر افسوس ہوا تو اٹھ کر بچن میں چلی آئی۔ معیز کے اسکول اور یار کے آفس جانے میں بہت وقت تھا۔ اتنی دیر میں کافی کام منٹ سکتا تھا۔ رات کے برتن دھو کے دو کینٹ کی اچھی طرح صفائی کی پھر ناشتا تیار کیا۔ معیز کو اٹھا کر واش روم بھیجا۔ یاد۔ شے کا کہنے آئی تو یار سوچ کا تھا۔ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی کہ ٹھوڑی دیر پہلے والی بے اختیار پر شرمندگی تھی۔ بس کھڑی دیکھتی رہی۔

"کتنا ظالم شخص ہے مجھے چھوڑ کر دوسری عورت کی سنگت میں خوش ہوتا ہے۔" اس نے خود کلامی کی۔

"تو کیا اتنے گندے چلے اور لڑتی جھگڑتی بیوی سے خوش ہو؟" اس کا خمیر کر لایا۔

"نہیں، اب نہیں لڑوں گی ہر وقت صاف ستھری رہوں گی پھر تم واپس پلٹ آنا کسی دوسری عورت کے پاس نہ جانا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

آصف اپنے آپ سے باتیں کرنے میں اتنی مگن تھی اسے احساس ہی نہ ہوا یا اور کب سے آنکھیں کھولے اسے اپنے پاس کھڑا روتا دیکھ رہا ہے۔
 "کون سی دوسری عورت؟" یار نے اس کا ہاتھ کھینچا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

"کوئی سی نہیں، مت بات کریں مجھ سے۔"
 "مما یو نیفارم چیچ کر لیا۔" معیز کی آواز پر آصف جھٹکے سے اٹھی۔

"چلو بیٹا ناشتا ٹیبل پر لگا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بچن میں لے آئی۔

"واؤ، آج تو آپ نے میری پسند کا ناشتا بنایا ہے۔" ناشتا دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ آصف، معیز کو تیزی سے ناشتا کرتے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ نماز پڑھ کر طبیعت میں ایک سکون سا اثر آیا تھا۔

یار، معیز کو چھوڑ کر آیا تو آصف بلند آواز سے تلاوت کر رہی تھی۔ وہ اس کی آواز کی چاشنی اور منہاس میں گم ہو گیا۔ تلاوت سے فارغ ہو کر آصف بچن میں آگئی۔ مغیث کی فیڈر بنا کر اسے پلائی پھر سبزی بنانے لگی۔ یار نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے چھری لے کر رکھی اور اس کا ہاتھ تمام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ کون سی عورت؟"

"کوئی سی بھی نہیں، چھوڑیں میرا ہاتھ مجھے بہت کام کرنا ہے۔" آصف نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

"بات سنو جہاں تک میرا خیال ہے تم نے مجھے مسز گیلانی کے ساتھ دیکھا تھا۔ دیکھ تو میں نے بھی تمہیں لیا تھا لیکن ان دنوں میں سخت پریشان تھا۔ وہ میرے پارنٹر کی وائف ہیں اکثر آفس کے معمولات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا اور تم نے بھی پوچھنے کی زحمت نہ کی خود ہی دل میں وسوسے پال لیے۔ خود بھی پریشان ہوئیں اور مجھے بھی گردیا۔" آصف کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"آپ خود نہیں بتا سکتے تھے، میں پوچھتی تو آپ کہتے کہ میں شک کر رہی ہوں۔" آصف نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔
 "ہاں تو محترمہ آپ نے یقین ہی کر لیا شک کے بجائے۔"

"تو کیا کرتی، آپ کو معلوم ہے عورت ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہے سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن دوسری عورت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تو میں نے تو پاگل ہونا ہی تھا۔ آپ کا رویہ بھی اتنا خطرناک تھا۔" آصف پھر سے چہکوں پہلوں رونے لگی۔ کچھ دیر تو یار اسے لب بھینچنے دیکھتا رہا پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"اچھا بس سوری..... معاف کر دو یار۔" یار نے اسے خود سے دور کرتے ہوئے اس کا چہرہ تمام لیا اور اپنی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"یہ تمام غلط فہمیاں ایک دوسرے سے بات کلیئر نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہیں اور نہ میں نے تمہیں جان بوجھ کر چابی ماری تھی اور نہ اسٹینڈ یقین کرو تمہاری تکلیف دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا تھا لیکن تم نے غصہ ہی اس قدر دولا یا....." اس نے کہتے ہوئے آصف کے ماتھے پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی۔

"یار مجھ سے سارے وعدے لے لیں خود بھی ٹھیک ہو جاؤں گی بس آپ کبھی دھوکا مت دینا۔" اب کہ وہ خود ہی اس کے سینے سے لگی۔ یار نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر نکائی اور سوپنے لگا کہ اچھے دوست خدا کی نعمت ہوتے ہیں اور آصف سوچ رہی تھی کہ ایک سمجھدار ماں کی ہستی ہی گھر ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔ ماؤں کی شہ پر ہی کتنے گھر ٹوٹتے بکھرتے ہیں خدا کا شکر ہے اس نے مجھے سمجھدار ماں اور مخلص دوست عطا کیے۔



پوخیزا منگ

رابعہ نیازی

دیکھ کر وہ آپوں آپ مسکرائی تھی۔ یہ اس کی روزانہ کی روٹین تھی جو ذرا سی ردو بدل کے بعد میرے سامنے ڈھرائی جاتی۔ آج بھی ناشتا شروع کرنے سے پہلے میں نے اس پر ایک اچھتی نظر ڈالی، وہ گھر کے عام سے لباس میں جس پر رات کی شکنیں نمایاں تھیں میں ملبوس میری تیاری کے دوران بکھری اشیا سینے میں مصروف

پر فیوم کا آخری مرتبہ اسپرے کرنے کے بعد میں نے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور سب کچھ ٹھیک نظر آنے پر واپس مڑ گیا۔ بیڈ کے بالکل ساتھ میرے پالش جوتے جگمگا رہے تھے۔ میں نے جھک کر جوتے پہنے تو زارا ناشتے کے لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میری پرفیکٹ تیاری کو

تھی۔ اس کے الجھے بال جوڑے کی شکل میں قید تھے۔ اس کی ہر صبح کا آغاز نماز کے بعد میرے کاموں میں گزر جاتا۔ وہ میرے آفس جانے تک ایک وفا شعار بیوی کا ثبوت دیتے ہوئے میری ایک، ایک چیز میرے ہاتھ میں پکڑاتی جاتی مگر میرے واپس آنے تک وہ تمام کام ختم کر کے بالکل فریش نظر آتی۔

”زارا تم کبھی ناشتا کرو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ میں نے آلیٹ کو کانٹے سے دو نیم کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

”نہیں آپ ناشتا کر لیں، میں بعد میں فارغ ہو کر آرام سے کھا لوں گی۔“ اس نے حسب عادت جواب دیتے ہوئے بیڈ پر پچھی چادر کی شکنیں دور کیں۔ روزانہ ہی ناشتے میں کئی طرح کے لوازمات نظر آتے۔ میں اپنی پسند کے مطابق کچھ چیزیں کھاتا اور باقی چیزیں یقیناً زارا میرے جانے کے بعد کھاتی۔ وہ میرا مزاج کافی حد تک سمجھنے لگی تھی۔ ورنہ صبح اس کے آلیٹ بنانے پر میرا دل ہاف فرائی انڈا کھانے کو کرنے لگتا یا پھر ہاف فرائی بنانے پر وہی کھانے کو مچھنے لگتا۔ مگر اب وہ تمام تراشیا میرے سامنے لا کر رکھتی اور میرے جانے کے بعد بچی ہوئی اشیا اس کے ناشتے کا سامان بنتیں۔ مجھے آج بھی اس پر نوٹ کر پار آیا مگر یہ صرف ایک لمحہ ہی تھا جس نے مجھے زارا کی گرفت میں لیا اور میرا دماغ پھر سے کہیں اور بھٹکنے لگا تھا۔

ناشتے کے بعد میں پھر سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا اور بالوں کو آخری بار برش کیا۔ خوب صورت جے بالوں کو مزید سنوارتے ہوئے میں واپس مڑا تو زارا نے ہاتھ بڑھا کر میری ٹائی درست کی اور میری مطلوبہ فائلز لیے مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو میں تیزی سے گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی کے دونوں اطراف میں بنے گھر متوسط طبقے کی کھلی عکاسی کرتے نظر آ رہے تھے۔ سوئے اتفاق وہ آج بھی اپنے دروازے میں کھڑی

عید

عید پھر سے جگائے دیتی ہے
سارے ماضی کے درد بے درماں
عید کی رونقوں میں شامل ہوں
ہنستے بستے شہروں میں جیسے قبرستاں
اور بڑھ جاتی ہے بھولی ہوئی باتوں کی کک
عید کا دن تو فقط زخم ہرے کرتا ہے
عید آئی ہے سلگتی ہوئی یادیں لے کر
آج پھر اپنی تنہائی پر ترس آیا ہے
مرسلہ: جسبیں نیاز، ملتان

نظر آئی۔ میرے قدموں نے جیسے چلنے سے انکار کر دیا۔ ست روی سے قدم اٹھاتا میں اسے ہی ٹکنے میں محو تھا۔ وہ اپنے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی میری مخالف سمت میں باہر جھانک رہی تھی۔ شاید اسی لیے اسے میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کائن کا پرانا سا پردہ تھا مجھے اس پر کسی خوب صورت تصویر کا گمان گزرا۔ میں اس کے بے حد قریب پہنچ کر نادانستگی میں رک گیا۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روزانہ یہ اور میں ایک ہی وقت گلی میں آسنے سامنے آن ملتے ہیں۔ یقیناً اس کی کیفیت بھی مجھ سے الگ نہیں..... دل بے چین میں خوش گمانی نے یہاں سے وہاں تک خوب ڈیرے ڈالے۔ خود پر نظروں کی تپش پا کر وہ میری طرف مڑی اور پھر چھپا ک سے پردے کے پیچھے گم ہو گئی۔ مگر اس دوران میں اس کے لبوں پر پھیلا مہسم دیکھ چکا تھا۔ اس کے لمبے بالوں میں بڑے، بڑے شیشوں والا پراندہ ہمیشہ ہی ڈلا نظر آتا۔ اب بھی اس کے تیزی سے مڑنے پر پراندے میں لگے گھنگر و چھمن سے بچ اٹھے اور میرے دل و دماغ میں جیسے سُر ملی



اختر شجاعت

مشاعر و کلام
ماہنامہ پاکیزہ

شکر، عطاءے الہی

اے وہ ذات (اللہ)! جس کی یاد، یاد کرنے والوں کے لیے سرمایہ عزت! اے وہ جس کا شکر، شکر گزاروں کے لیے وجہ کامرانی..... اے وہ جس کی فرمانبرداری، فرمانبرداروں کے لیے ذریعہ نجات ہے۔ رحمت نازل فرما حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل پر..... اور ہمارے دلوں کو اپنی یاد میں اور ہماری زبانوں کو اپنے شکر یہ میں اور ہمارے اعضاء اپنی فرمانبرداری میں مصروف رکھ..... کہ دوسری ہر یاد، ہر شکر یہ اور ہر فرمانبرداری سے بے نیاز کر دے۔

جب ہماری زندگی کے دن بیت جائیں اور سلسلہ حیات قطع ہو جائے اور تیری بارگاہ میں حاضر ہونے کا بلاوا آئے جسے بہر حال آنا اور جس پر بہر صورت لبیک کہنا ہے تو ہمارے کا تاجان، ہمارے جن اعمال کا شمار کریں ان میں آخری مقبول عمل تو یہ کو قرار دے..... اے رب تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما..... (آمین)

شکر کیا ہے؟

شکر کے لغوی معنی ہیں احسان ماننا اور احسان مندی..... اللہ رب العزت نے ہمیں اتنی نعمتیں عطا کی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں..... دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ممکن ہی نہیں ہے۔

خالق کائنات نے قرآن مجید میں اپنے ذکر کے ساتھ شکر کو بیان فرمایا ہے..... ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر کرو اور ناشکری سے بچو.....“

(سورہ بقرہ: 152)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ.....
”اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دے گا۔“
(سورہ نساء: 147)

”اور ہم بہت جلد شکر کرنے والوں کو اجر دیں گے۔“
(سورہ آل عمران: 144)

”اگر تم شکر کرو گے تو میں نعمتیں زیادہ کروں گا۔“
(سورہ ابراہیم: 7)

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ سے فرمایا..... ”اے موسیٰ میرا شکر بجالاؤ ایسا کہ میرے شکر کا حق ادا ہو جائے۔“

حضرت موسیٰ نے کہا..... ”میں کیونکر تیرے شکر کا حق ادا کر سکتا ہوں جبکہ اداے شکر خود ایک نعمت ہے۔“ تو قدرت کی طرف سے ارشاد ہوا۔

”اے موسیٰ! اب تم نے میرا شکر ادا کیا جبکہ یہ جان لیا کہ اداے شکر بھی میری ایک نعمت ہے۔“

سب سے پہلے انسان یہ علم و یقین پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتوں کا سرچشمہ اور وہی منبع حقیقی ہے..... اور جو کچھ بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا ہے اسی کی طرف سے ملتا ہے۔ ایک بار حضرت داؤد نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی..... ”اے میرے پروردگار! میں کیونکہ تیرے شکر سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں جبکہ شکر بھی تیری ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے تو خداوند عالم نے ان پر وحی کی کہ..... ”میں مقام شکر میں اس بات پر تم سے خوش ہوں کہ تم نے یہ جان لیا کہ تمہاری نعمتیں میری جانب سے ہیں۔“

حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ نعمت

بس تھوڑی دیر باقی ہے۔“ زارا کے ڈانٹ میں بھی پیار بھرا مان تھا۔

”میرا خیال ہے تم سے بچنے کے لیے میں اپنی ڈیوٹی اتوار کو بھی لگوا لوں ورنہ تم شاید مجھے گنجا کے پنا نہیں چھوڑو گی۔“ میں نے شرارتاً دھمکی دی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ کال بیل کی آواز نے اس کی ہاتھوں کی حرکت کو چند لمحے کے لیے روکا.....

”میں دیکھتی ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر کی جانب لپکی۔ اس وقت میں جس حلیے میں بیٹھا تھا باہر گیٹ تک جانا خاصا شرمندہ کر سکتا تھا۔ لہذا میں لاؤنج کے جالی دار دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

”کیسی ہو زارا باجی.....؟ میں نے آپ کو تنگ تو نہیں کیا اس وقت آکر.....؟“ ایک شیریں سی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ مہ جیں، زارا کے سامنے گیٹ کے قریب کھڑی تھی۔

”نہیں بالکل بھی نہیں، آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ زارا نے حسب عادت مسکرا کر کہا تو اس نے زارا کی کھائی تھام لی۔

”نہیں باجی، مجھے ذرا جلدی ہے، میں بیٹھنے نہیں آئی۔ آپ سے چھوٹا سا کام تھا۔“ وہ سر جھٹک کر بولی تو نیلے پراندے میں لگے گھنگر و خوب صورت لے پر بچ اٹھے تھے۔

”آپ کو تو پتا ہے میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ آج یہ خط... آیا ہے کہیں سے، جانے کس نے بھیجا ہے۔

آپ ذرا پڑھ کر سنا دیں۔“ اس نے گلابی لفافے میں قید وہ کارڈ زارا کی جانب بڑھایا جسے میں دو دن پہلے پوسٹ کر کے آیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو میرے ارد گردنا پنے لگا تھا۔ گلابی لفافہ زارا کے ہاتھوں میں کھلتا جا رہا تھا اور مجھے لگا کہ پراندے کے گھنگر و، شیریں تبسم اور زارا کی مان بھری کھلکھلاہٹ میرے کانوں میں یکے بعد دیگرے بجتی چلی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

”ارے بابا اب چھوڑ بھی دو، کیا گنجا کرنا ہے مجھے۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے زارا کے ہاتھ پیچھے کرنے چاہے جو تیزی سے میرے بالوں میں چل رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور زارا ہمیشہ کی طرح مجھے کرسی پر بٹھائے سر کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے بعد یقیناً وہ میرے پاؤں بھی رگڑ، رگڑ کر دھونے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

”زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ چپ چاپ بیٹھے رہو

گھنٹیاں ہی بجائیں مگر میں جانتا تھا وہ اب بھی پردے کے پیچھے چھپی کھڑی ہے اور میرے آگے بڑھنے پر پردے کی اوٹ سے جھانک کر اپنے بے قابو دل کی دھڑکن سنتی چلی جائے گی۔ اس کے نازک سر میں پاؤں میں کولھا پوری چپل مجھے پردے کے پیچھے سے نظر آ رہی تھی۔ ایک بار تو دل چاہا کہ آواز دے دوں مگر گلی میں کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب بھی ساتھ والے الطاف صاحب کو دیکھ کر میں ہولے سے کھٹکھٹا اور بے دلی سے آگے بڑھ گیا۔ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے بھی مجھے زارا کا خیال نہیں آیا جس کی زندگی کا محور صرف میری ذات تھی۔

”نہ جانے کیوں ہم سر دوں کو گھر کی پاکیزہ اور پرسکون فضا بھی مطمئن نہیں کر پاتی۔“ میں نے گلی کے آخری سرے پر جا کر ایک بار پھر خوش گمانی کے پروں کو دیکھا جو آج کل کچھ زیادہ ہی پرواز کرنے لگے تھے مگر خالی گلی بھائیں، بھائیں کر رہی تھی۔ مجھ میں مزید صبر کا مادہ موجود نہیں تھا۔ تین ماہ ہو چلے تھے اس چوہے بلی کے کھیل کو..... مگر آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مہ جیں کو اپنا حال دل بتا دینا چاہیے اور یقیناً وہ مجھ سے الگ نہیں سوچتی ہوگی۔ میں نے خود کو بھر پور نسلی دیتے ہوئے ایک خوب صورت کارڈ خریدا اور چند سطروں میں اپنے جذبات کو جس قدر مقید کر سکتا تھا کرنے کے بعد میرا رخ پوسٹ آفس کی جانب تھا۔

☆ ☆ ☆

”ارے بابا اب چھوڑ بھی دو، کیا گنجا کرنا ہے مجھے۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے زارا کے ہاتھ پیچھے کرنے چاہے جو تیزی سے میرے بالوں میں چل رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور زارا ہمیشہ کی طرح مجھے کرسی پر بٹھائے سر کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے بعد یقیناً وہ میرے پاؤں بھی رگڑ، رگڑ کر دھونے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

”زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ چپ چاپ بیٹھے رہو



سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ معصیت (گناہ) کے کسی کام میں ان سے مدد نہ لی جائے اسی کا نام شکر ہے۔

ہمیں اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ ہم سے جو بھی نیکی ہو رہی ہے اور جس اطاعت و عبادت اور ذکرِ خداوندی کا ہم سے ظہور ہو رہا ہے، یہ سب اللہ کی توفیق، مدد، قوت، طاقت اور انعام کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اپنے تمام احوال سے الگ ہو جائیں۔ اللہ کی ذات صفات اور نور افعال میں فنا ہو جائیں، اپنی عاجزی، نادانی کوتاہی کا اقرار کریں اور تمام احوال میں اپنا مرکز سکون اللہ کو سمجھیں۔

شکر..... زبان، دل اور دیگر اعضائے بدن سے ہوتا ہے..... دل کا شکر یہ ہے کہ نیکی کا ارادہ کرے اور مخلوق کے لیے بھی نیکی ہی سوچے..... زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ان کلمات کو کہے جو شکر ادا کرنے کے مخصوص ہیں..... مثلاً سبحان اللہ..... الحمد للہ..... جزاک اللہ..... شکر اللہ..... اعضا کا شکر یہ ہے کہ انہیں عبادتِ الہی میں معروف رکھا جائے..... اور برے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے..... آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ جس مسلمان کا عیب دیکھیں تو پردہ رکھیں..... کانوں کا شکر یہ ہے کہ جو عیب کی باتیں سنتیں اسے راز رکھیں..... اچھی محفل میں بیٹھیں اور اچھا ذکر سنیں یہ سب باتیں اللہ کے شکر میں داخل ہیں اس کے علاوہ زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے..... شکر کرنا عبادت ہے۔ شکوہ شکایت کرنا اہل تقویٰ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔

جو ان تمام امور کا خیال رکھتا ہے وہ اپنے پروردگار کا شکر گزار بندہ کہلاتا ہے..... مگر ایسے شکر گزار بندے بہت کم ہیں..... جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔
”اور میرے شکر گزار بندے کم ہی ہیں۔“

(سورہ سبأ، 13)

شکر کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے سے کم درجے کے آدمی کی طرف دیکھے اور اپنے اوپر خدا کے فضل و کرم کو دیکھے..... اور دوسرا آدمی جس آفت میں

ان کے والد نے مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہی..... تو ایک عرصے تک ہم دونوں اپنی، اپنی محبت دل میں لیے بیٹھے رہے یہاں تک کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد اس کے پچا تھے۔ انہوں نے اس کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔

جب پہلی رات ہم دونوں یکجا ہوئے تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”جانتے ہو کہ اللہ نے ہمیں کیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔ اس نے ہمارے دنوں کو ناخوشگوار آفت سے نجات دی۔ لہذا ہمیں آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہش سے باز رکھنا چاہیے اور اس نعمت کے شکر یہ میں ہم دونوں کو خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔“ دوسری رات بھی اس نے یہی کہا..... جب تیسری رات آئی تو میں نے کہا کہ گزشتہ دو راتیں تو میں نے تمہارے شکر میں گزار دیں آج رات تم میرے شکر میں عبادت کرو۔“ اس طرح ہم پینسٹھ سال گزار چکے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چھوٹا تو درکنار کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر نعمت الہی کے شکرانے میں گزار دی۔ ”سبحان اللہ..... ایسے پیارے، پیارے اللہ کے شکر گزار بندے گزر رہے ہیں۔“

☆☆☆

حضرت شفیق بلخی نے حضرت امام جعفر صادق سے فتوت (سخاوت، مروت، شجاعت خاصے وسیع معنی ہیں) کی نسبت ایک سوال کیا..... امام نے فرمایا..... آپ بتائیں آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ حضرت بلخی نے کہا کہ ہمیں اگر کچھ مل جائے تو شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔“ اس پر امام جعفر صادق نے فرمایا..... ”مدینہ میں ہمارے ہاں کتوں کا یہی حال ہے..... ہماری حالت یہ ہے کہ مل جائے تو اوروں میں بانٹ دیتے ہیں اور نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔“

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں

بنے لگے پھر رکوع کیا..... پھر سجدہ کیا اور ہر حالت میں روتے رہے..... میں نے دریافت کیا..... یا رسول اللہ ﷺ آپ اس قدر کیوں روتے؟ جبکہ آپ گناہ سے محفوظ ہیں..... اس..... بشارت کی موجودگی میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں ایسا تو وہ کرے کہ جس کی آخرت محفوظ نہ ہو..... آپ ﷺ نے فرمایا۔ کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی بشارت دے۔“ آپ ﷺ نے ایک شخص سے پوچھا۔ ”کیسے ہو؟“ اس نے کہا..... ”اچھا ہوں.....“ آپ نے سوال پھر دہرایا..... اُس نے پھر کہا ”اچھا.....“ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ پوچھا..... ”کیسے ہو؟“ تو اس نے کہا..... ”الحمد للہ اچھا ہوں.....“ تو آپ ﷺ نے فرمایا..... ”میں بھی یہی سنتا چاہتا تھا۔“ (کہ مکمل جواب یہی ہے)

☆☆☆

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں..... ایک بار میں ایک بزرگ سے ملنے ایک بستی میں گیا جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا گھر نہایت پاکیزہ دیکھا..... اس مکان میں دو محرابیں تھیں ایک محراب کے گوشے میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسری محراب میں ایک پاکیزہ اور روشن چہرے والی بوڑھی خاتون بیٹھی تھیں..... یہ دونوں کثرت عبادت میں بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرے آنے پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا..... تین دن میں ان کے یہاں رہا..... جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے ان بزرگ سے پوچھا۔ ”یہ پاک دامن عورت آپ کی کون ہیں؟“ انہوں نے فرمایا..... یہ ایک رشتے سے تو میری چچا زاد بہن ہے اور دوسرے رشتے سے میری بیوی ہے۔“ میں نے کہا..... ”میں نے تو ان تین دنوں میں آپ دونوں میں غیرت اور بیگانگی دیکھی ہے..... اس کی وجہ بیان فرمائیں.....“ انہوں نے جواب دیا..... ”بات یہ ہے کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے تھے.....

کتنی بڑی ہو اس پر ادائے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو۔“

مزید ارشاد فرمایا..... ”کہ محرمات (وہ باتیں جن سے روکا گیا ہے) سے کنارہ کشی کرو۔“

☆☆☆

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا..... ”قیامت کے دن کہا جائے گا کہ حمد کرنے والے کھڑے ہو جائیں..... لوگوں کا ایک گروہ اس پر کھڑا ہو جائے گا ان کے لیے ایک (علم، پرچم) جھنڈا ہوگا وہ اس کے ساتھ جنت میں جائیں..... عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! حمد کرنے والے کون ہیں؟“ جو لوگ ہر حالت میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں..... یعنی جو ہر دکھ اور سکھ میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔“

فرمان نبوی ﷺ ہے کہ ”اللہ کی چادر شکر ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کی طرف وحی فرمائی کہ میں طویل باتوں کے بجائے اپنے دوستوں سے شکر کرنے پر راضی ہو گیا ہوں..... اور صابرین کی تعریف میں فرمایا گیا کہ ان کا گھر جنت میں ہے۔ شکر کے وقت میں ان سے مزید شکر کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میری طرف نظر رکھنے پر انہیں مزید نعمتیں عطا کرتا ہوں۔“

ایک بار فتوحات کے موقع پر جب مال آیا تو حضرت عمر فاروق نے حضور اکرم ﷺ کے حضور عرض کی۔ ”ہم کون سا مال لیں؟“

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا..... ”ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل.....“ حضرت ابن مسعود کا ارشاد ہے کہ ”شکر نصف ایمان ہے۔“ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے بڑھ کر ذکر لا الہ الا اللہ کو افضل الذکر اور الحمد للہ کو افضل الدعاء کہا گیا ہے..... الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں..... کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ میرے پاس سے اٹھے اور تھوڑے پانی سے وضو فرمایا اور نماز شروع کی..... آپ ﷺ اس قدر رونے لگے کہ آپ کے آنسو سینے پر

آئی ہے عید جب، جب آئی ہے یاد تیری

شائستہ زریں

گے 'ابا کے انتقال کو چند ہی دن ہوئے تھے، میں نے دو تین دن میں 'پپی عید مبارک' لکھ کر دے دیا۔ یہ بی بی وی کے لیے میرا عید کا پہلا ڈراما تھا۔ عید کے



حسینہ معین

ایک دن بعد افتخار عارف نے فون کر کے بتایا کہ 'تمہارا ڈراما بہت کامیاب رہا، لوگوں نے بہت تعریف کی ہے۔' 'پپی عید مبارک' کا بہت چرچا ہوا۔ کئی چھوٹے، چھوٹے ایوارڈ بھی ملے۔ لیکن آج تک میں نے یہ ڈراما نہیں دیکھا۔

ایاز خان

کامیڈین

چند برس قبل ایک شو کے لیے امریکا کے ٹور پر

عید کا چاند ابھرا تیری یاد کے ساتھ چاندنی میں تیری یاد کی خوشبو پھیلی گزرے بیٹے لمحے جب ایک یاد کی صورت ہمارے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں تو ہمارے لیے اثاثہ بن جاتے ہیں۔ اگر یہ ساعتیں عید سے منسوب ہوں تو ہر عید پر ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور شاعر کا یہ خیال درست ثابت ہو جاتا ہے کہ آئی ہے عید جب، جب آئی ہے یاد تیری اور ہمارا موضوع بھی یہی ہے لیکن التزام ہم نے یہ رکھا ہے کہ صرف 'فنون لطیفہ' سے تعلق رکھنے والے معزز خواہن و حضرات کو سروے میں شامل کیا ہے۔ سو فی صدی زندگی سے متعلق ان کی عید کی یادیں نذرِ قارئین ہیں۔

حسینہ معین

ڈراما نگار

بی بی وی کی عید کے حوالے سے ایک ایسی یاد ہے جو بیک وقت اچھی بھی اور بری بھی۔ یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے میرے والد آرمی میں تھے، ایک ایکسٹنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مجھے بی بی وی کی جانب سے عید کا ڈراما لکھنے کو کہا گیا تھا لیکن شدید صدمے کی کیفیت میں، میں نے لکھنا بند کر دیا۔ بی بی وی سے کنور آفتاب، افتخار عارف اور محسن علی آئے اور انہوں نے مجھے سمجھایا کہ 'آپ کے والد آپ کی ہر کامیابی پر بہت خوش ہوتے تھے، آپ ڈراما لکھیں گی تو وہ بہت خوش ہوں

بندہ وہ ہے جو صرف ضرورت کے وقت ہی میرا شکر کرے اور صرف سزا اور ابتلا کے وقت ہی میرے سامنے زاری کرے..... اللہ تعالیٰ نے شاکرین کو صالحین، مقربین اور عالمین فرمایا..... اور یہ تینوں اعلیٰ ترین مقامات یقین میں سے ہیں.....

☆☆☆

ایک بار حضرت شیخ سعدی کی جوتی دوران سفر ٹوٹ گئی..... تو وہ پریشان ہوئے کہ لوگ کیا..... کہیں گے کہ پاؤں سے ننگا ہوں..... یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آپ کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو پاؤں سے معذور تھا..... آپ نے فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے پاؤں کی نعمت تو عطا کر رکھی ہے۔

رب کریم کی نعمتوں کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے..... جبکہ اس کی شان کری می تو یہ ہے کہ جس قدر اس کا شکر ادا کیا جائے تو وہ اتنا ہی نعمتوں میں اضافہ فرمادیتا ہے..... حضرت رابعہ بصری شکر ادا کرنے پر شکر ادا کیا کرتی تھیں..... کہ اللہ نے شکر کی توفیق دی تو اس شکر پر شکر ادا کیا جائے..... سبحان اللہ.....

کتنی عجیب بات ہے کہ اس رب کریم کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے ہم خوب لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی ایک چیز جو کسی وجہ سے ہمیں نہیں عطا کی گئی جبکہ اس کا عطا نہ ہونا یقیناً ہمارے ہی مفاد میں ہے..... اس ایک چیز کی محرومی ہمیں نہ صرف یاد دہتی ہے بلکہ ہم اس کا شکوہ بھی کرتے ہیں اور بار بار کرتے ہیں جبکہ ہمیں سوچنا چاہیے یہ مصیبت یا مشکل خود ہماری اپنی کسی کوتاہی کے سبب تو نہیں..... اگر ایسا ہے تو ہمیں چاہیے کہ اس کی بارگاہ میں معافی مانگیں، توبہ کریں..... ہمیں تو ہر لمحے اس عظیم ہستی کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ جس رب کریم نے ہمیں بے تحاشا اپنی نعمتوں سے نوازا ہے..... اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توفیق بخشے کہ ہم اپنے رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں اور اس کے شکر گزار بندوں میں سے ہو سکیں..... آمین۔

☆☆☆

بتلا سے اور وہ اس سے محفوظ ہے تو وہ اس پر ڈھیروں پر شکر ادا کرے پھر دین کے اعتبار سے اپنے سے بلند تر درجے والے پر نظر کرے اور اپنے سے بلند درجے آدمی کے علم..... ایمان اور حسن یقین پر رشک کرے اور اپنے آپ کو برا سمجھے اور اپنے آپ کو ملامت کرے اور اس قسم کے اعلیٰ احوال حاصل کرنے کی کوشش کرے جب ایسا ہوگا تو وہ شاکرین میں داخل ہوگا اور اس کا نام بھی مہر و صحن میں آجائے گا..... اس مفہوم میں حضور ﷺ نے فرمایا..... 'جس نے دنیا میں اپنے سے کم تر کی طرف نظر رکھی اور دین میں اپنے سے برتر کی طرف نگاہ رکھی تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر کر سکے گا..... اور جس نے دنیا میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھا اور دین میں اپنے سے کم تر کی طرف دھیان رکھا اسے نہ صابر رکھے گا اور نہ شاکر رکھے گا۔'

حضرت ایوب علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی..... آدمیوں میں سے میرے ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے ہیں جب بندہ میری نعمتوں پر شکر کرتا ہے تو دونوں فرشتے کہتے ہیں..... 'اے اللہ..... اس پر اپنی نعمتیں مزید فرمایا..... اس لیے کہ یہ اہل شکر و حمد ہے، شاکرین سے خوب قریب ہو اور ان کو مزید کی توفیق دے اور ان پر مزید انعام فرما..... اور اے ایوب علیہ السلام شاکرین کے لیے یہ انعام کافی ہے کہ ان کا درجہ میرے ہاں اور فرشتوں کے ہاں بڑھ جاتا ہے.....

چنانچہ میں ان کے شکر کا شکر کرتا ہوں..... فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں..... زمین ان سے محبت کرتی ہے اور آثار و نشانات ان پر روتے ہیں..... اس لیے اے ایوب علیہ السلام شکر گزار بن جا اور میرے احسانات و انعامات کو یاد کرنے والا ہو جا..... اور میں تمہیں ذکر کی توفیق دوں تو میرا ذکر کر اور تجھے شکر کی توفیق دوں تو میرا شکر کہ..... جن کو توفیق دیتا ہوں اس پر ان کا شکر کرتا ہوں اور شکر پر انہیں جزا دیتا ہوں..... اور ان پر راضی ہوتا ہوں..... اور میرے نزدیک بدترین



صائمہ کنول

وہاں موجود لوگوں کا ہنسنے، ہنسنے برا حال تھا خیر کسی نہ کسی طرح شوٹ مکمل ہوا لیکن عید کا یہ ڈراما اور اس کی ریکارڈنگ کے دوران ہونے والی حیران کن پریشانیاں اور دلچسپ لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے۔

حنایسین

ٹی وی پروڈیوسر

ایک عید کے موقع پر ہم نے بچوں کو ڈریم لینڈ لے جا کر ”عید فن ایٹ ڈریم ورلڈ“ کے نام سے پروگرام کیا تھا۔ پانچ مختلف رنگوں کی شرٹس پی ٹی وی نے بچوں کی تیار کروائی تھیں۔

بچوں کے پانچ گروپس بنائے ہر گروپ کی پہچان ان کی شرٹ تھی۔ ان گروپس کے درمیان مقابلے کروائے تھے۔ خاص کر سوئمنگ اور واٹر بوننگ کے مقابلوں میں بچوں نے خوب انجوائے کیا ہم نے بچوں کو تحائف بھی دیے۔ ہم اپنے ساتھ حسن جہانگیر اور دو ڈانسربھی لے کر گئے تھے۔ پروگرام ایاز احمد نے ہوسٹ کیا تھا۔ بچوں نے خوب ہلکا کیا اور عید کا بھرپور لطف اٹھایا۔ بچوں کے



سمیع ثانی

سے ہم کراچی پہنچ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ سارا دن سو کر گزارا شام کو عید کا بھرپور لطف اٹھایا، یہ احساس بہت دل خوش کن تھا کہ عید اپنے گھر اور اپنوں کے ساتھ منا رہے ہیں۔

صائمہ کنول

اسٹیج آرٹسٹ

پچھلے برس عید کے ایک کھیل کی ریکارڈنگ کروانی تھی، میرا کردار رشتے کروانے والی خاتون کا تھا، عین وقت پر دو کرداروں کا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے اپنے شوہر جہانگیر حسن اور پڑوسن خالہ حمیدہ کو رضامند کر لیا۔ دونوں کا کردار مختصر تھا، بس چند مکالمے ادا کرنے تھے۔ خالہ حمیدہ درست ادائیگی نہیں کر پار ہی تھیں ہمارے ڈائریکٹر سیفی حسن نے کہا کہ خالہ جو میں کہوں وہی آپ بھی بول دیجیے گا۔ خالہ راضی ہو گئیں وہی الفاظ ڈھرانے کے لیے لیکن ہوا یوں کے ہمیں ہدایت دینے کے لیے سیفی صاحب جو جملہ بولتے خالہ اسی انداز میں بولتیں مثلاً سیفی صاحب نے کہا کیو خالہ نے وہی الفاظ ڈھرا دیے

مگر اپنا وطن اپنا وطن ہے وہاں موجود پاکستانیوں نے کہا کہ یہ اشعار ان کے جذبات و احساسات کے ترجمان ہیں۔ تمام پاکستانی بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ کئی نے تو یہ تک کہا کہ پردیس میں عید ہمارے لیے خوشیوں کا سندیسہ نہیں، اداسی کا پیغام لاتی ہے۔ وطن سے دوری کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ خود میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی لیکن اپنی فنی ذمے داری



قدیل جعفری

خوش اسلوبی سے نبھائی۔ سوشو بہت کامیاب اور عید یادگار رہی۔

سمیع ثانی

ٹی وی آرٹسٹ

۱۹۹۶ء میں عابد علی کی پروڈکشن میں ”دوسرا آسمان“ کی ریکارڈنگ کے لیے دہلی گئے تھے ۳۵ دن تک مسلسل ریکارڈنگ کروائی۔ رمضان کا مہینہ تھا تمام فنکاروں کی شدید خواہش تھی کہ عید اپنے وطن اور گھر میں کریں۔ چاند رات کی صبح چار بجے تک ہم نے ریکارڈنگ کروائی اور صبح آٹھ بجے کی فلائٹ



ایاز خان

گیا تھا وہاں پر میں نے عید منائی تھی۔ لاس اینجلس کی مسجد میں تمام پاکستانیوں نے عید کی نماز پڑھی تھی، نماز میں نے پڑھائی تھی۔ وہاں مقیم تمام پاکستانی نہایت محبت اور عزت سے پیش آئے۔ کئی لوگوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اتنی محبتیں پا کر محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وطن سے دور ہیں لیکن گھر، بچوں اور بیگم کی کمی بہر حال محسوس ہوئی۔ عید کی رات کو شو ہوا۔ سب نے بہت انجوائے کیا۔ پاکستانیوں کی کثیر تعداد نے بھرپور پزیرائی کی۔

قدیل جعفری

ہوسٹ، شاعرہ

ناروے میں ایک عید شو کیا تھا۔ عید کا دن تھا ظاہر ہے وطن سے دور، سو وطن اور گھر والوں کی بہت یاد آرہی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ پر لگیں اور ہم پاکستان پہنچ جائیں۔ بہت جذباتی کیفیت تھی جب وطن کے ذکر پر میں نے یہ اشعار پڑھے۔

مجھے یہ بات بلبل نے بتائی
جہاں دل مطمئن ہو وہ چمن ہے
یہاں پردیس میں ملتا ہے سب کچھ

نے اپنی منہی ذتے داریاں نہایت خوش اسلوبی سے نبھائیں۔

سارہ رضا خان

مغنیہ

چند برسوں سے باوجود شدید خواہش کے عید پر گھر والوں کے ساتھ وقت نہیں گزار پاتی۔ گزشتہ سال چاند رات کو بڑے بھائی کا نکاح تھا اور ٹی وی پر میری لائیو ٹرانسمیشن، بھائی کے نکاح کے فوراً



سارہ رضا خان

بعد ٹی وی چلی گئی پروگرام ختم ہوتے ہی گھر آئی تو سارے مہمان جاچکے تھے صرف گھر والے ہی رہ گئے تھے۔ اگلے دن ہم نے سوچا کہ عید ملن پارٹی رکھتے ہیں۔ لیکن عید کے دن عید کا کنسرٹ کی وجہ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ہمیں آؤٹ آف شی جانا تھا ہمارا نجی پروگرام تو خراب ہو گیا لیکن عید کا کنسرٹ بہت اچھا ہو گیا، بعد میں گھر والوں کے ساتھ گید رنگ تو ہو گئی لیکن بھائی کے نکاح میں بھرپور شرکت نہ کر سکنے کا ملال دل میں رہ گیا۔ اس لحاظ سے یہ عید یادگار رہی۔

گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے بچوں کے بغیر عید میں لطف نہیں آ رہا تھا مگر جب حیا اور حرمین سے بات ہو گئی تو دل کو سکون بھی ملا اور عید کا لطف بھی آیا۔ کنسرٹ میں پاکستانیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کو بھی جھومتے دیکھا تو خوشگوار حیرت ہوئی اور عید کا لطف بھی دو بالا ہو گیا۔ وہ عید کا سب سے یادگار لمحہ تھا جب تقریباً تین ہزار کے قریب حاضرین نے ہمارے ساتھ مل کر اے وطن پیارے وطن گایا تو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ اس وقت جذبہ حب الوطنی کو عرفان اور میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔

ڈاکٹر ندانسیم کاظمی

اینکر Q ٹی وی

عید کی اصل خوشی یہی ہے کہ ہم اوروں کو بھی اس میں شریک کریں۔ پچھلی دفعہ عید شو کیا تو گھر میں ٹینشن تھی لیکن میں عید شو کے لیے کٹ کر چکی تھی۔ شو



ڈاکٹر ندانسیم کاظمی

کے تمام شرکانے بہت شرارتیں کیں، میں نے بھی بھرپور ساتھ دیا بے شک میرے اندر دکھ تھا لیکن میں

دباہتہ رہا ہوں ایسے ہی ایک عید شو میں، میں نے اپنی محبت رینا کو دیکھا اور فوراً ہی ان کی نانو کے قدموں میں بیٹھ گیا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔ اس عید شو پر رینا کی دید نے زندگی خوشگوار بنا دی۔ اس طرح وہ عید یادگار رہی کہ ہم نے ایک دوسرے کو پالیا۔ گویا وہ عید ہمارے ملن کی بنیاد بنی۔ اس کے علاوہ وہ عید شو بھی ہمیشہ یاد رہے گا جب معین اختر بھائی بھی ہمارے ساتھ شو میں تھے۔

رینا عرفان

ہوسٹ، مغنیہ

گزشتہ برس عرفان قریشی اور میں یورپ ٹور پر گئے۔ ہم دونوں چونکہ ایف ایم اور ٹی وی کے علاوہ میوزک میں بھی انوالو ہیں۔ وہاں ہالینڈ،



رینا عرفان

بیلجیم اور فرانس میں کچھ کنسرٹس شیڈول تھے۔ بیٹھی عید بھی ان ہی دنوں میں آئی۔ وہ عید بالکل مختلف انداز کی تھی۔ پہلے دن صبح مسلم کیونٹی ہال میں نماز عید ادا کی۔ دوپہر میں ریہرسل تھی۔ رات کو کنسرٹ۔ اللہ کے فضل سے سب بہت اچھا ہو



حنائیں

لیے عید کا نہایت کامیاب شو تھا اور میرے لیے بہت یادگار۔

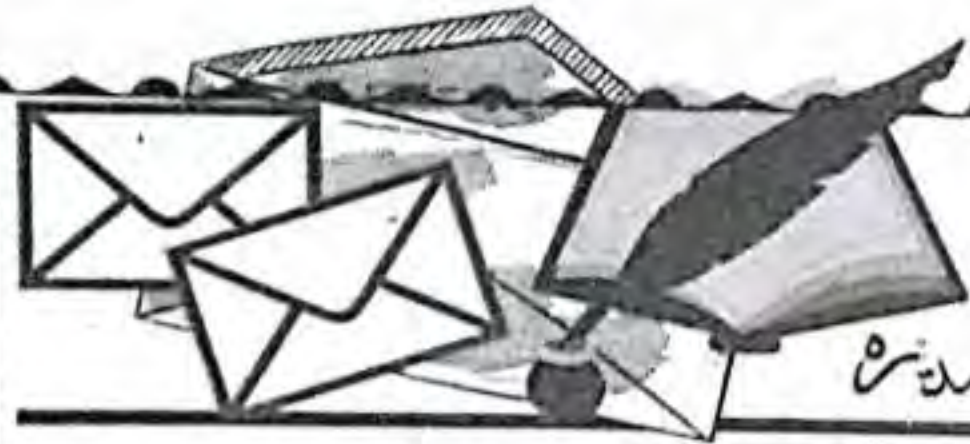
عرفان قریشی

ڈائریکٹر، آر جے ایف ایم ۱۰۷

بحیثیت پروڈیوسر اور ڈائریکٹر مختلف چینلوں سے



عرفان قریشی



مدیر

بہنوں کی محفل

ہو عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!
ہو حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

ہو آپ سب کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ دعا ہے کہ آپ جہاں، جہاں بھی ہوں صحت و تندرستی کے ساتھ خوشی اور محبتوں کے ساتھ رہیں۔ آپ کی ذات سے اگر کسی کو خوشی نہیں پہنچتی تو آپ کی وجہ سے کسی کو کوئی دکھ یا تکلیف بھی نہ پہنچے اور اس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے کہ اب پہلے کی طرح ملنا کم، کم ہو گیا ہے کہ پہلے خاندان کے چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرنے چاند رات میں اور پھر عید پر لازمی پہنچا کرتے تھے مگر اب بھی الحمد للہ عید پر بہت رونق ہوتی ہے۔ یہ دن ہمیشہ خاص ہی ہوتا ہے اور سب اپنی، اپنی بساط کے مطابق عید مناتے ہیں..... عید کے دن اگر گھر سے باہر نکلیں تو آنکھوں میں تراوشی محسوس ہوتی ہے پورا علاقہ، پورا شہر صاف ستھرا سا دکھائی دیتا ہے کہ ہر شخص نئے یا صاف کپڑے پہنے خوش باش سا دکھائی دیتا ہے اور یہ صفائی ستھرائی دل میں ایک عجیب سی طمانیت پیدا کرتی ہے اور ہنستے مسکراتے لوگ ہمیشہ خوب صورت دکھائی بھی دیتے ہیں مگر پھر بھی..... ہمارے آس پاس رشتے داروں میں دوستوں میں، روٹھے ہوئے لوگ روٹھے ہی رہتے ہیں وہ اپنے دل میں بغض کی ایک دیوار از خود کھڑی کر لیا کرتے ہیں۔ جب کسی کو ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہمیں بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ اگر کوئی ہمیں یاد نہیں کرتا تو ہمیں بھی کسی کو یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور یوں ہم اپنے بہت سے پیاروں سے پہلے دور اور پھر بہت دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مارے غصے کے انہیں فیس بک سے بھی بلاک کر دیتے ہیں اب یہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جھک جانے میں عظمت ہے، معاف کرنے والے کا درجہ زیادہ بڑا ہوتا ہے کہ جب جان کر بھی نہ جانا جائے تو اس کو شخصیت کا روکھا پن تو ضرور کہہ سکتے ہیں مگر ان سب کی دل کی ویرانی اور منتشر ذہنی کیفیت نہ کسی کو دکھائی دیتی ہے اور نہ اس سے چھینکا رہا یا جاسکتا ہے تو پھر ہم سب لوگ کیوں نہیں باز آتے ایسی حرکتوں سے ایسی باتوں سے جو ہماری خوشیاں کم کر دیا کرتی ہیں (لمحہ فکریہ) عزیز بہنو..... اپنی ذات سے دوسروں کی خوشیاں بڑھا کر دیکھیں تو کہیں..... آپ کی اپنی خوشیاں بھی دینی بنتی ہوتی چلی جائیں گی، انشاء اللہ۔

ہو پیار سے زیادہ پیاری بہنو..... میں جانتی ہوں آپ سب مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں اور ایسی ہی محبت میرے دل میں بھی آپ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے مگر میں آپ کو ہمیشہ تاکہ کرتی ہوں کہ نہ مجھے نہ میری بیٹی کو عید کا رڈ تک نہ بھیجا جائے..... اس مہنگائی کے دور میں فضولیات پر پیسے ہرگز نہیں خرچ کرنے چاہئیں کہ آپ کی دعائیں میرے لیے بہت خوب صورت تحفہ بلکہ تحائف ہیں جو مجھے دل سے پسند بھی ہیں مگر اس کے باوجود بعض بہنیں کچھ بھی بھینچنے پر تیار نہیں ہوتیں اور جو ان کا دل چاہتا ہے وہ کرتی ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے کوئی دوسرا کوفت میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ خیر..... اس وقت مجھے کوفت تو کیا شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک نوے سالہ خاتون سے فون پر بات کر کے۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی ہیں بڑا بیٹا اور اس کی بیوی ان کی چھوٹی بہو کو بالکل پسند نہیں کرتے ان خاتون کی کوئی بیٹی بھی نہیں ہے۔ وہ جب چھوٹے بیٹے کے پاس رہتی ہیں تو وہ اور ان کی بہو..... ان پر یہ احسان رکھتے ہیں کہ آپ کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کو ہم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور جب وہ بڑے بیٹے کے پاس جاتی ہیں تو وہ ان پر علیحدہ احسان دھرتے ہیں کہ آخر ہمارے پاس آنا بڑا ناں۔ آپ کو تو پھوٹے بیٹے کو عاق کرو دینا چاہیے۔ اباجی کا جو دکا نوں کا کرایہ آپ اس کے گھر میں بیٹھ کر خرچ کرتی ہیں وہ اس کو مانا ہی نہیں چاہیے وغیرہ وغیرہ بات مختصر یہ کہ آج نوے سالہ خاتون نے جب

خوشبو

☆ جب قرآن سے نکلتی ہے تو روح کو پاکیزہ کر دیتی ہے۔
☆ جب نماز سے نکلتی ہے تو مومن کی معراج بن جاتی ہے۔
☆ جب وضو سے نکلتی ہے تو محبت کے پھول بکھرنے لگتے ہیں۔
☆ مصباح رضا سید، یصل آباد

کے سوگوار چہروں پر خوشی کے جو رنگ بکھیر دیے تھے۔
تب دل کو جو نسکین ملی تھی وہ ناقابل فراموش ہے۔
☆ ☆ ☆

قارئین کرام! سروے سے جو مجموعی تاثر سامنے آیا وہ یہی ہے کہ فنی زندگی سے وابستہ عید کی یادوں میں بنیادی رنگ ایثار کا ہے۔ بلاشبہ فنون لطیفہ سے متعلق حساس دل اور بیدار ذہن ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں، جو اوروں کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتے ہیں۔ اپنے غم بھلا کر خوشیاں بانٹ دیتے ہیں۔ آپ نے پڑھا کیسے ایک عظیم دکھ سے گزرتے ہوئے بھی حسینہ آپا نے ”پپی عید مبارک“ کی سوغات عوام کو دی۔ بلاشبہ.....

یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں
لافتح صد حسین ہیں یہ ہنرمند جو ”عید، خوشی اور خوشیاں بانٹنے کا دوسرا نام ہے“ محض لفظوں میں استعمال نہیں کرتے بلکہ پوری سچائی سے جذبوں میں نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ سلام اے زندہ دلان وطن سلام۔

قارئین کرام! آپ سب کو ہماری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے عید مبارک۔ دلی دعا ہے کہ ہر آنکھ میں خوشیوں بھرا سورج ابھرے چمکتا رہے ہر آنکھ عید کے دن (آمین)

عظمی بلوچ

آرے

ایف ایم ۱۰ اور بحیثیت آر جے flood victim کے ساتھ گزاری جانے والی عید بلاشبہ ناقابل فراموش ہے۔ جن کا سب کچھ پانی بہا کر لے گیا ہو، ہم ان کے لیے چھوٹی، چھوٹی خوشیاں ساتھ لے کر گئے



عظمی بلوچ

تھے۔ یہ لائیو شو تھا جس کا نام ہم نے ”میشھی عید کی خاص خوشیاں“ رکھا تھا۔ میں اور میرے ساتھی RJS اپنے پروڈیوسر محمد عارف کے ہمراہ خواتین کے لیے مہندی، چوڑیاں اور بچوں کے لیے کھلونے لے کر گئے تھے۔ بچے اپنے گفٹ پا کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ہم سیلاب سے متاثر بچوں اور بڑوں کے تاثرات بھی براہ راست نشر کر رہے تھے۔ ایک خاتون بے تحاشا روتے ہوئے بتا رہی تھیں کہ میرے بھائی میرے لیے عید پر چوڑیاں اور مہندی لاتے تھے، یہ سن کر عارف بھائی نے چوڑیوں اور مہندی کا پیکٹ انہیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ”میں بھی تو آپ کا بھائی ہوں“ ہماری جانب سے تسلی کے بیٹھے بول اور عملی مظاہرے نے عید کے دن ان

مجھ سے یہ کہا انجم بنی کیا تم مجھے کسی مکان کا کوئی پورشن کرایے پر دلوا سکتی ہوتا کہ میں اپنی زندگی کے بقیہ دن سکون سے کاٹ سکوں تو مجھے انہیں دلاسا دینا اور سمجھانا کتنا مشکل ہو گیا اس کا اندازہ شاید آپ لگا ہی نہیں سکیں۔

اس سے قبل کہ آپ سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں آپ سے ایک ضروری بات اور کرلوں۔ میرا پرانا فون نمبر خراب ہے مجھ سے رابطے کے لیے آپ اس نئے نمبر پر رابطہ کیجیے۔ 021.36964779

اور اب آئیے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے ابھی پڑھ لیں اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری، اسلام آباد کے ٹی وی سیریل عنائیہ تمہاری ہوئی نے خوب دھوم مچائی دی ہے اب عید کے بعد دو جوتلو سے صائمہ کے دو خوب صورت سیریلز شروع ہو رہے ہیں۔ (مبارک ماہ کی مبارک ماہ)

پاکیزہ کی نئی مصنفہ حیات ترمذی، کافان ویلی کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کافان انٹرنیشنل اسکول کی پرنسپل بن گئی ہیں۔ (مبارک ماہ)

بفضل تعالیٰ میری نواسی اجیہ نے آغا خان بورڈ سے میٹرک کا امتحان اے ون گریڈ میں پاس کر لیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

مصنفہ اختر شجاعت کی دوسری کتاب بہت جلد آنے والی ہے۔ (مبارک ماہ)

رمضان المبارک میں ہماری بہت سی تبصرہ نگار بہنیں، قارئین بہنیں عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئیں اور بہت سی بہنوں کو احکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ (آپ سب کو بے حد مبارک ماہ)

دعائے صحت کے لیے التماس

- مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی کی طبیعت تاساز ہے۔
- مصنفہ زہت اصغر، کراچی بستر عیال پر ہیں۔
- مصنفہ شائستہ زریں، کراچی کی والدہ بیمار ہیں۔
- مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد کی طبیعت تاساز ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی علیل ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات بیمار ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری مسرتنور بخاری، کراچی علیل ہیں۔
- شاعرہ فری جاوید فری، لاہور کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز علیل ہیں۔
- پاکیزہ کی دیرینہ قاری اور تبصرہ نگار رضیہ زبیری، کراچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
- شاعرہ نجمہ اصغر کے..... بچے گرمی کی شدت کی وجہ سے شدید بیمار ہیں۔
- ہم سب کی لاڈلی امینہ عندلیب، سلاوالی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔

مبارک ہو

- نئی مصنفہ ساجدہ تاز، سندھ کی شادی ہو گئی ہے۔
- معروف ایٹک شائستہ لودھی کا نکاح ہو گیا ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری پروین ملک، کراچی کی مگنی ہو گئی ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری اور شعبہ تعلیم سے منسلک عمرانہ شہناز، کراچی کی شادی خوب دھوم دھام سے ہو گئی ہے۔

اور اب وہ عمر اندہ ندیم کہلاتی ہیں۔

انتقال پرمال

شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار نجمہ اصغر، کراچی کے والد اور والدہ لوگ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔

اس ماہ عالیہ رضا کی برسی ہے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

بہر رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ "میرا ناول رنگب خلش اختتام کو پہنچا۔ جسے سراہا بھی گیا اور یہ بھی فرمایا گیا کہ اس ناول کے بچنے کے لیے موٹا دماغ چاہیے حالانکہ ضرورت اس کے برعکس تھی۔ اسی کے پیش نظر میں آپ کو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی معصوم سی بات سنانا چاہوں گی۔ پروین شاکر کے پاس ایک بہت نامور گلوکارہ تشریف لائی جس کی ازدواجی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دکھ کا اظہار کچھ یوں کرنے لگی کہ جب میرے بچے چھین لیے گئے اور گھر سے نکال دیا گیا تو میں مگر چمچ کے آنسو روئی جب میرے ناول نے نئے موڈ پر نئی زندگی کو جنم دیا تو میں نے ناول کو انجام دینے ڈالا۔ تو میری قارئین کو قطعاً اچھا نہیں لگا۔ میں جانتی ہوں کہ پاکیزہ کی تبصرہ نگار خواتین ہر تحریر کو بڑی باریک بینی سے پڑھتی ہیں لیکن کسی نے رنگ خلش کو ان صاحبہ کی طرح نہیں پڑھا جو تیس سال سے پاکیزہ سے منسلک ہیں، ماشاء اللہ۔ رنگ خلش عید کے بعد کتابی شکل اختیار کرنے کی تیاری میں ہے جس کا انجام ساڑھ کی ازدواجی زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ نمر کو ہتھیار پھینکنے کے بجائے ہتھیار استعمال کرنے کے گمراہ کھاتی ہے کیونکہ یہی عورت کی عزت نفس، وقار اور معراج ہے۔ میرا ناول اور ہر کہانی سچائی پر مبنی ہوتا ہے ہمارا معاشرہ ایسے کتنے ہی نفسیاتی مسائل کو جنم دیتا ہے جو حال کا روپ دھار کر تاریخ کو ڈہراتے رہتے ہیں۔ سینٹ بگری کے بنے ہوئے مکانات میں محبت جیسے ٹھیسے ٹریلے جذبوں سے عاری بسنے والے مکین نئی نسل کی پرداخت بہتر طریقے سے کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ مرد مکان بناتا ہے اور عورت اسے گھر بنانے کی تک و دو کرتی ہے۔ دو ہستیوں کے نظریات میں یکجہتی اور ہم آہنگی سے ایسے گھروں میں پھول دکھلیاں مسکراتی ہیں۔ مصنفہ قوی کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فوقیت دی ہے اس کے تعاون کے بغیر کار جہاں کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے ذمہ داری بھی اسی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کہانی کے کردار آپ کو اپنے آس پاس ہی ملیں گے ذرا آنکھیں کھلی رکھیں تاکہ ظلم کو پہچان سکیں۔ کان کھلے رکھیں تاکہ فریاد کو سن سکیں۔ عادل جیسے بچے جو معاشرے کا ناسور ہیں ممکن ہے ان کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے اور وہ بچیاں جو معصوم ہیں ان کی شنوائی ہو سکے۔ رب ایک نفسیاتی مرض ہے اس بیماری کی دوا آپ کے دواخانے میں موجود ہے۔ اس کا نام ہے اپنے حقوق کی شناسائی۔ ذرا ڈھونڈیں اور مصنفہ قوی کو پہچانیں اگر وہ بے پروا، خود پسند اور تنہائی کو اولیت دیتا ہے، جذبات و احساسات سے محروم ہے تو وہ اپنی شریک حیات کو ہر پہلے کچھ کے لگائے گا، زبان سے نہیں اپنی خاموشی کی تیز دھار کھوار سے۔ اگر ہر بات پر ٹیل و قال کر کے نچا دکھانے کی کوشش اس کی فطرت میں ہے تو اس کی محبت بھی لہو لہان ہوگی۔ اگر وہ فرعون بن کر اپنی طاقت اور اختیارات کو منوانا چاہتا ہے تو اس کی چاہ ریت کے ذروں کے ماتند ہوگی جو ہر وقت آنکھوں کو اشکبار رکھے گی۔ جو اپنے ہم سفر کو عزت و تحريم کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اس کے ساتھی کے لٹن سے محبت و مسرت جنم لے گی۔ عورت کے بروقت فیصلے سے ان گنت بدنامیوں پر شوخ و شنگ رنگوں کی چھاپ لگ جاتی ہے اور نئی نسل کی پرداخت شوریدگی، انتشار اور آہ و بکا کے ماحول کے بجائے مسرت و طمانیت کے کھٹولے میں ہونے لگتی ہے۔ عورت کی قربانی اس کے اعلیٰ اخلاقیات و بلند کردار کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہماری مشرقی تربیت نے ہمارے پاؤں جکڑ رکھے ہیں لیکن جب قدم اٹھانے کی ہمت بحال کی جاتی ہے تو دنیا ہم پر وسیع ہو جاتی ہے اور رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ میں بات علیحدگی کی نہیں کر رہی۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے سوچیں۔ ماں جس کی بے لوث محبت و ایثار کا جواب نہیں وہ بھی اپنے بچے کو دودھ روئے پر ہی پلاتی ہے۔ ساڑھ بن کر زندگی گزارنے سے مسائل کا بھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہ میرے ناول کی تمیم تھی کہ محتاجی سے بہتر خود اعتمادی ہے جس میں

آزادی اور کامیابی ہے۔" (رفاقت بہن آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہے، ابھی ہماری قارئین ہمیں ناول سے متعلقہ آپ سے سوالات بھی کر رہی ہیں۔ ہم آپ کو وہ تمام سوالات ارسال کر دیں گے، مجھے امید ہے کہ آپ کے جوابات سے بھی پڑھنے والی بہنوں کی تسلی ہوگی اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا)

بھ ستارہ آئین کو مل گیا، پیر محل سے۔ "جون کا شمارہ شاعر ار رہا..... ہماری لنگوٹی حیا بخاری اور پیاری بوجھ صدف آصف جو شامل تھیں بہت اچھا لکھی ہیں ماشاء اللہ یار جو اور پیاری لنگوٹی جلدی، جلدی آیا کریں ناں..... بندی انتظار کرتی ہے۔ نزہت آپ نے بھی خوب لکھا۔ شیریں حیدر ویل ڈن ان کی حاضری اچھی لگتی ہے۔ صائمہ اکرم کی استوری خوب رہی..... نوک جھوک سے محظوظ ہوتے رہے ہم اور جناب باقی سب نے بھی شاندار لکھا..... سب کو شاباش..... آپ کی پرانی اور مستقل قاری عارفہ.... کراچی مجھے پاکیزہ کا باقاعدہ قاری بنا کر خود غائب..... مس یو آئی اب آپ تو رابطہ بھی نہیں کرتیں آجائیں ناں..... اب عید نمبر پر اک نظر نگہت سیما کا ناول اچھا ہے۔ قیصرہ حیات بھی اب بہت اچھا لکھیں گی۔ نیبلہ ابرار جا، ظالم خاتون میں نہیں بولتی، اب ہاں کتنا دلایا آپ نے۔ بشری گوئل ویل ڈن آپ کو دیکھ کر اچھا لگا۔ باقی سب نے بہت اچھا لکھا سب کو شاباش.... سیما یاسمین بھٹی کو پکڑیں ذرا تفصیلی انٹرویو لیں۔" (تہمیرے کا شکر یہ..... اب بے فکر رہیں سیما یاسمین بھی انٹرویو کے کٹہرے میں ضرور آئیں گی)

بھ سیدہ غزالہ عالم، کراچی سے۔ "طویل غیر حاضری عرصہ 10 سال کے بعد دوبارہ آگئی ہوں کیا تمہی یہ زندگی جس میں اپنے تین عدد مصوم بچوں کے ساتھ اور اپنے ہم سفر کے ساتھ..... مگر بہنوں کی ناگہانی موت نے سب کچھ ختم کر دیا کیے بعد دیگرے تین موت نے زندگی بدل دی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا..... والدہ کے انتقال کے بعد باہمی ظفرانہ 2010ء 23 مئی پھر رحمان عالم باہمی کا 16 جولائی 2011ء بھی نہیں بھولے۔ ہم سال میں تین، تین برسوں میں اتنے ہی نو مہر میں والدین پھر 23 مئی 16 جولائی اس لیے اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے ویسے ہی خوب صورت ہیں۔ پتا نہیں جگہ ملے گی یا نہیں کیونکہ اب دل مر چکا ہے، اب کچھ اچھا نہیں لگتا تو شاید آپ بھی ہمیں جگہ نہ دیں۔" (گڑیا یہ تمہارا پناہ پرچہ ہے، تم جم جم آؤ..... تم تو میرے دل میں رہتی ہو..... پہلے کی طرح شرکت کرو)

بھ عائشہ اعوان، رحیم یار خان سے۔ "ناٹل بہت اچھا تھا کیونکہ دو بچے کے ساتھ تھا۔ بڑی، بڑی آنکھوں کے ساتھ عروہ گلابی دو بچے کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ انجم باہمی کی محبت بھری باتوں نے دل موہ لیا۔ واقعی غریبوں کو ہماری ضرورت ہے اور خاص کر عید کے لمحات میں تو ہمیں ان کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے۔ کہانیوں میں غزالہ فرخ کی چاندرات اور دروازہ اچھی تحریر تھی۔ سارہ ملک کی جو کے برابر تھی، بہت زبردست تھی۔ رمضان کے مبارک ماہ کے بارے میں بہت خوب صورت انداز میں لکھا گیا۔ مبارک ہو۔ شیریں حیدر کی زندگی خاک نہ تھی، پڑھی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اختر شجاعت نے خشت الہی میں سرکار مدینہ جناب محمد عظیم کے جو ارشادات قلم بند کیے ہیں۔ پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ بہنوں کی محفل میں آمنہ عذیب کی علات کا پڑھا دعا ہے کہ اللہ پاک ان کو جلد صحت یاب کرے، آمین..... جلت رنگ خوب رہا ایک جملہ بہت پسند آیا..... جملہ..... چھوٹے قد کی رقیہ اپنا دوا اچھا اور بخیر جوڑا لکھی سے نوپتے ہوئے بڑ بڑا رہی تھی۔ اس جملے پر بہت ہی آئی۔ روحانی مشورے بہت اچھے تھے۔ اس طرح ہمیں دین کی باتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔" (پسندیدگی کا شکر یہ)

بھ ام ایمان قاضی، کوٹ چنڈہ سے۔ "نگہت سیما کے ناول کو پڑھا ہنوز دلچسپی برقرار ہے۔ فرحین انظفر کی کہانی پڑھ کر ایک حکمن کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ عورت اور قربانی لازم و ملزوم ٹھہرے۔ خیر آخر میں پھر بھی سب کچھ بہتر ہو گیا۔ ستارہ دل پڑھ کر کچھ حیرانی ہوئی کہ آج کے دور میں ڈیڑھ لکھا جیسا کوئی معصوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ارد گرد سازشوں کے تانے بانے بٹے ہوئے ہیں اور اسے کسی ایک بات یا عمل سے احساس ہی نہیں ہو رہا۔ نگہت اعظمی کا افسانہ پڑھ کر دنیا میں ہی مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پر یقین آ گیا۔ قیصرہ حیات کے ناول کی شروعات اچھی ہے اور ناول کا تنہیم بھی..... آگے چل کر مزید اچھا ہو جائے گا۔ چاندرات اور دروازہ ایک اچھی تحریر تھی۔ جوانی اور بڑھاپے کے خواب اور اندیشوں کے درمیان سفر کرتی ہوئی..... سب سے زیادہ متاثر مجھے سارہ ملک کے ناول جو کے برابر تھی نے کیا۔ وارث،

مرد کی فطرت کے کئی پہلو روشن کرتی ہوئی تحریر تھی۔ نورین کا نام ممکن بھی اچھا رہا۔ شیریں حیدر ہمیشہ کی طرح کچھ اچھا ہی لاتی ہیں۔ ان کی کہانی پر تبصرہ کہانی مکمل ہونے کے بعد کروں گی۔ آخری پرچہ اور بخشش کا در کھلا بھی سبق آموز تھا رہے تھیں۔ عورت کی مخصوص عادات کے حوالے سے۔ شجاعت میں اس پار خشت الہی کا موضوع دل میں ڈھیروں ندامت جگا گیا کہ اس غافل زندگی کے ساتھ ہم کس منہ سے اللہ کے سامنے جائیں گے۔ رمضان کے حوالے سے مختلف شخصیات سے سروے اچھا لگا۔ ڈاکٹر زاہدہ پروین نے بچیوں کے حوالے سے بہت اہم بات کی طرف دھیان دلایا۔ نزہت جنیں ضیا کی زبانی ان کے بیٹے کی شادی کا حال اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری میں رمضان کے حوالے سے اقتباسات اچھے لگے۔ جلت رنگ پڑھ کر آپا میں بہت دفعہ آپ کی ذہن کی زرخیزی پر حیران رہ جاتی ہوں۔ (شکر یہ)

بھ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد سے۔ "اس بار دین کی باتیں دیکھ کر لگا جیسے میری کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ مجھے کچھ کہنا ہے اس بار سب سے اعلیٰ رہا۔ خصوصی مضامین میں سب کچھ پر بارے ہٹ کر ملاحظہ خصوصاً شائستہ زریں کا سروے، میں اکثر گلگتاتی ہوں میں ساری بہنیں خوب سے خوب تر گلگتاتی تھیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کے قلم سے ہمیشہ ہی شگوفے پھوٹتے نظر آتے ہیں ہمیشہ سو میں سو نمبر تو آپ کے ہاتھ میں تھا قلم سے لکھے پاکیزہ ڈائری کو ملتے ہیں۔ حیرانوشین نے بخشش کا در کھلا لکھ کر فیت جیسے گناہ سے بچنے کو کہا اس ماہ مبارک کے مہینے میں ایسے گناہوں سے کیسے بچا جائے یہ ہمیں پڑھنے کو ملا۔ سارہ ملک کے لکھے جو کے برابر تھی میں بہت ہی پیارے طریقے سے مریم نے ہمیں چھوٹی، چھوٹی باتوں کا احساس کروایا۔ زندگی خاک نہ تھی، شیریں حیدر کے ہاتھوں کی کہانی خاص کچھ میں نہیں آئی۔ آگے آئندہ اقتضا پڑھیں گے تو ہی پتا چلے گا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہیں ناممکن اور آخری پرچہ میں ہمیشہ کی طرح پر ہاں خاص، خاص موقعوں کی طرح اللہ پر یقین اس کی بڑائی و کبریائی پڑھنے کو ملی اللہ تعالیٰ کے آگے ممکن اور ناممکن کچھ بھی نہیں ہے..... صرف کن کی کہنے کی دیر ہوتی ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے، ستارہ دل کیا لکھوں اس کے بارے میں نیبلہ ابرار جاپنی سیٹ اپنی جگہ اپنے ہاتھ کی خاصیت کو چھوڑنے کو تیار ہی نہیں یہ کہانی ڈیڑھ لکھی کی وجہ سے اونچی اڑان بھرتی جا رہی ہے اب تو ان کے شوہر نامدار کی اچھی خاصی اتاری ہو گئی ہے کہانی میں اب تو کہانی اور دلچسپ لگے گی۔ قیصرہ حیات کی آخری امید نے زبردست تاثر چھوڑا اپنی پہلی قسط میں ہی میرے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ نگہت سیما کے اعتبار و فاقانے بہت اچھی وفا بھائی ہے ان کے ساتھ بھی اور ہمارے ساتھ بھی روز ناول کی طرح ستارہ بن کر چمک رہی ہے یہ کہانی پاکیزہ چاند سے اور ہر مہینے اس میں ناول، ناولٹ، مینی ناول، افسانے اور باقی ساری چیزیں ستاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔" (پسندیدگی کا شکر یہ)

بھ حمیرا ملک، ساکھوٹ۔ یقیناً آپ نے فرضی نام سے خط لکھا ہوگا اور خط کسی طور پر بھی اشاعت کے قابل نہیں ہے مگر تمہاری زندگی کی کہانی پڑھ کر واقعی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تمہارا فون نمبر میں نے سنبھال کر رکھا ہے اگر کسی مستند این جی او کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تو میں ان کو تمہارا نمبر ضرور دے دوں گی مگر ایک بات یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ تم اپنے کپڑوں کی پیلیسی ٹی ٹی وی چینل پر ہی کیوں کر ناچا ہتی ہو۔ اگر تم اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے ڈیزائن کیے ہوئے کپڑے بیچنا چاہتی ہو تو فیس بک پر اپنی یوتیک کا اشتہار لگا دو، یہ کام تو اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے۔

بھ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ "سلسلے وار ناولوں میں قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بہت اچھی لگی۔ شیریں حیدر تو بہت اچھا لکھی ہیں اور ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ نگہت اعظمی کا ناول بہت پسند آیا۔ دیگر افسانوں میں غزالہ فرخ، سویرا ملک، نورین، نسیم منیر علوی نے متاثر کیا۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ خصوصی مضامین ڈاکٹر زاہدہ پروین اور اختر شجاعت کے مضمون اچھے لگے۔ شادی میرے شہزادے کی تو پہلے بھی شائع ہوا تھا اور اب بھی اچھا لگا۔" (کیوں نہ اچھا لگتا کہ ہر ماں کے لیے اپنا بیٹا اپنا شہزادہ ہی تو ہوتا ہے اور ہر ماں کو اپنا دل لہنا بیٹا بیٹا سب سے زیادہ خوب صورت لگتا ہے)

بھ فریدہ سجاد، کراچی سے۔ "پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں مگر مصروفیات کے باعث انجم کو فون بھی عرصے بعد کیا کرتی ہوں اس دفعہ تو انجم تمہارا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔ (میں نے پہلے بھی اسی محفل میں اپنا فون نمبر لکھ دیا تھا اب آپ نوٹ کر لیں 02136964779) اس دفعہ کے تمام افسانے ناولٹ بہت پسند آئے۔ خاص طور پر جلت رنگ کی کہ



بات ہے۔ (آپ کی پسندیدگی کا شکر یہ) ہاں سیمناف سے میرے بچے نے پڑھا ہے ان کی بھانجی کے انتقال کا بہت افسوس ہوا کہ اس بچی کو ہم نے دیکھا تھا۔" (آپ کی تعزیت سیمناف تک پہنچانی جا رہی ہے)

بھ صوفیہ اختر، کراچی سے۔ "سب پاکیزہ بہنوں کو پہلے عید کی اور پھر یوم آزادی کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک میں اور ہمارے شہر میں ہمیشہ امن و امان رکھے اور رزق کی فراوانی ہو، آمین۔ جولائی کا پاکیزہ بہت اچھا لگا مگر مجھے فیشن کے صفحات کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ نئے لباس، نئے انداز سے بہت سے لوگ بہت کچھ سیکھا کرتے ہیں۔ شادی میرے شہزادے کا عنوان دیکھ کر یوں لگا جیسے عمیر کی شادی کی شاید سالگرہ کا احوال ہوگا۔ خیر اچھا لگا۔ (سب کے بچے سب کے لیے اپنے، اپنے عمیر ہی ہیں اس لیے ہر بیٹا ہی شہزادہ ہوتا ہے) ناولٹ میں مجھے نگہت اعظمی کی تحریر پسند آئی۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ دوبارہ شروع ہوگی۔ میں بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں کہ مارکیٹ میں جو ان کی کتاب آئی تھی اب وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ ہاں جلتنگ اور بہنوں کی محفل اس دفعہ بھی سرفہرست رہی۔ آپ کا شکر یہ کہ آپ نے سرگرمیوں میں میری بیٹی سمیعہ اختر کی نیوز لگائی۔" (بیاری صوفیہ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکر یہ، اللہ کرے کہ آپ ہر ماہ اپنی خوشیوں کی نیوز ہمیں دیں اور ہم انہیں لگائیں۔ ہاں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا انشاء اللہ ہم جلد لگائیں گے۔ ہاں آپ کو اور تمام بہنوں کو بھی یوم آزادی مبارک ہو)

بھ نگہت اعظمی، کراچی سے۔ "مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی والدہ کے انتقال کے دکھ کو اتنے بڑے غم کو الفاظ کے ذریعے کیسے کم کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو ایسا دکھ ہے جو وقت کے ساتھ کم نہیں ہوتا بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے والدین کے نہ ہونے کا احساس شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک والدین زندہ رہتے ہیں ہمیں ان کے ہونے کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ان کے چلے جانے کے بعد ان کے نہ ہونے کا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے انسان بھری دوپہر میں جلتے سورج کے نیچے کھڑا ہے اور سر پر کوئی سایہ نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے میری ان سے اکثر ملاقاتیں نسرین باجی کے گھر میں ہوتی تھیں۔ ہمیشہ میں نے ان کو تک سب سے تیار دیکھا۔ ان کا انداز بہت مشفقانہ تھا۔ نسرین باجی اور ان کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ ایک ماں کی طرح میرا خیال رکھا۔ وہ میری ہر مشکل میں میرے کام آتی تھیں۔ وہ بر ملا اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ آج میرے بچے جس مقام پر ہیں اس میں ان کے بچوں کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے میرے بچوں کی تعلیم میں جس طرح میرا ساتھ دیا۔ میں اسے بھول نہیں سکتی۔ ان کا گھر میرے لیے میکے کی طرح تھا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے۔ انسان کے اس ظاہری جسم کو ایک دن فنا ہو جاتا ہے۔ بس صرف نیکیاں ہیں جو باقی رہنے والی ہیں۔ یقیناً آپ کی والدہ نے جو نیکیاں کی ہیں وہ روٹنی بن کر ان کی قبر میں اجالا بھیر رہی ہوں گی۔ آپ کے لیے یہ بات کتنی سکون بخش ہے کہ آپ کی والدہ نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت کی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے اور انشاء اللہ خدا ان کی نیکیوں کا اجر ضرور اور ضرور دے گا کہ وہ ایسا رخصن اور رحیم ہے کہ ایک نیکی کا ستر گنا زیادہ اجر دیتا ہے۔" (بے شک، الہی آمین ثم آمین)

بھ صفیہ بیگم، لالہ موٹی سے۔ "سب پاکیزہ بہنوں کو عید مبارک۔ پاکیزہ کا ہر شمارہ میرے لیے خاص ہوتا ہے۔ اسے نہ صرف میں بلکہ ہماری فیملی کے تمام افراد ہی بے حد شوق و ذوق سے پڑھتے ہیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انجم باجی ہمارے آپ دل میں ہستی ہیں اور ہر روز ہماری دعاؤں میں شامل رہتی ہیں۔ یوں تو مجھے اس کے افسانے ناول سب ہی اچھے لگتے ہیں مگر ذیشان کی شادی کا احوال گو کہ مختصر ہی شائع ہوا تھا بہت اچھا لگا تھا۔ ہم شدت سے اس کے تفصیلی احوال پڑھنے کے منتظر ہیں اور ہر بار دیر ہو رہی ہے۔ میری خصوصی مبارک باد محترمہ عذرا رسول کو پہنچادیں کہ آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ کو ہم نے بہت محبت سے پڑھا ہے۔" (عذرا رسول شکر یہ کہتی ہیں)

بھ نجمہ اصغر، کراچی سے۔ "انجم باجی، میں تو اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان رہتی تھی مگر کراچی کی قیامت خیز گرمی نے تو مجھے ہلا کر بلکہ لرزا کر رکھ دیا۔ اس گرمی میں روزے کی حالت میں میرے والد انتقال کر گئے۔ والدہ کی حالت ہنوز خراب ہے۔ بچے بھی تاحال بیمار ہیں۔ آپ سے رابطہ اس لیے کیا ہے کہ آپ دعا کیجیے گا کہ میری ماں، میرے بچے ٹھیک

ہو جائیں۔" (بیاری نجمہ تم بالکل پریشان مت ہو۔ میں اور ہماری سب بہنیں آپ سب کے لیے دعا کریں گی اور اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیوں کو ختم کر دے گا۔" (انشاء اللہ)

بھ نور افشاں، شکار پور سے۔ "باجی آپ کو خوشی کی خبر سنائی تھی۔ میرے مضامین یہاں کے سندھی اخبار میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں (بے حد مبارک باد) اور جب میں سب کو فخر سے بتاتی ہوں کہ میں پاکیزہ کی تمبرہ نگار بھی ہوں تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ انجم باجی آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کی باتیں، مشورے میرے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ کسی بھی بہن کو کوئی بھی مشورہ دیں یا نصیحت کریں، میں اسے پلو سے باندھ لیتی ہوں۔" (بیاری بیٹی تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو جو دوسروں کے تجربے سے بھی فائدہ اٹھانا جانتی ہو اور ایسے لوگ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ تمہارے لیے بے شمار دعائیں)

بھ مسز رضا، لاہور سے۔ "بہت عرصے بعد اس محفل میں آئی ہوں اور یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جب ماں بیمار ہوتی ہے تو بیٹیاں ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا کرتیں۔ بیمار ماں اگر چڑ چڑی بھی ہو جائے تو ان کی چڑ چڑاہٹ تک کو برداشت کر لیا کرتی ہیں اور اگر یہی سب کچھ ساس کے ساتھ ہوتا تو کہا جاتا ہے کہ اس حد تک میں نہیں کر سکتی ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں ایک بیماری جب خدمت کی جاتی ہے تو اس وقت وہ ساس نہیں ہوتی وہ بس ماں ہوتی ہے کہ ماں کی شکلیں تو بہت سی ہوتی ہیں۔" (مسز رضا آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور میں آپ سے متفق ہوں۔ جب چند سال پہلے میں نے اپنی بیمار ماں کو آئی سی یو میں بیڈ میں دیا تھا تو یہ احساس اسی وقت دل میں سراپت کر گیا تھا کہ میں یہ کام کسی بھی بیمار عورت کا کر سکتی ہوں تو مجھے گھن آتی تھی اور نہ ہی کوئی مسئلہ ہوا تھا کہ عورت ماں ہی تو ہے)

بھ سمعیہ اختر، کراچی سے۔ "آپ کا بہت شکر یہ ہماری امی کا خط شائع کر کے خوش کر دیا۔ پاکیزہ ایک نہایت منفرد اصلاحی، تفریحی اور ادبی رسالہ ہے جو تربیت کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ اس کی اکثر تحریر پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ گویا یہ تو میرے بھی دل میں تھا۔ اس دفعہ جس تحریر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رمضان المبارک کے پابرت مہینے کے حوالے سے اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کو سنوارنے کا راستہ دکھانے والی تحریر جو کے برادر نیکی ہے۔ اتنی چھوٹی، چھوٹی باتیں جن کو ہم گناہ کے زمرے میں شامل ہی نہیں کرتے کس قدر خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔ مبارک باد ساتھ اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر۔ باقی سارے سلسلے حسب معمول زبردست تھے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور اس کو سنوارنے اور نکھارنے والے ہاتھوں کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے، آمین۔" (نوازش)

بھ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "اس دفعہ پاکیزہ 26 تاریخ کو ملتا تو دل بے قرار کو قرار آیا۔ ٹائٹل بہت یونیک رہا۔ ادارے میں آپ نے بہت ہی پیاری بات کی جس کا حکم ہمیں ہمارا خدا بھی دیتا ہے اچھے کے ساتھ پیش آنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ برے لہجوں اور روٹیوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ہی آپ کی کامیابی ہے۔ سلسلے وار ناول اعتبار و وفا اپنے مخصوص انداز میں رواں دواں ہے۔ متاع دل کا چوتھا حصہ سو گوار کر گیا۔ شاہ زیب بیچارہ سب کو روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب خدا ڈر بیکنا کو اپنے بہت اپنوں کے شر سے بچائے۔ حیا بخاری کا ابر رحمت بہت ہی دلنشین تحریر تھی۔ کالج کے خواب بھی جو سگے اور سوتیلے کے گرد گھومتی ہوئی تھی لیکن خدا کسی کامبر ضائع نہیں کرتا۔ گھنٹی شیریں حیدر کی شاہکار تحریروں میں سے ایک تحریر تھی۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں میں احیان اور بسمہ دونوں نے پوری عزت اور وقار سے ایک دوسرے کو پایا۔ صائمہ اکرم کو اتنی خوب صورت تحریر پڑھی کہ میری مبارک باد کے ٹوکے قبول ہوں۔ اسیر و وفا کا دوسرا اور آخری حصہ چاہتوں، محبتوں کے گرداب میں گھومتا ہو ادا نیہ کا یقین بڑھا گیا کیونکہ وانیہ نے سب کی محبتوں کو اولیت دی اور کامیاب ٹھہری جبکہ رومانہ نے صرف اور صرف اپنی محبت کو آگے رکھا اور اس خود غرض محبت کی بدولت نامراد رہی۔ اختر شجاعت کا مضمون شمع ہدایت روح میں اتر کر دل میں جذب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے استفادہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اختر شجاعت کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں لکھیں۔ سلیم احمد بشیر سے ملاقات بہت بھرپور رہی ان کی سیدھی بچی اور بے ریا گفتگو نے دل موہ لیا۔ شائستہ زریں کا سروے ہر گھر کا سروے تھا۔ واقعی بچت کی گرمی کے

آ کے موسم کی گرمی کچھ بھی نہیں۔ بہنوں کی محفل ہم سب کی محبتوں اور چاہتوں کا پلیٹ فارم ہے جہاں انجم آپنی پیارا اور محبت کی ترنیں چلاتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز نسیا کو میری امی صادقہ جاوید کا سلام، میری امی اور ڈاکٹر ممتاز نسیا کا کراچی میں انور اسپتال میں کافی ساتھ رہا۔ جلتنگ حسب معمول قہقہے پھیرتا گیا۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ بہت محنت سے سجاتی ہیں۔ میں اکثر مستکناتی ہوں اور سندھیے کا رنگ ہی سب سے پیارا اور نیا رہا ہے۔ میری طرف سے انجم آپنی کو خصوصاً اور کوثر خالد، پروین افضل شاہین، امینہ مندیب اور بقیدہ تمام بہنوں کو پاکیزہ کے تمام اسٹاف کو عید کی ڈھیروں مبارکباد قبول ہو۔ (آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

بھ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ "عرصہ چار ماہ بعد اپنے وطن لوٹی ہوں۔ محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو بیٹے کی شادی کی مبارکباد اللہ جوڑی سلامت رکھے، آمین۔ عظمیٰ کے سزتا سے نے خوب، خوب سیر کروائی جن، جن جگہوں میں نہ جا سکی اب وہاں کی سیر بھی ضرور کروں گی۔ ارے ہاں یاد آیا، شمیم فضل خالق نے ہم سے بڑا زبردست دوستوں والا گلہ کیا ہے کہ میں ان کے افسانوں پر تبصرہ نہیں کرتی۔ اگر میں تبصرہ کر کے تعریف کروں گی تو لوگ اسے اقربا پروری کا نام دے لیں گے کہ فریدہ افتخار نے تو تعریف کرنی ہی ہے کہ آپ میری دوست ہو۔ ارے ظالم، پاکیزہ سے جان پہچان بھی تو آپ کے ہاں آپ کی مہمان نوازی کے مزے لیتے ہوئے رسالے میں آپ کی تحریر پڑھ کر ہوتی تھی اور یہ ایسا ستر تھا جو ابھی تک چل رہا ہے بس ایک نشہ ہے پاکیزہ۔ اب اس میں آپ کی تحریروں، شمیم فضل خالق کا کمال ہے یا پھر انجم انصاری وہ ان دیکھی جھٹتیں جو صرف میں ان کی نگارشات میں محسوس کر سکتی ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ شاید وہ صرف ہمارا خیال رکھتی ہیں نہیں بلکہ یہ ہر قاری لکھاری، بہن کا سونے کا خیال ہے اور ہوگا۔ شمیم فضل خالق کی مختصر مگر حقیقت پر مبنی کہانی پسند آتی۔ عظمیٰ، شیریں حیدر نے خوب بجا دی۔ انجام دل کو چھو گیا۔ سائیس دل بڑا رکھیں، بہوؤں کی غلطیاں نظر انداز کریں بے جا تنقید نہ کریں تو ساس، بہو اچھی دوست ہو سکتی ہیں۔ الحمد للہ ہم اس معاملے میں خوش قسمت ہیں۔ اعتبار وفاقا اچھا جا رہا ہے۔ ستاع دل فی الحال خاندانی ریشہ دوانیوں کی زد میں ہے۔ ابر رحمت، دھوپ چھاؤں لیتا ہوا آخر ماہ نور پر برس ہی پڑا کہانی کا انجام خوب تھا۔ رنگ خشک کو خوب صورت موزوں دے کر رفاقت جاوید نے کہانی میں ایک خود پسند مغرور انسان کو بالآخر مٹھکنے، سوم ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس کا اپنا بیٹا محذور ہو کر محتاج ہو گیا تھا۔ نمر کی زندگی کا امتحان بھی اب سود کے ساتھ ہونے والا ہے۔ صائمہ اکرم جو بدری کا چلو ہم ساتھ چلتے ہیں احیان اور بسہ کو آخر ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کا سامان کر ہی دیا۔ اچھی کہانی ہے آپ کی محفل کا آغاز و اختتام دونوں ہی پسندیدہ ہیں۔" (بھر پور تبصرے کا شکریہ)

بھ زاہدہ پروین، میر پور سے۔ "شادی میرے بیٹے کی پڑھ کر جی خوشی سے معمور ہو گیا۔ دولہا دلہن کی اور آپ کی تصاویر دیکھ کر خوشی دو چند ہو گئی۔ میری اور میری بیٹیوں کی طرف سے نہایت پُر خلوص مبارکباد قبول فرمائیے۔ یہ خوشی اللہ تعالیٰ آپ کو اور معراج رسول صاحب کو بہت، بہت مبارک کرے، آمین۔ تمام تفصیلات کے دوران جہاں آپ نے سین اور فرحان کا ذکر کیا، بے حد اچھا لگا۔ یقیناً آپ نہایت ہی خوب صورت دل و دماغ اور حسین سوچ کی مالک ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور دولہا دلہن کی جوڑی کو سلامت رکھے۔" (جی ہاں، سب سے محبت اور سب کا خیال رکھنے والی عذرا رسول آپ کی دعاؤں کے جواب میں جراک اللہ کہہ رہی ہیں)

بھ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ "ناٹل تو بے حد دلفریب لگا پنک، پنک سا۔ سب سے پہلے آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے بالکل صحیح لکھا ہے کہ عید کے دن غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرح ہمیں دلی سکون ملتا ہے۔ فرحمن اظفر کا افسانہ تو اچھا لگا مگر ہمیں اس کا نام مجھ میں نہیں آیا۔ سویرا فلک کا نقش، نگہت عظمیٰ کا ہنر، غزالہ فرخ کا جائیدرات اور دروازہ عرش رانی کا سوال بہترین افسانے لگے۔ سارہ ملک کا ناولٹ جو کے برابر تنگی نے تو کمال کر دیا۔ وہ یا میں تیری وہ فسانے تیرے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ خوش رہو قاطرہ رضوی جی، شیریں حیدر جو ہماری فلوٹ رائٹرز ہیں کا منی ناول زندگی خاک نہ تھی وہ کیا کمال کا ناول لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ گلنہ خلیل جو کہ ہماری پیاری دوست بھی ہیں اور بہترین شاعرہ بھی ہیں ان کو تعریف کی پڑی ان کی پر بے حد مبارکباد۔ حیرانوشین کا چھوٹا سا افسانہ بخشش کا درکھلا ایک نصیحت

آموزش تحریر بھی۔ نزہت جبین کا شادی میرے شہزادے کی پڑھ کر دل کر رہا تھا کہ کراچی جا کر شادی اینڈ کرتے واقعی شہناج اور اریہ کی جوڑی چاند اور سورج کی لگ رہی تھی۔ نزہت جی بے حد مبارکباد قبول ہو جس طرح آپ نے شادی کا احوال لکھا ہے بے حد پسند آیا۔ کھانوں کا منہ میں پانی آ گیا مگر جو بات بیٹھے گلاب جامن کی تھی کہ وہ تو میری پسندیدہ مشائی ہے۔ جلتنگ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی پاکیزہ ڈائری اور سندھیے میں سب نے اچھا لکھا۔" (شکریہ)

بھ جویریہ راج تنہا، کشمیر سے۔ "آپ بھی جو حیرت ہوں گے کہ یہ کون تشریف لایا ہے تو جناب ہم ہیں پاکیزہ کے دیرینہ خاموش قاری، پاکیزہ دل کی گہرائیوں کو چھو رہا ہے تو ساتھ ہی ساتھ شہرت کی بلند یوں کی طرف بھی گامزن ہے۔ اللہ کرے یہ یونہی کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ پہلی بار پاکیزہ میں خط لکھنے کی جسارت کی سوچا ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری بھی بھیج دوں۔ اگر پاکیزہ کے معیار پر پوری اترے تو بہت خوشی ہوگی۔ راحت و قانعی آپ کی پونٹری بہت پسند ہے پلیز پاکیزہ کے لیے پونٹری لکھتی رہیے گا اور پاکیزہ کے سب سلسلے سب سے اچھے ہیں۔ میں گاؤں سے خط لکھنے والی غالباً نہیں یقیناً پہلی ہوں۔ امید ہے جگہ طے کی پلیز شاعری کے حوالے سے ضرور بتائیے گا۔" (اس محفل میں خوش آمدید، اس محفل میں بھی بہت سی بہنیں گاؤں سے خط لکھتی ہیں۔ ابھی آپ کی شاعری پڑھی نہیں ہے انشاء اللہ حوصلہ افزائی کروں گی)

بھ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ "میری امی کو مجھ سے پچھڑے ہوئے پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ جب ہم ساتھ ساتھ تھے زندگی بدرنگ، بدوش اور پھینکی کی لگتی ہے جب ماں کی چھاؤں ساتھ نہ ہو۔ جون کا پاکیزہ پڑھا ہر کہانی پسند آئی اور بڑی مدت بعد دونوں میں پڑھ لیا سارا پرچہ کبھی کالج کے زمانے میں یوں پڑھا کرتے تھے۔" (پیاری کالج گرل، آئندہ ہر تحریر کے بارے میں اپنی رائے دینا)

بھ مہوش سمرن راجپوت، سیالکوٹ سے۔ "میری شروع سے عادت ہے سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں جانا مجھے لیز لکھنا اور پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اپنی پیاری بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نگہت سیمہ کا اعتبار وفاقا در پر ت ماضی سے پردے اٹھاتے آگے بڑھ رہا ہے۔ نبیلہ ابرار جا کا ستاع دل کوئی اتنا بھی خود غرض ہو سکتا ہے رشتوں کی ایسے بھی موت ہوتی ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شاہ زیب کا بے وقت مرنا دکھی کر گیا لیکن رائٹز بہتر جانتے ہیں۔ باقی سارے سلسلے اپنی جگہ خوب تھے لیکن ہم رہے نہ سدا کے جلد باز اس لیے پاکیزہ ختم کرنے کے بجائے لیز لکھنے کو ترجیح دی اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر رہے۔ عظمیٰ جی آپ کی غیر حاضری سے پاکیزہ کے رنگ پھلکے، پھلکے ہیں۔ صائمہ اکرم جی کوئی اچھوتی سی تحریر لے کر آئیں آپ رسالے میں شامل نہ ہو تو ایک عظمیٰ کی رہ جاتی ہے۔" (ہاں یہ تو بے شک..... ہماری صائمہ کی تحریریں زندگی سے بھر پور رہتی ہیں)

بھ سہیلی رب نواز سہیلی، اودھوالی بھکر سے۔ "میں تقریباً جو بھی رسالہ آجائے پڑھ لیتی ہوں لیکن کچھ رسالے مخصوص ہیں جنہیں میں ضرور پڑھتی ہوں ان میں پاکیزہ بھی شامل ہے۔ جیسے پاکیزہ نام ہے رسالہ بھی ویسے ہی پاکیزہ ہے اس میں اسٹوریاں بھی زبردست ہوتی ہیں۔ رفعت سراج، عمیرہ سید، سمیرا حمید، نایاب جیلانی، نگہت سیمہ، حیران خان اور جتنی بھی رائٹرز ہیں مجھے بہت پسند ہیں میری دعائیں ہمیشہ پاکیزہ کے ساتھ ہیں۔ میں بھی پاکیزہ میں لکھنا چاہتی ہوں کہانیاں پلیز مجھے ضرور جواب دیجیے گا۔" (پیاری سہیلی اس محفل میں خوش آمدید، آپ اپنی تحریریں ضرور بھیجیے گا۔ پڑھ کر جلد رائے دوں گی)

بھ ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ سے۔ "تمام ناولز اور کہانیاں ہر بار کی طرح زبردست تھے۔ خاص طور پر صائمہ اکرم کا چلو ہم ساتھ چلتے ہیں۔ زمرہ نعیم کا اسیر وفاقا، شیریں حیدر کا عظمیٰ، نبیلہ ابرار جا کا ستاع دل پڑھ کر رونا آ گیا۔ شاہ زیب کو بہت جلد موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔ پاکیزہ ڈائری میں امینہ مندیب کا مراسلہ بہت پسند آیا یہ حقیقت ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو ہر منظر دھندلا نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی اور شفا کے عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ نسیم احمد بشیر صاحبہ سے ملاقات اچھی لگی اور جلتنگ۔ دل کرتا ہے آپ کے ہاتھ جو مولوں۔" (اور ہمارا دل چاہ



رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لیں)

بہ پروین ناز، پنجاب سے۔ "رفاقت جاوید سے یہ گزارش کروں گی کہ نمرائی زندگی میں خوشیاں عادل نے جینی ہیں اور نیلہ ابرار جاکا کاوش کی میں داد دیتی ہوں انہوں نے متاع دل بہت، بہت اچھا لکھا ہے۔ نگہت سہا کا ناول بھی بہت زبردست ہے اور عقیدت کی جو تحریر بھی دیوار اس نے بھی کافی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں بس اتنا کہنا چاہوں گی سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں کاش کوئی ایک ان میں میری تحریر بھی ہوتی۔ یہ آہ دل میں بس چھپی گئی۔" (آپ خوب مطالعے کے بعد لکھیے انشاء اللہ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

بہ خولہ عرفان، کراچی سے۔ "ادارے میں انجم جی آپ نے بہت اہم نکتے کی وضاحت کی۔ دل خوش ہو گیا کیونکہ حقیقتاً ہمارے یہاں اچھے کے رشتے اور تعلقات جو روز بروز تنزلی کا شکار نظر آ رہے ہیں اس کا اہم سبب ہمارے درمیان صبر و برداشت کا فقدان ہے۔ اس واقعہ بھی بہت عمدہ افسانوں، ناولٹ اور ناولوں کا انتخاب رہا جو سلسلے وار ہیں ان کی تو بات ہی الگ ہے اعتبار و وفا اور رنگ غلش دونوں خوب صورت لفظوں اور انداز بیان کے اعتبار سے کہانی کو عمدگی سے آگے کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ نیلہ ابرار جاکا کا متاع دل میں کہانی دلچسپ موڈ پر آگئی ہے جس سے بھی بڑھ رہا ہے۔ وریکٹا کے مستقبل کے بارے میں رشتے داروں کے مشکوک اور غیر متصفانہ رویوں کا اندازہ کر کے افسوس بھی ہو رہا ہے۔ پہلے کی نسبت اب مزید دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ شیم فضل خالق کا خواب سراب کا جواب نہیں۔ انوکھا انداز چونکا دینے والا۔ دونوں کرداروں کے مکالمے اور احساسات و جذبات حقیقت سے قریب تر اور بہت جاندار تھے۔ بہت عمدہ ماشاء اللہ البتہ صائمہ قیصر ہاشمی نے اسے آزاد کردہ میں عورت کی زندگی کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے بہت اچھے انداز میں اس حقیقت سے روشناس کروایا ہے کہ ہر شخص مجبور ہے کسی نہ کسی کے آگے خواہ وہ خود کو کتنا ہی طاقت ور سمجھے دوسرے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی مثال ہاشمی کے دانتوں کی سی ہے کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ حیا بخاری کا ابر رحمت اور شیریں حیدر کا ناولٹ کھنٹی یقین کریں لفظوں کی جادوگری تھی کہ جب تک ختم نہیں ہو گیا اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیا۔ (مصنعات شکر یہ کہتی ہی) صدف آصف نے رشتوں کی ڈوری میں بے اعتباری سے اعتبار تک کے سفر کے لیے موزوں کہانی کا انتخاب کیا۔" (پسندیدگی کا شکر یہ)

بہ سمنگ ملکہ اعوان، شاہدرہ سے۔ "چلو ہم ساتھ چلتے ہیں صائمہ اکرم کی بہترین کاوش مگر ایک بات احیان جب گھر آیا واداجی مری جانے کے لیے تیار تھے تو بارہ بجے تھے جب وہ لوگ اسلام آباد گئے تب دو بجے تھے اور جب مری کی طرف گا مرن تھے تب بھی دو بجے تھے۔ سردیوں کی رات ہو شید سردی ہو کبھی برس رہا ہو اور نا تم..... مجموعی طور پر ایک اچھا ناول بغیر قسط اگلے ماہ۔ پرندہ والدین کے رویوں کے حوالے سے ایک اچھی تحریر پڑھنے کو ملی مگر ایک بات ہے آئی جن لڑکیوں نے بے راہ روی اختیار کرنی ہوتی ہے وہ تربیت کی وجہ سے ایسا نہیں کرتیں بلکہ میڈیا اور گھر سے باہر کلاس فیلوز کو دیکھتی ہیں تو ایسا کرتی ہیں (اچھی تربیت ہر جگہ برائی کی جانب قدم جانے سے روکتی ہے) نارسائی، تم ایمان بہت بہت مبارک ہو آپ خوب صورتی سے مسلسل اچھی رائٹر ہونے کا اعزاز پار ہی ہو۔ دلخراش اینڈ کہ ہمارے چھوٹے، چھوٹے، چھوٹے غلط فیصلے کس طرح ہمیں زندگیوں سے دور لے جاتے ہیں جس کا احساس ہمیں رزلٹ آنے پر ہوتا ہے۔ حوا زادی کو نیکم بشر نے خوب صورت لفظوں میں پرویا اور مرد کی حاکمیت کو واضح کیا۔ محبت رنگ ہے ایسا سعد یہ رئیس آئی اتنے خوب صورت خوب صورت ناپک آپ ڈھونڈ کر لاتی ہیں جن کا جواب ہی نہیں۔ اتنے پیار کرنے والے ہیرو، بگزی ہوئی ہیروئن کو منانے والے دنیا میں ناپید تو نہیں پھر ہمارے لیے کیوں نہیں ہم بگڑے جو نہیں۔ بہنوں کی محفل ایک ایسی بیشک ہے جہاں سب کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ آئی پلیز جیسے آپ کچھ عرصہ پہلے سے آیت کریمہ تر جے سمیت ساتھ حضرت یونس کا حوالہ دے کر شائع کرتی ہیں پلیز ایسے ہی کیا کریں۔ گل شاہین، فیروزہ بیگم، سہی رضوی، فرخندہ لطیف، سلنی غزل، ایندہ عندلیب، نسیم رضا، اقبال بانو، نازنین آفریدی، خولہ عرفان، شیریں ظفر، ایمان چوہدری، ملالہ اسلم نئی ہیں؟ کوثر خالد، پروین افضل شاہین کے خطوط بہت ہی اچھے تھے۔ بشری ادا کاڑہ، نزہت اصغر، فیصہ آصف کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانا

ہے۔ پاکیزہ ڈائری آبی عظمیٰ آفاق کی ہے ہی خوب صورتی سے بھر پور۔ سندیسے بھی اچھے تھے۔ (شکر یہ) آج کل تو کوئی اپنے سے چھ ماہ بڑی لڑکی سے شادی نہیں کرتا کجا کہ شادی شدہ، بیوہ اور ایک حد دینے کی ماں بھی ہو۔ قبول کرنا دل گردے کا کام ہے۔ ویسے بھی ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی مگر افسوس کہ ہمیں آج تک کوئی اچھا شخص نہیں ملا۔" (ملے گا، ضرور ملے گا امید رہ دنیا قائم ہے انشاء اللہ)

بہ نائلہ بیخ الرحمان، بہاول پور سے۔ "باجی میں آپ کی خاموش قاری ہوں پاکیزہ سے نانا بہت پرانا ہے۔ اب آپ مجھے بھی بہت پرانا نہ سمجھ لیں۔ میری امی اس وقت سے یہ رسالہ پڑھ رہی تھیں جب یہ ڈھائی یا تین روپے کا تھا۔ جب ہم نے پڑھنا شروع کیا تھا ایک دو بار بہنوں کی محفل میں شرکت کی۔ ہم ہیں راہی پیار کے سلسلہ چلتا تھا اس کے چند سوال آپ نے میرے بھی پنے تھے اور میرا نظریہ بھی شائع کیا تھا یعنی میاں بیوی کے حوالے سے بعد ازاں مصروفیت بڑھتی گئی پاکیزہ سے نانا تو نونا بس خاموشی سے سلسلہ چلتا رہا۔ اس سمبر میں پاؤں میں چوٹ کی وجہ سے بستر پر پڑی رہی نہ کام نہ کاج میاں اور بچوں نے خوب خدمت کی یہ میری مصروفیت سے خالی دن تھے۔ ایک افسانہ لکھ مارا جو کہ لال جوڑا کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں نے شور مچایا ماما آپ پاکیزہ میں بھی لکھو۔ میں نے کہا کہ بچے جو کام میں اپنی اولاد کے لیے پسند نہیں کرتی اب کیا میں لو اسٹوری لکھ، لکھ کر لوگوں کے بچوں کو خراب کروں میں تو معاشرتی کہانی لکھ سکتی ہوں تاکہ اگر کسی کے دماغ میں کوئی رتی بھری وجہ سے سمجھ آ جائے اور وہ میرے لیے راہ نجات بن جائے۔ بے شک میں خاموش قاری ہوں مگر پاکیزہ کے توسط سے آپ کی ہر قاری اور افسانہ نگار کو یاد رکھتی ہوں۔ صادق آباد کا ذکر ہے۔ صائمہ اکرم یاد نہ آئے ہونیں سکتا۔ اس بار تمام افسانے اچھے تھے۔ حیرانوشین، فرحین ظفر، سویرا ملک، نگہت عظمیٰ، غزالہ فرخ، سارہ ملک، شیریں حیدر، بشری گوئیل کے افسانے دل پراثر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب خواتین کو مزید ترقی نصیب فرمائے، آمین۔ البتہ اس بار ساسوں کی شامت آئی ہوئی تھی ہماری افسانہ نگاروں کے ہاتھوں۔ اللہ سب ساسوں کو نیک ہدایت دے۔ خوش ذائقہ میں آم کی بہار تھی روزے سے منہ میں پانی آتا رہا۔ بہنوں کی محفل اول تا آخر پڑھی سب سے ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا۔ سعد یہ ہا کو بچوں کی مبارک باد۔ پاکیزہ ڈائری زبردست اور سب سے دلچسپ۔ جلتے ٹیک معاشرے کی برائیوں کو کتنی خوب صورتی سے کور کرتی ہیں آپ پڑھ کے مزہ آ جاتا ہے۔ یہ صرف آپ کا کام ہے۔" (گڑیا تم ماشاء اللہ ٹیلنڈ ہو مگر جب افسانے میں مضمون شامل ہو جائے تو اس سے افسانہ ختم ہو جاتا ہے تم کسی دن مجھے فون کر لو۔ انشاء اللہ تمہاری حوصلہ افزائی ہوگی)

بہ یاسمین کنول راجپوت، پسرور سے۔ "آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر پڑھی بڑا دکھ ہوا اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ ابھی چند ماہ پہلے آپ نے اسلام آباد جانے کی روداد بتائی تھی تو اپنی امی جان کا ذکر کیا تھا کہ کیسے وہ آپ کی پسند کی چیزیں آپ کو کھلاتی تھیں اور کتنا پیار کرتی تھیں کتنا سلیقہ طریقہ تھا ان میں اور سستی، کاہلی بالکل نہ تھی جیسا کہ عمو ما اس عمر کی خواتین ہو جاتی ہیں آرام طلبی وغیرہ وہ متحرک اور مسلسل متحرک زندگی گزارنے والی نیک خاتون تھیں۔ آپ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور اتنی دور بیاہ دیا لیکن دل کے رشتے ہمیشہ قریب رہے وہ اسلام آباد اور آپ کراچی مگر فون کے ذریعے، آنے جانے کے ذریعے ساتھ، ساتھ تھیں اب اسلام آباد تو آپ جائیں گی مگر ماں کی عدم موجودگی آپ کو تکلیف ضرور دے گی۔ ماں رشتہ ہی ایسا ہے مخلص، بے لوث۔ اب جبکہ ہم خود ماں بن چکی ہیں اس رشتے کی سمجھ آتی ہے۔" (مگر جب کوئی نعمت اٹھائی جائے تو اس کی قدر اس وقت محسوس ہوتی ہے)

بہ محسنہ علی، بہت کھوکھر سے۔ "میں محسنہ علی ہوں۔ میں نے اپنی سولہ سال کی زندگی میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وقت نے میرے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ رائٹر بننے کا دور، دور تک بھی خیال نہ تھا۔ ساری زندگی تجارت پر پڑھتے ہوئے دوسروں کے چھوڑے ہوئے سبقوں پر عمل پیرا رہی۔ آج کسی منجملہ گلیسر کی طرح اپنا ایک سبق غلاف ذات کی صورت لیے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ دوڑ دوڑ تک وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس ماہ و صیام میں خدا مجھے کس تحفے سے نوازنے والا



ہے۔ ڈوبتی فجر کو ایک خیال نے ذہن کے درپچوں کی ادٹ سے جھانکا، دن ہونے تک میری انگلیوں کی پوروں پر چھلنے لفظ اپنی رہائی کے منتظر نظر آنے لگے جو دل میں تھا بے دھڑک صفحات کی نظر کرتی گئی۔ جو لکھا تھا پڑھا تو حواس کم ہونے لگے۔ سوچا ضلع بھکر کے پسماندہ سے گاؤں بستی کھو کر کی محنت علی کیونکر الفاظ کی سلطنت رکھ سکتی ہے۔ یہ میرے سفر کا آغاز ہے۔“ (پیاری محنت اس محفل میں خوش آمدید۔ تمہارا خط اور تمہاری کہانی پڑھ کر میں واقعی حیران رہ گئی۔ اتنی کم عمر لڑکی کی اتنی پختہ تحریر، ماشاء اللہ۔ تم میرے پاس ہوتیں تو گلے سے لگاتی مگر گڑیا جو تم نے مجھے لکھ کر بھیجا ہے وہ ایک فکاہیہ مضمون ہے۔ افسانہ نہیں مگر تمہارا یہ مضمون اخبار میں شائع ہو سکتا ہے)

بھ بنت پاکستان (یہ فلمی نام ہے) پنجاب کی شوخی..... ”بابی..... میں سوچ رہی تھی (کہ آپ سے پہلے سے ہی کہہ دوں) کہ اگر آپ مجھے اس عید پر کارڈ بھیجتا چاہ رہی ہوں..... تو پلیز آپ مجھے میرے موبائل کا کارڈ بھیج دیں..... بے شک دو یا تین بھیج دیں..... چھوٹے چھوٹے سے تو ہوتے ہیں.....“ (ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو تم..... لاہور سے کراچی کی فلائٹ میں چھوٹی سی تو ہوتی ہے، فوراً آ جاؤ..... اور جب تم مجھ سے ملنے آؤ گی..... تو میں سچی میں تمہیں موبائل کے ڈیڑھ سارے کارڈ دے دوں گی..... میں ان کے نمبر زکھر پنے کے بعد بھیجتی جو نہیں ہوں..... ڈیڑھ رکھے ہیں اچھا ہے کام آ جائیں گے)

بھ شائستہ زریں، کراچی۔ ”آخر شجاعت کے مضمون کی میں جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی..... اختر کا ایک، ایک فقرہ سونے میں تولنے کے لائق ہے..... ہاں اب ہم دلچسپ خوب صورت مکالموں سے سجا آپ کا ناول پڑھنا چاہ رہے ہیں آخر کب تک انتظار کروائیں گی.....“ (انشاء اللہ جلد..... ہاں آخر شجاعت شکر یہ کہتی ہیں)

بھ گلینہ ضیا بخش، کراچی سے۔ ”اس ماہ یعنی 15 اگست کو میری سالگرہ ہوتی ہے (بے حد مبارک باد) بس اب تو یہ دل چاہتا ہے کہ پاکیزہ کی کوئی تقریب ہو اور میں سب سے ملاقات کروں..... (جی ضرور) ہاں یاد آیا چند دن پہلے پاکیزہ کی راسخ نرہت جیسے ضیا کا کافی وی انٹرویو دیکھا تھا..... اور اس میں انہوں نے آپ کا نام لے کر آپ کی تعریف کی تھی..... آپ نے تو ضرور دیکھا ہوگا.....“ (نہیں، میں نے نہیں دیکھا، ہاں سنا تھا)

✉ کرن نذیر، اسلام آباد۔ آپ کا خط اور آپ کی راسخ نرہت پر ریسرچ کا مسودہ بھی موصول ہوا۔ جس میں آپ نے پاکیزہ ڈائجسٹ کی مدیرہ ہونے کے حوالے سے میرے تجزیے بھی شامل کیے ہیں، (شکریہ) کرن نے بہنوں کی محفل کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے کہ اس میں ہر جگہ سے آنے والے خط شائع کیے جاتے ہیں۔ افسانوں، ناولوں کی بھی تعریف کی ہے۔ بس میرے حوالے سے ایک غلطی ہوئی ہے کہ میں پاکیزہ کی مدیرہ سولہ سال سے نہیں گزشتہ پچیس سال سے ہوں..... آپ ریکارڈ کی درستی کر سکتی ہیں۔

بھ ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شح، سرگودھا سے۔ ”ادارہ یہ ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گیا اور آپ کا خاصہ ہے کہ آپ کے لبوں سے نکلے بات تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ فرحین انظرف نے بے اعتباری کی مگر ہیں کھولی بھی تو کب ہیں..... جب عمر کی نقدی میں چند سکے رہ گئے۔ قیصرہ حیات کی انٹری آخری امید کے ساتھ بہت پُر اثر رہی اور واقعی ہمیں اس کی ضرورت تھی۔ چاند رات اور دروازہ بھی سا سماں کے گرد گھوم رہی تھی۔ پتا نہیں ہمارے ہاں ساس کا کریکٹر اتنا کھلیکھنڈ کیوں ہوتا جا رہا ہے اصل میں سارا قصور بیٹے کا ہے جو اپنی ذتے داری، اپنی بیوی پر لا دیتا ہے۔ بیوی اور ماں میں پلا ابر رکھنے کے بجائے کسی ایک کی طرف جھکاؤ ہی پر اہم کری ایٹ کرتا ہے۔ ایک آپ کی ماں سے تو دوسری آپ کے بچوں کی دونوں کو ہی تقسیم دینی چاہیے کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ سارہ ملک کا ناولٹ بھی اس ساس، بہو کے تاظر میں تھا اسی لیے ہم نے بھی اپنی رائے مدلل دے دی۔ یہ رشتے واقعی ہماری نیکیوں کو کھار ہے ہیں۔ شیریں حیدر کا مٹی ناول ہمیشہ ہم کی طرح زبردست رہا، بشری گوندل کا آخری پرچہ بھی پُر اثر رہا، ہاں بشری کیونوں کے ساتھ تمہارا ذکر بننا تھا میرے انٹرویو میں مگر تم نے مجھے کیونکھلائے ہوتے تو یاد رہتا نا..... انعامات کا سن کر دل خوش ہو گیا مگر پہلا انعام بہنوں کی محفل کا ہونا چاہیے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اس پر انعام کی ضرورت نہیں۔“ (بات تو تمہاری ٹھیک ہے، بعض اشعار پر تو جرمانہ ہونا چاہیے کہ وہ اتنے گھنیا کیوں بھیجے جاتے ہیں)

بھ ارم خان..... ڈی جی خان سے۔ ”ڈیڑھ آئی گئی دعاؤں کے ساتھ ایک بار پھر آپ کی محفل میں حاضر ہوں جولائی کا پاکیزہ سانسے رکھے سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں۔ اصل میں متاع دل اور اپنی شاعری کے سوا کچھ نہیں پڑھا۔ اس لیے کچھ رسالے کے بارے میں لکھ نہیں سکتی (لوگ تو خوشی سے پھول جاتے ہیں اور تم.....) آئی جان بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری شاعری اور خط کو پاکیزہ میں جگہ دی اب اور شاعری بھیج رہی ہوں امید ہے جگہ ملے گی۔ دو ماہ قبل نغمی پری کے عنوان سے ایک تحریر بھیجی تھی آئی جان میری اس کہانی کا انجام کیا ہے۔“ (گڑیا! وہ پری تو کہیں اڑ کر چلی گئی، کہاں گئی اور کیسے گئی کچھ پتا ہی نہیں چلا..... تم کوئی دوسری کہانی بھیج دو)

بھ صبا نور، لہ سے۔ ”آپی میں اپنے دوسرے سسٹر کے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی اس لیے پاکیزہ سے دور رہی اب جو جولائی کا پاکیزہ دیکھا تو آپ کی امی کی ڈھکے کا جان کے شدید دکھ ہوا۔“ (دکھ اپنی جگہ مگر تمہارے امتحان دینے کی بہت خوشی ہوئی، جب فائل پاس کر لو تو مجھے بتانا)

بھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو سلسلے وار ناول تو اچھے جابھی رہے تھے ان کے علاوہ ناولٹ اور افسانوں میں زندگی خاک نہ تھی، جو کے برابر نیکی، متاع دل، قفس، بخشش کا درکھلا، وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے، چاند رات اور دروازہ خصوصی مضامین میں اتنی سی بات..... شمع ہدایت، شادی میرے شہزادے کی، سروے پسند آئے۔ ہم سعدیہ ہما شح کو ان کی بیٹی حور عین کی مسلسل کامیابیوں پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمارا دیرینہ مطالبہ پورا کرنے پر آپ کا بہت، بہت شکر یہ کہ سوال، شعر، تحریر پر انعامات دیا کریں گی۔“ (مگر سو اللہ بھی دلچسپ آنے چاہئیں..... آپ اور دیگر بہنیں خوب محنت کریں)

بھ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ”بابی آپ کس وقت فارغ ہوتی ہیں کہ انسان فون پر بات کر سکے میں نے فیس بک پر بیچ بھی کیا تھا کہ آپ کو لیکن رمضان کی وجہ سے مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں۔“ (رمضان کے آخری عشرے میں، میں احتکاف میں بیٹھی تھی اس لیے فون وغیرہ بھی ریسٹ نہیں کیے تھے) ہاں سارہ ملک نے جو کے برابر نیکی بہت اچھے موضوع پر لکھا بہت اچھا لگا مگر لاسٹ میں جو انہوں نے پانچ ہزار کا نوٹ عیدی میں دیا وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوا ہے زیادہ سے زیادہ ہزار ہونے چاہیے تھے۔ متاع دل کی کا پلا پلا دی ہے جانے کیسے حالات جگہ پر آئیں گے۔ حیرانوشین کا بخشش کا درکھلا اچھی تحریر تھی۔ خواتین کی صورت نخبیت سے باز نہیں رہ سکتی۔ پیٹ میں مرد ہوتا ہے دو چار منٹ بھی بات دبا نہیں سکتی۔“ (تیرے کا شکر یہ)

بھ سونیا ملک، فیصل آباد سے۔ ”سب سلسلے وار ناول اچھے جا رہے ہیں آئی عذر رسول کو میرا سلام دیجیے۔ آئی آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں، آئی ہماری تربیت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے، اللہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو اور ترقی دے۔ آئی آپ کے جلتنگ کی تو کیا ہی بات ہے جتنا مرضی موڈ خراب ہو مگر جلتنگ پڑھتے ہی دل میں اور چہرے پر خوشی کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں اور اب دیکھتے ہیں کہ آپ بہنوں کی محفل میں مجھے خوش آمدید کہتی ہیں کہ نہیں۔ آئی میں اور میری بہن آپ کو غزلیں بھیجیں تو آپ اپنے پاکیزہ کے خوب صورت صفحات کی زینت بنا دیں۔“ (گڑیا! اس محفل میں خوش آمدید..... آپ کی اور آپ کی بہنوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی..... مگر ابھی آپ کی کوئی غزل پڑھی نہیں ہے، اچھی ہوئی تو ضرور جگہ ملے گی)

بھ سدرہ کلثوم مروت، لکی مروت، صوبہ سرحد سے۔ ”آپ کا بہت، بہت، بہت شکر یہ، بہت مہربانی جزاک اللہ خیراً کثیراً آپی میرے پاس الفاظ نہیں اور کس طرح شکر یہ ادا کروں۔ اُف کتنی، کتنی خوشی ہوئی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش آپ کے ڈائجسٹ کے توسط سے پوری ہوئی۔ مٹی کے شمارے میں اپنی نظم دیکھی تو یقین نہیں آیا کہ میری لکھی ہوئی نظم ہے۔ رنگی پیاری آپی بہت بہت خوشی ہوئی۔ جون کا شمارہ تو ملا نہیں اور جولائی کا دیر سے ملا سو ابھی زیر مطالعہ ہے۔ آپ کا جلتنگ پڑھا بہت، بہت مزہ آیا۔ ایسے جیسے کوئی سویت ڈش کھائی جائے۔ اس کے ناول، سلسلے وار بہت، بہت اچھے جاری ہیں خوب مزہ آ رہا ہے۔“ (شکریہ)

بھ دیا آفرین، شاہدرہ سے۔ ”میں پاکیزہ کی خاموش قاری تھی لیکن اب سوچا کہ یہ خاموشی توڑ کر محفل میں شامل



پاکستان کے ذرا میری عظیمی آفتاب سعید

میرا خدا رحیم ہے کر دے گا سب خطائیں معاف
لکھ دوں اگر کبھی کوئی یوں ہی سی بات عشق میں
کلام ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

سوال کے چہ روزے

فخر کوٹھن نے فرمایا: جس نے رمضان کے
روزے رکھے اور اس کے بعد چھ (نفل) روزے شوال
(یعنی عید) کے مہینے میں رکھے تو پورے سال کے
روزے رکھنے کا ثواب ملے گا۔ اگر ہمیشہ ایسا ہی کرے تو
گویا اس نے ساری عمر کے روزے رکھے۔

مرسلہ: نور افشاں شکار پور

نماز

حضرت ابن مسعودؓ رسول پاک ﷺ سے
روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہر نماز کے
وقت ایک پکارنے والا بھیجا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے:
اے آدم کی اولاد! تم اٹھو اور اس آگ کو بجھاؤ جو تم نے
اپنے اوپر جلائی ہے پس لوگ اٹھتے ہیں، طہارت کے
بعد نماز ظہر ادا کرتے ہیں تو دو نمازوں کے درمیان ان
کے سامنے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ پس جب
نماز عصر کا وقت ہوتا ہے تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ پس
جب مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو بھی اسی طرح
ہوتا ہے۔ پس عشا کا وقت ہوتا ہے تو اسی طرح ہوتا
ہے اس کے بعد لوگ سو جاتے ہیں تو بعض سراپا خیر ہیں
اور بعض سراپا شر میں چلے جاتے ہیں۔

مرسلہ: ام ایمان قاضی، کوٹ مچھو

سلام اے ارضِ وطن

راہ گزاروں، کوہساروں، ابر پاروں کو سلام

حمد رب ذو الجلال

تو حرفِ حمد کو ایسے سنوار آنکھوں سے
جہانِ حمد میں آئے بہار آنکھوں سے
درِ خدا پہ نظر ایسے جذب میں آئے
لکھوں میں حمد کا ایک شاہکار آنکھوں سے
میں رب تیرے لیے لکھوں تمام حمد تری
تری صفات کا کیا ہو شمار آنکھوں سے
لبوں پہ آئے دعا مستجاب ہو جائے
تو رب کو عشق میں ایسے پکار آنکھوں سے
جو اشک ہوں وہ انہیں حمد میں شمار کرے
بہیں جو رب کی محبت شعار آنکھوں سے
تمام عمر خدا تیرے ذکر میں گزرے
اتر نہ پائے یہ تیرا شمار آنکھوں سے
کسی بھی وقت میں رب کو نہ بھولنے پائے
تو اس کو قلب میں ایسے اتار آنکھوں سے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلا نوالی

نعتِ رسول مقبول

تہا ہے میری زندگی میری حیات عشق میں
بھیجوں سلام صبح شام میری نجات عشق میں
کیسے انہیں بھلا سکوں رگ، رگ میں وہ ساگنے
میری حیات عشق میں پاؤں وفات عشق میں
کیسے چھپاؤں حالِ دل دیدہ تر کو کیا کروں
کھل گیا رازِ دل مرا لکھ دی جو نعت عشق میں
سجدے کروں میں رات دن رب کریم کے لیے
ڈوبی ہوئی ہے رات دن میری صلوة عشق میں

ہو جائے۔ رمضان المبارک کے اعتبار سے سچا سنوار پاکیزہ خوب صورت لگا۔ نزہت جیسی ضیائے شادی کی تقریبات کا
احوال سنایا گھر بیٹھے ہم نے بھی شرکت کر لی۔ اعتبار و فاقہ نگہت سیمنا خوب سہنس پھیلاتی ہیں، میں دو چار قطیں اکٹھی کر
کے پڑھتی ہوں اور نئے سلسلے وار ناول آخری امید کے لیے نیک تمنا میں ہیں جلد ہی یہ ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ نبیلہ ابر
راجا کا متاع دل ہماری متاع جاں بھی چکا ہے مگر پلیز اور طویل مت کیجیے بہنوں کی محفل پاکیزہ ڈائری اور جلتنگ سب
ہی خوب صورت سلسلے ہیں، میں پہلی بار شریک محفل ہونے کی جسارت کر رہی ہوں امید ہے برا تو نہیں مانا ہوگا۔ دیگر
سلسلوں کے ساتھ میں اپنی شاعری بھیج سکتی ہوں (ضرور) اسیر وفا کی بات نہ کروں تو نا انصافی ہوگی۔ (اس محفل میں
خوش آمدید..... پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ)

بھگت شاکرین، رحیم یار خان سے۔ ”موسم گل پڑھا شروع میں تو تحریر بہت بوجھل لگی ڈائلاگ اور لفاظی کی بھر
مار تھی سو جا بہت رومینک کھل ہے اور حسن پرست بھی مگر کہانی دو پیغام لیے ہوئے تھی کہ مرد کی ذات واقعی ناقابل اعتبار
ہوتی ہے سچ کہا گیا کہ مرد کی ذات پیاز کے پھلکے کے مانند ہوتی ہے۔ نفس پڑھا، مریم اس قدر ظلم سہتی رہی حیرانی ہوئی آج
کے اس جدید دور میں تو میڈیا خواتین کے حقوق کے لیے بہت جدوجہد کر رہا ہے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی اور مریم
والدین کی عزت کی خاطر سب برداشت کرتی رہی مگر کہتے ہیں ناں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو فٹا کا در کھل جاتا
ہے۔ آخر شجاعت کا مضمون خشیت الہی بہت ہی بہترین اور پُر اثر تھا جزاک اللہ..... مستقل سلسلے تو پاکیزہ کی روح ہیں اس
بار پاکیزہ ڈائری بہت محنت سے تھی ہے، رمضان شریف کے حوالے سے روحانی مشورے بہترین ہیں۔ جلتنگ میں
پہچانے آپ نے سو فیصد صحیح لکھا بلکہ دو پنا نام کی چیز تو بیشتر انگریز لینا ہی گوارا نہیں کرتیں۔ کیا ہم ایک اسلامی معاشرے
میں رہتے ہیں؟ کیا ہماری اخلاقی اور معاشرتی اقدار ہمیں یہ درس دیتی ہیں۔“ (ہاں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اور ہر طرف
ہو رہا ہے بس اللہ اپنا کرم کرے تو سب ٹھیک ہو جائے گا)

پیاری بہنو! یزم پاکیزہ کے لیے شوخ و چنچل سوالات موصول نہیں ہوئے۔ اس لیے اس ماہ یہ سلسلہ شروع نہیں کیا
گیا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ کتنی جلدی اور کتنے دلچسپ سوالات بھیجتی ہیں۔ اب آئے درود پاک پڑھ کر دعا مانگتے
ہیں۔ یا اللہ..... یا رحمن..... یا رحیم میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور
جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ
ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ،
ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا اور
دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری شائب سے بڑی ہے اور تیری
پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور ہمیشہ ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم و کرم اور فضل
کرنا۔ ازل سے ابد تک سب کو معاف کر دینا کہ بے شک میرا رب سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے
اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتہ

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63 فیئر III۔ سیکشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200, 021-35895313 EXT 107,118

کیا ایسے کارڈ بازار میں کم ہیں؟
جن پر کچھ لکھنا نہ پڑے
بس اپنا اور دو بچے کا نام لکھ بیجو
از: صالحہ کوثر، لاہور

عید کے لمحات

ٹھہری رہے لیوں پہ
اک بات
ہو تیرا ساتھ
ہو چاند رات
ہاتھ میں ہو تیرا ہاتھ
یہ رنگ و نور کی برسات
ستاروں کی کہکشاں
نہ بیٹے کبھی یہ حسیں مل
یہ دلکش حسیں ساعت
ہو تیرا ساتھ
ہوں عید کے لمحات

شاعرہ: فیصحا صف خان، ملتان

کچھ میٹھا ہو جائے

ڈاکٹر..... "آپ کے شوہر کو طبل آرام کی
ضرورت ہے یہ نیند کی گولیاں لے جائیں۔"
میں نے پوچھا..... "ڈاکٹر صاحب! میں انہیں
یہ کس وقت دوں؟"
ڈاکٹر..... "یہ ان کے لیے نہیں آپ کے لیے ہیں۔"
☆☆☆

☆ جس دن سے اس بے وفا کو چھوڑا ہے
دوستو.....! یقین کرو موبائل کی بیٹری تین سے چار
دن آرام سے چل جاتی ہے۔
از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

پاکیزہ محبت

جب من کے مڑکیف موسم میں
ان گنت خواہشوں کے جگنو

دل خون کے آنسو رویا تھا
جب کام نہ آئے سارے وصی
ہمیں ڈر تھا تیری رسوائی کا
ہم اس لیے تم سے ہارے وصی
دل ٹوٹ کے ریزہ، ریزہ ہوا
جب پھڑ گئے سب پیارے وصی

شاعر: وصی شاہ

مرسلہ: فریدہ، جاوید فری، لاہور

آنسو

آنسو مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی ہوتے
ہیں کیونکہ.....
مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے مگر.....
آنسو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جنہیں ہم
کھونا نہیں چاہتے۔

دعا

اس ماہ کا انعام یافتہ مرسلہ.....
دعا نصیب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے کیونکہ
جب زندگی میں سب کچھ بدل جائے تو انسان کے
پاس صرف دعا ہی بچتی ہے جو نصیب بدل دیتی ہے۔
از: غل شاہین، رحیم یار خان

لکھی لکھائی عید مبارک

سہلی رومت میں زندہ ہوں
کس حال میں ہوں مت پوچھو
کیا سوچتی ہوں بتاؤں کیوں؟
خط کیوں نہیں لکھا مجبوری ہے
مجبوری کیا ہے بتا نہیں سکتی
ذرا سوچ سہلی کیا تھے ہم
اب کیوں اتنے بدل گئے ہیں؟
ایسی بھی مصروفیت کیا
کہ سندر سہلی کو رٹی رٹائی
عید مبارک عید کارڈ پہ لکھ بھیجیں

لیں۔ بس! اس دن سے محبت اندھی..... اور حسن
ظالم ہو گیا۔

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

وعدہ نبھاؤ ناں

پچھلے برس بھی میرے سا جن
تم نے یہ اقرار کیا تھا
چاند رات کو ملنے آؤں گا
تمہارے لیے پیار بھرے
ڈھیروں تحفے لاؤں گا
سجا کر پھول کلائیوں میں
تن من کو مہکاؤں گا
چھپ کر ست رنگی آئینل میں
زلغوں سے خوشبو چراؤں گا
دیکھو پھر سے سا جن عید آنے والی ہے
راہوں میں وفا کے دیپ جلانے بیٹھے ہیں
گاؤں کو آنے والے رستے
تیری چاہ میں سجائے بیٹھے ہیں
سا جن اپنا وعدہ نبھاؤ ناں.....
چاند رات کو ملنے آؤ ناں.....
شاعرہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

سب سے اچھی

زندگی کی سب سے اچھی ہجرت گناہوں سے
نیکیوں کی طرف آنا ہے۔
مرسلہ: مصباح رضا سید، فیصل آباد

غزل

اس جیون سے ہم ہارے وصی
جب دشمن نکلے سارے وصی
آواز کو اس کی ترس گیا ہوں
کوئی دور سے مجھ کو پکارے وصی
قسمت پر وہ اپنی ناز کریں
ہیں جن کے چاند، ستارے وصی

لعل و گہر پیدا کیے اس خاک نے ہر دور میں
تیری حرمت پر مٹے ان جاں نثاروں کو سلام
دشمنوں کی نینداڑ جاتی ہے جن کے خوف سے
تیرے شاہیں اور تیرے شاہسواروں کو سلام
ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں کے پاسباں
جاں سے پیارے سبز پرچم اور ستاروں کو سلام
اپنے ارض پاک پر برسا تو بارش امن کی
بارشوں کو آبشاروں اور پھواروں کو سلام
گنگائی ندیاں ہر سو ہیں ایسے خوش خرام
لہلہاتی کھیتوں اور باغبانوں کو سلام
مرسلہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

گزارش

میری آنکھوں میں روشن نور کی شمعیں
تو کچھ دیر اور جلنے دے
میرے مولا مجھے تو حوصلہ دے
مجھے تو اور جینے دے
اندھیرے سے میں ڈرتی ہوں
تاریکیوں سے خوف آتا ہے
سیاہ راتوں کی وحشت سے
میرا دل ڈوب جاتا ہے
مجھے ان ظلمتوں کے خوف سے
تو اب نکلنے دے
میرے مولا مجھے تو نور دے
مجھے تو اور جینے دے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

لوک کتھا

کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے محبت اور حسن
آپس میں دوست تھے ایک رات دونوں ساتھ،
ساتھ تھے کہ اتنے میں چاند نکل آیا، محبت چاند کی
بے حد تعریف کر رہی تھی یہ بات حسن کو بہت بری
لگی۔ اس نے غصے میں آکر محبت کی آنکھیں نوچ
لی۔



جلزنگ نجم انصار

دلہن اور ماڈلنگ

اور ان تصاویر کو کبھی اکیلے میں دیکھتی تو بھل، بھل آنسوؤں سے روتی پر زندگی میں ملنے والا گولڈن چانس اماں کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔

رعنا کے شوق چاہے کتنے ہی جھکے تھے مگر فرمانبرداری کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں شیشے کے سامنے چاہے کتنی ہی ادائیں دکھا کر خود ہی دیکھتی مگر اس سے آگے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ ماڈلنگ کی دنیا میں چوری چھپے قدم رکھنے کے بارے میں سوچتی پھر یوں ہوا کہ اماں نے رعنا کی شادی طے کر دی اور وہ بھی چٹ پیٹ..... ابھی رشتہ ہی طے ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ جولائی میں شادی بھی ہو رہی ہے۔

”اماں اتنی گرمی کے موسم میں کوئی شادی ہوتی ہے؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”ہاں بھئی..... بہت سارے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اسکول، کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں..... مہمانوں کو کبھی آنے جانے میں آسانی رہتی ہے۔“

”میں نے تو جولائی کی کسی دلہن کو بھی روتا پینٹا نہیں دیکھا سب ہی اسٹیج پر ہنستی مسکراتی ہی نظر آتی ہیں.....“ اماں کی بات بھی غلط نہیں تھی..... پھر رعنا بیگم بھی اپنی شادی کی تیاریوں میں جت گئیں۔ سب سے زیادہ خرچہ اس نے ملبوسات کی تیاری میں کیا..... اس کی نانی نے تو بہت سمجھایا بھی کہ کپڑے پر لگا پیسہ نظر نہیں آیا کرتا مگر رعنا نے ان کی بات سن کر چنگیوں میں اڑادی اور پھر شادی کا دن آپہنچا.....

اس دن سخت ترین گرمی تھی لو بھی چل رہی تھی مگر رعنا دھانی اور شاکنگ پنک لہنگے، کرتی میں بہت خوب

رعنا کو ماڈلنگ کا کس قدر شوق تھا۔ کیٹ واک کرتی ہوئی ماڈلز سے حد سے زیادہ اچھی لگا کرتی تھیں۔ کبھی وہ اپنے دالان میں ان کے انداز میں ذرا جو چلنے کی کوشش کرتی تو اماں کی پھنکار سننے کو ملتی۔

”ارے کیا کنکروں کی طرح چل رہی ہے، صبح طرح چلا کر۔“ اس نے بار بار کوشش کی کہ ماں کو قائل کر سکے کہ اسے ماڈلنگ کا شوق ہے اور وہ اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔

”ماڈلنگ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا تمہیں؟“ اماں نے ایک دن اس کی لمبی سی تقریر سن کر کہا۔

”خوب شہرت ملے گی۔“

”ہمیں لڑکیوں کی شہرت پسند نہیں ہے، اس کے علاوہ کیا فائدہ ملے گا؟“ ان کی جرح جاری تھی۔

”خوب پیسے ملیں گے..... آپ کو پتا ہے ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات کے سیکنڈوں کے حساب سے پیسے ملتے ہیں۔“

”ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ اپنی لڑکی کی ادائیں بچیں۔“

”اماں لوگ ترستے ہیں..... اس فیلڈ میں آنے کے لیے اور ایک آپ ہیں کہ مجھے جانے سے روک رہی ہیں۔“ رعنا نے خاصے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

”جب ہم نے نہ کر دی تو کر دی..... اور اب اس بارے میں پوچھنا بھی نہیں۔“ اماں کا لہجہ خاصا اڑا تھا۔

رعنا نے اپنی تصاویر جو کسی اشتہاری کمپنی میں بھیجی تھیں اور وہاں سے بلاوے کا لیٹر بھی آیا لیٹر

عناہت کرتا ہے لیکن کبھی، کبھی ان کے بس کی بات بھی نہیں ہوتی۔

از: ایمان چوہدری، فیصل آباد

ذات

چاند پھر آنسوؤں میں ڈوب گیا
رات پھر در بدر اکیلی ہے
اپنی تنہائیوں کا بوجھ لیے
ذات ہر موڑ پر اکیلی ہے
از: سیما گل، ملتان

لاجواب

ایک نوجوان ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے گیا۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے نوجوان سے اس کی اہلیت و قابلیت پوچھنے کے بعد ایک عجیب سوال کیا شاید ان کا مقصد نوجوان کی تحمل مزاجی آزمانی تھی۔ ”اگر میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

نوجوان چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔
”نوسر، اعتراض تو مجھے نہیں ہے..... مگر ایک مسئلہ ہے۔“

”کیسا مسئلہ.....؟“ ان صاحب نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔

”سر ہمارے خاندان میں وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج ہے۔“ نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

ہری مریچیں

شادی کی ایک تقریب میں جن آ گیا، جن کو دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔

ایک بابا جی نے لڑکیوں کو وضو کرنے کو کہا۔ لڑکیاں وضو کر کے آئیں تو..... جن کی چیخیں نکل گئیں۔

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

چاہتوں کے ڈھیروں اشجار کی
پر خرمینوں پر جگمگ، جگمگ کرتے ہیں
تو قلب کی ان گنت خواہشوں میں سے
خواہش اولین ہوتی

میری پاکیزہ محبت ہوئی سر بسجود
میری اس چاہت کی سر زمین ہوتی
میری زیست کے ہم نشین ہوتی
میری خواہش اولین ہوتی
شاعرہ: سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

میرا دل

کسی نے ایک شادی شدہ شخص سے پوچھا۔
”آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟“
اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اور وہ بولا ”جو میرا دل کرتا تھا۔“
مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

کیسے کہوں

ہم نے روک رکھا ہے
خود کو یہ بتانے سے
تم سے جو محبت تھی
اب نہیں وہ باقی
شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

اچھی باتیں

☆ ایمان یہ نہیں ہے کہ رب پاک دیتا ہے
بلکہ ایمان یہ ہے کہ رب پاک یقیناً دے گا۔
☆ منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار کھانی پڑتی ہے۔
طعنوں کی یا تنہائی کی.....

☆ مجھے پتا چلا کہ وہ مجھے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے تو مجھے اس کی محبت اچھی لگنے لگی پھر مجھے پتا چلا کہ اس کا بھی محبوب ہے پھر مجھے اس کے محبوب سے بھی محبت ہو گئی اور وہ مجھے نوازتا ہی چلا گیا۔

☆ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں

صورت لگ رہی تھی۔ مووی میکرز اور فوٹو گرافرز سے اس نے بطور خاص کہا تھا کہ وہ اپنی تصاویر اسٹج پر ہی بنوائے گی اور جب مہمان شادی ہال میں پہنچے تو رعنا اسٹج پر اچھی خاصی ماڈلنگ کر رہی تھی۔ بارانی اور دوہا میاں بھی ایک جانب کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ایک ہاتھ سے دوپٹا اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے کانوں کے بالے کو پکڑے کھڑی ہو جاتی تو کبھی ہاتھ میں شیشہ لے کر اس کو شرمائی نظروں سے دیکھتی۔

ایک تصویر بنواتے وقت تو حد ہی کر دی۔ اپنا لینگا دونوں ہاتھوں سے اوپر کرتے ہوئے اپنی آنکھیں میز سے اٹھانے پر گاڑ دیں۔

”ارے بھئی، یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اماں یہ سب دیکھ کر بدحواس سی ہو گئیں۔ لوگوں کی ہنسی نے انہیں خاصا بدحواس کر دیا تھا۔

”اماں جی بہت خوب صورت پوز ہے..... اس تصویر میں پنڈلی تک مہندی بھی نظر آرہی ہے۔ اور پائلیں بھی۔“ فوٹو گرافر نے وسیع القلمی سے تعریف کی۔

”ارے بس بھی کرو.....“ انہوں نے ایک فوٹو گرافر کے تو تھپڑ بھی جڑ دیا جو دوپٹا ہٹا کر رعنا کی تصویر بنا رہا تھا۔ تب دوہا مسکرا کر بولے۔

”بھئی ماڈلنگ کا ہمیں بھی شوق ہے..... ہم دونوں کی ایک ساتھ ہی تصویریں بنادیں، یہ کیا بات ہوئی کہ دلہن کی تو تصویریں بن رہی ہیں اور دوہا بچا رہا اکیلا کھڑا دیکھ رہا ہے۔“

”ہاں، ہاں آپ بھی آجائیں۔“ مووی میکر نے انہیں اسٹج پر چڑھاتے ہوئے کہا اور پھر سب نے دیکھا وہ دونوں اب ماڈلنگ کا شوق پورا کر رہے تھے۔ کبھی سیدھے، کبھی میز سے، کبھی بٹکے ہوئے..... دونوں خطرناک پوز دے رہی تھے اور مہمان کہہ رہے تھے۔

”دیکھنا ان دونوں کی تصویریں بہت اچھی آئیں گی۔“ (کر لوگل)

”اور اگر کسی ٹائٹل پر بھی چسپ جائیں تو ان کی جوڑی کسی فلمی جوڑی سے کم نہیں لگے گی۔“ رعنا تو بے حد خوش تھی..... اس کے تمام ادھورے ارمان آج پورے ہو رہے تھے۔

اکثر دلہنیں اپنی شادی کی تصویر کھنچواتے وقت ماڈلنگ کرتی نظر آتی ہیں کیا ان سب کے دل رعنا جیسے ہوتے ہیں..... یا سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

مختصر افسانے

- 1- اللہ وہ آ گیا..... اب میں کیا کروں.....
- 2- زندگی ضیق کر دی اس نے..... اب دیکھتی ہوں میں بھی.....
- 3- کہاں گیا.....؟ کدھر چلا..... ڈراما سنے تو آ.....
- 4- آ جا رہے..... آ جا..... ورنہ..... بس..... ہاں!
- 5- تم مل جاؤ..... تو پتا چلے گا تمہیں کہ میں کیا حشر کرتی ہوں۔
- 6- نہ بابا نہ..... میں تمہاری تعریف کروں گی..... نہ بابا نہ.....
- 7- پاگل کہیں کا..... اپنی بھکتی ہوئی کار میں بیٹھ کر ہیرو سمجھ رہا تھا۔
- 8- ٹھیک ہے خوش..... میں تم سے بات کرنا تو کیا دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی.....
- 9- جانتے نہیں تم..... مجھ کو..... کہ میں کتنی اکل کھری ہوں، تمہارے گھر والوں کو میں ایک آنکھ برداشت نہیں کر سکتی۔

ایک طویل ناولٹ

- ہیرو، ہیروئن کی چونچالیں، 25 صفحات تک۔
- غلط فہمیاں، پشیمانیاں، 18 صفحات تک۔
- ہیرو، ہیروئن کو حقیقت کا ادراک 8 صفحات تک۔
- بقیہ دس صفحات پر خوشگوار اختتام۔

اوجھاپن

آج مجھے مسز مراد کا انٹرویو کرنا تھا۔ ٹھیک پانچ

بجے جب میں اپنی چھپاتی کار میں ان کے گھر پہنچی تو ملازم نے مجھے ان کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

ماشاء اللہ ان کا یہ ملاقاتی کمر ایسا ہی سجا سورا تھا جیسا میرا ڈرائنگ روم ہے بلکہ میرے کمرے میں سجاوٹ کی اشیا اس سے کہیں زیادہ ہی ہیں۔

دس پندرہ منٹ میں عنابی رہنمی جوڑے میں مسز مراد آئیں، اتفاق سے میرا سوٹ بھی اسی کلر کا تھا..... ہاں نفیس اس سے زیادہ تھا۔ انہوں نے کانوں میں سونے کے چھوٹے، چھوٹے سے بندے پہن رکھے تھے اور گلے میں کچھ بھی نہیں تھا، ہاتھ میں اولڈ فیشن کی چھتری کے ڈیزائن کی انگلی تھی۔

میرے نئے فیشن کی جدید جیولری دیکھ کر وہ ہکا بکا سی رہ گئیں۔

”رضیہ! آپ تو بے حد نفیس جیولری پہن کر آئی ہیں۔“ تب میں بے اختیار ہنس پڑی۔

”آپ ہنسی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔“ وہ بولیں۔

”یہ بات مجھے معلوم ہے۔“ میں پھر ہنسی۔

”آپ نے اپنے گھر کو خوب سجا رکھا ہے۔“ میں نے پونہی کہا۔

”شکریہ.....“ وہ انکساری سے بولیں۔

”ہاں میں نے بھی اپنے گھر کو خوب سجا یا ہے۔ اگر کوئی مہمان کرسٹل کی ایک دو چیزیں اٹھا کر اپنے گھر لے جائے تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔“ میں پھر ہنس دی۔

”کیا آپ کے ساتھ، کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے؟“ وہ متحیر سی پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں، ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے، جس شام آپ اپنے بلوکی سا لگرہ کا کارڈ دینے آئی تھیں۔ اس شب بھی کوئی ہاتھ صاف کر گیا تھا۔“

”آف، ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔“ انہوں نے متاسف لہجے میں کہا۔

”چورتو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔“

”اچھا.....“ اب وہ مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”میں نے دراصل مسز خان کی ساڑھی کی تعریف نہیں کی تھی، ان کی بہن کی مہندی میں وہ زبردست پارلر سے تیار ہوئی تھیں۔ بس وہ جل گئیں۔ میرے ہاں ویسے کا کارڈ دینے آئیں تو بس حساب برابر کر لیا۔“

”اوہ.....“ حیرت سے ان کے منہ کے زاویے تبدیل ہونے لگے۔

”چلیے..... ہم انٹرویو کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی فحورٹ ڈش کون سی ہے؟“

”اتنا مشکل سوال فوری طور پر تو نہیں دے سکوں گی جواب۔“

”یہ مشکل سوال ہے؟“

”بے حد مشکل ہے، میری پسند تو آئے دن بدلتی رہتی ہے۔“

”آج کل کیا پسند ہے آپ کو.....؟ یعنی موسم گرما میں آپ کیا کھانا پسند کرتی ہیں؟“

”بہت طویل فہرست ہے، یوں بھی میں کھانے کی کہاں شوقین ہوں، بس تھوڑا بہت چکھتی ہوں مگر چکھنے چکھانے میں بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔“

”کیا کچھ ہو جاتا ہے۔“

”یہ تو میں ڈسکس کر کے بتا پاؤں گی۔“

”کب تک.....“

”ایک ہفتہ تو لگ جائے گا۔“

”اتنا وقت لیں گی آپ.....“

”پہلے میں گھر میں ڈسکس کروں گی پھر میں اپنے وکیل سے بات کروں گی۔“

”اتنی درد سہی کی کیا ضرورت ہے؟“

”ہر آدمی اپنی کلاس کے حساب سے بات کرتا ہے۔“ انہوں نے اپنی بھوئی اچکا کیں۔

”ہاں یہ تو ہے مگر میں تو کبھی، کبھی اپنی کلاس سے

بچے بھی اتر آتی ہوں۔“ میں ہنسی مگر ہنستے، ہنستے وہ ایک دم رک گئیں۔ ان کی بچی کو لیے آیا داخل ہو کر بولی۔
”میڈم، آپ کی امی کے گھر سے جو کڑھی آئی تھی جو آپ نے دو پہر میں کھا کر کہا تھا کہ رات کو بھی وہی کھائیں گی۔ یہ بے بی صاحب بول رہی ہیں کہ ان کو بھی صرف کڑھی چاہیے مگر وہ تو آپ کے لیے ہی بچی ہے۔ میں یہ بے بی صاحب کو کھلا دوں یا آپ کھائیں گی۔“ تب میں ہنس کر کھڑی ہو گئی۔

”شکر یہ مسز مراد، مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔“
قارئین کرام، ان دنوں میں بڑے لوگوں کی بیگمات سے صرف ایک ہی سوال پوچھ رہی ہوں۔ جی ہاں مجھے اسی موضوع پر ایک ریسرچ پیپر تیار کرنا ہے۔ موضوع تو یقیناً آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا۔
”او چھاپن!“

یہ خبر دوسری بات ہے کہ اگر ایسے موضوعات پر اوچھے لوگ ہی قلم اٹھائیں..... تو..... بات دل میں اتر جائے گی۔

ایک مکالمہ

(نند) ”کیسی ہیں بھابی آپ! اب طبیعت کیسی ہے؟“
(بھابی) ”ٹھیک ہوں، طبیعت کا کیا پوچھتی ہو، وکی ہی خراب ہے، نزلہ، زکام کو لوگ بیماری ہی نہیں سمجھتے۔ جوڑ، جوڑ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سر میں اس قدر درد ہے کہ نہ کہیں جانا اچھا لگ رہا ہے اور نہ ہی کوئی آیا..... اور اس مرتبہ کراچی کی گرمی کیسی پڑی ہے..... الٹی تو ب.....!“

(نند) ”میں تو اس وجہ سے آگئی، امی نے فون پر بتایا تھا کہ تمہاری بھابی، آج تین دن ہو گئے، اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں، جانے فریج میں کتنا کھانا بھر رکھا ہے، وہی لپالپ کھا رہی ہیں، گھر کے

باورچی خانے کو آ کر دیکھ نہیں رہیں کہ بڑھیا نے کیا پکایا اور کیا کھایا۔“

(بھابی) ”ارے بھئی، جب اپنی طبیعت اچھی نہ ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا، مجھے تو اپنے بچے برے لگ رہے تھے..... اللہ گرمی میں تو کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔“
(نند) ”ارے ہاں، بچے نظر نہیں آ رہے ہیں کہاں؟“

(بھابی) ”دو بچے بڑی آپالے گئی ہیں اور دو چھوٹی آپا نہیں احساس تھا کہ مجھے بچے کس قدر تنگ کرتے ہیں ان کے شور کی وجہ سے میں دو پہر کو مووی تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے بچے اپنی خالوں کے پاس گئے ہیں میں نے اپنی شادی تک کی مووی دیکھ ڈالی۔“

(نند) ”ڈاکٹر کو دکھایا آپ نے کہ آپ کو نزلہ ہو گیا ہے، شاید وہ اس حالت میں آپ کو ایڈمٹ کر لیتا..... ہو سکتا ہے کہ ناک کا کوئی چھوٹا موٹا آپریشن بھی ہو جاتا۔ کم از کم.....“

دس بارہ بوتلیں گلوکوز کی لگ جاتیں تو آپ کی کمزوری تو دور ہو جاتی۔ شاید جو تندر کو دیکھ کر آپ کو چکر آتے ہیں اور آپ قصد اپنا دروازہ بند کر کے اس وقت تک بیٹھی رہتی ہیں، جب تک سب تندر میں اپنے گھر نہیں جاتیں۔“

(بھابی) ”ارے ڈاکٹر کا کیا پوچھتی ہو، آج ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں تو سو پچاس بیماریاں تو وہ نکال ہی دے گا مگر تمہارے بھائی کے پیسے سے ہمدردی ہے کہ ہر دکھ، تکلیف، پریشانی اپنی جان پر جمیل جانی ہوں۔ اب تم اپنی بہن کو دیکھ لو، پچھلے دنوں خوب موٹی ہو رہی تھیں اور اپنے میاں کو کہہ دیا کہ مجھ پر درم چڑھ رہا ہے، خوب ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگاتی رہیں، ڈاکٹروں کے لکھے ٹانک پنی پنی کر اور مزید موٹی ڈھسو ہو گئی ہیں اور میاں بیچارہ بیوی کے لیے ہلکان ہوتا رہتا ہے اور جب بھی آتا ہے کہتا

ہے کہ ”بیچاری صنف ہر وقت بیمار رہتی ہے۔“ بھئی مجھے نہیں آتے یہ ڈھکوسلے دکھانے، اس لیے بیماری بھی ہو جاؤں تو چپ چاپ بستر پر پڑ جاتی ہوں۔ اب رات کو کوئی پانچ دفعہ مجھے چھٹکس آئیں، تین دفعہ کھانسی اٹھی، تین دفعہ پانی پینے کے لیے اٹھی، ایک دفعہ ٹوائلٹ جانے کے لیے اٹھی، اب تم ہی بتاؤ میں رات کو کتنی دیر سوئی ہوں گی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی، اب ظاہر ہے میں صبح کے وقت ہی سوؤں گی..... جب تمہارے بھائی آفس گئے، اسی وقت میری آنکھ لگی تھی۔ تمہاری اماں کی آواز میرے کانوں میں تیر کی طرح آئی، میاں بھوکا پیاسا دفتر جا رہا ہے، بیوی صاحبہ کمرے میں بے ہوش پڑی ہیں۔ سچ اتارونا آیا کہ بتا نہیں سکتی مگر مجھے تو عادت ہی نہیں ہے..... کچھ بولنے کی۔ دم کی مٹھی دم میں ہی مار لی، بھئی اب اگر تمہارا بیٹا بھوکا پیاسا آفس جا رہا تھا تو تم اسے ناشتا کرا دیتیں، آخر شادی سے پہلے بھی تو دیتی تھیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیٹوں کی شادیاں کرنے کے بعد یہ مائیں اپنے بیٹوں کا کام کیوں چھوڑ دیتی ہیں۔“

(نند) ”ارے چھوڑیں آپ ان باتوں کو، آپ یہ بتائیں، آپ نے ناشتا کیا یا نہیں..... اس وقت تو تین بج رہے ہیں۔“
(بھابی) ”میں کیوں نہیں کروں گی ناشتا.....“

سامنے والے حلوائی کو کہہ رکھا ہے کہ روزانہ گیارہ بجے چھ پوریاں، حلوا اور ترکاری اپنے نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کرے۔ لسی کے دو گلاس بھی وہ اسپیشلی طور پر بنا کر بھیجتا ہے۔ ناشتے میں تو میرے روپے لگتے ہیں مگر دو پہر کا کھانا، چار بجے کے قریب کھاتی ہوں۔ میری آپا نے بریانی پکا کر پیکیٹوں میں فریز کر کے دی ہے، جب بھوک لگتی ہے ایک پیکیٹ نکالا مائیکرو ویو میں گرم کیا اور پیٹ بھر لیا..... نہ تو میرا کوئی خرچہ ہے اور نہ ہی کوئی کام..... بیمار پڑی ہوں تو میری بہنیں ہی کام

طہرنگ

آ رہی ہیں۔ کسی کے سر پر بوجھ نہیں ہوں۔“
(نند) ”ارے چھوڑیں ان باتوں کو، میں تو آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ کل ہمارے میاں اپنی پرموشن کی خوشی میں فانیو اسٹار ہوٹل میں ڈنڈے رہے ہیں مگر آپ کی تو طبیعت خراب ہے۔ خیر..... پھر کسی.....“

(بھابی) ”اچھا، فاروق ڈنڈے رہے ہیں۔ نہیں بھئی میں ضرور آؤں گی۔ بس کمزوری ہے مگر میں ایسی بھادج نہیں ہوں جو اپنی نند کی خوشی میں شریک نہ ہوں، ضرور آؤں گی۔ وہی ہوٹل ہے ناں جس میں تم نے اپنے بچوں کی سالگرہ کی تھی۔“

(نند) ”ہاں وہی ہے مگر آپ سے تو اٹھا نہیں جا رہا نہ کوئی آتا اچھا لگ رہا ہے..... اور.....“
(بھابی) ”ہاں، ہاں..... اس کے باوجود میں آؤں گی کہ اپنی نندوں کو ہمیشہ اپنی بہنوں سے زیادہ جو سمجھا ہے۔ ہاں اگر چلنے والی ہوتی تو کبھی نہیں آتی..... ہاں یاد آیا اس ہوٹل کا کھانا کیا مزے دار ہوتا ہے۔ کتنا ہی کھا لو..... میرا تو پیٹ نہیں بھرتا..... چائیز کا تو جواب ہی نہیں..... ہاں

میں فیروزی سوٹ پہن لوں، جس میں آڑی، آڑی موہے کی کلیاں کڑھی ہوئی ہیں۔ اس کو پہن کر میں زیادہ خوب صورت لگتی ہوں۔ اس کی میچنگ سینڈل تم سے لے لوں گی جو تم اس وقت پہنے ہوئے ہو، جاتے وقت یہیں چھوڑ کر جانا واپسی پر اپنی اماں کی کوئی چپل پہن جانا۔“

(نند) ”اچھا میں چلتی ہوں، لگتا ہے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ اماں کمرے میں اکیلی پڑی ہیں۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا جا کر ان کو دیکھ لیں۔ ہاں دو دو فریج میں رکھا ہے وہ ہمارے اماں کو پلا دینا۔ خود مت پی لینا..... کہ آپ نے کہا کہ آپ کو دو دو سے الرجی ہو جاتی ہے۔“

☆☆☆



☆ سیمگل، ملتان

چہرے سجے، سجے ہیں تو دل ہیں بچھے، بچھے
ہر شخص میں تضاد ہے دن رات کی طرح
☆ علی شاہین، رحیم یار خان

مختصر ہو گئیں اب دوستوں کی دوستیاں
صبح ہوئی تو صبح بخیر، رات ہوئی تو شب بخیر
☆ فرخندہ جعفری، گجرات

اپنے بے نور چراغوں کو ضیا دی جائے
نہ کہ ہمسائے کی قدیل بجھائی جائے
☆ کوثر خالد، جزائوالہ

پھر جاگ اٹھا ہے دل میں پرانے دنوں کا درد
جی چاہتا ہے پھر کوئی تازہ غزل کہوں
☆ ماہ نور قیصر، راول پنڈی

ایسا وجدان کہ ہر اک شے میں تو ہی تو
ایسا فہدان کہ نزدیک رگ جاں بھی نہیں
☆ جبین نیاز، ملتان

اذاں پہ قید نہیں بندش نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں
☆ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

چھپ چھپ کے روؤں اور سر اٹھن ہنسون
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا
☆ مگینہ ضیا بخش، کراچی

ہوا کی ہیروی کرنی پڑے گی
یونہی تھوڑی شجر جھک کر ملیں گے
تمہاری میزبانی کے بہانے

کوئی دن ہم بھی اپنے گھر ملیں گے
☆ دیا آفرین، شاہدرہ

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہے زہر یہ بھی پی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت میں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

☆ ☆ ☆

☆ رابعہ شاہد، دہلی

ہمارا تذکرہ چھوڑو، ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں، وفا میں مار دیتی ہیں
☆ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

عید کے چاند میں کھو کر نہ جانے
کتلی ماؤں نے اپنے چاندوں کو سا شاہوگا
☆ سیدہ غزالہ عالم، کراچی

محبوبوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی وہ روح کا قرار تھا
اسے میں نے مڑ کے صدائے دی کہ پلٹ گیا وہ راہ سے
میں خزاں ہوا تو پتا چلا میری ذات کا وہ نکھار تھا

☆ شبانہ ملک، ڈی جی خان
اپنے تیور تو سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

☆ فریحہ شبیر، شاہ نکڈر
بکھرے ہیں میری زندگی کے ورق تمام
نہ جانے کب کوئی آندھی اڑا کر لے جائے

☆ عرشہ جنید، کراچی
کانچ کے پیچھے چاند بھی تھا، کانچ کے اوپر کائی بھی
تینوں تھے ہم، وہ بھی، میں بھی اور تنہائی بھی
یادوں کی بو چھاڑ سے جب پلکیں بھینکنے لگتی ہیں
سوندھی سوندھی لگتی ہے تب ماضی کی رسوائی بھی

☆ روپینہ حیات مغل، کراچی
رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ملتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

☆ ناظمہ شاہین، واہ کینٹ
اس شہر کے اجڑے دامن میں
کچھ جیون کے دن بیت گئے
وہ راتیں گئیں وہ باتیں گئیں
سکھ ہار گئے دکھ جیت گئے

☆

☆

☆

☆ یاسمین کنول، پسرور
کہیں گم زمانوں کی داستاں کہیں حال و فردا کا راز داں
کہیں رنگ حسن غزل میرا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
میرے ساتھ بھی دو قدم چلو ہو سکے تو ساتوں جنم چلو
میری چشم تری ہے التجا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
☆ کائنات عبدالخلیم، میر پور خاص

کوئی پہر ایسا گزرا نہیں ہے
تیرے بارے میں جب سوچا نہیں ہے
ہمیں سب لوگ سمجھاتے ہیں آکر
اسے کوئی بھی کچھ کہتا نہیں ہے

☆ نیلو فرخان، بہارہ کہو
تیرا دل میں اترنا پھر تیرا دل سے اتر جانا
قیامت تھا اگر وہ قیامت سے یہ بڑھ کر ہے
☆ عزیز نسیم، گوجرانوالہ

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆ ارم کمال، فیصل آباد
عید بھی آئے گی اور آکر گزر جائے گی
مندل زخم مگر پھر سے لگیں گے رسنے
یاد بے ساختہ آئے گا کوئی جانِ حیات
اک اداسی میرے ماحول پہ چھا جائے گی

☆ رودا حنیف، کراچی
توڑ کے رشتے تاتے سارے غیر کی محفل کی آباد
باد صبا! تو ہی بتا ہم رسم عید منائیں کیا
نامہ برد جا کر یہ کہتا تنہا سا غراب تک ہے
دل کا ماتم کرنے والے جشن عید منائیں کیا

☆ پروین افضل، بہاول نگر
نماز پڑھ کے ترے غم گلے لگاؤں گا
اکیلے عید منانا مری سرشت نہیں
☆ صائمہ سجاد، بنگش، کوہاٹ

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆



مزیدار سویاں

اجزاء: سویاں، ایک پکٹ۔ کنڈینسڈ ملک، ایک ٹن۔ الائچی، تین عدد۔ لونگ، دو سے تین عدد۔ ترکیب: ایک دہلی میں سویاں ڈال کر بھون لیں اور نکال لیں پھر اسی دہلی میں تھوڑا سا گھی ڈال کر اور الائچی، لونگ ڈال کر کڑا میں پھر اس میں سویاں ڈال کر بھونیں اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر ذرا سا پکائیں۔ جب یک جائے اور ملک اچھی طرح میلٹ ہو جائے تو اسے گھی لگے سانچے میں ڈال کر پھیلا لیں اور ٹھنڈا ہونے پر اس کو کسی بھی صیغہ میں پیس کاٹ لیں اور اگر چاہیں تو اس کے لڈو بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

مرسلہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

چاکلیتہ اسٹرابیری موز کیک

اجزاء: اٹھ سے، چھ عدد۔ میدہ، چار کھانے کے چمچ۔ کوکو پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، آدمی پیالی۔ وینلا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ گھی، ایک کھانے کا چمچ۔

اسٹرابیری موز کے اجزا

اسٹرابیری، دو پیالی۔ فریش کریم، دو پیالی۔ چاکلیٹ سیرپ، آدمی پیالی۔ جیلٹن، ڈھائی کھانے کے چمچ۔ اسٹرابیری ایسنس، چند قطرے۔ چینی کا شیرہ، آدمی پیالی۔

ترکیب: اسٹریچ بنانے کے لیے صاف خشک پیالے میں اٹھوں کی سفید پوں کو چینی کے ساتھ پھینٹیں۔ پھر اس میں زردی ملا کر پھینٹ لیں۔ میدہ

296 ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2015ء

اور کوکو پاؤڈر ملا کر چھان لیں اور وینلا ایسنس کے ساتھ پھینٹے ہوئے اٹھوں میں ملا لیں۔ نو انچ کے دو سانچے لے کر ان میں برش کی مدد سے آئل لگائیں اور تیار کیے ہوئے کچھر کو دونوں میں آدھا، آدھا ڈال دیں۔ پہلے سے گرم کیے ہوئے ادون میں 180C پر پندرہ سے بیس منٹ بیک کر کے نکال لیں اور ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔

اسٹرابیری موز بنانے کے لیے

اسٹرابیری کو صاف دھو کر ہلکی آٹھ پر پکنے رکھ دیں۔ جب وہ اپنے ہی پانی میں گل جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے پلینڈ کر لیں۔ چینی کے شیرے میں ایسنس ملا کر رکھ لیں، کریم کو فریزر میں دس منٹ رکھ کر ٹھنڈی کریں اور الیکٹریک بیٹر سے پھینٹ لیں۔ جیلٹن میں چار کھانے کے چمچ نیم گرم پانی ملا کر اسے اٹلتے ہوئے پانی کے پیالے میں پکائیں، جب پھلنے پر آجائے تو اسے کریم اور پلینڈ کی ہوئی اسٹرابیری کے ساتھ ملا کر پھینٹ لیں۔ موز تیار ہے۔

کیک کو ٹھنڈا کر کے پین سے نکالیں اور دونوں کیک پر شیرہ پھیلا کر ڈال دیں۔ جب شیرہ تھوڑا سا جذب ہو جائے تو کیک کو چاکلیٹ ساس سے کور کر دیں اور اس پر موز پھیلا کر لگائیں اور فریزر میں رکھ دیں۔

دوسرے کیک کو بھی اسی طرح تیار کر لیں پھر دونوں کیک کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں اور اسے مکمل طور پر موز سے کور کر دیں۔

تین سے چار گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔

پریزنٹیشن: اس زبردست کیک کو تازہ اسٹرابیری سے سجا کر خاص مواقع پر پیش کریں۔
مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کھو

شاہی مرغ

اجزاء: چکن کی بوٹیاں، آدھا کلو۔ ثابت گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ بادام، پستے، دو کھانے کے چمچ۔ اورک، بہسن پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، تین سے چار عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانی، فریش کریم، ایک پیالی۔ لال مرچ پسلی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ گھی، تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن کی بوٹیوں کو دھو کر خشک کرنے رکھ دیں۔ پیاز کو باریک کاٹ لیں اور بادام، پستوں کو دھو کر بھگو دیں۔ پھلکا نرم ہونے پر چھیل کر انہیں پھیلا کر خشک کر لیں۔ پین میں گھی میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑا میں پھر اس میں پیاز کو سنہری فرائی کر کے گرم مسالے کے ساتھ نکال لیں۔ اسی پین میں گھی میں اورک، بہسن، لال مرچ اور چکن ڈال کر تیز آٹھ پر بھونیں۔ اس دوران الائچی اور بادام، پستوں کو گرائنڈر میں باریک پیس میں پھر اسے پلینڈر میں ڈال کر ساتھ میں فرائی کی ہوئی پیاز اور آدمی پیالی کریم ڈال کر پلینڈ کر لیں۔ پلینڈ کیے ہوئے کچھر کو چکن میں ڈال کر چار سے پانچ منٹ درمیانی آٹھ پر پکائیں پھر آٹھ تیز کر کے بھون لیں۔ گھی علیحدہ ہونے پر ہلکی آٹھ پر تین سے چار منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

پریزنٹیشن: ڈش میں نکال کر اوپر سے کریم پھینٹ کر ڈال دیں اور گرم گرم شیر مال کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: زانیہ محمود، کوئٹہ

بلوچی رائس

اجزاء: گوشت، آدھا کلو۔ لال مرچ پسلی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول، دو پیالی۔ پسا ہوا دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ہلدی، ایک

حوش دانقہ

چائے کا چمچ۔ اورک، بہسن پسا ہوا، دو چائے کے چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ پیاز، تین عدد درمیانی، زعفران یا زردے کا رنگ، ایک چمچ۔ آلو، تین عدد۔ کیوڑا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، تین عدد درمیانی۔ ہرا مسالا، آدمی پیالی۔ ثابت گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، تین چوتھائی پیالی۔ ترکیب: پیاز کو باریک کاٹ کر رکھ دیں، آلو اور ٹماٹر کے موٹے گول قتلے کاٹ لیں۔ گوشت کو صاف دھو کر رکھ لیں اور چاولوں کو بیس منٹ کے لیے بھگو کر رکھ دیں۔

پین میں کوکنگ آئل کو درمیانی آٹھ پر گرم کریں اور اس میں آلوؤں کو ہلکی آٹھ پر سنہرا فرائی کر کے نکال لیں پھر اسی پین میں پیاز کو سنہری فرائی کریں اور فرائی ہونے پر تھوڑی سی پیاز نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔ پین میں اورک، بہسن، نمک، گوشت، لال مرچ، دھنیا اور ہلدی ڈال کر بھونیں پھر ایک پیالی پانی ڈال کر ہلکی آٹھ پر پکنے رکھ دیں۔ علیحدہ بڑے پین میں چاولوں کو نمک ملے پانی میں گرم مسالا ڈال کر ابالیں اور چھلنتی میں پانی نتھار لیں۔ گوشت گل جائے تو چولھے سے اتار لیں اور ابلے ہوئے چاولوں کے تین حصے کر لیں۔ دہی میں کیوڑا ایسنس اور زردے کا رنگ ڈال کر پھینٹ لیں۔ بڑے پین میں ایک حصہ چاولوں کا ڈال کر اس پر آلو اور ٹماٹر کے قتلے رکھیں پھر آدھا گوشت ڈال کر اس پر دوسرا حصہ چاول ڈالیں پھر گوشت ڈال کر ٹماٹر کے قتلے رکھیں اور تیسرا حصہ چاولوں کا ڈالیں۔ آخر میں فرائی کی ہوئی پیاز، باریک کٹا ہوا ہرا مسالا اور دہی ڈال کر ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ آٹھ تیز رکھ کر پھر ہلکی آٹھ پر دس سے بارہ منٹ دم دے دیں۔

مرسلہ: ناہیدہ انجم، کراچی

☆☆☆





اعتبار
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔
اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے ہو۔
اسے مت چھوڑو جو تمہیں چاہتا ہے۔
اس سے کچھ نہ چھپاؤ جو تم پر اعتبار کرتا ہے۔
از: نجمینہ ضیاء بخش، کراچی

زندگی مختصر ہے
طے گا کیا دلوں میں نفرتیں رکھ کر
بڑی مختصر سی ہے زندگی مسکرا کے ملا کرو
از: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

کیسی خوشی؟
شوہر..... "تمہاری امی کی مذاق کی عادت نہیں
گئی۔"
بیوی..... "کیا کہہ دیا میری امی نے؟"
شوہر..... "آج بھی مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ
میری بیٹی سے شادی کر کے خوش تو ہونا.....؟"
از: نور افشاں، شکار پور

وقت
کون کس کے ساتھ کتنا مخلص ہے
وقت سب کی اوقات بتا دیتا ہے
از: ماہا بلوچ، میر پور خاص

ایک حکایت
جاں بلب اگر تم ہو تو یقین ہے روزی
دو ہاتھ سلامت ہیں تو ہر زمین ہے روزی
از: کوثر خالد، جزانوالہ

بہت چھوٹی سی تھی میری بڑی، بڑی آنکھوں میں سہمی
نہیں تھی۔

از: عرشہ جنید، کراچی

سن لو
مت پوچھ کہ کس طرح چل رہی ہے زندگی
اس دور سے گزر رہے ہیں جو گزرتا ہی نہیں
☆☆☆

ناراض ہونے کا شوق بھی پورا کر لو
لگتا ہے تمہیں ہم زندہ اچھے نہیں لگتے
از: نجمہ اصغر، کراچی

خوب صورت پیغام سب کے لیے
ہمیشہ اپنے آپ کو 'زیر' سمجھو 'زیر' نہیں سمجھو
کیونکہ
کل کو تمہیں 'پیش' بھی ہوتا ہے۔
مرسلہ: نعل شاہین، رحیم یار خان

شکوہ، جواب شکوہ
بطور پیغام کی صورت
شوہر کا شکوہ.....

اتنے کنکر ہیں دال میں بیگم
ایک لقمہ بھی کھا نہیں سکتے
بیگم کا جواب.....
رات دن اتنے پان کھاتے ہو
چار کنکر چبا نہیں سکتے
شوہر کا شکوہ.....

تم فیروں سے تو ہنس، ہنس کر ملاقات کرو ہو
اور ہم سے وہی زہر بھری بات کرو ہو
بیگم کا جواب شکوہ.....

ہم غیر کے آگے تمہیں کیا حال سنائیں
پاس آ کے سنو دور سے کیا بات کرو ہو.....
از: مسز ایس اے نقوی، ڈیرا غازی خان

سوال

دل کو تیرا بس تیرا خیال ہے اک
تیری یاد کا ہر جانب جال ہے اک
تو کب آئے گا انتظار سے پوچھتی ہیں آنکھیں
دل کے لب پہ بھی یہی سوال ہے اک
ارم خان..... ڈی جی خان

غصہ
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے
اور اب..... پرانی باتوں پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔
از: سیدہ جیاعباس شاہ..... مرالی تلہ سنگ

تلاش
حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے
کہ مجھے پوری زندگی میں دو لوگوں کی تلاش رہی پروہ
مجھے نہ مل سکے۔

ایک وہ جس نے صدقہ کیا ہو اور وہ مفلس ہو گیا
ہو اور دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی
پکڑ سے محفوظ رہا ہو۔

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

فصیحہ آصف کے نام
تمہارے ہجر کے موسم گوارا ہیں
تمہارے ہجر میں دنیا بھلا دوں گی
تمہارے پیار کی گہری اذیت یاد رکھوں گی
میں سب کچھ بھول جاؤں گی
محبت یاد رکھوں گی

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

دل کی باتیں
اب عمر، نہ موسم، نہ وہ رستے کہ وہ چلے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
ہمراہ ترے پھول کھلاتی تھی جو دل میں
اب شام ہی وہ دل سے خالی نہیں جاتی
از: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ



حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے الفاظ بھی بیان کیے ہیں جو انہوں نے مانگی تھی۔ اس دعا کا موقع محل یہ تھا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں حکومت کے سربراہ بن گئے اور آپ کے والد جب عرصہ دراز کی جدائی کے بعد مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملے تو آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اللہ کے حضور یہ دعا مانگی۔

ترجمہ: اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارسازِ حقیقی ہے۔ پس تجھ سے اتنی غرض ہے کہ مجھے مسلمان ہوتے ہوئے وفات دے اور نیکیوں سے جا ملے۔

اسرار دعا..... حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے بھی بے شمار فوائد ہیں۔ اس کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی سالک جو روحانی منزل پر رواں دواں ہو تو وہ اس آیت کو کثرت سے پڑھے تو خواب یا مراقبہ میں اس پر زمین اور آسمان کے اسرار ظاہر ہوں گے۔ آسمانوں کے اوپر اللہ کی جو مخلوق رہتی ہے اس کا دیدار ہوگا اور جس طرح آخرت برپا ہوگی اس کے مشاہدات نظر آئیں گے۔

ترجمہ: اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ کر اور مجھ کو اور میری نسل کو اس گمراہی سے بچا کہ لگے ہوں کو پوجتے، اے میرے پروردگار! کچھ شک نہیں

کہ ان بتوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کیا ہے تو جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو، تو بچنے والا مہربان ہے (پ ۱۳۔ سورہ ابراہیم، آیت ۳۵)

یہ دعا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر مکہ کو امن والا شہر بنانے کے لیے مانگی تھی۔ اس دعا کا ایک فائدہ تو استقامتِ ایمان ہے کہ اس کے پڑھنے سے انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔ دعا کو پڑھے۔ انشاء اللہ راہِ راست پر آجائے گا۔

اس دعا کے پڑھنے سے انسان کو بخشش بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس دعا کا خاص عمل یہ ہے کہ جو بچے نافرمان اور بے راہ ہوں تو ان کے والدین روزانہ بعد نمازِ فجر اس آیت کو پڑھ کر پانی پر دم کر کے انہیں پلایا جائے تو انشاء اللہ بچے راہِ راست پر آجائیں گے۔ آیت کے ان اسرار کے حصول کے لیے مرشدِ کامل کی باطنی توجہ کا ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ توجہ کے بغیر بات نہیں بنتی۔

خاتمہ بالخیر کے لیے بھی ہر عالم دین، امام مسجد بلکہ ہر مسلمان کو نماز کے بعد اس دعا کا پڑھنا ضروری ہے اور جو شخص ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اس دعا کو عمر بھر پڑھتا رہے تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

بزرگانِ دین اور اولیاء کے معمول کے مطابق اگر کوئی شخص اس دعا کو عشا کی نماز کے بعد گیارہ مرتبہ اول و آخر دو در شریف ۴۱ روز تک پڑھے تو اس کی ہر وہ مشکل آسان ہو جائے گی جس کا وہ خواہشمند ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دیگر دعا

ترجمہ: اے میرے پروردگار! قید مجھے اس سے زیادہ

محبوب ہے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے مکر نہیں پھیر دے گا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (پ ۱۲۔ سورہ یوسف، آیت ۳۳)

حضرت یوسف علیہ السلام نے..... زلیخا سے بچنے کے لیے جب یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس دعا کو قبول فرمایا اور اس دعا کے پڑھنے سے..... زلیخا کے مکر کے اثرات ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی خیر و برکت سے عصمتِ نبی کی حفاظت کی۔

اسرار..... صوفیائے اور اللہ کے فقیروں نے اس دعا کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس دعا کے کثیر فوائد ہیں۔ اس دعا کے پڑھنے سے انسان کے والدین کی مغفرت ہوتی ہے اور اہل ایمان کی بخشش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع قائم ہوتا ہے۔ اولاد نیکی کی طرف راغب ہوتی ہے۔ لہذا جو شخص اسے نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھے اس کی جان، مال، عزت، رزق بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔

کافروں کی ایذا سے

محفوظ رہنے کی دعا

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف (ہمیں) لوٹ کر جانا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں (کے جور و ظلم) کا محتہ مشق نہ بنا اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف کر۔ بے شک تو زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ (پ ۲۸ مجتہدہ - آیت - ۶)

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کافروں کی ایذا رسانیوں سے بچنے کے لیے کی لہذا شریعت پرست لوگوں سے بچنے کے لیے یہ دعا بہت مفید ہے۔ یہ دعا

در اصل غیروں پر غلبہ حاصل کرنے کی ہے جو شخص ظالموں میں پھنسا ہوا یا ایسی مشکلات میں ہو جن میں لوگ اسے تنگ کرتے ہوں تو اسے چاہیے کہ اس دعا کو پڑھے تو انشاء اللہ غلبہ پائے گا اس دعا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مصیبت سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت بن جاتی ہے۔

حضرت ہارون کے لیے دعا

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میرا اور میرے بھائی کا قصور معاف فرما اور ہم دونوں کو اپنی رحمت کے سائے میں لے اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ (پ ۹۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

موسیٰ کو خدا تعالیٰ نے تورات دینے کے لیے کوہ طور پر بلوایا تھا۔ یہ گئے تو اپنے بھائی ہارون کو اپنا نائب کر گئے۔ ان کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو بنی اسرائیل بے چین اور بے یقین تو تھے ہی، ایک شخص سامری کے بہکانے سے چاندی سونے کے بھڑے کی صورت بنا کر پوجنے لگے۔ حضرت موسیٰ نے واپس آ کر یہ حال دیکھا تو بڑے ناخوش ہوئے اور ہارون علیہ السلام سے دست و گریبان ہو پڑے۔ انہوں نے معذرت کی اور اپنی مجبوری ثابت کی۔ تب کہیں جا کر موسیٰ کا غصہ فرو ہوا۔ اس پشیمانی کے وقت موسیٰ نے یہ دعا کی۔

اس دعا کی خاصیت یہ ہے کہ آج بھی اگر کسی کے بھائی دوست یا عزیز سے اللہ کی نافرمانی ہو جائے تو وہ اس دعا کو پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی غلطی معاف کر دے گا اور اسے اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس کے لیے دعا کرنا ہو، دو رکعت نفل پڑھ کر سجدے میں یہ دعا تین مرتبہ پڑھنی چاہیے انشاء اللہ اللہ معاف کرے گا۔

☆☆☆



نظری کمزوری سے نہیں ہے۔ نظر کی کمزوری کی مندرجہ ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً آپ کی بہن میں۔ (1) آنکھ کے پردے میں پیدا ہونے والی نقص۔ ماہر امراض چشم آنکھ کے معائنے کے بعد بتا سکتا ہے۔ اس میں عمل جوان ہونے تک نظر کمزور ہوتی رہتی ہے۔ (2) دماغ A کی کمی سے بھی رات کو اندھیرے میں نظر نہیں آتا۔ گاجر، سیب، چغندر، شلجم، بادام، آم اور دیگر موسم کے پھل باقاعدگی کے ساتھ کھائیں۔ (3) پڑھنے کا طریقہ، سورج کی روشنی میں براہ راست نہ پڑھیں، لیٹ کر نہ پڑھیں، پڑھتے ہوئے خیال کریں کہ کتاب کا پی اور آنکھ کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ ہو۔ روشنی اوپر سے یا پیٹھ سے کتاب کا پی پر پڑے ڈائریکٹ آنکھوں پر نہ آئے۔ (4) ٹی وی اور کمپیوٹر کو مسلسل نہ دیکھیں۔ ٹی وی جتنے اچھے کا ہے اتنے فٹ کا فاصلہ رکھیں (کم از کم 12 فٹ)۔ (5) سر پر کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ (6) کوئی بیماری؟ (7) خون کی کمی کا ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ (8) آنکھوں کی ورزش کرائیں۔ خصوصاً صبح سویرے سورج نکلنے کے وقت 2 سے 3 منٹ دیکھیں۔ بالکل صبح سویرے کی دھوپ 15 منٹ تک جسم کو لگائیں۔ ڈاکٹر ولیمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن 3 ماہ تک مسلسل استعمال کر کے حال بتائیں۔ Physostigma-30، Calc. phos-30 اور Calc flour-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ صبح دوپہر اور شام (رمضان میں افطار، سوتے وقت، سحری) میں استعمال کریں۔

منہ سے بو آنا

مسز خلیل۔ لیتہ

میرے دو مسائل ہیں ان کے لیے برائے مہربانی کوئی دوائی تجویز کر دیں۔ مسئلہ نمبر 1: بریٹ کا سائز نارمل سے زیادہ ہے۔ ورکنگ woman ہوں۔

0-baccis e کے 11-11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر ہر کھانے سے پہلے یوں دن میں 3 مرتبہ کھانے میں تمام پھل اور سبزیاں لیں، ابلی ہوئی بھی لے سکتی ہیں۔ جاول آلو بھی لے سکتی ہیں۔ آم اور کیلا کنٹروں کر کے کھائیں۔ سوپ بھی لیا کریں۔ کم از کم چھل قدی ایک گھنٹا ضرور کریں۔

نظری کمزوری

نورالعین فاطمہ۔ چونیاں قصور

میری چھوٹی بہن کی نظری کمزوری کا مسئلہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کو ہر وقت سردی کی شکایت رہنے لگی۔ شروع میں معمولی سردی سمجھ کر کبھی پینا ڈول ٹیبلٹ لے لیتی اور کبھی انور کر دیتی۔ مستقلاً درد رہنے پر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ بچی کی نظری کمزور ہو رہی ہے اور ڈیڑھ نمبر کا چشمہ تجویز کیا۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہر چند ماہ بعد چشمے کا نمبر بڑھ جاتا۔ اب یہ صورت حال ہے کہ اس کی نظر ساڑھے تین نمبر کے چشمے تک آگئی ہے۔ بھی اندھیرے میں ہو تو سامنے بڑی چیز تک نظر نہیں آتی۔ ہمارے لیے یہ بہت پریشانی کی بات ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ ایسا کیا کیا جائے کہ اس کی تیزی سے گرتی ہوئی نظر ٹھہر جائے بلکہ ٹھیک ہونا شروع ہو جائے۔ میری بہن کی خوراک کافی کم ہے جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر قدرے کمزور بھی ہے۔ دوسرے وہ نظر خراب ہونے کی ٹینشن بھی بہت لیتی ہے اس وجہ سے اکثر رونے لگ جاتی ہے۔ قبض کی شکایت بہت زیادہ رہتی ہے۔ آپ کوئی اچھی سی اور فوری اثر والی دوا تجویز کر دیجئے جس سے نہ صرف نظر گرنا ٹھہر جائے بلکہ بہتر ہونا شروع ہو جائے۔

جواب: آپ نے وزن اور قد نہیں لکھا جس سے ہم اندازہ کرتے کہ آپ کی بہن کتنی کمزور ہے؟ قبض کا تعلق صرف غذا سے نہیں بلکہ پانی اور آرام طلب زندگی اور خون کی کمی سے بھی ہوتا ہے۔ ہاں اس کا تعلق بالواسطہ



نشو ابے
ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہانہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فونو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

وزن کی زیادتی

عائشہ۔ پتوکی

میری عمر 37 سال ہے۔ میرا قد پانچ فٹ ہے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیوکلینک

ستمبر 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مینے بھیجیں اسی مینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:

میرا وزن 125 کلوگرام ہے۔ میری خوراک میں ناشتے میں ایک کپ دہی، گیارہ بجے ایک کپ چائے، دوپہر میں بھی ایک اور کبھی دو روٹیاں۔ رات میں بہت ہی کم کبھی کبھی چکن پیس کھاتی ہوں (مہینے میں دو بار) فروٹ میں آم کا جوس ہو تو روزانہ 2 آم اور خربوزے یا تربوز کا موسم ہو تو 2 سے 3 قاشیں کھاتی ہوں اور بس۔ بیماری مجھے کوئی نہیں ہے الحمد للہ۔ ڈاکٹر صاحب میں بڑھتے وزن سے بے حد پریشان ہوں۔ فی سبیل اللہ میری مدد کریں۔ جواب: اتنا وزن آپ کا کیسے ہو گیا؟ یہ نہیں لکھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یا کوئی بیماری ہوئی؟ ورزش کیا کرتی ہیں؟ یہ خوراک جو آپ نے بتائی ہے کتنے عرصے سے لے رہی ہیں؟ کوئی ہارمونز کے ٹیسٹ وغیرہ کرائے یا نہیں؟ ان سب کی تفصیل بھیجیں۔ فی الحال 3 ماہ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولیمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ Calc. Carb-200 ہفتے میں ایک مرتبہ۔ یہ دوا لینے سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لینی۔ اس دوا کے ایک دن بعد Fucus ves-0 اور Phytolaca

ماہانہ پاکیزہ۔ اگست 2015





Staphisagria-30
Bufo-30 کے 10-10 قطرے
آدھے گلاس پانی میں جبکہ
Alfalfa-Ø کے 15 قطرے

آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔
متوازن غذا میں دودھ، پھل، سبزیاں زیادہ استعمال
کریں۔ چاول کا استعمال بھی مفید ہے۔

رحم کی خرابی

عائشہ راجپوت - شیخوپورہ

میری عمر 24 سال ہے۔ شادی کو چار سال ہو گئے
ہیں۔ شادی سے پہلے مجھے لیکوریا کی شکایت تھی لیکن
شادی کے بعد زیادہ ہو گیا ہے۔ میں ذرا سی بھی کوئی گرم
چیز نہیں کھا سکتی اور گرم دوا بھی نہیں اگر کھاتی ہوں تو بہت
جلد آٹکھیں پھلی پڑ جاتی ہیں اور لیکوریا زیادہ بڑھ جاتا
ہے۔ میرے ایام بھی ٹھیک نہیں ہیں اب بھی چھ ماہ سے
نہیں ہوئے۔ میں نے انگریزی دوائی بہت کھائی لیکن
کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں درد رہتا ہے۔
لیڈی ڈاکٹر کو چیک اپ کروایا تو اس نے کہا کہ پیٹ
کے نچلے حصے میں سوجن ہے یعنی بچہ دانی پر۔ پیٹ بھی
بہت پھول گیا ہے۔ میرا معدہ بھی خراب رہتا ہے۔
بھوک بہت لگتی ہے لیکن جب کھانا کھا لیتی ہوں تو ہاتھ
پاؤں کانپتے ہیں۔ قبض بھی رہتا ہے اور گیس بھی۔
میرے سر میں بھی درد رہتا ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں رہتا،
حافظہ بھی کمزور ہے۔ مجھے انتہائی کمزوری محسوس ہوتی
ہے۔ ریڑھ کی ہڈی میں درد رہتا ہے اور کندھوں میں
بہت درد ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں کیریاں چلتی ہیں۔
ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں۔ سردیوں میں شدید سردی
اور گرمیوں میں شدید گرمی کی وجہ سے دل گھبراتا ہے۔
سارے جسم سے گرمی نکلتی ہے اور ہاتھ پاؤں کے تلووں
میں سے بھی۔ بلڈ پریشر ہر وقت لو رہتا ہے۔ مجھے مٹاپا
بہت تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ مجھے سب ورزش کرنے کا

10-10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3
مرتبہ پیئیں۔

بری صحبت

اسامہ حفیظ - لاہور

میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ بری صحبت اور آزادانہ
نیت کے استعمال نے میری صحت پر برا اثر ڈالا ہے۔
میری عمر 17 سال ہے۔ اب مجھے احساس ہو گیا ہے اور
میں نے دل و دماغ سے سدھرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اچھی
ڈانٹ کے ساتھ دوائی لینا بھی بہت ضروری ہے تاکہ میری
صحت بحال ہو جائے۔ میں آری میں جانا چاہتا ہوں جو
میرے پاپا کا خواب ہے۔ پر مجھے ڈر ہے کہ میری اس
حالت کی وجہ سے وہ مجھے رجیکٹ ہی نہ کر دیں۔ برائے
مہربانی مجھے کوئی ایسی دوا بتائیں جو مجھے مکمل طور پر صحت
یاب کر دے اور میں آری میں جاسکوں۔

جواب: یہ ہمارے معاشرے کا بڑا المیہ ہے کہ
ماں، باپ بچوں سے اور بچے ماں باپ سے دوستانہ
ماحول نہیں رکھتے تاکہ جب وہ بلوغت کو پہنچیں تو ان میں
ہونے والی نفسیاتی و جسمانی تبدیلیوں کا ذکر کریں اور ان
کی صحیح رہنمائی ہو۔ رہی سہی کسر دوستوں کے بعد Net
نے تمام کر دی۔ بچے جب تک ذہنی طور پر تیار نہ ہوں
ان کو قبل از وقت سیکس کی باتیں معلوم ہونا ان کی تباہی ہی
نہیں بلکہ پورے معاشرے کی تباہی ہے۔۔۔ اسلامی
اصولوں کے مطابق ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی
زندگی کا نارگٹ بنائیں کیونکہ وہ نوجوان جو اپنی زندگی کا
نارگٹ بناتے ہیں تو ان کی توجہ بے کار لایا یعنی چیزوں کی
طرف نہیں ہوتی بلکہ اپنے اپنے Goal کی طرف ہوتی ہے۔
نماز، قرآن پڑھیں، ذکر اللہ کریں۔ اچھی ویب سائٹس
وزٹ کریں۔ اچھے لوگوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ دینی
کتابوں کا مطالعہ بھی اس وقت اور اس عمر میں بہت اچھا
رہے گا۔ ڈاکٹر ولما شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل
ادویات 2 ماہ تک استعمال کریں اور پھر حال بتائیں۔

چہرے پر خارش بھی ہوتی ہے۔ ایکٹی سوپ اور نیوب
ڈاکٹر نے دیں۔ ایک ماہ استعمال کے دوران آرام رہا۔
پھر اسی طرح ہو گیا۔ میرے چہرے پر کوئی رونق نہیں
ہے۔ مرجھایا ہوا ہے۔ جھٹھے گال، سانولی رنگت، ہر وقت
آنکھوں میں نیند اور تھکی تھکی رہتی ہوں۔ جب میں نے
پاکیزہ میں آپ کے بارے میں پڑھا تو اللہ کا شکر ادا کیا
کہ اللہ نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔ مہربانی فرما کر میری
رہنمائی کریں۔ مجھے کوئی دوا تجویز کریں۔ شکر یہ۔

جواب: تمہاری اب تک صحیح تشخیص و علاج نہیں
ہوایا تم نے نہیں کیا۔ ذہنی آسودگی جسمانی افعال پر اثر
انداز ہوتی ہے۔ ذہنی آسودگی کے لیے صبر شکر اور
قناعت کرو، نماز قرآن پڑھ کر اپنے مسائل کے حل کے
لیے دعا کیا کرو۔ متوازن خوراک دودھ، دہی، مکھن،
پنیر، انڈے، گوشت (گائے بکر اور مرغی)، مچھلی، دالیں،
سبزیاں اور پھلوں کو اپنی غذا میں شامل کرو۔ واک کیا
کرو۔ ابتدا 5 منٹ، پھر ایک گھنٹا، آہستہ آہستہ بڑھاؤ۔
بچوں کو اپنے والدین سے اپنے مسائل ضرور شیئر کرنے
چاہئیں۔ غذا ہلکی پھلکی سادہ ہو۔ تلی ہوئی بھنی ہوئی اور تیز
مرچ مصالحوں سے پرہیز کرو۔ کھانا خوب اچھی طرح چبا
کر کھاؤ۔ جلدی جلدی نہ نگو اور اس کے ساتھ پانی کا
استعمال نہ کیا کرو۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا پھر 2
گھنٹے بعد پیا کرو۔ ڈاکٹر ولما شواہے جرمنی کی مندرجہ
ذیل ادویات 2 ماہ استعمال کے بعد تمام حالات تفصیل
سے بتانا۔ Bismutum Pentarkan Ptk-16
ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ
لیں۔ Magnsium phosphoricum
Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ
تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Ferrum
Pentarkan Ptk-45 دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ
تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔
Rhustoxicodendrom Pentarkan Ptk-7
اور Urtica Pentarkan Ptk-6 دونوں کے

اچھا نہیں لگتا۔ کیا کوئی ایسا علاج
ہے کہ میری پریشانی دور ہو۔ مسئلہ
نمبر 2: میں جو کچھ کھاتی
ہوں دانت میں اٹک جاتا ہے۔
اس کے علاوہ صبح اٹھنے پر اور زیادہ
وقت منہ بند رہے یا کھایا پیانا نہ جائے تو بدبو آتی ہے۔
جواب: اپنا قد اور وزن بھی لکھنا تھا تاکہ اندازہ
کیا جاتا کہ جسامت کے اعتبار سے صحیح ہے یا نہیں؟
ہارمونز کی یا زیادتی کی وجہ سے سائز کم۔۔۔ یا زیادہ
ہو جاتا ہے جو قابل علاج ہے۔ آپ رات کو کھانے کے
بعد برش کیا کریں اس کے بعد دھاگے یا خلال یا ڈینٹل
فلاس سے دانتوں کے درمیان خالی جگہوں کو صاف بھی کیا
کریں۔ دونوں مسائل کے لیے ذیل میں دی گئی ڈاکٹر
ولما شواہے جرمنی کی ادویات استعمال کریں۔
Mercsol-30, Chimaphila-30, Fragaria
ves-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر
دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

نسوانی مسائل و خوبصورتی

ارم اقبال - سرگودھا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ 13 سال کی عمر میں ہی مجھے
ماہانہ ایام آگئے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کی
کوئی ترتیب نہیں۔ مجھے لیکوریا بھی عرصہ دراز سے ہے۔
پچھلے ایک سال سے میرے بال تیزی سے جڑوں سمیت
نکل رہے ہیں۔ بے حد باریک، چھوٹے ہیں، سر میں
خشکی، بال روکھے اور دو منہ کے ہیں۔ میرے جسم پر اکثر
الرجی ہو جاتی ہے۔ خارش کر کے وہ جگہ سوج جاتی ہے۔
ایک دو ماہ دوائی لی ہے۔ صافی بھی بے حد پی لی لیکن کوئی
مسئلہ حل نہ ہوا۔ معدے میں بے حد جلن ہوتی ہے۔
پٹوں میں کھنچاؤ ہو جاتا ہے۔ درد ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر
زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاتا۔ پٹھے اکڑ جاتے ہیں۔ میرے
چہرے پر عرصہ چھ سال سے دانے اور کیل مہاسے ہیں۔

304 ماہنامہ پاکیزہ - اگست 2015ء

305 ماہنامہ پاکیزہ - اگست 2015ء



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، ہرمل کوالٹی، کمپیوٹریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سکی۔ پیٹ میں انجکشن لگا کر پیشاب نکالا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے اسے انجکشن اور ڈریپس لگا دیں۔ پوری رات اسے ہر 5 منٹ بعد تھوڑا تھوڑا پیشاب آ جاتا۔ اسے سخت بخار تھا اور بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جب اسے پیشاب ٹھیک آنے لگا تو میڈیسن کھلانا بند کر دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میڈیسن کھانے سے اسے بخار ہو جاتا ہے۔ ہومیو پیتھک میڈیسن کھانے سے اسے نزلہ وزکام ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ اب بھی جوڑوں میں درد ہے۔ درد کی وجہ سے ہاتھ پاؤں سوچ جاتے ہیں۔ تمام ریپورٹس کی فوٹو کاپی ارسال کر رہی ہوں۔ ان کی روشنی میں میری بیٹی کے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ تازیت دعا گور ہوں گی۔

جواب: نوشین کو موسم کے حساب سے پانی پلایا کریں۔ زیادہ گرمی میں زیادہ پانی پلائیں تاکہ پیشاب آرام سے کھل کر آئے۔ اسے کھانے میں تیز مرچ مصالحے اور مرغن اشیاء نہ دیں۔ ایک ماہ دوائی کھلانے کے بعد اس کے بلڈ کے مندرجہ ذیل ٹیسٹ کرانے کے بعد مکمل حال بتائیں۔

Urea, Uric acid, Creatinine

ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Pentarkan Ptk-73 Rhustoxicodendron کے 10 قطرے ایک گھونٹ یا آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Solidago Pentarkan Ptk-79 کے 10 قطرے ایک گھونٹ یا آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

☆☆☆

مشورہ دیتے ہیں لیکن مجھ سے ورزش بھی نہیں ہوتی۔ جواب: آپ کی کیفیات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے مسائل کے حل کے لیے سنجیدگی سے اب تک علاج نہیں کیا اسی وجہ سے وقت کے ساتھ آپ کی بیماریاں بڑھ گئیں۔ کیشیم اور بی کلسیم کی کمی بھی لگتی ہے۔ مایوس نہ ہوں۔ آپ کے ان تمام مسائل کا ہومیو پیتھک میں حل موجود ہے۔ لیکن توجہ کے ساتھ علاج کریں۔ واک کیا کریں۔ تیز مرچ مصالحوں، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں کا استعمال نہ کریں۔ غذا کو اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ سب سے زیادہ پانی نہ پیا کریں۔ متوازن غذا استعمال کریں۔ دہی کا استعمال بڑھا دیں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Magnasium phosphoricum Pentarkan Ptk-60 گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Calc carb-30 اور Sepia-30 کے 10 قطرے آدھے گلاس میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ Bismutum Pentarkan Ptk-16 کی ایک گولی تھوڑے سے پانی سے 3 مرتبہ پئیں۔

جوڑوں کا درد اور پیشاب کی بندش

ٹریانواز۔ لیہ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب میری بیٹی نوشین کنول جس کی عمر 23 سال ہے ذہنی معذور ہے۔ تقریباً عرصہ ایک سال سے اس کے جوڑوں میں درد رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں سوچ جاتے تھے۔ اچانک اس کا پیشاب بند ہو گیا۔ متاثرہ جگہ پر سوزش ہونے کی وجہ سے نالی نہ لگ



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوا بے سنگل ری میڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیو پیتھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY

FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY